رسائل

۱۷

جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

انجمن اردوے معلیٰ مُسلم یونیورسٹی

کا

علمی و ادبی سالنامہ

سُہیل

رشید احمد صدیقی (علیگ) مرتّب

آل احمد سرور (علیگ) معاونِ مرتّب

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں ۱۳۵۴ھ ۱۹۳۶ء طبع ہو کر شائع ہوا

قیمت دو روپے آٹھ آنے

محصول تین روپے

فہرست مضامین

شذرات :-

باز گو از نجد و از یارانِ نجد

وسط سنہ ۱۹۲۷ء میں سہیل کا چھٹا اور اس سلسلہ کا آخری نمبر شائع ہوا۔ آج سنہ ۱۹۳۵ء کے آخر میں اس کو پھر منظرِ عام پر لانے کی توفیق ہوئی، پہلے یہ سہ ماہی تھا، اب سالانہ ہوگا، اسی اعتبار سے بعض تبدیلیاں بھی نظر آئیں گی۔ یقین ہے کہ یہ تبدیلیاں پسندیدہ بھی ہونگی اور مفید بھی۔

سہیل کا ماضی کچھ ایسا تاریک نہیں رہا ہے کہ اس کے لئے ہم شرمندہ ہوں اور نہ ایسا تابناک رہا ہے کہ اس کے سامنے دنیا کا ہر کارنامہ بے نور کیا جا سکے۔ ہمارے لئے یہ اکتفا کرتا ہے کہ ہم سے جو کچھ ہو سکا کرتے رہے، جب کچھ نہ ہو سکا تو خاموش رہے اور صورتِ حال اُمید افزا ہوئی تو جلد سے جلد پھر آمادۂ کار ہو گئے۔ ہم سے یہی ہو سکا اور ہو سکتا ہے اور یہ کوئی قابلِ سرزنش بات بھی نہیں ہے۔ آئندہ سہیل دسمبر کے آخر میں شائع ہوا کریگا۔ اس کی ظاہری صورت دل کش نہ ہو تو یہ نہ ہمارا قصور ہے نہ سہیل کا مقصد، ہم حتی الوسع اس کا لحاظ ضرور رکھیں گے

کہ جو مضامین اس تک راہ پائیں وہ مفید دلچسپ اور قابل قدر ہوں۔ اُردو میں بے شمار اور مختلف رسالے شائع ہوتے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ اُن سے ہر مذاق کی کسی نہ کسی حد تک تشفی ہوتی رہتی ہے۔ سہیل کے موجودہ نمبر میں بھی اس کا التزام ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مضامین میں تنوع ہو، لیکن تنوع کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ معمولی یا ادنیٰ مذاق کی بھی تسکین ہو سکے۔ بحیثیت ایک دار العلوم کے ہمارا نصب العین یہ ہے کہ اُردو کو ایسی ترقی پذیر سطح پر رکھا جائے جو اُردو اور اُردو داں دونوں کے لئے صحیح اور صالح ہو، ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُردو سمجھ سکیں بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فراست اولوالعزمی اور ہمدردی کے ساتھ اُردو کی توسیع و ترقی میں حصہ لے سکیں۔

جہاں تک اُردو کا تعلق ہے علی گڑھ کا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے سمجھدار، ہمدرد، وسیع النظر اور وسیع المشرب ہستیوں کو ایک مرکز پر مجتمع کیا، قابلیت کا معیار جغرافیائی نہیں بلکہ علمی و عالمانہ رکھا، اس اعتبار سے جو لوگ علی گڑھ کے نام سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں وہ تنگ دلی اور ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم کو ان سے عداوت نہیں ہے ہم ان کو حریف نہیں سمجھتے، ہم کو صرف ان کی تنگ خیالی پر ترس آتا ہے۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ علی گڑھ کوئی محاذِ جنگ نہیں ہے بلکہ وہ صحیح اور صالح جذبات اور ذوقِ عمل کی دعوت دیتا ہے، ہم کو اس امر کا اعتراف ہے کہ علی گڑھ سے باہر کے لوگ بھی اُردو کے ہمدرد ہیں، صاحب طرز ہیں، اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ ان کے خلوص، ان کی قابلیت، ان کی علوہمتی میں کوئی شک نہیں۔ علی گڑھ ایک تصور کی ترجمانی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ذی استعداد اور سمجھدار لوگ اس کی اعانت کریں اس کے لئے نہ اس کی ضرورت ہے کہ لوگ علی گڑھ میں آکر ملازمت کریں، نہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کے نام پر بھلے مانسوں پر زندگی دوبھر کر دیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ خود کام کریں، ہم کو کام کرنے دیں اور ایک دوسرے کے رفیق کار بنیں اور یہ بھی نہ ہو سکے تو کچھ نہ کریں۔ اکثر اس قسم کی مدد بھی بڑی قیمتی ہوتی ہے۔

کچھ لوگ نہایت خلوص لیکن کسی قدر بے صبری کے ساتھ دریافت کریں گے کہ علی گڑھ اس وقت کیا کر رہا ہے یہ سوال ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کرتے ہیں، خاموشی سے کرتے ہیں اور تحسین و تنقیص سے بے نیاز ہو کر کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک دقت کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے عام طور پر جب کبھی علی گڑھ کے سلسلہ میں کوئی بحث چھڑتی ہے تو ہمارے دوست غیر شعوری طور پر موجودہ علی گڑھ کا

مقابلہ گزشتہ علی گڑھ سے کرنے لگتے ہیں اور ان حقائق کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں جو موجودہ اور گزشتہ علی گڑھ کو ایک دوسرے سے متمائز کرتے ہیں، بجا طور پر کرتے ہیں اور ناگزیر طور پر کرتے ہیں۔ ابتداءً علی گڑھ کا قیام اس ضرورت اور اس نیت کی بنا پر ہوا تھا کہ ایک ہولناک ابتدا کو ہولناک تر انجام سے بچایا جائے ۱۸۵۷ء میں وہ سب کچھ ہو گیا جو اپنے شدائد اور عواقب کے اعتبار سے اندلس، بغداد اور قسطنطنیہ کے زوال سے کسی حد تک سنگین تر تھا۔ مسلمانوں کی حکومت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی دولت و امارت، ان کا تمدن، ان کی معاشرت ان کا علم و فضل غرض ان کی ساری متاعِ حیات تباہ ہو چکی تھی، بربادی کی یہ انتہا نہ تھی بلکہ اس کا انجام اس سے بھی زیادہ تاریک اور مایوس کن نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ اب صرف اس حکومت کے ہاتھ میں نہ تھا جو ان کے بجائے ہندوستان کے سیاہ و سپید کی مالک ہو چکی تھی بلکہ ان کا مقابلہ ہندوستان کی ان دیگر اقوام سے بھی تھا جو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں سے بیزار تھیں۔

اس حالت میں سرسید سینہ سپر ہوئے۔ ہمارے نزدیک* سرسید کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ آنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ایسے وقت امداد کی جب بظاہر ان کا کوئی معین و مددگار نہ تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ایک سے زیادہ غنیموں سے محفوظ رکھا جو اکثر اعتبار سے ظاہری دشمنوں سے زیادہ سفاک اور بے پناہ تھے۔ عام طور پر جب کوئی قوم شکست کھاتی ہے تو اس کو صرف اپنے قریب ترین دشمن سے عہدہ برآ ہونے کی فکر ہوتی ہے اس کی اپنی ایک ہی جماعت ہوتی ہے جس کے اغراض و مقاصد قریب قریب یکساں ہوتے ہیں اس کو متحد ہونے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ مثال میں جنگِ عظیم کے بعد جرمن قوم کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جس نے باوجود تباہی کے اپنے آپ کو جلد سے جلد منظم کر لیا۔ لیکن مسلمانوں کی حالت بالکل جداگانہ تھی وہ اپنے ہی گھر میں دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے اور اب جو دنیا ان کے سامنے تھی، اس میں تجارت کے نئے اصول، سائنس کے جدید ترین انکشافات، تعلیم کے نئے نظریئے، اخلاق و مذہب کے عجیب و غریب تصورات برسر کار تھے۔ مسلمانوں کو ان سب سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ مادی اسباب اور وسائل کا فراہم کر لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا ذہنی انقلابات سے متوازن اور ہم آہنگ ہونا دشوار ہوتا ہے۔

ان تمام امور کو مدِ نظر رکھ کر اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سرسید نے علی گڑھ تحریک کی طرح ڈالی۔

اب سر سید اور ان کے رفقا محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، چراغ علی نے مسلمانوں کے لئے حیاتِ نو کی بساط بچھائی ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ان غریبوں پر جو کچھ گزر گئی اس کا اعادہ یہاں یوں طوالت سے خالی نہ ہوگا کہ اس پر مسلمانوں کی گزشتہ شصت سالہ تاریخ اور علی گڑھ کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے ؎

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

چنانچہ مسلمانوں کے صلاح و فلاح کے سلسلہ میں جتنی تحریکیں اس زمانہ میں علی گڑھ سے اٹھائی گئیں وہ سب کم و بیش کامیاب ہوئیں تعلیم، مذہب، اخلاق، زبان، علوم، سیاست، تمدنی و معاشرتی روایات غرض زندگی کے ہر شعبہ کے نشیب و فراز پر ہمارے قوم کی نظریں علی گڑھ کی سمت اٹھتیں اور کامراں واپس ہوتیں۔

ہندوستان کی تاریخ نے نیا ورق الٹا۔ آئین سیاست نے بھی پہلو بدلا، جدید ترین علوم اور جدید ترین انکشافات نے زندگی کو یکسر منقلب کر دیا اور اخلاق، مذہب، تعلیم، حکومت، صنعت و حرفت، تجارت اور سیاست نے اپنی اپنی جگہ پر مستقل حیثیت اختیار کی۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نئے نئے اصول وضع کئے گئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا اور یہ عین فطرت تھا جس میں طنز و تمسخر یا نہ ارزانی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ ان قوتوں یا ان مطالبات سے یکہ و تنہا عہدہ برآ ہونے سے علی گڑھ معذور رہا۔ انگلستان کے بارے میں یہ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ وہاں کی مشہور یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج جن کے نام لیوا ہم بتائے جاتے ہیں، اخلاق، مذہب صنعت و حرفت، تجارت و سیاست وغیرہ وغیرہ میں وہاں کے باشندوں کی براہ راست خضر راہ بنی ہوں۔ اس سلسلہ میں اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں کی تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت، حکومت سب کچھ انگلستان ہی کی ہے اور انھیں کے لئے ہے! آکسفورڈ، کیمبرج کو نظر انداز کیجئے، خود ہندو یونیورسٹی سے کب ہندو قوم اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ بات وہی ہے جس کا اس سے پہلے اعادہ کیا جا چکا ہے یعنی ہم روایات کی پرستش کرتے ہیں اور حال سے اغماض کرتے ہیں۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ جہاں تک تعلیم اور تربیت ذہنی کا تعلق ہے ہم کو علی گڑھ پر نظر رکھنا چاہیئے لیکن اس کے علاوہ زندگی کے جتنے اور شعبے ہیں مثلاً صنعت و حرفت،

تجارت، سیاست وغیرہ وغیرہ ان کے لئے مزید اور نئے نئے ادارے کھولنے چاہئیں اور انھیں سے مطابقت آری کی صورت نکالنی چاہیئے۔ ورنہ ہمیشہ خلطِ مبحث ہوتا رہے گا۔ اب علی گڑھ کو وہ مواقع حاصل نہیں ہیں اور نہ میسر آسکتے ہیں جو عہد گزشتہ میں اس کو حاصل تھے اب ہم کو اور ہمارے نکتہ چینیوں کو تقسیم عمل کے اصول پر کاربند ہونا چاہیئے ورنہ ظاہر ہے یہ گتھی سلجھنے کے بجائے اُلجھتی ہی جائے گی۔

ہم اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ علی گڑھ پر غور کرنے سے پہلے ان مسائل پر بھی غور فرمالیا کریں علی گڑھ کے لئے نہایت آسان ہے کہ وہ صنعت وحرفت اور اس قبیل کے دوسرے شعبوں کو قائم کرکے ہر سال ایسے طلبا بھیجنا شروع کردے جو ان علوم وفنون میں کامل ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی کھپت کہاں ہوگی اور کیسے ہوگی۔ اس سلسلہ میں ہندو یونیورسٹی کی مثال پیش کرنے سے پہلے اس پر بھی غور کرلینا چاہیئے کہ ہندوستان کی حکومت میں جہاں سے اس قسم کے کاروبار کے دروازے کھلتے بند ہوتے رہتے ہیں مسلمانوں کا کہاں تک عمل دخل ہے یا خود مسلمانوں کے کاروبار کتنے اور کیسے ہیں جو ہمارے نوجوانوں کو اپنی آغوش میں لے سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہماری بیرونی جماعت اس سلسلہ میں کیا کر رہی ہے۔ اس کو کیا کرنا چاہیئے اور خود اس پر اس زبوں حالی کی ذمہ داری کہاں تک عائد ہوتی ہے!!

یہ ایک اجمالی خاکہ تھا جسے ذہن میں رکھ کر ہم کو علی گڑھ کی صورت حال کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ اس وقت اُردو کی خدمت کس طور پر کررہا ہے۔ اس سوال کا جواب مختصر طور پر دیا جاچکا ہے یعنی ہم سے جو کچھ ہوسکتا ہے ہم خاموشی کے ساتھ کررہے ہیں۔ پچھلے سال یونیورسٹی نے اُردو میں ام اے اور آنرز کی جماعتیں کھولدیں اور اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ یہ جماعتیں ابھی ابھی معرضِ وجود میں آئی ہیں یہ امر نہایت اُمید افزا ہے کہ طلبا کی تعداد سال بسال ترقی پذیر ہے۔ اس سال ہمارے دو ہونہار طلبا اپنے اپنے مخصوص مضامین کی ترتیب وتدوین کے لئے ہندوستان کے مختلف حصص کا جہاں مفید مطلب مواد مل سکتا تھا دورہ کرتے رہے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے حیدرآباد کا بھی سفر کیا اور پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب کی ہدایات، مہمان نوازی اور سرپرستی سے مستفید ہوکر واپس ہوئے۔ ابولیث صاحب صدیقی جن کا مضمون انھیں صفحات میں نظر سے گزرے گا، اُردو کے مختلف تذکروں پر کام کررہے ہیں اور ان تمام تذکروں کو مدنظر

اب سرسید اور ان کے رفقا محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد تاریخ مرتب کرنا چاہتے ہیں۔
کے لئے حیاتِ نو کی بساط بچھائی ہے
۔یسٹ صاحب کو اس سلسلہ میں کتب خانہ
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را نسخے دستیاب ہوئے اور انھوں نے
ان غریبوں پر جو کچھ گزر گئی اس کا اعادہ بیکار ہے۔ معین الدین صاحب دردائی اُردو مثنویوں پر کام کر رہے ہیں۔
گزشتہ شصت سالہ تاریخ ادب علی گڑھ
میں ان کا ایک مضمون "بہار کی اُردو شاعری" پر نظر سے گزرے گا۔ معین صاحب نے اس مقالہ کی ترتیب میں نہایت تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے اور بڑی سعی کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ دورانِ تحقیقات میں ان کو بہار کے بعض خانقاہوں، درگاہوں اور شائقین علم کے ذاتی کتب خانوں میں اُردو کے نہایت نادر اور کار آمد نسخے نظر آئے جن کو منظرِ عام پر لانا نہایت ضروری ہے۔ اس کام کو وہ کسی نہ کسی وقت ضرور شروع کریں گے۔ ہم کو اُمید ہے کہ ان کی یہ سعی مشکور ہوگی۔ ان تحقیقی کاموں کے علاوہ خلیل الرب صاحب صدیقی نے جناب اصغر کے جدید ترین کلام کے مجموعہ سرودِ زندگی پر تنقید کی ہے، علی سردار جعفری صاحب نے ایک ڈراما "دیوانے" پیش کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ سب مضامین لکھنے والوں کی آئندہ ترقی اور شہرت کا موجب ہونگے۔ ہم کو اپنے ان تمام طلبا کی قابلیت اور محنت پر اعتماد ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ یہ اردو ادب اور ہمارے درس گاہ کے چشم و چراغ ثابت ہونگے۔

سہیل کا مقصد اشتہار بازی نہیں ہے اس لئے ہم نے اس کو تبرکات کا مجموعہ بنانے سے گریز کیا ہے۔
انجمن اُردوئے معلی اور سہیل ہماری درس گاہ کے طالب علموں کی چیزیں ہیں اور بڑی حد تک انھیں طالب علموں کی مالی امداد پر اس کا قیام و بقا منحصر ہے۔ طالب علموں کے مضامین کو کاملین فن کے معیار سے نہیں پرکھنا چاہیئے۔ طالب علم پھر طالب علم ہیں۔ ان میں کہیں لغزشیں نظر آئیں گی۔ ان لغزشوں کی اصلاح ہوتی رہی تو آخر میں یہی لوگ صاحبِ طرز اور صاحبِ فن ہو جائیں گے۔ نکتہ گیری کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرنا چاہیئے۔ نوجوانوں کی بعض لغزشیں بوڑھوں کی اکثر موشگافیوں سے زیادہ قابلِ احترام ہوتی ہیں۔

ہم مسرور اور مطمئن ہیں کہ علی گڑھ میں اب بھی وہ صلاحیت وہ جوہر، وہ ولولے اور وہ امکانات موجود ہیں جن کی تنظیم و تشکیل میں اُردو کی صلاح و فلاح مضمر ہے۔ آپ سہیل میں طلبا کے کافی مضامین مطالعہ فرمائیں گے ہمارا عقیدہ ہے کہ کوئی قوم اور اس کا ادب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک اس کے نوجوان اپنے

جوشِ عمل اور جذبۂ خدمت سے ان کے لئے مزید اور نئے نئے ادارے کھولنے چاہئیں اور انھیں سے مطابع آرای
جس کے بغیر کسی اہم کام کا تسلسل د شۂ خلطِ مبحث ہوتا رہے گا۔ اب علی گڑھ کو وہ مواقع حاصل نہیں ہیں اور نہ میسر
اس طرح پر پرکھنا چاہئیے۔ اس کے سے تھے اب ہم کو اور ہمارے نکتہ چینیوں کو تقسیم عمل کے اصول پر
ہونے والا نہیں ہے اور یہی اس کام کی اہمیت اور حرب مذ اُلجھتی ہی جائے گی۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ر عا. گ. ر غور کرنے سے بعد
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ان مقالات کے علاوہ اس سال انجمن کی سرکردگی میں اُردو کا ہفتہ منایا گیا جس میں طلبا اور اساتذہ نے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ یہ تقریب محض گرمیِ محفل کے سلسلہ میں نہ تھی، جو مقالات پڑھے گئے وہ اپنی اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے نہایت درجہ قابلِ قدر تھے۔ ہمارے طلبا میں یہ تقریب نہایت مقبول ہوئی اور باہر بھی قدر کی نظروں سے دیکھی گئی۔ اُردو اور انگریزی صحائف اور ہمدردانِ یونیورسٹی نے اس کی جس طور پر پزیرائی کی اُس سے کارکنانِ تقریب کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ انجمن کے سامنے نہایت مفید پروگرام ہے، بعض مقالات اور دیگر کتب کی تدوین و طباعت کا کام بھی پیشِ نظر ہے لیکن انجمن کے پاس مشکل سے اتنا سرمایہ ہے کہ وہ سہیل کی طباعت و اشاعت کی کفیل ہو سکے۔ اس لئے بعض نہایت ضروری کام رُکے پڑے ہیں۔ یہاں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم نہایت ادب اور خلوص کے ساتھ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کی توجہ اُس تجویز کی طرف مائل کریں جس کا ذکر صدرِ انجمن نے اُردو ہفتہ کے افتتاح کے موقع پر خطبۂ صدارت میں کیا ہے یعنی :۔

"علی گڑھ میں اُردو کا ایک دار التصنیف ہونا چاہیئے جس میں ہندوستان کے مختلف فضلا اور ہمارے منتخب فارغ التحصیل طلبا تصنیف و تحقیق میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم نوا رہ سکیں۔ ہم کو سرسید کی طرف اگر عود کرنا ہے تو سرسید کے اس زبردست کارنامے کو کیوں فراموش کیجئے۔ اُنھوں نے شعر و ادب کے مفسرین کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور یہ انھیں کا فیضان ہے کہ علی گڑھ میں اُردو کا نشأۃ الثانیہ طلوع ہوا، اور علی گڑھ نے وہ سب کچھ کیا جس کے لئے اُس کا نام روشن ہے۔"

اس تجویز کو معرضِ وجود میں لانا ازبس ضروری ہے۔ طباعت و اشاعت کا معقول و مستقل انتظام نہ ہونے کے

رکھکر جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں اُردو کی ایک مختصر لیکن جامع تاریخ مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کام نہایت مفید اور اُردو کی تاریخ سمجھنے میں بڑی سہولت کا موجب ہوگا۔ ۔۔۔یث صاحب کو اس سلسلہ میں کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد اور بعض مشاہیر کے ذاتی کتب خانوں سے بعض نادر نسخے دستیاب ہوئے اور انھوں نے جستہ جستہ لیکن ضروری اقتباسات حاصل کر لئے ہیں۔ ۔۔۔ معین الدین صاحب درداؔئی اُردو مثنویوں پر کام کر رہے ہیں۔ ۔۔۔ ان کا ایک مضمون "بہار کی اُردو شاعری" پر نظر سے گزرے گا۔ معین صاحب نے اس مقالہ کی ترتیب میں نہایت تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے اور بڑی سعی کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ دورانِ تحقیقات میں ان کو بہار کے بعض خانقاہوں، درگاہوں اور شائقین علم کے ذاتی کتب خانوں میں اُردو کے نہایت نادر اور کارآمد نسخے نظر آئے جن کو منظرِ عام پر لانا نہایت ضروری ہے۔ اس کام کو وہ کسی نہ کسی وقت ضرور شروع کریں گے۔ ہم کو اُمید ہے کہ ان کی یہ سعی مشکور ہوگی۔ ان تحقیقی کاموں کے علاوہ خلیل الرب صاحب صدیقی نے جناب اصغرؔ کے جدید ترین کلام کے مجموعہ سرودِ زندگی پر تنقید کی ہے، علی سردار جعفری صاحب نے ایک ڈراما دیوانے پیش کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ سب مضامین لکھنے والوں کی آئندہ ترقی اور شہرت کا موجب ہونگے۔ ہم کو اپنے ان تمام طلبا کی قابلیت اور محنت پر اعتماد ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ یہ اردو ادب اور مادر درس گاہ کے چشم و چراغ ثابت ہونگے۔

سہیل کا مقصد اشتہار بازی نہیں ہے اس لئے ہم نے اس کو تبرکات کا مجموعہ بنانے سے گریز کیا ہے۔

انجمن اُردوئے معلیٰ اور سہیل ہماری درس گاہ کے طالب علموں کی چیزیں ہیں اور بڑی حد تک انھیں طالب علموں کی مالی امداد پر اس کا قیام و بقا منحصر ہے۔ طالب علموں کے مضامین کو کاملین فن کے معیار سے نہیں پرکھنا چاہیئے۔ طالب علم پھر طالب علم ہیں۔ ان میں کہیں لغزشیں نظر آئیں گی۔ ان لغزشوں کی اصلاح ہوتی رہی تو آخر میں یہی لوگ صاحبِ طرز اور صاحبِ فن ہو جائیں گے۔ نکتہ گیری کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرنا چاہیئے۔ نوجوانوں کی بعض لغزشیں بوڑھوں کی اکثر موشگافیوں سے زیادہ قابل احترام ہوتی ہیں۔

ہم مسرور اور مطمئن ہیں کہ علی گڑھ میں اب بھی وہ صلاحیت وہ جوہر وہ ولولے اور وہ امکانات موجود ہیں جن کی تنظیم و تشکیل میں اُردو کی صلاح و فلاح مضمر ہے۔ آپ سہیل میں طلبا کے کافی مضامین مطالعہ فرمائیں گے ہمارا عقیدہ ہے کہ کوئی قوم اور اس کا ادب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک اس کے نوجوان اپنے

جوشِ عمل اور جذبۂ خدمت سے دوسرے کام کرنے والوں کے معین نہ ہوں تہیل میں آپ کو وہ توازن ملے گا جس کے بغیر کسی اہم کام کا تسلسل دکھانا ناممکن ہے۔ اس چیز کو نہ تو ایک نمبر سے دکھایا جا سکتا ہے اور نہ اسے اس طرح پرپرکھنا چاہیئے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ خود کام میں تسلسل ہو۔ یہ کام سالہا سال کا ہے اور پھر بھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور یہی اس کام کی اہمیت اور خوبی کی ضمانت ہے ؏

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک ست

ان مقالات کے علاوہ اس سال انجمن کی سرکردگی میں اُردو کا ہفتہ منایا گیا جس میں طلبا اور اساتذہ نے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ یہ تقریب محض گرمیِ محفل کے سلسلہ میں نہ تھی، جو مقالات پڑھے گئے وہ اپنی اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے نہایت درجہ قابلِ قدر تھے۔ ہمارے طلبا میں یہ تقریب نہایت مقبول ہوئی اور باہر بھی قدر کی نظروں سے دیکھی گئی۔ اُردو اور انگریزی صحائف اور ہمدردانِ یونیورسٹی نے اس کی جس طور پر پذیرائی کی اُس سے کارکنانِ تقریب کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ انجمن کے سامنے نہایت مفید پروگرام ہے، بعض مقالات اور دیگر کتب کی تدوین و طباعت کا کام بھی پیشِ نظر ہے لیکن انجمن کے پاس مشکل سے اتنا سرمایہ ہے کہ وہ تہیل کی طباعت و اشاعت کی کفیل ہو سکے۔ اس لئے بعض نہایت ضروری کام رُکے پڑے ہیں۔ یہاں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم نہایت ادب اور خلوص کے ساتھ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کی توجہ اُس تجویز کی طرف مائل کریں جس کا ذکر صدر انجمن نے اُردو ہفتہ کے افتتاح کے موقع پر خطبۂ صدارت میں کیا ہے یعنی:-

"علی گڑھ میں اُردو کا ایک دار التصنیف ہونا چاہیئے جس میں ہندوستان کے مختلف فضلا اور ہمارے منتخب فارغ التحصیل طلبا تصنیف و تحقیق میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم نوا رہ سکیں۔ ہم کو سرسید کی طرف اگر عود کرنا ہے تو سرسید کے اس زبردست کارنامے کو کیوں فراموش کیجیے۔ اُنھوں نے شعر و ادب کے مفسرین کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور یہ انھیں کا فیضان ہے کہ علی گڑھ میں اُردو کا نشاۃ الثانیہ طلوع ہوا اور علی گڑھ نے وہ سب کچھ کیا جس کے لئے اُس کا نام روشن ہے۔"

اس تجویز کو معرضِ وجود میں لانا ازبس ضروری ہے۔ طباعت و اشاعت کا معقول و مستقل انتظام نہ ہونے کے

سبب سے یونیورسٹی کی علمی کارگزاریاں منظر عام پر نہیں آئیں - اس کے علاوہ نہ تو دوسروں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور نہ اس قسم کے کام کی ترغیب و تحریص ہوتی ہے۔ اس کے لئے معقول اور مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن نہ اتنے سرمایہ کی کہ ہم اس اہم تحریک کو نظر انداز کر دیں یا قابلِ التفات نہ سمجھیں۔ خود ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی کوئی تحریک قوم اور ملک کے سامنے پیش کی جائے تو ہماری توقعات بڑی حد تک پوری ہونگی۔

ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلہ پر انہیں صفحات میں ڈاکٹر اشرف صاحب کا مضمون خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فی نفسہ زبان کا مسئلہ اتنا پیچیدہ اور نازک نہیں ہے جتنا اسے مذہبی اور جماعتی رنگ دے کر ناخوشگوار اور ناپسندیدہ بنا دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ بیداری صرف فرقہ وارانہ کشاکش اور باہمی نفاق اور بے اعتمادی کا ایک دردناک مظاہرہ ہے۔ جب یہ مسلّم ہے کہ ہندوستان کی نجات اور آزادی اس پر نہیں منحصر ہے کہ ایک فرقہ کے علاوہ تمام دوسرے فرقوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا جائے یا ان کو وجودِ معطل قرار دے دیا جائے تو پھر اس میں کیا قباحت ہے کہ ان کے جائز حقوق کو انصاف اور سیرچشمی سے نہیں تو مصلحتِ وقت کی بنا پر تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن اگر بے جا پاسداری اور ناروا سلوک سے مطلب برآری کی توقع کی جاتی ہے تو پھر بددلی، بے چینی، افتراق و نفاق کا جو کچھ انجام ہوگا اس سے بھی روگردانی نہ کرنا چاہیئے۔ خالص ہندو یا خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس قسم کے مسائل کا تصفیہ ناممکن بھی ہے اور بڑی حد تک ناروا بھی۔ شرافت اور محبت کا اقتضا تو یہ ہے کہ ہندوستان کی کس مپرسی اور درماندہ اقوام کی تالیف قلوب بھی مدِ نظر رہے لیکن اگر شرافت اور مروت کو ہندوستان کی سیاست سے خارج سمجھ لیا جائے اور رواداری کو بھی پس پشت ڈال دیا جائے پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ صریح بے انصافی کو کبھی پائندگی نصیب ہو۔ ہندوستان کی صلاح و فلاح میں مسلمانوں کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ضرور ہی رہا ہے۔ پھر ہندوستان کی انتظامی در و بست میں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کیوں نظر انداز کی جائے اور اس پر مسلمان آزردہ ہوں تو شکایت کا کیا محل ہے۔

اس کے علاوہ جب کوئی مسئلہ ہندوستانی یا قومی نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا ہے تو توقع بھی کی جاتی ہے کہ ہندوستان جن اقوام پر مشتمل ہے اُن سب کی صلاح و فلاح مدنظر ہوگی۔ قومی یا ہندوستانی کے معنی نہ تو "ویدک دھرم" ہے اور نہ "خلافتِ راشدہ"۔ بصورتِ دیگر ویدک دھرم کے بجائے خلافت راشدہ کیوں نہیں یا

دونوں کے بجائے "برطانیہ" یا "برطانیت" کیوں نہیں! قومی زندگی کی نشوونما اگر مذہبی یا جماعتی رنگ میں ہوئی تو ظاہر ہے کہ مذہبی اور جماعتی فساد کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوتا رہے گا اور اس کی ذمہ داری ذمہ داروں کو کچھ اس طور پر بھگتنی پڑے گی کہ لوگ آشوبِ ہلاکو اور فتنۂ چنگیز کو بھی بھول جائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان درماندہ ہیں ان کو نہ اپنے آپ پر اعتماد ہے اور نہ اس نصب العین پر جس کے وہ علمبردار رہ چکے ہیں اور جس نے دنیا میں تمدن، اخوت، عافیت، جرأت، صداقت، شعروادب، علم وحکمت کو بلند، متوازن اور استوار کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب قوت بازو اور قوتِ ایمانی دونوں سے محروم ہیں۔ دوسرے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں لیکن ہم اس بحث کو طوالت نہیں دینا چاہتے۔ مسئلہ زیر نظر صرف اُردو ہے۔ اُردو ہندی جھگڑے سے پہلے کسی کو کبھی اس کا احساس نہ ہوا کہ ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان کی ضرورت ہے اور یہ محض اس بنا پر تھا کہ اردو عام طور پر سارے ہندوستان میں بولی یا سمجھی جاتی تھی۔ ہم کو یقین ہے کہ دنیا کے کسی حصۂ ارض میں جو جغرافیائی، تمدنی یا سیاسی اعتبار سے ہندوستان ہی کی مانند مختلف الحال اور مختلف النوع رہا ہو کوئی زبان اتنی کارآمد یا مقبول نہ تھی جتنا کہ ہندوستان میں اُردو اور محض اس بنا پر کہ اردو کی حیثیت اُس لسانی مفاہمہ کی تھی جو ہندوستان کی اقوام نے غیر شعوری طور پر بطیب خاطر بلا جبر واکراہ یا ترغیب و تحریص کے خود بخود کرلیا تھا۔ اگر اُردو کا وجود اس لئے ناقابلِ برداشت ہے کہ اس سے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت یا ان کا تمدنی یا معاشرتی تسلط یاد آتا ہے تو پھر ان کو اُردو کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے وہ تمام ذہنی اور مادی برکات بھی ہندوستان کی سرزمین اور ہندوستان کی تاریخ سے مٹانے کی کوشش کرنا چاہئے جن سے ہندوستان نے فائدہ اٹھایا ہے اور جن کی بنا پر یہی ابنائے وطن دنیا کے متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کے سامنے اپنی عظمت اپنے حقوق اور اپنی کارکردگی کی داستانیں دہراتے ہیں!

اسی ہندی تحریک کا ایک شاخسانہ وہ اضطراب و انتشار ہے جو بعض حلقوں میں سرحدی صوبہ میں اُردو کو ورنا کیولر قرار دینے کے سبب سے رونما ہے۔ ہندی کے علمبردار جس بیباکی سے ہندی کو جبریہ طور پر منوانے کی کوشش میں سرکف اور آمادۂ پیکار ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُردو جس مرنجاں مرنج طریق پر بے منت غیرے

ہندوستان اور ہندوستانیوں کے دلوں میں گھر کر رہی ہے۔ اس کو مٹا کر ہندی کی اشاعت کی جائے اور لوگوں کو ہندی سیکھنے اور بولنے پر مجبور کیا جائے۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ بھی اسی طور پر اور اسی ذہنیت کے ساتھ ہندی کی تبلیغ و اشاعت میں حصّہ لے؟ ہمارے اس کہنے سے معاً ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے گویا صوبۂ سرحدی میں اُردو کی اشاعت اسی طور پر کی جا رہی ہے۔ لیکن صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ سرحدی اضلاع میں اُردو جتنی مقبول اور کارآمد ہے اس سے کہیں زیادہ سرحدی صوبہ کے علاوہ ان تمام مقامات میں ہندی اجنبی اور غیر کارآمد ہے جہاں ابنائے وطن اپنی دولت، طاقت اور اقتدار کے بل پر ہندی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ صوبۂ سرحدی میں اُردو کو مقبول ترین ورناکیولر قرار دینا عین انصاف اور عین ہمدردی ہے۔ صوبۂ سرحد اور آس پاس (دور دور تک) جو زبان مروّج اور مقبول ہے اُن سے سب سے زیادہ نزدیک اور سب سے زیادہ متجانس اُردو ہے اور ہمارا خیال ہے کہ انتظامی مصالح کی بنا پر بھی حکومت کو کسی ایسے فعل کا مرتکب نہ ہونا چاہیئے جو نسبتاً کم متمدن یا تعلیم یافتہ قوم یا قبیلہ کے اشتعال پذیر جذبات کو اُکسانے کا محرک ہو۔ زبان کے مسئلہ میں حکومت کا یہ رویّہ ہمدردانہ منصفانہ اور ان سب سے بڑھکر دانشمندانہ بھی ہے۔ ہندی کو جبری طور پر صوبۂ سرحد میں نافذ کرانے میں بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں۔ ان قبائل میں غلط فہمی یا بدگمانی کا پیدا ہونا، ہندو مسلمان انگریز، سکھ کسی کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

سیاسی، معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے جو اہمیت اور قبول عام اُردو کو نصیب ہے اس کا تذکرہ سطورِ بالا میں کیا جا چکا ہے۔ اب ہم نہایت اختصار لیکن وثوق کے ساتھ اُردو کی لسانی حیثیت کو پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اربابِ نظر پر یہ امر بھی روشن ہو جائے کہ اُردو قطعاً وہ زبان نہیں ہے جس کو ہندوستان میں کسی اعتبار سے اجنبی کہا جا سکے۔ نظر براں اُردو کو بدیسی کہنا زبان کی تاریخ، ترکیب اور فلسفہ سے بیگانگی کی دلیل ہے۔

حسب ذیل بحث پروفیسر سید وحید الدین سلیم مرحوم کی معرکتہ الآرا کتاب وضع اصطلاحات سے ماخوذ ہے جسے انجمن ترقی اُردو نے اورنگ آباد (دکن) سے شائع کیا تھا)

ماہرین لسانیات نے السنۂ عالم کی تقسیم یوں کی ہے:

۱- آریائی ۲- سامی ۳- تورانی

آریائی زبان دو شاخوں میں منقسم ہے :-

(۱) مشرقی (۲) مغربی

مشرقی شاخ چار شعبوں میں تقسیم ہے :-

(۱) ہندی ایرانی (۲) اناطولک

(۳) تھریسی الیری (۴) بالطوسلوکی

ہندی ایرانی: ۱- ہندیائی اور ۲- ایرانیائی شعبوں میں منقسم ہے۔

ہندیائی دو بڑے مجموعوں پر مشتمل ہے یعنی :

(۱) سنسکرت اور (۲) غیر سنسکرتی

سنسکرتی زبانوں کے زمرہ میں: سنسکرت، پالی، مہاراشٹری، ماگدھی، سورسینی، کشمیری، سندھی، مرہٹی، اُڑیا، بنگالی، آسامی، راجستانی، گجراتی، نیپالی، سنگھالی، ہندی بھاشا اور اُردو کا شمار ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو اُن زبانوں میں شامل ہے جو سنسکرت سے مشتق ہیں۔

دوسری طرف ایرانیائی شعبہ میں پشتو، فارسی، ژند اور پہلوی زبانیں شامل ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو کا رشتہ فارسی اور اس کی شاخوں سے بھی ہے۔

عربی کا تعلق سامی خاندان سے ہے اور ترکی کا تورانی سے۔ اُردو میں عربی زبان کے الفاظ مشتقات ترکیب یا قواعد کی کارفرمائی جس حد تک ہے اس سے کم و بیش ہم سب واقف ہیں اس لئے اس کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں۔

ترکی زبان کا رشتہ تورانی سے ملتا ہے۔ اُردو میں ترکی الفاظ کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔

اس طور پر اُردو کا تعلق دنیا کے تینوں مشہور خاندانہائے السنہ سے ہوا

لیکن چونکہ اُردو زبان کی ترکیب اور اس کی گرامر وہی ہے جو آریائی خاندان کے زبانوں کی ہے اس لئے اس کو آریائی ہی زبانوں کے خاندان میں شامل کیا گیا ہے اور دوسرے دو خاندانوں (سامی اور تورانی) کو نظرانداز کر دیا گیا ہے گو عربی جس حد تک اُردو میں دخیل ہے اس کو نظرانداز کرنا ناانصافی بھی ہے۔

آریائی زبانوں کا پہلا مشترک اصول یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ پاس پاس رکھدیئے جائیں جس کو ہم مرکب امتزاجی بھی کہہ سکتے ہیں مثلاً انگریزی میں ہارس ریس۔ پوسٹ مین۔ جابلون ہیں۔ اُردو میں اس کی چند مثالیں یہ ہیں:
اکاس دیا۔ جیب گھڑی، خانہ داماد، زن مرید۔

آریائی زبانوں کا دوسرا مشترک اصول یہ ہے کہ الفاظ تو پاس پاس رکھے جائیں لیکن ان کے درمیان قواعد کے اعتبار سے ربط ہو اسے مرکبِ ارتباطی کہتے ہیں مثلاً: بک پاکٹ، پاس ٹائم، برک واٹر، انجن ڈرائیور اُردو میں اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:-
چڑیمار، مُنھ توڑ، مکھی چوس، چلتا پرزہ۔

گو اس میں شک نہیں کہ مرکبات امتزاجی میں مرکبات اضافی اور مرکب ارتباطی مرکبات توصیفی اور بعض فعلی مشتقات کے سوا کچھ اور نہیں۔

تیسرا اصول جو آریائی زبانوں میں مشترک اور یکساں طور پر پایا جاتا ہے یہ ہے کہ لفظ کے شروع یا آخر میں ایک جزو بڑھا دیا جائے جس کو اصطلاح قواعد میں پریفکس (سابقہ) اور سفکس (لاحقہ) کہتے ہیں۔ آریائی زبانوں میں سنسکرت کے علاوہ یونانی، لاطینی، اطالوی، فرانسیسی، اندلسی، آسٹروی اور پرتگالی بھی شامل ہیں سابقہ اور لاحقہ کی کارفرمائی اُردو میں بھی مسلم ہے۔ جہاں یہ بیشتر فارسی، ہندی کہیں کہیں عربی سے اور ایک جگہ ترکی سے لئے گئے ہیں۔ اس سے اُردو کی ہمہ گیری اور ہمہ پزیری ثابت ہوتی ہے۔

چوتھا اصول آریائی زبانوں میں یہ ہے کہ حسب ضرورت ہر لفظ سے فعل بنا لیا جائے۔ اس کی مثالیں اُردو میں کثرت سے ملیں گی۔ اس کے بعد اُردو مصادر کی بحث آتی ہے جن میں ایک تو وہ ہیں جو آواز سے بنائے گئے ہیں مثلاً: بڑبڑانا، بھنبھنانا اور دوسرے وہ جو عام الفاظ سے بنائے گئے ہیں مثلاً: بخشنا، برمانا، رنگنا۔ ان ہر دو اقسام کے سلسلہ میں اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کو بخوفِ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ فارسی بھی آریائی زبان ہے، وہاں بھی بالکل اسی طرح فارسی یا عربی زبان سے الفاظ لے کر مصادر بنائے گئے ہیں مثلاً: آگاہ سے آگاہیدن - رقص سے رقصیدن وغیرہ۔

مذکورۂ بالا چار اصول آریائی زبانوں میں عام طور پر کارفرما ہیں۔ جن میں سے پہلے تین اصول سامی

خاندانوں کی زبانوں میں نہیں ملتے ۔ چوتھا اصول البتہ عربی زبان میں بھی پایا جاتا ہے مگر مصادر کے خاص اوزان مقرر ہیں جن کی پیروی کیے بغیر یہ اصول عربی زبان میں دخیل نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں بے محل نہ ہوگا اگر ہم یہاں اُردو زبان میں آریائی اور سامی عناصر کے تناسب کا بھی جائزہ لے لیں۔

پروفیسر سلیم مرحوم نے سید احمد دہلوی کے مشہور لغت فرہنگ آصفیہ کے حوالہ سے مختلف زبانوں کے الفاظ کی حسب ذیل جدول پیش کی ہے:-

فرہنگ آصفیہ میں مجموعی الفاظ کی تعداد ۵۴۰۰۹ ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱ - ہندی جس کے ساتھ پنجابی اور پوربی زبان کے بعض خاص الفاظ بھی شامل ہیں	۲۱۶۴۴
۲ - اُردو یعنی وہ الفاظ جو غیر زبانوں سے ہندی کے ساتھ مل کر بنے ہیں۔	۱۷۵۰۵
۳ - عربی	۷۵۸۴
۴ - فارسی	۶۰۴۱
۵ - سنسکرت	۵۵۴
۶ - انگریزی	۵۰۰
۷ - مختلف	۱۸۱
میزان کل	۵۴۰۰۹

یہ تفصیل ہر قسم کے شکوک کا نہایت آسانی کے ساتھ ازالہ کر سکتی ہے اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ اُردو ہندی نژاد نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر آریائی زبان نہیں ہے اور ہندوستان کی مشترک زبان بننے کی حقدار نہیں ہے یا اہلیت نہیں رکھتی لاعلمی اور ناانصافی ہے۔

اعلیٰحضرت خسروِ دکن نے دارالعلوم علی گڑھ کے منصب چانسلری کو شرف قبول عطا فرما کر ہمارے تقاضا دب کو جن جن جذبات تشکر و عقیدت سے مملو فرمایا ہے اس کا اندازہ احاطۂ بیان سے باہر بھی ہے اور بے نیاز بھی

سلطان العلوم کی اس دانش پژوہی و علم پروری پر ابنائے ملک و ملت مسرور، مطمئن اور مفتخر ہیں جس طرح اس دار العلوم کی فیض رسانی جغرافیائی حدود سے آزاد اور نسل و جماعت کے تصور سے بے نیاز رہی ہے اسی طرح شہریار دکن کی بے دریغ بخشش بھی عام اور عالمگیر رہی ہے۔ اس نسبت سے شہریار دکن کے سایۂ عاطفت کی ہمہ گیری اور ہمہ نوازی مبرہن اور متیقن ہے۔ اس دار العلوم کو ایسے ہی سلطان العلوم کی تمنا تھی جو پوری ہوئی۔ الحمد للہ ابتدائے قیام ہی سے اس درس گاہ کی آبیاری اس چشمۂ فیض سے ہوتی رہی ہے اور علی گڑھ کی ترقی، منزلت اور کامرانی میں دکن نے جس جس پہلو سے اور جن جن مواقع پر دستِ کرم بڑھایا ہے اس کی تفصیل کا دوسرا موقع آئے گا یہاں ہم صرف ؎

درودے می تواں گفتن، سجودے می تواں کردن

پر اکتفا کرتے ہیں۔

سلطان العلوم کی ۲۵ سالہ جشن جوبلی کی تقریب میں اہالیانِ یونیورسٹی کا ایک وفد آستانۂ دولت پر حاضر ہو کر نذرِ عقیدت پیش کرے گا۔ ہم اس موقع پر انجمن اُردوئے معلّٰی کی طرف سے اُردو کے سب سے بڑے محسن کی خدمت میں اپنی عقیدت، خیر سگالی اور دعائے جاہ و منزلت کا ہدیۂ مختصر پیش کرتے ہیں۔

اکتوبر کی آخری تاریخوں میں خواجہ الطاف حسین صاحب حالیؔ مرحوم کی ولادت کی صد سالہ برسی پانی پت میں منائی گئی۔ اس اہتمام بالشان ادبی و تاریخی جشن کی صدارت مادر کالج کے مشہور و مقتدر فرزند اور یونیورسٹی کے سابق چانسلر ہز ہائی نس والیِ بھوپال نے فرمائی۔ ہندوستان کے بہت سے ممتاز ادیب، شعرا، مشاہیرِ علم اور حکومت کے سر برآوردہ اراکین شریک تھے۔ جلسہ کی کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی۔ حالی اسکول کے بچّوں نے نہایت موثر انداز اور لہجہ میں مسدس کے چند بند سنائے۔ اس کے بعد علّامہ سر اقبال کی ایک مختصر نظم جو اسی موقع کے لئے تصنیف ہوئی تھی اور سہیل کے آئندہ صفحات میں نظر آئے گی پڑھی گئی۔ جس میں شاعر نے نہایت وقار، متانت اور عقیدت کے ساتھ حالیؔ کی عظمت کا اعتراف اور والیِ بھوپال کی بلند پایہ شخصیت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مشاہیر شعر و ادب نے نہایت جامع اور پُر مغز مقالے پڑھے جن میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا

مقالہ حالی بحیثیت محب وطن سہیل کے انھیں صفحات میں شائع کیا جارہا ہے۔ اُمید ہے کہ پسند کیا جائے گا۔

حکمراں بھوپال نے اس مبارک موقع پر حالی ہائی اسکول اور بچیوں کی تعلیم کے لئے بیس ہزار روپئے عطا فرمائے، علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبا نے ایک ہزار کی رقم پیش کی۔ حکام دربار بھوپال نے ایک ہزار روپئے، نواب صدر یار جنگ بہادر نے پانسو اور دیگر اصحاب نے نہایت کشادہ جبینی کے ساتھ مالی امداد فرمائی۔ اس موقع پر حالی پبلشنگ ہاؤس نے مسدس حالی کا جدید اڈیشن شائع کیا جو اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اس جشن کے انعقاد سے پہلے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لئے علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ نے جس ولولہ، ہمدردی اور عقیدت کا ثبوت دیا اس سے ہم بے انتہا متاثر، مسرور اور مطمئن ہیں۔ کارپردازانِ تقریب نے مہمانوں کی پزیرائی، قیام وطعام اور راحت رسانی کے انتظامات جس عالی شان پیمانہ پر کئے تھے اور جس خیر وخوبی کے ساتھ وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے وہ بجائے خود ان کی عقیدت اور ان کے ولولۂ خدمت کا بہترین نمونہ تھا۔

یہ مختصر روداد تھی حالی سنٹنری کی جن سے ناظرین کم وبیش واقف ہونگے۔ یہاں ہم اُن میلاناتِ ذہنی اور ہوا کے رُخ، پر بھی کچھ اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں جس کے بغیر اس جشن کی شان نزول اور حسن خاتمہ کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

غدر کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کو جس نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محسوس کیا وہ حالی تھے لیکن حالی اُن لوگوں میں نہ تھے جن کی آواز بھی سب سے پہلے سُنی اور سمجھی جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس آواز کے صحیح اور موثر ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسی آواز کی بازگشت آخر تک قائم رہتی ہے اور اس سے پہلے جتنی اور آوازیں بلند ہو چکی ہوتی ہیں وہ سب یا تو ختم ہو جاتی ہیں یا ان میں تاثیر نہیں باقی رہتی۔

حالی مسلمان تھے اور مسلمانوں کی واماندگی کے مفسر۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ہم اس سے انکار کر کے حالی کی روح کی توہین نہیں کرنا چاہتے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی مسلمان نہ بھی ہوتے تو بھی وہ مسلمانوں کی فلاکت و ہلاکت پر اسی انسانی ہمدردی اور اسی قوتِ ایمانی کے ساتھ خون کے آنسو روتے اور دعوتِ عمل دیتے جو ان کی زندگی کا امتیازِ خصوصی تھا۔ ان کا حلم ان کی تواضع، ان کا اخلاق

ان کی ہمدردی، ان کی انسانیت، اپنی اپنی جگہ نرمی، لینت اور عطوفت کی مکمل تشبیہ تھی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ اُس طلب، اُس ولولہ، اُس بیداری اور پیش قدمی کا مظاہرہ تھا جو اکثر اپنی عریانیوں کے ساتھ نمودار نہیں ہوتا بلکہ اپنے ردِ عمل کے ماتحت دگرگوں ہوکر دنیا اور دنیا والوں کے سامنے آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ حالی کی بردباری اور ان کی مسکنت اُن تمام طوفان زائیوں پر فوق تھی جن سے ان کو سابقہ تھا۔ پیغمبر اور فاتح میں یہی فرق ہے، اور اسی فرق کو پاکر اور پہچان کر وہ لوگ آمادۂ پیکار ہوئے جو مذہب یا خدا کو حقیقت نہیں بلکہ روایت سمجھتے آئے ہیں۔

تعجب کرتے کرتے ہم کو بے اختیار ہنسی آئی جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ والیِ بھوپال کا مقاطعہ اس لئے کرنا چاہیئے کہ انھوں نے جشنِ حالی کا صدر ہونا منظور فرمایا۔ تنگدلی اور تنگ ظرفی کا یہ وہ مظاہرہ تھا جس کی مثال نہ آنکھوں نے دیکھی اور نہ کانوں سے سنی۔ جشنِ حالی کا پروگرام عام ہوچکا تھا اس میں ہم نے کوئی بات ایسی نہ دیکھی جس کو ہندوستان کی صلاح و مفاد کے لئے مضر سمجھ سکتے، والیِ بھوپال کی سیر چشمی اور روشن خیالی، رواداری اور حریتِ فکر کے ہم قائل ہوں یا نہ ہوں، اڈیٹر لیڈر اس کے معترف ہیں، پھر اس مخالفت کو کس چیز پر محمول کیا جائے؟ ممکن ہے پانی پت کے میدان میں تاریخ ہند کے کچھ ایسے اوراق منتشر ملے ہوں جن کا مطالعہ مشاہدہ کے حدود تک پہنچا ہو اور مشاہدہ نے دماغی توازن دگرگوں کردیا ہو۔ لیکن ہم اپنے دوستوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ہز ہائی نس نے پانی پت کے میدان میں اسی نیت اور ولولہ کے ساتھ قدم رکھا تھا جس سے وہ کرکٹ کے میدان میں قدم رکھنے کے عادی تھے اور اسی مسرت اور اطمینان کے ساتھ واپس ہوئے جس مسرت و اطمینان کے ساتھ وہ کرکٹ فیلڈ کو چھوڑتے تھے۔

راقم السطور اس جشن کے موقع پر موجود تھا، اس کے مناظر، اس کی فضا اور اس کی کیفیت اب بھی ذہن و دماغ پر منقش ہے۔ خواجہ سجاد حسین صاحب کی بزرگی، ان کا بڑھاپا، آواز میں رقت، ہاتھوں میں رعشہ، قویٰ میں اضمحلال، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے میں ماندگی۔ کبھی یہ بھی معلوم ہوتا کہ علیین سے خود حالی ہماری فنا دگی پر ہمیں تسکین دینے آئے ہیں، کبھی یہ محسوس ہوتا کہ خود خواجہ صاحب ہماری کمزوری، ہماری بے حسی اور ہماری بے بسی کا پیام لے کر حالی کے ہاں جانے والے ہیں، دوسری طرف ہز ہائی نس پر نظر پڑتی تو

تو قلب و دماغ پر ایک دوسری کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہز ہائی نس صدارت کی کرسی پر نہایت وقار حلم اور اعتماد کے ساتھ متمکن تھے۔ وجاہت، ذہانت، مستعدی، نفاست، سادگی اور شگفتگی کے پہلو بہ پہلو ایک طرح کا رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ بحیثیت صدر کے ممدوح نے جو کچھ فرمایا اس میں ایک نوجوان کا تصور و تخیل، آزمودہ کار کی سنجیدگی و پختگی اور سرخیل کا عزم و اعتماد پایا جاتا تھا۔ جلسہ کی ساری فضا میں ایک خاص قسم کا نظم، ترفع اور مخصوص انداز کی رجائیت جاری و ساری تھی جس میں ہز ہائی نس کی موجودگی اور ان کا منصب اس درجہ موزوں اور مناسب حال تھا کہ کسی قسم کی کہیں کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ توفیقِ انسانی اور تائید الٰہی کا یہ منظر و مظہر اُمید ہے، ہمارے دلوں کو تا دیر گرماتا رہے گا۔

حالی! سلام و رحمت، تیرا خلوص برگزیدہ تھا، تیری دعائیں مقبول ہو کر رہیں گی۔ آمین

حالی کی اس یادگار کو مزید تقویت پہنچانے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف مشاہیر شعر و ادب اور پیشوایانِ ملک و ملت سے درخواست کی جائے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے اپنے زریں خیالات سپرد قلم فرمائیں۔ اس طور پر نہایت گراں قدر مقالات کا ایک مجموعہ نذر حالی یا کسی اور نام سے شائع ہو سکے گا۔ ہندوستان بالخصوص اُردو میں ممکن ہے یہ چیز نئی ہو لیکن ہندوستان سے باہر اس قسم کی مطبوعات اور یہ نذر عقیدت، نہایت عام اور مقبول ہے۔ ہم پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب کی توجہ خاص طور پر اس جانب منعطف کرانا چاہتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ ہماری اس تجویز کو مزید تقویت حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے پہنچے گی۔ انشاء اللہ

مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کو ایک نادر قلمی کتاب، ہماری یونیورسٹی کے قلمی کتب کے ذخیرہ میں دستیاب ہوئی ہے جس کا نام ہشت کنشت ہے۔ پورے دو سو صفحات پر محیط ہے، تقطیع $9 \times 5\frac{1}{2}$ کاغذ دیسی بانس کا۔ ہر صفحہ پر بارہ سطریں ہیں اور بعض پر تیرہ بھی۔ خط معمولی لیکن خواندہ ہے۔

کلکتہ میں مسٹر ولیم بیم مارٹن کی فرمائش سے منشی غلام احمد دہلوی نے اُردو میں اس کا ترجمہ کیا شروع کتاب میں مترجم نے اپنے مختصر حالات لکھنے کے بعد یہ لکھا ہے۔

"حضرت امیر خسرو کی کتاب ہشت بہشت کے قصۂ بہرام گور کو میر حسین شاہ متخلص بہ حقیقت نے فارسی نثر میں لکھا تھا۔ مسٹر ولیم ہیم مارٹن صاحب کی فرمائش سے میں نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا۔"

اس کتاب کا تاریخی نام باغ و بہار ہے جس سے ۱۲۱۷ھ فصلی نکلتا ہے۔

یہ نسخہ ۱۲۱۹ فصلی مطابق ۱۱۲۷ھ کا لکھا ہوا ہے یعنی سنہ تصنیف سے صرف دو سال بعد لکھا گیا۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے ابھی یہ کتاب شائع نہیں ہوئی ہے اگرچہ اس زمانہ کی اکثر کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ مزید اور مکمل تر تحقیقات کے بعد، حالات مساعد ہوئے تو مولانا ممدوح اس کتاب کو طبع کرانے کی کوشش فرمائیں گے

ہماری یونیورسٹی کے اساتذہ کی حسب ذیل کتب شائع ہوئیں :-

۱- اصول تعلیم	از	پروفیسر خواجہ غلام السیدین
۲- شہیدانِ وفا کا خوں بہا کیا	از	"
۳- طنزیات و مضحکات	از	رشید احمد صدیقی
۴- دیوانِ مومن	از	مولانا ضیاء احمد صاحب ام اے
۵- سلسبیل (مجموعۂ کلام آل احمد سرور صاحب)	از	آل احمد سرور صدیقی ام اے

سہیل کے بعض مضامین کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے بعض دیگر مضامین کے بارہ میں جستہ جستہ ضروری اشارات یہاں کر دینا ضروری ہے۔

مصوری کے میلاناتِ نو پر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب (علیگ) کا مضمون یوں قابل توجہ ہے کہ صاحب مقالہ کو فنونِ لطیفہ بالخصوص مصوری سے خاص لگاؤ ہے اور وہ مشرق و مغرب کے جدید رجحانات سے پوری طور پر باخبر ہیں۔ عام طور پر اس قسم کے مضامین کے تراجم ہوتے ہیں اور ہم کو یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش آئی ہے کہ خود ہمارے ہاں کے اصول و اسلوب فن پر ان کو کیونکر اور کہاں تک تطبیق دیا جا سکتا ہے یا

مختلف ممالک کے میلانات میں کہاں کہاں اور کس حد تک توافق یا تصادم ہے۔ اس مضمون میں سلیم صاحب نے ہماری دشواریوں یا کوتاہیوں کو مدنظر رکھکر ہم کو فن اور صاحبانِ فن سے روشناس کیا ہے اور کامیاب ہوئے ہیں۔
تصاویر کی "فرہنگ" دینے سے گریز کیا گیا ہے، البتہ جن مصوروں کے موقلم کے یہ نتائج ہیں ان کا جستہ جستہ تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ تصاویر کے سمجھنے سے پہلے مصور کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ نمونہ کے طور پر جو تصاویر سہیل میں شامل ہیں ان کا انتخاب ذوقِ نظر کے ماتحت نہیں کیا گیا اس لئے اس کے پرکھنے میں بھی ذوقِ نظر کا دخل نہ ہونا چاہیئے۔ تصاویر نوجوان عورتوں کی نہیں ہیں بلکہ "جہاں دیدہ" اور "الم آزمودہ" مصوروں کی ہیں اس لئے چالیس سال یا اس سے کم عمر والوں کے ذوق کی تشفی نہ ہو سکے تو ہم کو معذور سمجھا جائے۔

اُردو شعر و ادب میں ابھی سجاد علی انصاری علیگ مرحوم کا نام زندہ ہے۔ اس جوانا مرگ بے مثل اور بے پناہ ادیب، شاعر اور طنز نگار کو بھولنا آسان بھی نہیں ہے۔ سجاد کی یاد میں (غالباً ۱۹۲۵ء) میں ہم سب نے ان کے مضامین اور اشعار کا مجموعہ محشرِ خیال کے نام سے شائع کرایا تھا۔ سجاد کے مخالفین بھی تھے لیکن ان کے فن ان کے اسلوب اور ان کے خلوص کا زمانہ قائل تھا۔ مہدی اور سجاد اسی میخانۂ علی گڑھ کے، رندانِ قدح خوار تھے۔ دونوں میں فرق تھا لیکن دونوں کا اپنا اپنا مقام تھا جو اب تک ہماری نظر میں ہے لیکن اب بھی ہماری دسترس سے باہر۔ ان دونوں کے بارہ میں اس وقت اصغر کے دو مصرعے بار بار اور بے اختیار یاد آتے ہیں ؎

(۱) مہ و انجم سے بہتر ایک جامِ آتشیں ہوتا!

(۲) بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں!

سجاد مرحوم کا ایک ڈراما ان کی زندگی کی ٹریجڈی پر ختم ہوا تھا، ہم اصغر صاحب کے بدل ممنون ہیں کہ ان کی وساطت سے روزِ جزا کے اوراق دستیاب ہوئے۔ چونکہ سجاد مرحوم کی یہ آخری ادبی یادگار ہے۔ اس لئے ہم جوں کا توں نذرِ ناظرین کرتے ہیں۔

سجاد انصاری کے بارہ میں کہا جاسکتا ہے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

وہ اپنی آگ میں خود خاکستر ہو گئے۔ اس ڈراما میں وہی دبی ہوئی چنگاریاں ملتی ہیں ؎
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

روزِ جزا میں خیر و شر کو ٹکرانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ اہرمن و یزداں کو ایک دوسرے کا حریف قرار دیا گیا ہے۔ روزِ جزا میں خیر و شر کو متیقن کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کا تضاد نمایاں نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کے تناسب کو متعین کرنا چاہا ہے۔ اور اسی نیت اور نظر سے اس کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے حالی کو محبِّ وطن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سے نہ صرف حالی کی زندگی اور شاعری پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ضمناً وطن دوستی کا صحیح اور اسلامی تصور بھی سامنے آجاتا ہے۔ مزید براں ان کا مخصوص طرزِ تحریر (جس کے نمونے کم نظر آتے ہیں) بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس قلندرانہ بانکپن کی مثال اب تک ان کی شخصیت تھی۔ یہ جدت دیکھئے کیا رنگ لاتی ہے ؎
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں!

بابِ تنقید میں صرف چند متفرق مطبوعات کا بے ترتیب تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ سال بھر کی مطبوعات کا اس طور پر جائزہ لیا جائے کہ ہم اپنے شعر و ادب کے بعض رجحانات کا پتا لگا سکیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریقۂ کار زیادہ دل چسپ ہے اور کار آمد بھی۔ یہ ہماری پہلی کوشش ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ اس کو بہتر اور دل چسپ تر بنا سکیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آئندہ ہندی اور انگریزی ادبیات کے میلانات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ اس طور پر توقع یہ کی جاتی ہے کہ ہم اپنے ادب کو دیگر ادبیات سے ہم آہنگ و متوازن رکھ سکیں گے۔

حصۂ نظم بظاہر مختصر ہے لیکن اپنی خوبیوں کے اعتبار سے یقیناً قابلِ اعتنا ہے، اس حصہ کو عمداً مختصر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ نثر اس وقت نظم سے زیادہ ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ اس بارہ میں اختلافِ آرا ممکن ہے۔ لیکن ہماری نیت بخیر ہے اور یہی ہماری جواب دہی ہے۔

تصاویر میں سے دس مغربی مصوروں کے موقلم کا نتیجہ ہیں، دو سارداکیل کی، ایک چغتائی کی اور

ایک ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کی۔ مغرب کے جدید مصوروں کی اہمیت سے عام طور پر ہم ناآشنا ہیں اس لئے اُن کی زندگی اور حالات مختصر طور پر بیان کئے جائیں گے۔ ان مصوروں کا "جذبۂ بے اختیار شوق" اور استواریِ عزم، ہندوستان کے مصوروں ہی کے لئے نہیں بلکہ "موچیوں" کے لئے بھی قابلِ تقلید ہے!

سہیل کی ترتیب طباعت اور اشاعت میں اوّل تو میں خود اپنا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے میں براہِ راست، یا ناظرینِ سہیل براہ ترکستان، کسی نااہل یا نامعقول کے شکرگزار ہونے پر مجبور ہوتے۔ گو اس کا وعدہ نہیں کرتا کہ آئندہ بھی میں ایسا کرسکوں گا!

اپنے بعد اپنوں ہی میں سے سب سے زیادہ احسان مند میں آل احمد سرور صدیقی ایم اے کا ہوں جنھوں نے سہیل کی خاطر نہ اپنی عزت و عافیت کی پروا کی اور نہ دوسروں کی۔ میرے شوقِ فضول کو اُنھوں نے اپنی جرأتِ رندانہ سے جہاں تک پہنچایا وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ مجھے بذاتہ سرور صاحب کے سلیقہ، ذہانت اور تندہی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ میں ہر ایسے کام کو اپنے سر لیتا ہوں جس میں سرور صاحب میرے معین و مددگار ہوسکتے ہیں یعنی اُن سے بیگار لی جاسکتی ہے۔ اس قسم کے کام آتش کو اپنی جوانی میں بہت کرنے پڑے، اس لئے سرور صاحب سے کام لینے میں باہر والوں سے جو سرخروئی ہوتی ہے وہ تو اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اصلی نفع وہ تسکین ہے جو سرور صاحب کی بیگار سے میرے جذبۂ انتقام کو پہنچتی رہتی ہے۔ دعا ہے کہ آئندہ چل کر اُن کو بھی کوئی سرور مل جائیں۔

ہاں تو تکلفات برطرف، سہیل میں سب کچھ کیا دھرا سرور صاحب کا ہے اور اس سلسلہ میں ہر تعریف و تحسین کے مستحق وہ ہیں۔ خامیوں کا ذمہ دار میں ہوں اور یہ ایثار اس اعتماد کی بنا پر ہے کہ اس میں کوئی خامی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کا اعتماد بجائے خود مستقل خامی ہے۔ لیکن جس طور پر انگریزی میں اعتماد سے اعتماد "پیدا ہوتا ہے" اسی طور پر، اُردو میں بات میں بات نکل آتی ہے۔ چنانچہ اعتماد کے سلسلہ میں یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جتنا مجھے سہیل کے بہمہ صفت موصوف ہونے پر اعتماد ہے اتنا خود ناظرین کو میری خلوصِ نیت پر اعتماد نہیں ہوسکتا کیونکہ قاضی جلال الدین صاحب نے ایک بار آہِ سرد

کھینچکر اور غم و غصہ کو تول کر فرمایا تھا :

خلوص کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے

لیکن اگر میری خلوص نیت پر کسی کو اعتبار نہیں ہے تو مجھے ہر شخص کے اصابتِ رائے پر بھی ایمان نہیں ہے۔ کیونکہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے اور اس میں کیا حرج ہے کہ میں اس مقولہ کا مورد اپنے اور سرور صاحب کے علاوہ بقیہ سب کو سمجھوں ! دلائل غلط ہوں تو کیا مضائقہ نتیجہ تو صحیح ہے۔ اب بھی آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو میرا کیا قصور ؎

پسرِ نوح با بداں بہ نشست
خاندانِ نبوتش گم شد

یہ شعر چسپاں ہونے کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ صرف سیدین صاحب کی ضد میں لکھا گیا ہے جنھوں نے عابد صاحب سے "متاثر" ہو کر ایک نئے آرٹ کی طرح ڈالی ہے۔ جس میں دونوں کا حلیف بھی ہوں اور حریف بھی کہ کون شخص کتنا جلد اور کس بے تکے پن سے دوران تقریر یا تحریر میں ایسے اشعار یا فقرے "چست" کر سکتا ہے جن کو موضوع موقع یا محل سے دُور دُور کا لگاؤ نہ ہو۔ یہی لیل و نہار ہیں تو سرور صاحب بھی کبھی اس زمرہ (شعر؟) میں آجائیں گے ! سَعی اور مِنّی قسم کی حرکتوں کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اتمام من اللہ بہ ہر نوع مسلّم ہے۔

اس سلسلہ میں نور الرحمٰن صاحب بی اے (علیگ) کا خاص طور پر ممنونِ کرم ہوں تصاویر کی طباعت اور سرورق کی تیاری میں نور صاحب نے جس انہماک اور تندہی سے کام لیا ہے اس سے اکثر میں خود گھبرا گیا ہوں۔ اس قسم کے تمام کام نور صاحب کو سپرد کر کے میں اطمینان سے بیٹھ گیا اور چاہتا تھا کہ اطمینان سے بیٹھا رہوں لیکن نور صاحب نے چین نہ لینے دیا اور توقعات سے کہیں پہلے ساری چیزیں مکمل کرا دیں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایک منظم پروگرام میں اس قسم کی مستعدی کتنے رخنے پیدا کر دیتی ہے۔ میں اطمینان سے کام کرنے کا عادی ہوں۔ نور صاحب ہر کام کو جلد سے جلد پورا کر دینے کے خوگر ! تیسری دقت مرشد کی

طرف سے نازل ہوئی۔ آپ کا مسلک یہ ہے کہ کام جلد جلد کرو لیکن اسے پورا نہ ہونے دو۔ اول تو ان سے دیر دیر سے ملاقات ہوتی تھی اور جب ہوتی تو ہمیشہ یہ کہتے کہ سہیل کے شائع کرنے میں آپ بڑی تاخیر کر رہے ہیں، جب میں یہ کہتا کہ آپ کے مضمون نہ ملنے سے دیر ہو رہی ہے تو کوئی نہ کوئی مضمون فوراً لکھنا شروع کر دیتے اور نامکمل چھوڑ کر چلے جاتے، مزید تقاضوں پر کوئی اور موضوع اختیار کر لیتے اور اسے نامکمل تر حالت میں چھوڑ کر روانہ ہو جاتے۔ بالآخر پانی پت کے میدان میں یہ معرکہ سر ہوا!

مغرب کی جدید مصوری میں، سیزان، گوگان، خان گوخ اور پکاسو کو پیمبری کا درجہ حاصل ہے۔

پال سیزان پال سیزان ۱۸۳۹ء میں فرانس کے شہر ایکس میں پیدا ہوا۔ باپ دولت مند بینکر تھا اور اس کی خواہش تھی کہ بیٹا قانون پڑھے۔ سیزان کا رجحان شروع ہی سے مصوری کی طرف تھا لیکن اس کی اجازت والدین سے بڑی مشکلوں کے بعد ملی سیزان کی مصوری کی ابتدا اکسپرشنزم سے ہوئی اور اس کو پسارو کے شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس کی شروع کی تصویروں سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے مصوری کے اس اسکول سے اطمینان نہ تھا اور اکسپرشنزم کے "چھچھلے پن" سے اس کی طبیعت گریز کرتی تھی اور کوشش تھی کہ تصویر میں گہرائی اور ٹھوس پن پیدا ہو۔ پکاسو کیوبزم یا مکعبیت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح سیزان نے گہرائی اور ٹھوس پن کو برتا ہے۔ اس میں کیوبزم کے خد و خال نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ سیزان مصور اور محض مصور تھا۔ لیکن مصوری اس کے لئے وسیلۂ معاش نہ تھی۔ پیرس میں وہ دن بھر مصوری میں مصروف رہتا تھا اور رات بھر اس الجھن میں کہ کل خدا جانے پھر مطلع صاف ہو یا بدلی اور بارش میں روشنی ایسی نہ ملے کہ تصویر کو اور آگے چلا سکے۔ سیزان کو اپنی تصویروں سے کبھی پورا پورا اطمینان حاصل نہ ہوتا تھا۔ بناتے بناتے عاجز آ کر یونہی پڑی رہنے دیتا اکثر بددل ہو کر پھاڑ ڈالتا تھا لیکن کبھی ان کو مکمل نہ سمجھتا تھا۔ اس کی بیوی انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرتی تھی۔ اس کی تصویریں رسمی طرز سے اس قدر جداگانہ تھیں کہ ان کو نمائشوں میں جگہ نہ دی جاتی۔ تصویر اور مصور دونوں کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا۔ لیکن سیزان نے اپنی زندگی ہی میں بالآخر وہ دن بھی دیکھ لیا کہ وہی لوگ جو اس کا مذاق اڑاتے تھے ان دھجیوں کو جمع کر کے آنکھوں سے لگا رہے" جن تصویروں کو کوئی چار پیسوں کو نہ پوچھتا تھا ان کے اب بازار میں ہزاروں لگتے تھے۔ لیکن خود سیزان کی طبیعت میں ان کی طرف سے آخر تک بے اطمینانی ہی رہی یعنی یہ کہ جی میں جتنا کچھ تھا اس کے ادا کرنے کا امکان انگلیوں میں نہ پاتا تھا۔ مرنے سے سال بھر پیشتر

یعنی ۱۹۰۶ء میں ایک خط میں لکھتا ہے کہ " اب میں بہت بڈھا ہو گیا ہوں اپنے کو پہلے حاصل نہ کر سکا تو اب کیا 'حاصل' کر سکوں گا۔ ہاں ایک راہ البتہ میں نے نکالی ہے لیکن ابھی سرِ منزل ہی کھڑا ہوں"۔ سیزان مزاج کا تیز اور طبیعت کا سیدھا اور دُھن کا پکّا تھا اور اپنے کام کو بڑی اونچی کسوٹی پر کستا تھا جس مجبوری کی اسے زندگی بھر اُلجھن رہی وہ بڑے سے بڑے مصور کی مجبوری تھی۔ چھوٹے اور بے اُمنگ دلوں میں جو کچھ سماتا ہے اس کی لیس پوت کر دینا آسان ہے لیکن ایک بلند اور بے چین طبیعت کی وجدان اور اضطراب کا نقشہ تصویر میں پورا اتارے جانا دشوار اور بہت دشوار ہے۔

پال گوگان پیرس میں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوا۔ فرانسیسی ماں ہسپانوی امریکن۔ لڑکپن میں گھر سے بھاگ کر جہاز کی نوکری کر لی اور اس سلسلہ میں کئی بار دنیا کے گرد چکر لگایا۔ بعد میں پیرس کے ایک بنک میں نوکر ہوا۔ شادی کی بچے ہوئے۔ خاصی دولت کمائی۔ غرضکہ خوشحالوں کے زمرہ میں شامل ہوا۔ ۲۸ برس کی عمر ہو چکی تھی لیکن ابھی تک مصوری کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ایک دن اتوار کو بیٹھے بٹھائے بچوں کے رنگ آمیزی کے بکس کو لیکر کچھ بنانا بگاڑنا شروع کیا۔ مذاق ہی مذاق میں مصوری جان کا آزار بن گئی۔ گھربار چھوٹا بیوی بچوں کو ان کے وطن ڈنمارک روانہ کر دیا۔ مفلس، فلاکت زدہ گوگان کو ایک عرصہ تک پیٹ بھر کر کھانے کے لئے اسٹیشن کی دیوار وں پر اشتہار پینٹ کرکے لگانے پڑے۔ دن بھر کی مزدوری دو روپے۔ پوسٹ کارڈ بنا بنا کر ٹکے ٹکے بیچے۔ اسی زمانے کی ایک تحریر میں لکھتا ہے کہ " میں نے انتہائی مصیبت جھیلی ہے۔ لیکن مصیبت ہوتی ہی کیا ہے۔ آدمی سبھی کچھ انگیز کرے جاتا ہے۔ افسوس ہے تو اس کا کہ اپنے کام کی مہلت نہیں ملتی"۔ پھر لکھتا ہے کہ " یہ صحیح ہے کہ مصیبت زندگی کے لئے ایک تازیانہ ہوتی ہے لیکن نہ اس قدر کہ زندگی کے بیچ سے دو ٹکڑے ہو جائیں"۔ کچھ دنوں بعد ہی خان گوخ سے ملاقات ہوئی اور دوستی بڑھی ۱۸۹۱ء میں یورپ کو خیرباد کہکر بحرالکاہل کے ایک جزیرے ٹہی ٹی کا سفر کیا وہیں اپنے ہاتھوں سے مٹی کا ایک جھونپڑا تیار کیا۔ اور وہیں کے نیم وحشیوں میں گزر بسر کرنے لگا۔ انھیں کی صورتوں پر اپنی تصویروں کی بنا ڈالی لیکن افلاس نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ بڑی مشکل سے آٹے دال اور رنگوں کے دام پورے پڑتے تھے وہ تصویریں جو آج ہزاروں میں بکتی ہیں اس زمانے میں کوئی احساناً خرید لیتا تھا تو روٹی چلتی تھی۔ فراغت کے ساتھ پینٹ کر سکنے کی تمنا میں فرانس کے کسی تاجر سے دو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی اُجرت کا معاملہ کرنا چاہا لیکن نہ ہو سکا۔ اسی تنگی و تباہ حالی میں طرح طرح کے مرضوں نے گھیرا۔ آخر میں جذام ہو گیا۔ سب کچھ ہوا۔ لیکن مصوری کا جنون بلائے بے درماں کی طرح زندگی کے ساتھ رہا۔ کرب سے کرب کی حالت میں برش ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ 'وحشیوں' کی طرف داری میں ایک بار تین مہینے قید اور کئی سو فرینک کے جرمانے کی سزا پائی۔ اس مقدمہ کی پیروی اور اس کے نتیجہ نے اس کی زندگی کے آخری دنوں کو عذابِ الیم بنا دیا۔ اس کے خطوط کا ایک سلسلہ ہے جس میں آخری

خط کا آخری جملہ ہے کہ "یہ ساری فکریں مجھے مارے ڈال رہی ہیں" اس کے کچھ دنوں بعد تنہائی اور کس مپرسی میں موت پائی۔ اس کا دشتی نوکر دھیاناؔ دھاریں مار مار کر روتا تھا اور چیختا کہ "دنیا میں ایک انسان تھا نہ رہا" مصوری نہ ہوئی مپرسی کی آزمائش ہوگئی لیکن مرنے والا زندگی کی سولی پر پورا اترا اور زندگی کے اخیر لمحوں تک اس کو اپنی انوکھی مصوری کے انوکھے رنگوں اور انوکھی صورتوں پر پورا اعتماد رہا۔

ونسنٹ فان گوخ سنہ پیدائش ۱۸۵۳ء سکونت ہالینڈ۔ باپ پادری تھے۔ بیٹے کا پیشہ پہلے تجارت قرار پایا اور اس سلسلہ میں اپنے ایک چچا کے پاس جو تصویروں اور کتبوں وغیرہ کی تجارت کرتے تھے کام سیکھتا رہا لیکن بعد میں اس کا بھی پادریت ہی کی طرف رجحان ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں انگلستان کا سفر کیا اور لندن میں عرصے تک غریب بچوں کو پڑھانا اور سڑکوں پر مذہبی تقریریں کرنا شغل زندگی رہا۔ ایک سال بعد ہالینڈ واپس ہوا۔ اور کوشش یہ رہی کہ گورنمنٹ کی طرف سے مزدور پیشہ طبقوں کے لئے پادری مقرر ہو جائے۔ لیکن اسی زمانے میں مصوری کی دھن سوار ہوئی۔ مزاج میں تلون بے حد تھا گوگاں کے ساتھ ایک عرصے تک دوستی رہی پھر کسی بات پر اتنا جھگڑا بڑھا کہ اس کی جان پر حملہ کیا اور خود دماغی توازن کھو بیٹھا۔ پاگل خانہ میں داخل ہوا۔ اچھے ہونے کے بعد مصوری کی شدت بدستور مستولی ہوگئی۔ اکثر رات رات بھر تصویریں بناتا رہتا۔ دن دن بھر اسی دھن میں سرگرداں کھیتوں اور پہاڑیوں کا چکر لگاتا رہتا۔ آخر میں خود اپنی ایک شبیہ بنائی جو اس کی مصوری کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی ۱۸۹۰ء میں خودکشی کر لی۔

پابلو روئی یا پکاسو ماں کے نام کی نسبت سے پابلو پکاسو ۱۸۸۱ء میں شہر ملاگا میں پیدا ہوا۔ مصوری کا شروع ہی سے شوق تھا ایک عرصے تک ملاگا میں پرورش پانے کے بعد بارسلونا گیا اور وہاں سے کچھ عرصہ کے بعد پیرس پہنچا۔ اس زمانے کی تصویروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے متعلق ایک فرانسیسی مبصر کی رائے ہے کہ "پکاسو سر میں لاطینی اور تال میں عرب ہے" اور سچ یہ ہے کہ یہی دونوں پہلو اس کی مصوری میں آج تک نمایاں چلے آتے ہیں۔ افریقہ کے "وحشی آرٹ" کی طرف یورپ کی توجہ پکاسو ہی کے رجحانات کے سبب سے ہوئی۔ پکاسو ہی نے کیوبزم کی بھی ابتدا کی۔ اس کی طبیعت میں ایجاد کی امنگ کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پکاسو صحیح معنوں میں مصوری کا معلم ہے۔ یورپ کے مصوروں میں کوئی قابل ذکر مصور ایسا نہیں جو پکاسو کے اثر سے بالکل بچ نکلا ہو۔ اب بھی مصوری میں نت نئے ڈھنگ پیدا کرتا رہتا ہے۔ سیزان، فان گوخ اور گوگاں

(ض)

برخلاف، پکاسو اپنی حیات ہی میں کامیاب اور مقبول ثابت ہوا۔ لیکن جس حد تک وہ زندگی میں ان سے زیادہ کامیاب ہے اسی حد تک جدید آرٹ کی بت شکن تحریک میں اس کا مرتبہ ان تینوں سے کم ہے، جو بزبان ثاقب کہہ سکتے ہیں کہ ؎

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

"حالی کو آج ہم سے کچھ سرگرانیاں ہیں"

ناکارہ ہستیوں کی کیا زندگانیاں ہیں؟ — کچھ کام کرنے والے جانِ جہانیاں ہیں
دنیا میں ہیں وہ شاداں دنیا ہے ان کی خواہاں — کاموں پہ جن کے نازاں خود کامرانیاں ہیں
کل تک تو سرگراں تھے حالی سے یار اُن کے — حالی کو آج ہم سے کچھ سرگرانیاں ہیں
ہو کیوں نہ سرگرانی، ہو کیوں نہ بدگمانی — غائب ترقیوں کی ساری نشانیاں ہیں
ہے جنسِ علم ارزاں سب کے لئے جہاں میں — قحطِ عمل سے لیکن ہم میں گرانیاں ہیں
اسباب ہیں میسّر سامان ہیں فراہم — کم ہمتی کی پھر کیوں ریشہ دوانیاں ہیں

"کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں"

احسن مارہروی

یادِ رفتگان

آل احمد سرور (علیگ)

فروغِ شمع جواب ہو رہے گا رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

حضرت ریاض خیرآبادی

کے انتقال کو سال بھر سے زیادہ ہونے آیا اور ملک کے طول و عرض میں ان کی وفات پر اظہارِ غم اور اُن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہو چکا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس شاعرِ اعظم کا خراج اس آسانی سے ادا نہیں ہو سکتا۔ مرحوم کی ذات سے نہ صرف غزل کی رنگینی زندہ تھی بلکہ شوخی اور سرمستی بھی اُن پر ختم تھی۔ آپ اگرچہ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے مگر دنیائے سخن میں داغ دہلوی کے جانشین بن کر رہے۔ آپ کے قلم نے رندی و سرمستی، شوخی و زندہ دلی کی ایسی ایسی تصویریں کھینچی ہیں کہ باید و شاید۔ خصوصاً خمریات کے میدان کو تو آپ نے اپنا کر لیا۔ اس کے قطع نظر آپ کے خطوط بھی ہماری قدیم انشا کا اچھا نمونہ ہیں اور ریاض الاخبار، اودھ پنچ، فتنہ اور گلچیں کے صفحوں پر آپ کی گلکاریاں ابھی تک اپنی تازگی برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ نثر و نظم دونوں ریاض کی طبعی سادگی و سادہ دلی کا نمونہ ہیں اور طرزِ تحریر کی بے ساختگی پڑھنے والوں کے دل پر اور بھی اثر کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ مرحوم کی زندگی نہ صرف پُرآشوب رہی بلکہ پُرحسرت بھی۔ آپ کا دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ اس کے انتخابات شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ریاض کی شاعری پر سب سے بہترین تبصرہ خود اُن کا یہ شعر ہے ؎

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اُڑا دیئے
جس غنچے پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

حضرت عزیز لکھنوی

جنھوں نے حال ہی میں اس دنیا سے رحلت کی، اگرچہ لسان القوم صفی لکھنوی کے

شاگرد تھے، مگر شہرت کے آسمان پر استاد کے برابر چمکے۔ لکھنؤ اسکول میں آپ کا دم بسا غنیمت تھا۔ آپ کا دیوانِ غزلیات گلکدہ کے نام سے پہلے ہی شائع ہو چکا تھا اور ایک مجموعہ قصائد صحیفۂ ولا کے نام سے شاید دو یا تین سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ لکھنؤ کی مردہ شاعری جس میں الفاظ کے طلسم اور "نزع کے ہنگام" کے سوا کچھ نہ تھا، عزیز کے تخیل کی مینا کاری سے بہت کچھ سنور گئی تھی۔ آپ کا یہ شعر اقبال نے اُردو کے پانچ بہترین اشعار میں رکھا تھا ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

اکبر الہ آبادی فرمایا کرتے تھے کہ عزیز کے اس شعر پر میں اپنا دیوان دے سکتا ہوں ؎

اور آثار عیاں چہرۂ بیمار سے ہیں
جائیے جائیے اب آپ پشیماں ہونگے

حضرت نظم طباطبائی کی عظمت کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ آپ صرف ایک خوش گو شاعر ہی نہ تھے بلکہ عربی و فارسی کے جیّد عالم بھی تھے۔ چنانچہ لسانیات پر کئی رسالے آپ سے یادگار ہیں۔ آپ نے اگر ایک طرف غالب کی شرح لکھ کر اُردو پر احسان کیا تو دوسری طرف امرأ القیس جیسے بلند پایہ عربی شاعر کے کلام کی بھی شرح لکھی۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران میں آپ نے کئی مفید ادبی خدمات انجام دیں اور دار الترجمہ کے کام میں بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔ گرے کے مشہور مرثیہ کا ترجمہ آپ نے جس خوبی سے کیا تھا اس سے ہر اُردو داں واقف ہے۔ افسوس ہے کہ یہ دو چار بزرگ جو اگرچہ چراغِ سحری تھے مگر پھر بھی جن کے دم سے قدامت اور جدیدیت کی درمیانی کڑیاں قائم تھیں، ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اب ایسے لوگ کہاں ہیں جنھوں نے ایک طرف ہمارے قدیم مشاہیر کی آنکھیں دیکھی ہوں اور دوسری طرف نئی روشوں اور نئی راہوں کے نکالنے میں بھی مصروف رہے ہوں۔

جناب جگت موہن لال صاحب رواں دورِ جدید کے ممتاز شعرا کی صفِ اول میں تھے۔ آپ عزیز لکھنوی کے

شاگرد تھے۔ اگرچہ آپ کا سارا کلام ایک خاص کیفیت (درد و اثر کی) لئے ہوئے ہے مگر آپ کی رباعیاں خاص طور پر آپ کا کارنامہ ہیں۔ آپ کا ایک دیوان "روح رواں" کے نام سے حضرت عزیز لکھنوی کے ایک مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان اکیڈمی کے زیر اہتمام آپ نے ایک انگریزی ڈرامے کا ترجمہ "فریب عمل" کے نام سے بھی شائع کیا تھا۔ مرتے وقت آپ اپنی ایک مثنوی "گوتم بدھ" کی تکمیل میں مصروف تھے۔ افسوس ہے کہ موت نے آپ کو ہم سے بہت جلد چھین لیا۔ اُردو شاعری کو آپ سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

نواب نصیر حسین خیال کو بجا طور پر "بہار کا آزاد" کہا جاتا تھا۔ آپ کے طرزِ تحریر میں وہی دل کشی و دل آویزی پائی جاتی تھی جو مرحوم آزاد کا طرۂ امتیاز تھی۔ آپ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے صوبۂ بہار میں اُردو کی ترتیب و تہذیب میں نمایاں حصّہ لیا۔ "مغل اور اُردو" جو درحقیقت آپ کی مجوزہ تصنیف "داستانِ اُردو" کا ایک باب تھی، ملک میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کی بے وقت موت سے یہ داستان ادھوری رہ گئی۔

جناب آغا حشر کاشمیری کو ہندوستان کا شیکسپیر کہا جاتا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ آپ نے شیکسپیر کے کئی ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور درحقیقت اس وجہ سے کہ آپ کے ڈراموں سے اُردو میں ڈراما نویسی کا آغاز ہوا۔ "یہودی کی لڑکی"، "چنڈی داس" اور "عورت کا پیار" آپ کے اچھے ڈراموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ فن کے نقطۂ نظر سے یہ تمثیلیں بہت کامیاب نہیں مگر چونکہ ہمارے یہاں ڈرامے کی حالت بہت پست ہے، اس لئے یہ ابتدائی کوششیں ہر لحاظ سے اہم اور قابل قدر ہیں۔ مگر آغا حشر کا ماتم محض انڈین شیکسپیر کا نہیں، ایک اچھے شاعر کا ماتم ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ حالات و واقعات "موجِ زمزم" اور "شکریۂ یورپ" کے مصنف کو اس وادی سے ہٹا کر دوسری طرف لے گئے۔ یہ دونوں نظمیں نہایت پاکیزہ اور دل کش ہیں اور ان کی وجہ سے حشر کی شہرت اُن کے ڈراموں

سے زیادہ برقرار رہے گی۔

مولوی ممتاز حسین اُن چند مغتنم ہستیوں میں سے تھے جو اپنی ساری عمر اپنے ایک نصب العین تک پہنچنے میں گزار دیتے ہیں۔ آزادیِ نسواں اور تعلیم نسواں کے لیے مرحوم نے چالیس سال تک جو ٹھوس اور مفید کام خاموشی سے کیا ہے اُس کا احسان آنے والی نسلیں ابدالآباد تک نہ بھولینگی حقیقت یہ ہے کہ مولوی ممتاز حسین، حالی اور سر سید جیسی چند ہستیوں نے اس بارۂ خاص کی طرف متوجہ ہو کر ہماری لاج رکھ لی۔ ورنہ مسلمان کہیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ رسالۂ "تہذیب نسواں" کا شاندار ریکارڈ خدمت محض آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے الفاظ آپ کا زبردست خراج ہرگز ادا نہیں کر سکتے ہاں ایک ترقی یافتہ مہذب قوم جس میں مرد اور عورتیں دوش بدوش مل کر قومی زندگی کے ڈھانچے کو روح، جسم اور گوشت پوست بخشیں گے، مولوی صاحب مرحوم کے کارنامے کا زندۂ جاوید نمونہ ہوگی۔

مصوّری کے میلاناتِ نو

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی (علیگ)

انیسویں صدی کی تمام تر ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ملکہ توریہ اور تار برقی کی ایجادیں تھیں ملکہ سے نظامِ سیاست کا وہ بُت متصور ہی جس کی نیائش اور پرستش میں جملہ اقوام مغرب جنگِ عظیم کے بُت شکن زلزلوں تک مصروف رہیں تار برقی سے یورپ کی وہ تمام ایجادات متصور ہیں جن کا مقصد انسان کی مادّی اور دنیاوی زندگی کو سامان آرائش و آسائش سے بہرہ مند کرنا تھا لیکن انیسویں صدی کے آخر میں اہل یورپ کو اپنے 'آسائشی' نقطۂ نظر کی تہی مائگی کا رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا اور ان کی نظریں بیرونی ماحول سے منحرف ہو کر روحانی زندگی پر پڑنے لگیں جس کا نتیجہ من جملہ دیگر لوازم ذہنی کے یہ ہوا کہ ان کے نفسیاتی تصور میں شدید ہیجان و تہلکہ برپا ہو گیا۔

ڈوسٹوئفسکی اور دیگر روسی ناول نگاروں کا اسلوب بیان اور طرز نگارش اسی ذہنی میلان کا پیش خیمہ تھا اور چونکہ دماغ کی تربیت حکمیات کے اصول پر ہو چکی تھی اس لئے انھیں اصول کے ماتحت موجودہ علم النفس کی بنیاد رکھی گئی۔ چنانچہ تشریح اور تجزیہ کے وہ اصول جو مادّی ماحول پر قابو و قدرت حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے تھے اب قلبی اور دماغی افتاد و اطوار کی تحقیق و تفتیش میں برسرِ کار لائے جانے لگے۔ طبائع کے اس رجحان کا اثر شعر و ادب کے علاوہ فنِ موسیقی پر بھی پڑا لیکن اس کا سب سے قوی اثر فنِ مصوری پر پڑا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ فنونِ لطیفہ کی کسی دوسری صنف پر "بیرونیت" اس درجہ مسلّط نہ تھی جتنی کہ یورپ کی مصوری پر چنانچہ اس کا ردّ عمل بھی نہایت درجہ شدید ہوا مصوری کے اس انقلاب میں فوٹو کی ایجاد کا بھی بڑی حد تک حصہ تھا کیونکہ فوٹو اس اسلوب فن کے خلاف جس کو "نیچرلزم" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اتمام حجت کی حیثیت رکھتا تھا۔

نیچرلزم کے ردّ عمل کے طویل سلسلے میں یورپ کی مصوری نے اب تک جتنے روپ بدلے ہیں اور جن جن عنوانات سے مختلف اسالیب فن ایک دوسرے سے متمیز ہوئے مثلاً اکسپرشنزم، ڈوینزم، کیوبزم، ورٹی سزم، فیوچرزم وغیرہ وغیرہ ان کا ذکر، ان ناموں کے الجھیڑوں سے قطع نظر، پوسٹ اپرشنزم یا ماڈرنزم یا جدیدیت کی عام اصطلاح کی ماتحت کیا جاتا ہے لیکن قدیم اور جدید کے فنی یا اصطلاحی فرق اور تفرقوں کو پوری طور پر سمجھنے کے لئے

بہتر ہوگا کہ ہم کسی نہ کسی حد تک نفس مضمون یعنی آرٹ کا صحیح تصور مختص کر لیں۔

'آرٹ' کی جامعیت کو پوری طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آرٹ انسان کی اُس خلقی یا بنیادی اُمنگ کا نتیجہ ہے جو 'غمِ روزگار' کا غم غلط کرنے کے لئے اُس میں ودیعت کر دی گئی تھی اور رفتہ رفتہ 'اندوہِ عشق' کے پر تکلف اظہار کا وسیلہ بن گئی۔ ایک شاعر نے نہایت لطیف، بلند اور بلیغ انداز میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

شاعری اور موسیقی کے فنون توام کی ابتدا گڈریوں کے گیت اور دھوبیوں کے برھوں سے ہوئی ہوگی میر اور فانی کی نوحہ سنجیاں یا سوہنی اور بھیرویں کے آلاپ بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ اسی طور پر مصوری کی ابتدا پتھر اور دھات کے برتنوں یا آلات و اوزار پر نقش و نگار سے ہوئی نہ کہ لیلیٰ مجنوں کے مرقعوں سے۔ چنانچہ مصوری کے آغاز کار میں آرٹسٹ کی حیثیت محض ایک دستکار یا کاریگر کی تھی جو اپنے گرد و پیش کی موجودات کا ہو بہو نقشہ اتارنا چاہتا تھا اور اس زمانہ کا معیارِ کمال اور کامیابی یہی تھا کہ آرٹسٹ نے نقل کو کہاں تک "مطابق اصل" بنا دیا۔

غارہائے اجنٹا کے صنّاع بھی اسی معیار کے مطابق داد کے خواہاں ہونگے۔ راجپوت اور مغل اسکول کے مصور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں لیکن آج ہم میں شاید کوئی ایسا نہ ہوگا جو ان "اگلے وقتوں" کے لوگ کو صحیح معنوں میں نیچرلزم کا مفسّر یا علمبردار کہہ سکے۔

اسلرائلڈ اپنے خاص انداز میں ایک جگہ کہتا ہے کہ ہجر یار کی مصیبت سے صرف ایک مصیبت سوا ہے اور وہ وصلِ یار ہے ؎

بلائے فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلیٰ

نیچرلزم پر یہ لطیفہ پوری طور پر صادق آتا ہے۔ نیچرلزم کے سلسلہ میں مصوری نے اسلوب کی کتنی کروٹیں بدلیں لیکن نیچر کی نقل پوری اُتری تو بے مزہ ہوگئی۔ بقول غالب اور "صورتِ قفل ابجد" ؎

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اور یہی لازم بھی تھا کیونکہ آرٹ بالآخر انسان کی تخلیقی اُمنگ کا آئینہ ہے نہ کہ فطرت کی نقالی کا وسیلۂ کار

سمجھانے والوں نے اسے یوں بھی سمجھایا ہے کہ آرٹ کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک انفرادی دوسرا اجتماعی۔ اول الذکر کا تقاضا یہ ہے کہ کہنے والا اپنی کہے اور موخر الذکر کا منشا یہ ہے کہ سننے یا دیکھنے والا سنے دیکھے اور لطف اٹھائے۔ یہ آرٹ کے دو اساسی اصول ہیں۔ ان اصولوں کا تناسب مختلف اسالیب فن میں مختلف رہا ہے لیکن ؎

اپنی کہی وہ آپ سمجھے یا خدا سمجھے

اگر کور ذوقی پر مبنی نہ ہو تو اجتماعی پہلو کے فقدان کو بھی ثابت کرتا ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رخ نیچرلزم ہے جس میں انفرادی پہلو تقریباً سوخت ہو جاتا ہے اور جاندار چیزوں کی صرف ایک بے جان نقل ہاتھ لگتی ہے۔ یہ دونوں صورتیں صحیح معنوں میں آرٹ کے حدود سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اسالیب فن میں انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کا تناسب مختلف زمانوں اور ملکوں کے تمدن اور ذہنی رجحانات کا آئینہ دار رہتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک ہی اسلوب فن ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے شمع ہدایت نہیں بن سکتا۔ ذوقِ نظر کا تقاضا ہے کہ انسان ہر اسلوب فن کے اندر رطب و یابس میں تمیز کر سکے۔ اسالیب فن بذات خود اچھے یا برے نہیں ہوتے، اچھے یا برے ہوتے ہیں ان کے برتنے والے یا ان کے عمل اس اصولی تشخیص و تمیز کے ماتحت انسان ؎

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سے بھی لطف اٹھا سکتا ہے اور ؎

دیکھا جو مجکو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

سے بھی ؎

ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

سے بھی اور ؎

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

سے بھی لیکن زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز' میں بھی ایک حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور مذاقِ عام کا ابتذال بھی ایک شے ہے جو فنونِ لطیفہ کی عام روش میں انقلاب لازم کر دیتی ہے اور جو اہل فن اس انقلاب کے بانی ہوتے ہیں وہ پیمبر فن کہلاتے ہیں۔ ہم میں سے کون شخص بہزاد کے نام سے نہیں واقف ہے لیکن ہم میں سے کتنے لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ

بہزاد ہمیپر فن اس لئے نہیں مانا گیا کہ اس کے قلم کی سی باریکی کسی دوسرے کو نصیب نہ تھی یا اس کی بنائی ہوئی شبیہیں فطرت کا بے کم و کاست مرقع ہوتی تھیں!

واقعہ یہ ہے کہ بہزاد کے عہد تک اسلامی ممالک میں تصاویر صرف کتابوں کے مصور نسخوں میں محصور اور مقید ہیں اور بیچارہ مصور شاعروں کا پرچا یا غلام بنا رہا اور یہ ظاہر ہے کہ غلام کو آزادی تخیل بھی ممنوع رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نقش و نگار کی صنعت کاریوں کے سیلاب میں تصاویر خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ مصوروں کی صناعی رسمی اور مصنوعی ہو کر رہ گئی۔ ان کے حیوان رسمی حیوان اور انسان رسمی انسان ہوتے تھے جن کی رگوں میں سب کچھ تھا صرف لہو کی بوند نہ تھی جو "ڈیوٹ" کی طرح کھڑے ہوتے تھے اور کٹ پتلیوں کی طرح حرکت کرتے تھے۔ بہزاد وہ شخص تھا جس نے تصویر کو رسمی قیود سے آزاد کیا اور مصور کو خطاطوں کی برہمنیت سے آزاد کر کے اسے ایک جداگانہ وجود اور حیثیت بخشی۔

بہزاد کی باریکی قلم دوسرے مصوروں میں بھی پائی جاتی ہے بلکہ اس اعتبار سے بعض دوسرے مصور اس سے بڑھے ہوئے بھی ہیں۔ لیکن جو چیز دوسروں کے ہاں عنقا ہے وہ بہزاد کے قلم کی "جولانیت" اور اس کے ہیولوں کی "شدت حیات" ہے۔ بہزاد کی ایک اور صفت بھی قابل لحاظ ہے اور وہ اس کے قلم کی صلابت ہے جس کو ہم "صلابت قلمی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہزاد کے مقلدین میں قوت عمل اور مردانہ انداز کم پائے جاتے ہیں حالانکہ یہ چیز بہزاد کا نہایت نمایاں امتیاز ہے۔ یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ بہزاد کا زمانہ کم و بیش وہی زمانہ تھا جب یورپ میں فنون لطیفہ کی روشوں میں ایک شدید انقلابی ہیجان رونما تھا۔ زوال آمادہ عیسائیت حیات افروز یونانیت کے لئے جگہ خالی کر رہی تھی اور نشاۃ الثانیہ کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔

ہر نئی تحریک اپنی راہیں اور جولانگاہ ساتھ لاتی ہے جدت تخیل اور شدت عمل اس کے ہم رکاب ہوتی ہے لیکن مرور ایام سے تخیل میں کہنگی اور عمل میں واماندگی آ جاتی ہے اور جو اسلاف کعبہ اور کربلا چھوڑتے ہیں ان کے اخلاف کے ہاں

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط

کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

رنائسنس کا بھی یہی حشر ہوا۔ رافائل کا تنوع، میکائیل انجلو کی جولانیت، ڈاونچی کی اسرار نوازی، روبنس کی شدت مجاز، ریمبرانٹ کا ذوقِ نقش و رنگ، بعد کے مصوروں میں ناپید ہے۔ ان کی عظیم الشان شخصیتوں کے مقابلہ میں

بعد کے آنے والوں مصوروں کی تہی مائیگی تاسّف انگیز ہے۔

یورپ کی مصوری میں جو انقلاب رونما ہوا اس کے آوردے یہی لازوال ہستیاں ہیں لیکن اس مرتبہ اس انقلاب کا مرکز روم کے بجائے پیرس بنا اور گیوٹو اور رفائل کے صحیح جانشین سیزان، فان گوخ اور گوگان ہوئے۔ کیونکہ انھیں لوگوں نے نیچرلزم کا تختہ اُلٹا۔ ان سے پہلے وہ لوگ تھے جن کو امپرشنسٹ یا متاثرین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کے اولین سرخیل مونے، پسارو اور رمانے قابل الذکر ہیں، یہ لوگ دراصل نیچرلزم اور جدیدیت کے درمیانی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

امپرشنسٹ نیچر کو پیش نظر رکھنے کے قائل تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ان تاثرات کو آب و رنگ دیا جائے جو مشاہدۂ فطرت سے ان کے قلب و دماغ میں متموّج یا متہیج ہوں۔ امپرشنسٹ مقام کے متلاشی نہ تھے بلکہ اُن لمحات کو مقید و منقوش کرنا چاہتے تھے جن میں فطرت کی ایک خاص جھلک یا کیفیت نمایاں ہو۔ اور چونکہ یہ کیفیات روشنی کے مخصوص انعکاس اور فضائے عام سے وابستہ ہوتی تھیں۔ اس لئے ان تصاویر کی نمایاں خصوصیت رنگوں کا ایک خاص نکھار ہوتا ہے جس کو رنگ کے چھینٹے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

امپرشنسٹوں کے خلاف سیزان کے مشرب والوں کا مقصد لطیف مناظر کے دل کش اضطراری لمحات کو آب و رنگ سے قلمبند کرنے کا نہ تھا بلکہ وہ انسان اور فطرت کی اندرونی کیفیات کو ان کی تمام تر کلیت میں نمایاں کرنا چاہتے تھے ان کی سعی مستحسن تھی اور اس کی کامیابی اتنی ہی ناممکن الحصول وہ روح کی مادّہ پڑوہی کو مادّہ کی روح پڑوہی میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اکسپرشنزم کا سارا معاملہ "ارنی" اور "لن ترانی" کا سا معاملہ تھا۔ چنانچہ پیکر کے روح کو بے حجاب کرنے کی تمام تر کوشش کا وہی حشر ہوا جس کے غالب قائل تھے ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بایں ہمہ یہ کوشش بجائے خود بہت بڑی تھی جو انجام کے اعتبار سے ناکام سہی لیکن اس کے اثر کو تمام دنیا کی مصوری نے قبول کیا اور اب بھی قبول کر رہی ہے میرا خیال ہے کہ شاید مصوری کا بعید ترین مستقبل بھی ان تاثرات سے سبکدوش نہ ہو سکے۔

سیزان اور دوسرے اکسپرشنسٹ مصوروں کی ایک نمایاں خصوصیت جس کو انھوں نے روح فطرت کی برافگندگیٔ نقاب کا وسیلہ بنایا ہے۔ افراد مجاز کے نقش و رنگ میں مبالغہ ہے جس طرح کریکیچر (مضحکہ خاکے) میں ہم چہرہ کے خطوط کو اس انداز سے گھٹا بڑھا دیتے ہیں کہ باوجود شباہت قائم رہنے کے کسی شخصیت کا وہ اندرونی پہلو نمایاں ہو جو محبت، مظلومیت، خوف، ظرافت، حرص و ہوس اور اس قبیل کے دوسرے جذباتِ انسانی کو اُکسا سکے۔ اسی وسیلہ سے مصوری نے مجاز کے قیود سے

آزاد ہو کر حقیقت تک پہنچنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس وسیلہ کو انتہائی فروغ یوں ملا کہ اجسام کے نقوش اور خطوط کی صورت گری اقلیدسی شکلوں میں کی جانے لگی۔ اسی اسلوب کو 'کیوبزم' یا 'مربعیت' بھی کہتے ہیں جس کی طرح پکاسو نے ڈالی۔ اس اسلوب میں بالآخر یہاں تک غلو کیا جانے لگا کہ چہرہ کی ہر شباہت ہمارے ایشیائی شعرا کے محبوب کی کمر اور دہن بن گئی اور حاصل رنگ اور نقش کا ایک خیالی گھروندہ بن گیا۔

یہ منطقی انجام تھا اس ردّ عمل کا جو نیچرلزم کے خلاف انیسویں صدی میں بروئے کار آیا تھا۔ خودداریِ ساحل آزادیِ دریا سے ہمیشہ بے نیاز رہی ہے' چند سال سے یورپ میں نیو ابجکٹیوٹی (نو مجازیت) کے نام سے ایک اور تحریک شروع ہوئی جو از سرِ نو صورت نوازی کی راہیں نکالنے میں سرگرم ہے۔

پکاسو کے آخری زمانہ کی تصویروں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہی شخص جس کی مجاز کشی کیوبزم کی حد تک پہنچی تھی اس قسم کی تصویریں بنانے پر کیوں کر آمادہ یا قادر ہوا۔ قدامت پسند کوتاہ بین طبائع بول اٹھیں گی کہ ہر پھر کر گردشِ پرکار' کے اندر ہی قدم رکھنے پڑیں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ زندگی ہمیشہ نئے مظاہر کی جستجو میں رہتی ہے اور زندگی کا پرکار گھومتا بھی ضرور ہے لیکن پرانے نقطوں پر واپس کبھی نہیں ہوتا۔ نو مجازیت اور نیچرلزم کی تصویروں میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کو وہی لوگ صحیح طور پر سمجھ اور برت سکتے ہیں جو مجاز کشی کی کٹھن منزلوں کو طے کر چکے ہیں۔ متذکرہ صدر تمام اسالیب آج یورپ میں دوش بدوش برسرِکار ہیں لیکن مصوری کی آخری منزل نو مجازیت ہی ہے۔

صدیوں پیشتر جب ہندوستان سے یورپ تک کی مسافت طے کرنا 'جوئے شیر' لانے سے کم نہ تھا۔ ان دونوں ممالک کے فنّی اثرات میں کسر و انکسار برابر جاری و ساری رہا۔ چنانچہ اب جب کہ وسائل آمد و رفت اور خبر رسانی کے ذرائع اور وسائل میں مزید ترقی اور سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ ہندوستان کی مصوری کا اثر محلِ تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ گزشتہ صدی میں یورپ کا جو کچھ اور جتنا کچھ اثر ہندوستان پر پڑا ہے وہ بیشتر انگلستان کی وساطت سے بروئے کار آیا ہے اور انگلستان نہ صرف سیاست بلکہ آرٹ میں بھی انقلاب کا دشمن ہے۔ جہانگیری اور جہانبانی کے لئے اس کی یہ افتادِ طبع کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ آرٹ کے لئے یہی چیز سمِّ قاتل ہے۔

آرٹ کی ترقی کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں اوّل طبیعت کا حسّاس ہونا۔ دوم طبیعت میں اپج اور امنگ کا ہونا۔ اول الذکر خصوصیت قدیم راہوں پر قائم رہنے پر مجبور کرتی ہے' مؤخر الذکر نئی راہیں اور نئی منزلیں تلاش

کرتی رہتی ہے جہاں تک فنون لطیفہ کا تعلق ہے انگلستان کی فطرت میں نئی راہیں اور نئی منزلیں تلاش کرنا سرے سے ناپید ہے۔ انگلستان کا صدیوں سے دستور رہا ہے کہ جو روشیں گھس پس کر یورپ میں "طوق گلو افشار" ہو جاتی ہیں انھیں وہ 'طوق زرّیں' قرار دے کر رقص طاؤس کرتا ہے اور داد کا بھی طالب ہوتا ہے۔ شاید ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ جدیدیت رنوار جیسے اعتدال پسند مصور تک کی ایک تصویر کو لندن کی نیشنل گیلری میں داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اب آج کل جب کہ یورپ کے انقلاب مصوری کی دار و گیر کے بعد فرانس، جرمنی اور اٹلی کے مصور نو مجازیت کا ایک متوسط اور معتدل اسلوب دریافت کرنے میں کوشاں ہیں۔ ہمیں اکسپرشنزم کے نسخے حاصل ہوتے ہیں اور اکثر لوگوں سے اپسٹائن کا نام عجائب روزگار کے طور پر سنتے سنتے

سر بگریباں ہوں کہ اسے کیا کہئے

چنانچہ ہندوستان کی مصوری پر یورپ کا جو اثر پڑا وہ محض نیچرلسٹک (متعلق بہ نیچرلزم) تھا اسی اثر کے ماتحت بمبئی کے اسکول کی بنا پڑی جو ہندوستان کی تمام گزشتہ فنی روشوں سے اس قدر جدا تھا کہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خود ہندوستان کی مصوری پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ راوی ورما اور اس قبیل کے دوسرے مصوروں کے کارناموں اور یورپ کی معمولی سے معمولی نیچرلسٹ تصویروں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف مذہبی مضمون اور موضوع کا البتہ اس میں شک نہیں کہ راوی ورما اور اس قبیل کے دوسرے مصوروں کے کارناموں اور یورپ کی معمولی سے معمولی نیچرلسٹ تصویروں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف مذہبی مضمون اور موضوع کا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ راوی ورما کی اس روش کا اثر ہندوستان کی مصوری پر پڑا، جیسا کہ یورپ میں نیچرلزم کے خلاف رد عمل ہوا تھا۔ اس انقلاب کے بانی ابانندرو ناتھ ٹگور ہوئے جن کی شخصیت اور اہمیت پر میں کسی دوسرے موقع پر اظہار خیال کر چکا ہوں۔

ٹگور اسکول پر یورپ کی جدیدیت کا کوئی براہ راست اثر نہیں پایا جاتا۔ لیکن یورپ میں جدیدیت کی تحریک اور ہندوستان میں ٹگور اسکول کی تحریک کے اسباب وسائل اور مقاصد کم و بیش یکساں ہیں۔ یورپ کی جدیدیت نے چین کے مصوروں اور افریقہ کے حبشی صورت تراشوں کو پیش نظر رکھ کر اُن سے استفادہ کیا تو دوسری طرف ٹگور اسکول نے غار ہائے اجنتا کے مصوروں اور بت تراشوں کو اپنا رہبر بنایا۔ یورپ کی مصوری نے نیچر پرستی سے انحراف کیا۔ ٹگور اسکول نے بھی ایک طرف برطانیہ کی ساختہ پرداختہ نیچرلزم کے اثرات سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور دوسری طرف

مغل اسکول کی موشگافیوں سے جن کو مغلوں کے زوال کے بعد اب کوئی پوچھنے یا پوچھنے والا نہ تھا۔ روگردانی کی لیکن روح کے متلاشی دونوں تھے یورپ کی جدیدیت بھی اور ٹگور اسکول بھی۔ البتہ موخرالذکر نے جسد و جان کا وزن بہت کچھ قائم رکھا۔
اب صورت حال یہ ہے کہ ٹگور اور ان کے بعض شاگردوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ٹگور اسکول کے دوسرے مصوروں کی ساری مصوری کا ماحصل قوم پرستی یعنی اسلاف پرستی نکلتا ہے۔ لیکن آرٹ اور قوم یا اسلاف پرستی میں مفاہمہ گوارا کیا جاسکتا ہے معاہدہ ممنوع ہے۔ آرٹسٹ پہلے خود ہے پھر ہندوستانی یا کچھ اور۔ آرٹسٹ وہ ہے جو ہمہ وقت اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے متاثر یا پیکر زائیوں میں مصروف و منہمک ہو اور اس پر بھی قادر ہو کہ اپنے تاثرات کو نقش و رنگ بھی دے سکتا ہو۔ اسے صنم ساز اور صنم پرست دونوں ہونا چاہیئے۔ ہندوستان پر قومی غلامی اس درجہ مسلط ہے کہ اس کے مصوروں کے ذہن و دماغ تخلیقی عناصر سے بالکل خالی ہو چکے ہیں وہ ایک ایسی وادی میں گمراہ ہی نہیں بلکہ واماندۂ راہ بھی ہیں جس کے ماحول اور موجودات کو کسی ساحر نے یکلخت سرد، ساکت اور جامد کر دیا ہو۔ چنانچہ بھر مار جس چیز کی ہے وہ دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیں اور فنِ بت تراشی کی پرانی حکایتیں ہیں۔ اس میں بھی کامیابی ہوتی تو کوئی شکایت نہ تھی لیکن مشکل یہ ہے کہ بت پرستی جتنی آسان ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل بت تراشی ہے۔
زمانۂ قدیم میں ساری قوم کا ذہن ایک ہونے پر بے کم و کاست متفق ہوتا تھا اور صورت گر کی حیثیت محض ایک کاریگر کی ہوتی تھی۔ آج کا مصور اپنی ذاتی شخصیت کا مالک ہے اور اس میں اور دیگر افراد قوم میں اگر کوئی تعلق ہے بھی تو بہت دور کا۔ ہندوستان میں مصوری پر دوہری مصیبتیں نازل ہیں۔ ایک طرف تو ذہنی بے بضاعتی یا ذہنی ادبار نے ذوقِ فن باقی نہ رکھا۔ دوسری طرف خود مصوری کو اپنی خاص حسن ادا پر اطمینان ہو گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو بت آج کل کے مصور بناتے ہیں ان میں نہ تو متمدن اقوام کے تخیل کی جولانی یا بوقلمونی ہوتی ہے اور زمانۂ قدیم کے افراد کا جوشِ مذہبیت اور ظاہر ہے کہ یہی دو عناصر دیوتاؤں کے قابلِ یقین ہیولیٰ بنانے کے لئے لازم آتے ہیں۔
دلی کی گزشتہ نمائش میں سارداکیل کی بنائی ہوئی چند تصاویر نظر سے گزریں جو اس نقطۂ نظر سے قابلِ التفات تھیں کہ سارداکیل میں ایک عظیم المرتبت مصور ہونے کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ جس کا ثبوت وہ تین تصویریں ہیں جو اس نمائش میں موجود تھیں یعنی "بھکاری"، "سارنگی والا" اور "نانی کا مدرسہ" لیکن ستم ظریفی یہ کہ ان تصویروں کے خالق ہونے کے باوجود وہ پھر اسی مذہبی فرسودہ لکیر کے فقیر بن جاتے ہیں جو اُن کی مصوری کا بظاہر ناقابلِ تغیر

وان گوخ　　　سورج مکھی کا پھول　　　(آئل پینٹنگ)

اصول معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا "نٹ راجا شیو" خصوصیت کے ساتھ قابلِ تاسّف ہے۔ اس کے ہر خد و خال کا انتہا سے زیادہ واضح ہونا، کمزور اور آورد سے بھرے ہوئے خطوط، سہانے اور پُر محبت رنگ، شیو جی کی زلزلہ انگیز اور صاعقہ فگن شخصیت سے جو قدیم مصوروں اور بت گروں سے ہم تک پہنچی ہے وہ سب کر گزرتے ہیں جو محمود غزنوی کے گرزوں سے نہ ہو سکا تھا۔ پیاری مدھ ماتی آنکھیں اور "غنچۂ ناشگفتہ" دہن اپنے اپنے مقام پر اچھی چیزیں ہیں لیکن نٹ راجا کے جبروت وجلال میں ان کا کہاں دخل۔

ہندوستان میں آج شاید کوئی مصور ایسا نہیں ہے جس پر ٹگور کا کم و بیش اثر نہ پڑا ہو لیکن باوجود ان اثرات کے چغتائی کے عمل میں ہم ایک مخصوص روش پاتے ہیں جو عجب نہیں ترقی کر کے ایک مستقل "اسکول" کی حیثیت اختیار کرے باوجود اُس تمام نقد و جرح کے جو میں ٹگور اور دوسرے ہندوستانی مصوروں پر اکثر کرتا رہا ہوں۔ مجھے اس امر کا احساس و اعتراف ہے کہ چغتائی باوجود ان تمام فارسی اور ہندی اثرات کے جو ان پر طاری ہیں ایک مخصوص رنگ کے مالک ہیں اور یہ رنگ پنجاب کے اکثر مصوروں کے لئے مصوری کی ایک نئی راہ پیش کر رہا ہے۔ البتہ یہ امر قابلِ تاسف ہے کہ اگر چغتائی کی تصویروں میں خالص آرائشی پہلو مصوری کے عناصرِ اساسی کے تابع رہتا ہے تو ان کے تابعین کی مصوری بیشتر آرائشی نقش و نگار میں گم ہو جاتی ہے۔

صفحاتِ بالا میں مصوری کی جدید روشوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں یورپ اور ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے موجودہ فنی میلانات سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ چین اور جاپان کی موجودہ مصوری کے معیاری نمونے نظر سے اس قدر کم گزرے ہیں کہ ان کی بنا پر کوئی مستقل رائے قائم کرنی دشوار بھی ہے اور ناانصافی بھی لیکن اس میں شک نہیں کہ دیگر ممالک کی مانند ان ممالک میں بھی مصوری اور بت گری کے میلانات میں ایک طرح کا انقلاب و ہیجان رونما ہے خود ہندوستان کا یہی حال ہے۔ یورپ سے مرعوب اور مسحور ہونا اور وہ بھی غلامی کی حد تک ایشیا کی تمام قوموں میں کم و بیش مشترک ہے۔

مصوری کی جن روشوں کا تذکرہ صفحاتِ ماسبق میں کیا گیا ہے ان میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ حتی الامکان ایسی اصطلاحات اور اسلوبِ بیان سے پرہیز کیا جائے جو بجائے اس کے کہ مصوری کا ذوق پیدا کریں یا تنقیدی مضامین کے مطالعہ کے محرک ہوں پڑھنے والوں کے دل میں یہ خطرہ پیدا کر دیں کہ مصوری کا باوا آدم ہی نرالا ہے اور یہ چیز ان کے بس کی نہیں ہے۔ تنقیدی مضامین کا مطالعہ اس کا مقتضی ہے کہ اس کا پڑھنے والا کم سے کم اتنا ضرور ہو کہ تصویر کو سمجھتا نہ ہو تو

اس سے دلچسپی ضرور رکھتا ہو۔ اس لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس فن سے دلچسپی رکھتے ہوں تنقیدی مضامین کے مطالعہ سے پہلے اچھی تصویر کا مطالعہ کریں پھر یہ بھی ہے کہ تصویر اور عورت سمجھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ محبت کرنے کی ہیں لیکن اگر کسی صاحب کو اس نظریہ سے اتفاق نہیں ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ تصویر دیکھنے کی چیز ہے۔ ھوالاول ھوالاٰخر وہ لوگ جو رنگ اور نقش کا حس کم رکھتے ہیں وہ تصویر کے معنی سمجھنے کے خواستگار ہوتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تصویر کا اگر کوئی ادبی پہلو ہوتا بھی ہے تو اس کو حقیقی معنوں میں مصوری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اثر آفرینی یا اثر اندازی کے اعتبار سے مصوری، موسیقی سے ملتی جلتی ہے کسی دُھن یا راگنی سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ سننے یا گانے والا گائے ہوئے الفاظ کے معنی بھی سمجھے۔ موسیقی سے تمام و کمال لطف اندوز ہونے کے لئے ہوا کی وہ لہریں مجرد "کافی ہیں جو کسی گلے یا ساز سے نکل کر کانوں کے پردوں کو لرزاں کرتی ہوئی ساری رگ و پے میں اہتزاز پیدا کر دیں۔ موسیقی سے بہرہ مند ہونے کے لئے ذہانت کی ضرورت کم ہے اور اس کی زیادہ کہ رباب کے ساتھ جسم کا رباب بھی مترنم اور مرتعش ہو جائے۔

ایک فاضل کا قول ہے اور نہایت صحیح قول کہ نقاد کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے حساسیت کو متعدی بنا دے اور یہ چیز "اچھی انگریزی" یا "اچھی اردو" سے اس قدر ممکن نہیں ہے جتنا کہ ان ٹوٹے ہوئے الفاظ اور شکستہ بیانی سے جو ایک واقعی حساس طبیعت اپنی تمام بیچارگی اظہار کے ساتھ عالم اضطراب و اضطرار میں پیش کر دیتی ہے "اچھی انگریزی" سے اگر یہ ممکن ہوتا تو رسکن کے آرٹ پر ان جید اور بے نظیر تحریروں سے جو انگریزی ادب میں جانِ سخن سمجھی جاتی ہیں۔ آرٹ کی متعلق بھی کچھ پلے پڑتا اور اچھی اردو سے یہ ممکن ہوتا تو رشید صاحب نے اس مضمون کا بار کم از کم میرے سر نہ ڈالا ہوتا۔

ہندوستان میں فن مصوری کی طرف طبائع کا رجحان اس قدر کم ہے کہ مصوری پر مجھے اندیشہ ہے ہر مضمون بیگے اور ٹیڑھی کھیر والی حکایت بن سکتا ہے۔ مصوری کے نکات کو ادبی تمثیلوں سے سمجھانے اور حل کرنے میں بیشتر اس کا خدشہ رہتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ "بادۂ ساغر کے بغیر" یہ جرعہ گلے سے اُترتا بھی نہیں۔ بہرحال میں ان سطور کی بڑی کامیابی سمجھوں گا اگر ان کے مطالعہ کے ساتھ ناظرین ان تصویروں پر بھی جو اس مضمون سے متعلق ہیں ایک نظر ڈال کر دوسری اور تیسری نظر ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

"جبریلِ مشرق"

آلِ احمد صدیقی سرور
ایم۔ اے (علیگ)

جبریلِ مشرق، علامہ اقبال کا تازہ ترین اُردو کلام بالِ جبریل کے نام سے شائع ہوا ہے بانگِ درا کی اشاعت کے بعد سے مشہور تھا کہ علامہ موصوف نے اُردو میں لکھنا کم کر دیا ہے اور اس شبہ کو خود اُن کے الفاظ نے کہ "اُردو میں شعر نازل ہی نہیں ہوتے" اور قوی کر دیا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں راوی و گنگا کی تمام بہاریں جیحوں و سیحوں کی رَو میں بہ نہ جائیں اور ان کی فارسی شاعری جو ہمارے لئے وادیٔ بے راہ (Blind alley) کی مانند ہے، اُردو کے حق میں کانٹے نہ بوئے۔ مگر بڑی خوشی کی بات ہے کہ عصرِ حاضر کے سب سے بڑے اُردو شاعر نے اپنی مادری زبان کو خیرباد نہیں کہا بلکہ تازہ کلام کے تیور بتا رہے ہیں کہ "بطنِ گیتی" سے "آفتابِ تازہ" پیدا ہونے والا ہے!

اقبال کی شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اب اس بلندی پر ہیں جو ترک و قبول کے منازل سے گذرتی ہوئی احساسِ عظمت پر ختم ہوتی ہے۔ ان کی جگہ بقائے دوام کے دربار میں متعین ہو چکی ہے اور ان کا درجہ میر و مرزا اور انیس کے قریب "محفوظ" ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمیں بالِ جبریل پر نظر کرتے وقت تمام آموختہ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اقبال نے شاعری اور شعرا دونوں کو متاثر کیا ہے۔ گزشتہ ربع صدی میں اُردو نظم کے نئے جو نئے راستے کھلے ہیں ان میں اقبال کا بہت بڑا حصہ ہے اور معاصر شعرا کا پیش نہاد بھی پہلے سے بہت کچھ بدل گیا ہے۔

محض تغزّل جو ہمارے شعرا کا طرۂ امتیاز تھا اب "حدِ ادب" نہیں رہا بلکہ اگر ایک طرف حسرت کے علاوہ فانی، جگر اصغر نمودار ہوئے ہیں تو دوسری طرف جوش، حفیظ، صفی و اختر شیرانی نے بھی نظم کا میدان وسیع کیا ہے۔ یہ سب اشخاص بالواسطہ یا بلاواسطہ اقبال کے کلام سے یا اُس فضا سے جس میں اقبال کا رنگ و آہنگ جاری و ساری ہے متاثر ہوئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اقبال نے شاعر کے تجربہ کی دنیا کو وسیع کر کے ایک طرف اُسے جہد البقا سے زیادہ مانوس کر دیا ہے، دوسری طرف فنی شعور (Artistic Conscience) میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔

اقبال متفکر بھی ہے اور شاعر بھی، خطیب بھی ہے اور مغنی بھی۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی میں اور سیاسیات کی دنیا میں وہ رجعت پسند ہے۔ بظاہر اس تفاوت کا اثر ہماری اجتماعی زندگی پر اچھا نہیں پڑا۔ ایک طرف شعرا

کی نیت میں شبہ ہونے لگا ہے اور دوسری طرف دنیائے فکر و عمل میں ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی ہے لہذا اقبال کی شاعری اور اُن کی عملی زندگی میں جو تفاوت معلوم ہوتا ہے اس کے اسباب و علل پر غور کرنا ہمارے لئے بیحد ضروری ہو گیا ہے۔

حضرت شاہ محدث دہلوی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک دفعہ کسی آیۂ کریمہ کے معجزات بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرما گئے تھے کہ اس کی تلاوت سے سبکسارانِ ساحل، دام موج و "حلقہ ہائے نہنگ" دونوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ راوی ناقل ہے کہ کسی "یتیم و اسیر" راہرو کو یہ نسخہ ایسا ہاتھ آ گیا تھا کہ روز اپنے "حوائج ضروری" کے سلسلہ میں اس اسم اعظم کے زور سے جمنا پار آیا جایا کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے اظہار عقیدت کے لئے شاہ صاحب موصوف کو مدعو کیا اور اُس وقت یہ معلوم ہوا کہ مسیحا بھی کبھی کبھی بیمار ہو جایا کرتے ہیں۔

قریب قریب کچھ ایسا ہی خیال ایک طبقے کا اقبال کے متعلق ہے اور رسالہ جامعہ دہلی کی کسی گزشتہ اشاعت میں جو نظم اُن پر شائع ہوئی ہے اس کا "انجام" بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یعنی ملک کی بدقسمتی ہے کہ مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق" کی تمام جادو گریوں سے واقف کار کلیم سرمایہ داروں کی فرعونیت سے مسحور ہو جاتا ہے اور "قفس" کو "آشیاں" سمجھنے لگتا ہے۔ خود شاعر کے اعتراف سے اس نظریہ کو تقویت ہوتی ہے ؎

"اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

مگر چونکہ ہمارے یہاں غزل گوئی کا اثر خیالات پر بھی پڑا ہے اور اشعار میں تسلسل بالکل ضروری نہیں سمجھا جاتا اس لئے کسی شاعر کا فلسفۂ زندگی اس کے اشعار سے اس وقت تک اخذ نہیں کیا جا سکتا جب تک کئی دفعہ اُسے دہرایا نہ گیا ہو۔

قرینِ قیاس یہ ہے کہ بالِ جبریل کا حسب ذیل شعر اقبال کی شاعری پر بہترین تبصرہ ہے اور اس سے اُن کی عملی زندگی کے چند پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یورپ میں ایک غزل لکھی گئی ہے جس کے شروع کے شعر یہ ہیں ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اور تان اس شعر پر آن کر ٹوٹی ہے ؎

مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ　　　　مقامِ عقل سے آسان گذر گیا اقبال

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظریات کے میدان میں شاعر کی تگ و تاز بہت دور تک ہے مگر اس پر وجدانی کیفیات پورے طور پر طاری نہ ہو سکیں اور شاعری جب سوسائٹی کی ترجمان ہوئی تو شعریت کو کچھ نہ کچھ صدمہ ضرور پہنچا۔

اس سلسلہ میں ایک نظریہ اور قابلِ غور ہے۔ اس سے شاعر اور سیاست داں کی ظاہری تفاوت پر تو روشنی پڑتی ہے مگر شاعر کی عظمت پر داغ آتا ہے۔ وضاحت کے لئے بالِ جبریل کی ایک نظم سنئے ؎

چیونٹی

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند　　　　تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

عقاب

تو رزق اپنا ڈھونڈھتی ہے خاکِ راہ میں　　　　میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

یعنی شاعر کا نصب العین زندگی کی جد و جہد اور ارتقا کے صبر آزما منازل سے بچ کر تخئیل کی فضاؤں میں پرواز کرنا اور اس طرح "غذائے روح" فراہم کرنا ہے۔ یہ چیز اپنی جگہ پر کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو لیکن اسے عملی زندگی کی جانبازیوں سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال اور اس کی شاعری میں ذرا بھی تفاوت نہیں رہتا۔ وہ زمانہ کے مکر و فریب سے اچھی طرح واقف ہے، مگر اس کا مقصد شروع سے دنیا میں رہنا نہیں، اپنی دنیا الگ بنانا ہے جس میں عافیت ہے اور پرواز اور زمانۂ ماضی کے دل خوش کُن افسانے ہیں ؎

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز　　　　حدیث بے خبراں ہے "تو با زمانہ بساز"

اور "با زمانہ ستیز" کی ایک صورت زمانہ سے علیحدہ رہنا بھی ہے۔

اقبال دنیا کی پستیوں کا قائل نہیں۔ فضاؤں میں پرواز اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ اس کے خیال میں شاعری میں وسعت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب زندگی کو ذرا بلندی سے دیکھا جائے۔ یہ خیال اپنی جگہ پر کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، مگر چونکہ اقبال نے اپنا نصب العین محض "ہُوائی" رکھا ہے اس لئے سیاست کی دنیا اُسے اہم نہیں معلوم ہوتی اور یہاں وہ جو کچھ کرتا ہے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ مریخ کا کوئی باشندہ اگر ہماری زندگی کی کشاکش کو برابر دیکھتا رہے تو اُسے ہم سے ہمدردی ہونا قرینِ قیاس ضرور ہے مگر یہ اور بھی قرینِ قیاس ہے کہ یہاں ترکِ وہی کرے گا جس کے خلاف کرنے کا اس نے عزم

کر لیا تھا اس کی وجہ ہی عملی زندگی سے گریزاں رہنا ہے چونکہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اس لئے میں اسے اور واضح کرنا چاہتا ہوں۔

ہر شاعر کے اظہار خیال کے لئے ایک تشبیہی مترادف (Symbolic Equivalent) ضروری ہے یعنی کسی خاص ذریعے سے وہ اپنی شاعری کے سب سے قیمتی اور سب سے بنیادی تجربے کو زندہ جاوید کرتا ہے، مثلاً کیٹس نے اپنے (Ode to Nightingale) میں "عندلیب زار" کا جو نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کے صحیح تصور کے بغیر کیٹس کی شاعری کا تجزیہ نامناسب ہے۔ اسی طرح شیلے (Shelley) نے (Ode to Skylark) میں جو عکاسی کی ہے اس کے حقیقی تخیل کے بغیر اُس کی شاعری کی عظمت کا اندازہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے گھوڑے کو گاڑی میں آگے جوتنے کے بجائے اُسے گاڑی کے پیچھے جوت دیا جائے۔ اقبال کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چند مخصوص چیزیں انھیں خاص طور پر متاثر کرتی ہیں اور انھیں کو لوٹ پھیر کر وہ نئی ترکیبوں سے موزوں کرتے ہیں۔ کسی شاعر کے کلام میں ان چیزوں کی تکرار بجائے خود نہایت دلچسپ ہے اور بشرط فرصت اس پر بالتفصیل گفتگو کی جائے گی مگر اس وقت ہمیں نفس مضمون پر آنا چاہیے۔ اقبال کے یہاں محمود و ایاز، سومنات شاہین، خودی بار بار آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق اقبال کا خاص نظریہ ہے۔ مگر ان میں سے شاہین سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں اور نہ صرف مختلف نظموں اور غزلوں میں اُسے اپنا تشبیہی مترادف بنایا ہے بلکہ ایک علٰحدہ نظم بھی اس پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا — جہاں عشق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل — نہ بیماریِ نغمۂ عاشقانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

دوسری جگہ "ایک نوجوان" سے ارشاد ہوتا ہے ؎

"عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

بہرحال یہ خیال کہ اقبال ہنگامۂ زندگی سے بچ کر فضاؤں میں پناہ لینا چاہتے ہیں، نہایت دلچسپ ہے اور اس سے اُن کی شاعری پر نئی روشنی پڑتی ہے۔

یہاں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ شاعر کا سیاسیات کے گرداب میں پڑنا کہاں تک مناسب ہے۔ شاعری ایک ذہنی تجربے کا روشن تخیل ہے۔ تجربے کا جوہر جتنا قیمتی ہوگا اسی قدر قیمتی اس کی شاعری ہوگی۔ اس تجربہ کا اظہار اشعار میں ہوتا ہے اور اظہار خیال کے ذریعے سے ابلاغ خیال اور (Expression) کے ذریعے سے (Communication) ہوجاتی ہے۔ شاعر کی تسلّی وہیں ہوجاتی ہے جہاں اس کے اشعار مکمل ہوگئے مگر پڑھنے والوں کا مقصد آرٹ نہیں زندگی ہے اس لئے وہ اس میں اپنا فلسفہ، اپنا تخیل، اپنی حبِ وطن کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ بائرن یا Rupert Brooke کی طرح شعرا اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنادیں مگر شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کیونکہ یہ اس کا مقصد نہیں ہاں اس کے دماغ میں خیالات ضرور شدت کے ساتھ موجزن ہوتے ہیں ورنہ جوشِ بیان اور صداقت مفقود ہوجائے۔ بعض شعرا زبردستی اپنے آپ کو اس رو میں بہا لیتے ہیں مگر پڑھنے والا ایک نظر میں آمد و آورد میں امتیاز کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر جوش کو لیجئے۔ اُنھوں نے جب تک شبابیات پر زورِ قلم صرف کیا، کلام بحیثیت مجموعی بلند رہا، مگر ان کی انقلابی شاعری سرتاسر آورد ہے۔ اُنھوں نے زمانہ کی رو میں بہنا چاہا ہے اور چونکہ کہنہ مشق شاعر ہیں اس لئے الفاظ کے طلسم اور پیچیدہ تراکیب کے ہجوم سے مزدور کی تہی مائگی اور سرمایہ دار کی رعونت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے اقبال کی اس قسم کی چیزوں میں ایک خاص روانی، ایک خاص جوش ہوتا ہے "جو لایا ہوا" نہیں ہوسکتا۔ ملاحظہ ہو ؎

فرمانِ خدا فرشتوں کے نام

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

میرے نزدیک اس نظم میں سوائے اس کے کوئی خوبی نہیں ہے کہ جوش سے لکھی گئی ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے ۔ جوش میں آکر وہ ایسی بات کہہ گئے ہیں جو اُن کی عام روش کے خلاف ہے یعنی "جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو" یاد رہے کہ یہ اس شخص کی زبان سے نکل رہا ہے جس کے لئے قرطبہ اور الحمرا کے آثار اب تک حشر در آغوش ہیں۔ اس لئے اگر ہم اس ایک بات کو زیادہ اہمیت نہ دیں تو بھی ہمیں اس کے خلوص نیت میں شبہ نہیں ہونا چاہیئے ۔

اقبال کے متعلق چند شکوک رفع کرنے کے بعد اب آئیے بالِ جبریل کی شاعری کو پرکھیں ۔

عام طور پر شاعری کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے اور اس کے بعد کلام میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اچھے اچھے شاعروں کو دیکھا ہے کہ اُن کی عمر میں زوال کے ہوتے ہی شاعری میں بھی زوال آجاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام تر جذبات کی فراوانی میں گم رہتے ہیں اور انحطاط عمر کے ساتھ، شدتِ جذبات کم ہونے لگتی ہے۔ جذباتی شاعری کا اکثر یہی حشر ہوتا ہے ۔ کم شعرا عمر کے ساتھ شعورِ فن Artistic Conscience میں بھی ترقی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ شاعر جو عالم جوانی میں " نور و نغمہ کی دنیا" بن کر رہا کرتا تھا ۔ ایک خاص فلسفۂ زندگی میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ وہ اچھا خاصہ خطیب بن جاتا ہے ۔ میتھو آرنلڈ پر جو الزام لگایا گیا ہے وہ اقبال پر بھی لگایا جاسکتا ہے اور اس وقت صرف ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس جنگ کا ابھی کوئی فیصلہ کن پہلو نہیں نکلا یعنی شاعر خطیب سے نبرد آزما ہے (A poet is struggling with a preacher)

بانگِ درا اور بالِ جبریل کے شاعر میں بہت فرق ہے ۔ اگرچہ "آبِ رواں کبیر" کے کنارے خواب شروع سے دیکھے جاتے ہیں "خاکِ مدینہ و نجف" روزِ اول سے آنکھ کا سرمہ ہے اور تہذیبِ حاضر کی چمک ابتدا سے نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے، مگر شاعر کے اندازِ بیان میں نمایاں فرق ہو گیا ہے ۔ جوش کی جگہ سنجیدگی نے، خندۂ دنداں نما کی جگہ، ایک لطیف تبسم نے اور شعلۂ جوالہ کی برق سامانیوں کی جگہ ایک مسلسل، متوازی اور محیط ضیا باری نے لی ہے پہلے شمع و شاعر ہو یا طلوعِ اسلام، شاعر کا قلم بقول شخصے "ٹھاٹیں مارتا ہوا چلا جاتا تھا ۔ ایک طوفان تھا جس میں بلندیٔ تخیل اور پیرایۂ بیان نہایت خوبصورتی سے سموئے گئے تھے ۔ اب ایک ہلکا سکوت ہے جو بجائے خود ایک جہانِ معنی اپنے اندر رکھتا ہے ۔ دوسرے ہر نظم بجائے خود مستقل تھی اور اپنی جگہ پر بالِ جبریل میں طرزِ بیان دوسرا ہے ۔ تخیل جو پہلے فضاؤں میں رقص کرتا تھا الفاظ میں ناچ رہا ہے ۔ نشہ اُتر گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ہلکی لطیف کیفیت نے

لے لی ہے۔ اب وہ طوفانی خروش نہیں، الفاظ کوثر میں ڈھلے ہوئے، نگینہ میں جڑے ہوئے نکلتے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں سب معلوم ہوتا ہے بیک وقت یا کم از کم ایک طرح کے وجدان کے ماتحت لکھی گئی ہیں بحیثیت مجموعی کلام کا معیار بلند ہے مگر مخصوص و مختص نظموں کا امتیاز مشکل ہے۔

کتاب کے سرورق پر جو شعر ہے وہ کلام کی نرمی و نزاکت پر دال ہے ؎

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اس کے بعد غزلیں ہیں جو مختلف موقعوں اور مختلف مقامات پر لکھی گئیں۔ یہ صرف غزلیں نہیں حالات حاضرہ اور مسائل مہمہ پر اچھے خاصے تبصرے ہیں۔ کوئی قرطبہ کے بے نظیر مناظر کو دیکھ کر موزوں ہوئی ہے کہیں شاعر افغانستان کی مہماں نوازی و اخوت کے مظاہرے سے متاثر ہوا ہے، کہیں اس نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے تجربات نظم کر دئے ہیں۔ بعض جگہ اس نے اُس بے چینی کا اظہار الفاظ میں کیا ہے جو اس پُر آشوب زمانے میں ہر قلب کے اندر کانٹا بنی ہوئی ہے کہیں بارگاہ ایزدی میں شکوے ہیں اور کہیں نیازمندانہ معروضات۔ غرضکہ ؎

وہ کونسا ہے نغمہ جو اس ساز میں نہیں

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے غزل سے نظم کا کام لیا ہے۔ یہ طرز بانگ درا میں بھی نمایاں تھی مگر بال جبریل میں تو خالص تغزّل جس کے بہترین ترجمان صرف میرؔ، مومنؔ، داغؔ اور حسرتؔ ہوئے ہیں سرے سے نہیں ہے یا ہے تو نہ ہونے کے برابر ہے اگر کہیں کہیں ایک آدھ شعر ملتا ہے تو وہ اس طرح جیسے قدیم مثنوی نگار حمد و نعت لکھا کرتے تھے اور اس کے بعد مطلب پر آجاتے تھے جب ذیل غزلوں کے چند اشعار سے معلوم ہوگا کہ وہ مخصوص تجربات جن کو ہم "اُڑتے اُڑتے" سن پائے تھے کس قدر روشن طریقے سے زندۂ جاوید کئے گئے ہیں ۱۹۳۳ء میں ہندوستان کے ماہرین تعلیم کا ایک وفد کابل بلایا گیا تھا جس میں اقبالؔ، سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی شریک تھے وہاں کے تاثرات ملاحظہ ہوں ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

قلندر جز دو حرفِ لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو   نہ کر خاراشگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

دوسری غزل پڑھنے کے بعد آپ کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے چند رازِ درون پردہ آئینہ ہو سکتے ہیں ۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی   نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

کبھی سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری   کبھی سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

نظامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا   طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے   وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی

قرطبہ کی سرزمین میں جو کایا پلٹ ہو گئی ہے اس کا حال سنئے ۔

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب   بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی   اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے   دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

غزلوں میں آپ کی توجہ اتنی " زورِ بیان، تڑپ، سوز و گداز، صفائی زبان اور روانی وغیرہ وغیرہ" کی طرف نہیں دلاؤں گا جتنی خاص مضامین کی طرف۔ چند اشخاص فلسفہ کو شاعری کا جامہ زیبِ تن کئے دیکھ کر کچھ چراغ پا ہونے لگتے ہیں مگر یہاں صرف فلسفہ ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔

اقبال کا مذہب ہر شخص کو معلوم ہے وہ ملا پر طعن کرتا ہے مگر ملا کے عقاید کا خود پابند ہے۔ وہ حضرت یزداں کا شاکی ہے۔ مگر یزدانیت کا معترف، وہ جبر و اختیار دونوں کا قائل ہے، وہ کبھی کبھی اپنی بے حجابی یا رسوائی پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے مگر پھر مسکرا کر چپ بھی ہو رہتا ہے وہ ایّامِ ماضی کے خیال نے کر مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ زاہد کی ہنسی اُڑاتا ہے مگر اس کی توہین گوارا نہیں کرتا۔ مگر وہ مغرب اور ہر مغربی شے کا جانی دشمن ہے اور اس میں کوئی خوبی اُسے نظر نہیں آتی۔ جی چاہتا ہے تو رعایت لفظی اور صنائع و بدائع سے کھیلتا ہے مگر اسی طرح جس طرح ایک ماہرِ فن بچوں کے کھلونے سے کھیلے۔ مُنہ کا مزا بدلنے کے لئے تصوف کی چاشنی بھی ہوتی ہے مگر زیادہ نہیں۔

کبھی کبھی وہ (Strained Paradox) سے بھی کام لیتا ہے۔ کبھی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔

گویا اُسے یقین نہیں کہ ایک دفعہ کہنا "گوشِ ناشنوا" کے لئے کافی ہو مگر پھر بھی اس نے اُردو غزل کا دامن بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکیٔ طینت سے ہے گہر کا وضو

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

اور وہ شعر جو نہ معلوم کیوں اس مجموعہ سے نکال دیا گیا ؎

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عینِ فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مے خانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا میرا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز کتابِ صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

ان چند متفرق اشعار کے بعد ایک خاص غزل کے چند اشعار اور سُن لیجئے ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطاب آخر اُٹھتے ہیں حجاب آخر
احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا سوز و تپ و تاب اوّل سوز و تپ و تاب آخر
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر
مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

غرض جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں، یہ غزلیں نہیں حالاتِ حاضرہ پر مختلف تبصرے ہیں۔ شاعر اگرچہ "نور و نغمہ" کی فضاؤں میں مصروفِ پرواز ہے مگر اپنے گرد و پیش کا جائزہ بھی لے لیتا ہے اور اس لئے جو بات اُسے اہم نظر آتی ہے، اشعار میں بیان ہو جاتی ہے۔ خود ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

اُردو شاعری پر اس روش کا اثر میرے خیال میں خوش گوار ہو گا۔ تغزل کا داخلی رنگ اس قدر محدود ہو گیا تھا کہ خود غالب کو اس کا شکوہ کرنا پڑا اور اب ان کے بعد کے شعرا نے تو اس رنگ پر چل کر اس کی کوتاہیوں کا اچھی طرح ثبوت دے دیا۔ اقبال کی غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقِ جذبات، جوشِ قلب، سوز و گداز، درد و اثر صرف جذباتِ عشق و محبت کی عکاسی سے ہی نہیں اس عالمِ مجاز کی ہر چیز سے اُبل سکتے ہیں۔ حُسنِ خیال، حسنِ نظر، حسنِ ادا صرف مسائل ہجر و وصل کے لئے ہی نہیں، مشکلاتِ انسانی کو حل کرنے کے لئے بھی صرف ہو سکتے ہیں۔

ان غزلوں کے علاوہ جگہ جگہ کچھ قطعات بھی موتیوں کی صورت میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں ایک خاص شانِ انانیت پائی جاتی ہے ؎

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے!

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں | خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر جلوۂ دوست | قیامت میں تماشا بن گیا میں
نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں | خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی | اماں شاید ملے اللہ ہُو میں

نظموں کے بارے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں ۔ اُن میں بیشتر اقبال کے سفر یورپ کی یادگار ہیں اور اُن میں مشاہیر یورپ کے متعلق اچھی طرح اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ان میں سب سے زیادہ مسولینی سے متاثر ہوئے ہیں ۔ اس کی فاشیت ان کے مردِ منتظر یا مافوق العادت انسان کے تصور (Super man) سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے ۔ مسولینی قدیم بنیادوں پر جدید نظام تعمیر کرنا چاہتا ہے ۔ اس لئے اقبال کی نظر میں اس کا پروگرام اگر قابل قبول نہیں تو کم از کم اہم ضرور ہے ؎

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارہ لعلِ ناب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

"نپولین کے مزار" پر جو نظم لکھی گئی ہے اس میں کردار کی لذتیں خوب دکھائی ہیں ۔ مگر ٹھیک کہا ہے ؎

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر | جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس | عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

اقبال کی نظر میں لینن کا تصور نہایت دلچسپ ہے ۔ شاعر نے اُسے بارگاہ ایزدی میں اپنی گمراہیوں کی صفائی پیش کرتے دکھایا ہے ۔ یہ تصور صحیح نہیں ۔ کیونکہ لینن شک و شبہ میں بھٹکنے والا نہیں تھا ۔ اس نے اپنے گردوپیش کے حالات کا جائزہ لے کر ایک نظریہ کائنات اور اس کی تخلیق کے متعلق قائم کیا تھا اور اس پر سختی سے عامل تھا ۔ اقبال نے اس کو ایک کافر کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو ممکن تھا کہ ایمان لے آتا ۔ حالاں کہ یہ بات حقیقت سے دور ہے ؎

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

سرمایہ داروں کے خلاف لینن کی انتہا پسندی کا یہ جواز پیش کیا گیا ہے ؎

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

یہ نظم شاعر کی قادر الکلامی کا اچھا نمونہ ہے آخری دو شعر حسبِ معمول ختم ہوتے ہیں ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

سارے مجموعے کی جان ہے وہ نظم جس کا عنوان "جبریل و ابلیس" ہے۔ ابلیس کی سیرت میں چند ایسی بلند پایہ خوبیاں ملتی ہیں کہ صدیوں پیشتر سے شعرائے عظام اس کی عظمت کے قائل ہو گئے تھے ملٹن نے جب فردوس گم شدہ لکھی تو اس کا مقصد آدم کو ہیرو بنانا تھا مگر ابلیس کے جوش و استقلال سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس عظیم الشان کتاب کا سب سے عظیم الشان کیرکٹر ابلیس ہی ہے اور ملٹن کی شاعری کے بہترین نمونے اس کی تقریروں ہی میں ملتے ہیں اُن میں سے بعض تو ضرب المثل ہو چکے ہیں۔

"The Mind is its own place and in itself
can make a hell of heaven and heaven of hell."
"Awake. arise! or be for ever fallen."

مگر یہ امر واضح رہے کہ ملٹن خود نہایت سچا اور پکا عیسائی تھا اور اس کا یہ عظیم الشان کیرکٹر "مشیتِ ایزدی" کی بعض خاص الخاص مصلحتوں کو بے نقاب کرنے کے لئے متصور کیا گیا تھا بالفاظ دیگر اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو بقول اصغر ؎

"کفّار کا مر جانا خود مرگِ مسلماں ہے"

لہٰذا ابلیس کی عظمتوں کو بے نقاب کرنا، فطرت کے ان حجابات کو اٹھا دینا ہے۔ جو ہمارے اور حقیقت

کے درمیان حائل ہیں یہی سجاد انصاری نے اپنے آخری ڈرامے "روز جزا" میں کیا ہے اور اس سے ان کی عقیدت و مذہبیت ظاہر ہوتی ہے نہ کہ دہریت۔

جبرئیل شروع میں کچھ مشفقانہ اور سرپرستانہ لہجہ استعمال کرتے ہیں ؎

ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو ؟

جواب اس قدر جامع ملتا ہے کہ پھر فوراً گفتگو کا رخ بدلنا پڑتا ہے۔

جواب ابلیس :- سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو۔

ابکی بار، جبرئیل ابلیس کو وہ گلیاں یاد دلاتے ہیں جن میں دونوں کی جوانی گذری تھی۔

جبرئیل- ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو — کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو

ابلیس کا جواب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے پہلا شعر یہ ہے ؎

ابلیس :- آہ اے جبرئیل تو واقف نہیں اس راز سے — کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

مقربِ بارگاہ فرشتے کے ترکش میں اب ایک تیر طنز و رشک کا رہ گیا ہے. فرماتے ہیں حضرت جبرئیل ؎

جبرئیل :- کھو دئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند — چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

اس طعنے پر ابلیس کا پُر جوش جواب اردو شاعری کے لئے مایۂ ناز ہے ؎

جواب ابلیس :- ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو — میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر — کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا — میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے — قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح — تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

دو نظمیں اور قابل ذکر ہیں ایک "مرید ہندی اور پیر رومی کا مکالمہ"۔ دوسرا "آدم کا استقبال روح ارضی کی طرف سے"۔ پہلی نظم میں ان مسائلِ مہمہ کو جو مرید ہندی کے لئے عقدہ ہائے لاینحل بنے ہوئے تھے مولانا رومی کی مثنوی کے اشعار سے حل کیا گیا ہے اور دوسری میں اقبال اپنی جوانی کے طرز بیان پر آگئے ہیں

ایک بند ملاحظہ ہو اللہ رے حسنِ بیاں ؎

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
بچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

تہذیب جدید سے اقبال کی نفرت، بعض جگہ خوف بلکہ سراسیمگی کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ "سینما" اور "ایک نوجوان کے نام" دونوں میں جو نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے وہ بہت پیش پا افتادہ اور پرانا ہو چکا ہے۔ اپنی آنکھیں بند کر لینے سے ترغیب گناہ ضرور نہیں ہوتی مگر ساتھ ہی ساتھ ہم فطرت کے بے شمار دل فریب مناظر سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

مضمون بالا کا مقصد اقبال پر کوئی قطعی فیصلہ کرنا نہیں۔ اقبال کے جدید کلام کی روش دیکھنا ہے۔ اقبال کی خوبی ریا برائی؟ یہ ہے کہ وہ محفل کو اصغر و جگر کی طرح مستی و خودرفتگی کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ روح میں بیداری اور خیالات میں موجودہ حالات سے بے اطمینانی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بالِ جبریل بانگِ درا سے بہتر نہ بھی پختہ تر تو ہے۔ اقبال نے عصرِ حاضر کے عام تجربات کو اشعار میں "سمو" کر گو "شعریت" کو نقصان پہونچایا ہو مگر اردو شاعری کا دامن ضرور وسیع کیا ہے۔ حقیقی شاعری میں صرف "نغمہ" یا "پیغام" ہی نہیں ہوتا، اس کے لئے "منتخب زبان" بھی نہایت ضروری ہے، وہ منتخب زبان جو تجربے کا وجدان الفاظ میں بکھیر دے۔ بالِ جبریل کی زبان، باوجود اپنی متانت کے ایسی ہی ہے اور بالِ جبریل کے شاعر کی اس تسلی میں ہم دل و جان سے شریک ہیں ؎

نہ ہو مایوس اے اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اناتول فرانس کا فلسفۂ زندگی

سید اشفاق حسین بی اے (آکسن) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محبّت

انسان کی محبت خود ایک ادنیٰ شے ہے مگر غم کی بلندیوں سے اُسے ایک اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوجاتا ہی اور وہ خدا تک پہنچ جاتی ہے۔ ("سرخ سوسن" ص۲۱۶*)

سچی محبت وہی کرتا ہے جو بلا وجہ محبت کرتا ہے۔ ("ادبی زندگی" جلد۲ ص۱۵۶)

حسن کی بنا محبت ہے۔ ("حضرت کاگیر کا کنوان" ص۴۶)

محبت کی خطائیں معاف کردی جاتی ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ جب خالص محبت ہوتی ہی تو جیب سے کوئی بری بات سرزد ہی نہیں ہوتی۔ مگر نفسانی محبت میں جتنی محبت ہوتی ہے اُتنی ہی نفرت، خود غرضی اور غصہ بھی۔

("سرخ سوسن" ص۲۲۶)

تھوڑی بہت شہوانیت کے بغیر سچی محبت ہوتی ہی نہیں۔

("ادبی زندگی" جلد۲ ص۱۵۶)

انسان کے لئے شہوانیت لازمی ہے۔ ("سرخ سوسن" ص۶۳)

ہماری محبت کی وجہ یہی ہوتی ہی کہ ہم کو محبت ہوتی ہے اور تمام باتوں کے باوجود محبت ہوتی ہی۔

("حضرت سروئین کی خواہشات" ص۱۱۵)

جو چیز ہمارے دل میں ایک تمنّا پیدا کرتی ہے اور ہم سے محبت کراتی ہی وہ ایک ایسی طاقت ہی جو نرم بھی ہے اور دہشت انگیز بھی اور جو حسن سے بھی زیادہ زبردست ہے۔ ہم کو ہزار میں ایک عورت ایسی ملجاتی ہے جو اگر ایک بار ہمارے قبضہ میں آجائے تو پھر ہم اُسے چھوڑ نہیں سکتے اور جس کی خواہش ہمیشہ قائم رہتی ہے بلکہ بڑھتی جاتی ہی محبت کی یہ لاعلاج بیماری ہمارے جسم کے جوہر سے پیدا ہوتی ہی۔ ایک اور چیز اس کی محرک ہوتی ہے جسے ہم بتا نہیں سکتے کہ کیا ہی۔ اُسے جسم کی روح کہتے ہیں۔ ("سرخ سوسن" ص۳۱۳)

---

* ملاحظہ ہوں اناتول فرانس کی تصنیفات (مطبوعہ کالمان لیوی۔ پیرس)

تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ محبت، وحشیانہ محبت نے ایک کھیل کی سی باقاعدگی حاصل کرلی ہے جس کے قاعدوں کی پابندی ساری دنیا کرتی ہے۔ یہ کھیل مشکلات اور پیچیدگیوں سے بھرا ہوا ہے، یہ ایک نہایت ہی لطیف کھیل ہے۔ مگر کھیل کا انجام ہمیشہ فطرت، نامعلوم اور بیدرد فطرت ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس سے زیادہ بیرحم اور بداخلاق کھیل بھی کوئی اور نہیں ہے۔

("ادبی زندگی" جلد۴ ص۲۶)

محبت اور عورت

عورت کے متعلق یہ بتانا آسان نہیں ہے کہ اُسے محبت ہے یا نہیں۔

("سرخ سوسن" ص۲۴۹)

عورت جب محبت کرتی ہے تو اُسے نہ دوزخ کا ہراس ہوتا ہے نہ جنت کی ہوس۔

("بہٹر نوز بیٹر" ص۲۸)

محبت میں مردوں کو شکلوں اور رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے، اُنھیں شبیہیں درکار ہوتی ہیں۔ مگر عورتوں کو صرف کیفیات کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ اندھی ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہ محبت ہم سے بہتر کرسکتی ہیں۔ اگر آپ اس نظریہ کی تردید میں سیکے* کے چراغ اور تیل کے قطرہ کو پیش کریں تو میں عرض کروں گا کہ سیکے عورت نہیں ہے۔ وہ روح ہے۔ یہ وہی بات نہیں ہوئی بلکہ بالکل اُس کی اُلٹی سیکے کو دیکھنے کی فکر تھی، عورتوں کو صرف احساس کی خواہش ہوتی ہے۔ سیکے کو نامعلوم کی تلاش تھی، عورتوں کو کبھی نامعلوم کی جستجو نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنے ایک کھوئے ہوئے خواب یا ایک یاد یا ایک خالص کیفیت کو پھر حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ بس۔ اگر اُن کے آنکھیں ہوتیں تو اُن کی محبت کس طرح سمجھ میں آتی!

("ایپکورس کا باغ" ص۱۵۱)

محبت عبادت کے مانند ہے، وہ دیر میں شروع ہوتی ہے۔ خاص خاص طبیعتوں اور قدرتی پاکیزگی کو چھوڑ کر بیس

* یونان قدیم کی ایک دیوی (روح) ایروس محبت کے دیوتا کی محبوبہ۔ سیکے سے کہا گیا کہ ایروس دراصل ایک نہایت ہیبت ناک دیو ہے۔ ایک رات وہ اُٹھی اور سایہ پروس کا چہرہ دیکھنے کے لئے چراغ قریب لائی۔ تیل کا ایک قطرہ ایروس کے بدن پر گر پڑا اُس کی آنکھ کھل گئی اور وہ بھاگ گیا یوں سیکے اپنی جنت کھو بیٹھی اور در بدر مصیبت کی ماری پھرتی رہی۔

سال کی عمر میں عورت نہ تو محبت کر سکتی ہے نہ عابدہ ہو سکتی ہے۔........ زیادہ تر عورت اُس عمر پر پہنچکر محبت کے جذبہ کو قبول کرتی ہے جب اُسے تنہائی کا خوف باقی نہیں رہتا۔ یہ پُرجوش جذبہ دراصل ایک خشک ریگستان ایک تپتا ہوا بیابان[۵۱] ہے۔ یہ نفسانی جذبہ دنیاوی پیاس اور مذہبی پیاس سے کہیں زیادہ سخت۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اعلےٰ مرتبہ کی محبت کرنے والی عورتیں اُتنی ہی کمیاب ہیں جتنی کہ اعلیٰ مرتبہ کی تپسیا کرنے والی جو لوگ کہ دنیا اور زندگی سے بخوبی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عورتیں سچی محبت کی کُھری کملی سے اپنے جسم کو خوشی سے نہیں ڈھانکتیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلسل ایثار سے کمیاب چیز کوئی نہیں ہے۔ پھر خیال کیجئے کہ جب عورت محبت کرتی ہے تو اُسے اپنے آپ کو قربان کر دینا پڑتا ہے۔ آزادی، سکون، زندہ دلوں کی لطیف تفریحیں، ناز و نخرے، کھیل، تماشے، دنیا کے مزے سبھی سے ہاتھ دھولیتی ہے۔

("سرخ سوسن" صہ ۱۰۲)

عورت

دنیا کو بنانے والی عورت ہے۔ وہ یہاں کی ملکہ ہے، جو کچھ ہوتا ہے وہ اُسی کی ذات سے اور اُسی کے لئے عورت مرد کی بہت بڑی تعلیم و تربیت دینے والی ہے، وہ اُسے دلفریب خوبیوں، خوش اخلاقی، اور خوش فہمی کی تعلیم دیتی ہے اور اُس رعونت کی جو خوشامد سے کوسوں دور رہتی ہے۔ یہ ہم کو اُسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اُس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنا کہ سیاسی قہوہ خانوں میں عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ آخرالامر ہم اُسی کی معرفت اس نظریہ کی تہ تک پہونچتے ہیں کہ جذبات کے خواب اور عقیدہ کی تاریکیاں بالکل اجنبی ہیں اور نیز یہ کہ انسان جس چیز کے اختیار میں ہے وہ عقل نہیں ہے۔

("ایپکورس کا باغ" صہ ۳)

شریف عورتیں اور بازاری عورتیں

اگر عورت روپیہ کی خاطر اپنے آپ کو حوالہ کر دینے سے ایک بڑا گناہ کرتی ہے تو اپنے آپ کو مفت حوالہ کر دینے سے وہ اُس سے کہیں بڑے گناہ

---

[۵۱] ریگستان کا نام۔

کی مرتکب ہوتی ہے، کیونکہ پہلی حالت میں وہ جو کچھ کرتی ہے، زندہ رہنے کے لئے کرتی ہے۔ اس لئے اگر اُس کا فعل درخورِ جواز تو نہیں ہوتا مگر وہ قابلِ عفو اور خدا کے رحم و کرم کی حقدار ضرور ہوتی ہے، کیونکہ خدا خودکشی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اُس کے بندے جو اُس کے مندر ہیں اپنے آپ کو مٹا دیں۔ علاوہ بریں جب عورت زندگی کی خاطر اپنے کو کسی مرد کی کاربرآری میں دیدیتی ہے تو اُس کی بیچارگی قائم رہتی ہے اور وہ اُس فعل سے کوئی لطف نہیں اُٹھاتی اس بنا پر اُس کے گناہ کی اہمیت سُبک ہو جاتی ہے۔ مگر وہ عورت جو اپنے آپ کو مفت حوالہ کر دیتی ہے وہ مزے لیکر گناہ کرتی ہے اور اپنی خطا پر نازاں ہوتی ہے۔ اُس گھمنڈ اور اُس لذت سے جس سے وہ اپنے جرم کو بوجھل کرتی ہے اُس کا جرم اور سنگین ہو جاتا ہے۔

("پرندوں[1] کا جزیرہ" ص ۳۵۵)

کنوارپن

ہمارے اور تمام خیالات کی طرح محبت سے متعلق جو ہمارے خیالات ہیں وہ بھی ایسے دقیانوسی رسوم پر مبنی ہیں جن کی ابتدا بھی اب ہم کو یاد نہیں ہے۔ اخلاقیات کے احکام جن کی بنائے وجود بھی اب باقی نہیں ہے، بیکار سے بیکار فرائض، مضر سے مضر اور سخت سے سخت بندشیں محض اپنی قدامت اور نامعلوم ابتدا کی وجہ سے بالکل اٹل ہیں نہ اُن کی مخالفت کیجا سکتی ہے نہ اُن کی صحت کی جانچ۔ ہر طرف اُن کا ادب اور احترام کیا جاتا ہے اور اگر کسی نے اُن کی نافرمانی کی تو اُس پر ہر طرف سے لعنت و ملامت کی بوچھار ہوتی ہے ....

لڑکی پر جو یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے دولہا کے پاس کنواری جائے یہ اُس وقت مقرر کیا گیا تھا جب جوان ہوتے ہی شادی کر دی جاتی تھی۔ مگر اب جبکہ پچیس تیس سال کی عمر تک لڑکیاں شادی نہیں کرتی ہیں اُن پر یہ فرض عائد کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ شاید آپ فرمائیں کہ یہ کنوارپن ایک تحفہ ہے جو دولہن دولہا کو دیتی ہے (اگر اُسے کبھی کوئی دولہا نصیب ہوا) اور اُس تحفہ سے دولہا بہت خوش ہوتا ہے۔ مگر ہم کتنے مردوں کو دیکھتے ہیں کہ برابر بیاہی عورتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور جو بھی اُن کے ہاتھ آ جاتی ہے اُس سے اُسی قدر خوش ہوتے ہیں جتنا کہ کسی دوسری

("پرندوں کا جزیرہ" ص ۳۱۴)

---

[1] Penguin کے لئے مجھے اُردو میں کوئی لفظ نہیں ملا کتاب کا صحیح نام Penguins کا جزیرہ ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم

سیانی کے معنی "واقف" یا "سمجھدار" کے ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ فلاں لڑکی سیانی ہے جبکہ فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں جانتی ہے۔ لڑکیوں کی یہ ناواقفیت ہماری ریاضت کا پھل ہے۔ مگر انتہائی احتیاط کے باوجود بھی جو لڑکیاں زیادہ سمجھدار ہوتی ہیں وہ سب کچھ جان جاتی ہیں کیونکہ نہ اُن کی اپنی فطرت کوئی اُن سے پوشیدہ رکھ سکتا ہے نہ اُن کے جسمانی حالات نہ اُن کے حسیات۔ البتہ جو کچھ وہ اس طرح جانتی ہیں غلط طریقہ سے جانتی ہیں، اُلٹا جانتی ہیں ہماری محتاط تربیت کا ہی اتنا نتیجہ ہوتا ہے۔

("پرندوں کا جزیرہ" ص ۳۱۵)

جذبات

تند جذبات ہی دنیا کی حسین اور لطیف چیزیں ہیں اور وہ مہمل ہیں۔ جو چیز سب سے زیادہ خوبصورت ہے وہی سب سے زیادہ عقل سے دور ہے، یعنی محبت۔ ("میرے دوست کی کتاب" ص ۲۹)

دل و دماغ

دل سے دماغ کو تقویت پہنچتی ہے مگر دماغ سے دل کو نہیں۔ ("ادبی زندگی" ص ۳۳)

بہتر ہے کہ دل میں سادگی ہو اور عقل میں نہو۔

حق کے وہ نکتے جو عقل دریافت کرتی ہے بے ثمر ہی رہتے ہیں۔ صرف دل ہی میں یہ قوت ہے کہ وہ اپنے خوابوں کو بارور بنا دیتا ہے۔ ہر شے جس سے وہ محبت کرتا ہے اُس میں وہ جان ڈال دیتا ہے۔ دنیا میں نیکی کے بیج جذبات ہی سے پڑتے ہیں عقل میں اتنی صلاحیت کہاں —— لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے عقل کا بیکار بوجھ اُتار کر پھینک دیا جائے اور جوشِ عمل کے پر لگائے جائیں۔ اگر انسان صرف عقل ہی سے کام لے تو وہ کبھی اُڑ سکتا نہیں۔ ("ژیروم کوئنیار صاحب کے خیالات" ص ۲۰)

مستقبل

شاذ ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے آنے والے واقعات و حالات بتانا اپنا پیشہ اختیار کر لیا ہو وہ اپنی اسی قابلیت کے ذریعہ امیر ہو جائیں۔ اُن کا فریب بہت جلد کھل جاتا ہے اور اُن کی دغابازی اُن کو قابلِ نفرت بنا دیتی ہے۔ لیکن

کہیں اگر وہ مستقبل کا حال در اصل بتائے ہو سکتے تو ہم اُن سے اور بھی زیادہ نفرت کرتے، کیونکہ اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ آیندہ کیا ہونے والا ہی تو اُس کی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے۔ آنے والی بدنصیبیاں معلوم کرکے وہ ابھی سے کڑھنے لگے اور اپنی موجودہ خوش نصیبیوں سے بھی لطف نہ اُٹھا سکے، کیونکہ اُن کا خاتمہ ہر وقت اُس کی نگاہ کے سامنے رہے گا لاعلمی انسان کی شادمانی کے لئے لازمی ہی اور یہ ہم کو ماننا پڑیگا کہ انسان زیادہ تر اس شرط کو بخوبی پوری کرتا ہی۔ خود اپنے متعلق قریب قریب اور دوسروں کی بابت تو قطعاً ہمیں کچھ علم نہیں ہوتا۔ جہالت سے ہمیں سکون حاصل ہوتا ہی اور جھوٹ سے سکھ۔ ("دیوتا پیاسے ہیں" ص ۳)

انسان کی بیچارگی

بھلائی انسان میں فطرتاً موجود نہیں ہوتی نہ اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے حق میں کیا بھلا ہی، کیونکہ وہ نہ تو اپنی فطرت سے واقف ہوتا ہی اور نہ اپنی قسمت سے آگاہ۔ جس چیز کو وہ مفید سمجھتا ہے بہت ممکن ہی کہ وہ مضر ہو۔ وہ اپنے لئے مناسب چیزوں کا انتخاب نہیں کرسکتا کیونکہ وہ جانتا ہی نہیں کہ اُس کی ضروریات کیا ہیں۔ وہ تو ایک شیرخوار بچہ کی طرح ہی جو جنگل میں بیٹھا (بلا ڈونا) بین مائل دودھ سمجھکر چاٹ رہا ہو اُسے کیا خبر کہ یہ دھتورے کا دودھ زہر ہے۔ ("حضرت کلیر کا کنواں" ص ۱۰)

انسانی تہذیب

میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہی کہ انسان فطرتاً نیک ہے۔ میری رائے میں تو وہ اپنی اولیں حالت یعنی بربریت کو بدقت اور بہت آہستہ آہستہ چھوڑ رہا ہے۔ وہ عدل اور نیکی کی تنظیم کی بڑی زبردست کوششیں کرتا ہے، مگر ایسا عدل جس کا کوئی بھروسہ نہیں اور نیکی ایسی کہ جس کے وجود کا بھی یقین نہیں۔ اُس وقت کو ابھی ایک زمانہ درکار ہی جب انسان حلیم الطبع ہو جائے گا اور ایک دوسرے کا بہی خواہ۔ وہ زمانہ ابھی دور ہی جب انسان آپس میں لڑائیاں لڑنا چھوڑ دیں گے اور جنگی تصویریں مخرب اخلاق اور شرمناک چیزیں خیال کیجائیں گی اور چھپائی جایا کریں گی۔ میرے خیال میں تو ابھی بہت دنوں تشدد کا راج قائم رہے گا، ابھی بہت دنوں تک قومیں ذرا ذرا بات پر ایک دوسرے کو نوچتی پھاڑتی رہیں گی، ابھی بہت دنوں تک خود ایک ہی قوم کے لوگ زندگی کی ضروریات بجائے آپس میں برابر برابر بانٹنے کے نہایت جوش سے ایک دوسرے کے مُنہ سے چھینتے رہیں گے۔ مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی خیال ہی کہ جوں جوں انسان کی تنگی اور مصیبت میں کمی ہوتی

ہے تو اُس کی جنگجوئی اور درندگی میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ اقتصادی ترقی سے رسوم میں تھوڑی بہت اصلاح رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتی ہے مجھے تو ایک ماہر علم نباتات کے اس دعوے سے اتفاق ہے کہ کانٹے دار جھاڑیاں hawthorn اگر خشک اور سخت زمین سے نکال کر تر اور نرم زمین میں بو دی جائیں تو اُن میں کانٹوں کی جگہ پھول کھلنے لگیں

("بیرزیرے صاحب پیرس میں" ص ۲۴۱)

سبب اور نتیجہ

ہے کوئی جو سبب اور نتیجہ کے اُلجھاؤ کو کبھی سلجھا سکے؟ ہے کوئی جو کسی کام کے کرتے وقت کہہ سکے "مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں"؟

("بلتھزر" ص ۱۴۲)

تغیر

ہر تغیر و تبدل سے خواہ وہ کتنا ہی ہماری حسب مدعا کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ رنج ضرور ہوتا ہے کیونکہ جو کچھ بھی ہم ترک کرتے ہیں وہ ہمارا ایک جزو ہوتا ہے۔ ایک زندگی ختم کر کے ہی ہم دوسری زندگی شروع کر سکتے ہیں۔

("سلویسٹر بونار کا جرم" ص ۳۱۷)

انسان کی مختلف شخصیتیں

ہر شخص مختلف آدمیوں کی نظر میں ایک جدا انسان ہوتا ہے، جتنے دیکھنے والے اتنی ہی اُس کی مختلف شخصیتیں۔ اس خیال کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی عورت کبھی دو مردوں کی نہیں رہی ہے۔

("سرخ سوسن" ص ۳۱۵)

تنقید

فلسفہ اور تاریخ کی طرح تنقید بھی ایک قسم کی رومان ہے جس سے واقف کار اور چھان بین کرنے والے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور رومان کسی قسم کی بھی ہو اگر ٹھیک سمجھی جائے تو طرح آپ بیتی ہوتی ہے۔ اچھا نقاد وہی ہوتا ہے جو اُن واقعات اور کیفیات کو بیان کرے جو شاہکاروں کے ہجوم میں اُس کی روح پر گزرے ہوں۔

جس طرح کوئی خارجی حسن کاری (آرٹ) نہیں ہو سکتی اُسی طرح کوئی خارجی تنقید بھی نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ

بزعم خود پسندی یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے کئے ہوئے کاموں، اپنی بنائی ہوئی چیزوں میں سوائے اپنی شخصیت کے کچھ اور بھی پیش کرتے ہیں وہ ایک نہایت ہی غلط فلسفہ کا شکار ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کبھی اپنی شخصیت کی چار دیواری کے باہر نکلتا ہی نہیں۔ ہماری سب سے بڑی مصیبتوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اگر ہمیں زمین اور آسمان کو ایک نظر کسی مکھی کی آنکھوں سے دیکھنے یا قدرت کو ایک بار کسی بن مانس کے سادہ اور سپاٹ دماغ سے سمجھنے کا موقع مل جائے تو اس کے عوض ہم کیا کچھ نہ دے ڈالیں۔ میری رائے میں ہمارے لئے بہترین صورت یہی ہے کہ ہم اپنی اس وحشت ناک حالت کا خندہ پیشانی سے اعتراف کرلیں اور یہ مان لیں کہ جب کبھی بھی ہم اپنے آپ کو خاموش نہیں رکھ سکتے تو ہم خود اپنی ہی باتیں کرتے ہیں۔

("ادبی زندگی" جلد ۲ صـ ۱۷۶)

تشدد کا جواب

سچے معنوں میں حق اسی میں ہے کہ انسان اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔ شرع پاک ہونی ہے تو محبت ہی سے! انصاف ہے تو فراخدلی میں۔ زبردستی کا جواب زبردستی سے دینا ہرگز مناسب نہیں ہے کیونکہ جنگ لڑنے والوں کو جنگ ہی کا سبق سکھاتی ہے اور یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ لڑائی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ البتہ اگر تشدد کا جواب نرمی سے دیا جائے تو تشدد کرنے والا اپنے مخالف سے سہارا نہ پاکر خود ہی بیٹھ جائے گا۔

("حضرت کلبر کا کنواں" صـ ۲۰)

تارے

چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو فطری طور پر پھول اور تارے توڑنے کی خواہش ہوتی ہے۔ مگر تارے توڑے جانے پر راضی نہیں ہوتے اور لڑکیوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ دنیا میں کچھ خواہشات ایسی بھی ہوتی ہیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں۔

("پیٹر فوزیٹر" صـ ۲۰)
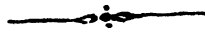
دیوانے

سید علی سردار جعفری حزیں
متعلم اُردو (آنرز)

افراد:-

ملکہ طلیطلہ

جولین	ایک فوجی افسر
کیٹس	ایک پاگل یہودی
ڈانڈلو	ملکہ کا غلام

دو فوجی سپاہی

دیوانے

قصرِ شاہی۔ ملکہ کا کمرہ۔ کھڑکی
میں سے چاند دکھائی دیتا ہے

ملکہ:۔ آج پورا چاند ہے۔

جولین:۔ ہاں۔

ملکہ:۔ اور کل آدھا چاند تھا۔

جولین:۔ ہاں۔

ملکہ:۔ چاند معلوم ہوتا ہے جیسے کسی جوان عورت کا جنازہ۔ اس پر کیسا حزن برس رہا ہے۔

جولین:۔ جیسے کسی ملکہ کا جنازہ۔ اس پر وقار بھی برس رہا ہے۔

ملکہ:۔ نہیں کسی ملکہ کا جنازہ نہیں۔ کسی شہزادی کا جنازہ۔

جولین:۔ ہاں۔ میرا یہی مطلب ہے۔

ملکہ:۔ میں کہتی ہوں کسی شہزادی کا جنازہ۔ ملکہ تو صرف میں ہی ہوں۔

جولین:۔ اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ ملکہ تو صرف میری بہن ہی ہے۔

ملکہ:۔ لیکن تم تو میرے فوجی سردار ہو۔

جولین:۔ کیا بھائی نہیں؟

ملکہ:۔ ہاں۔ ہاں۔ بھائی بھی لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم میرے فوجی سردار ہو۔

جولین:۔ اس میں کیا شک ہے!

ملکہ:۔ چاند بالکل عریاں ہے۔

جولین:۔ نہیں ملکہ۔ یہ ایک حسن عریاں ہے۔

ملکہ :- جو میں کہتی ہوں وہ کہو۔

جولین :- کہئے۔

ملکہ :- کہو چاند بالکل عریاں ہے۔

جولین :- چاند بالکل عریاں ہے۔

ملکہ :- اس کا سینہ عریاں ہے۔

جولین :- اس کا سینہ عریاں ہے۔

ملکہ :- اور اس کا نظارہ بھی عریاں ہے۔

جولین :- اور اس کا نظارہ بھی عریاں ہے۔

ملکہ :- (ڈانڈلو کی طرف دیکھ کر) کھڑکی پر پردہ ڈال دو۔ (ڈانڈلو باریک پردہ کو گھسیٹ دیتا ہے)

پہلا سپاہی :- ملکہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

دوسرا سپاہی :- ہاں۔ جیسے خالی صراحی۔

پہلا سپاہی :- اس کا چہرہ کتنا پھیکا معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا سپاہی :- ہاں۔ باسی چاند کی طرح۔

پہلا سپاہی :- اس وقت اس کے چہرے پر بالکل نمک نہیں۔

دوسرا :- وہ اپنے بھائی جولین کے سامنے ایسی ہی ہو جاتی ہے۔

پہلا :- کیوں ؟

دوسرا :- وہ ملکہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

پہلا :- شادی !؟

دوسرا :- ہاں شادی ! لیکن ملکہ کو مردوں سے نفرت ہے۔

ملکہ :- کیوں جولین میں خوبصورت ہوں ؟

جولین :- بیحد۔

ملکہ:- دنیا میں کوئی میری برابر خوبصورت نہیں۔

جولین:- دنیا میں کوئی تیری برابر خوبصورت نہیں۔

ملکہ:- نہیں کوئی مرد بھی اتنا خوبصورت نہیں۔ جولین۔ تم بھی اتنے خوبصورت نہیں ہو۔

جولین:- کیا تم اسی لئے مجھ سے شادی نہیں کرتیں۔

ملکہ:- مجھے مردوں سے نفرت ہے۔

جولین:- تمہیں مجھ سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔

ملکہ:- تو کیا میں تم سے شادی کروں۔

جولین:- بھائی سے زیادہ بہن پر کس کا حق ہو سکتا ہے۔

ملکہ:- مگر یہ کیسے ممکن ہے؟

جولین:- (آنکھیں جھپکا کے) کیوں؟

ملکہ:- میں طلیطلہ کی ملکہ ہوں اور تم ایک فوجی افسر۔ ملکہ کی شادی بادشاہ سے ہونی چاہیئے۔

جولین:- جب تم مجھ سے شادی کر لوگی تو میں یہاں کا بادشاہ ہو جاؤنگا۔

ملکہ:- اسی لئے تو میں شادی نہیں کرتی۔ تم یہاں کے بادشاہ بننا چاہتے ہو۔

پہلا سپاہی:- دیکھو ملکہ کا چہرہ پھر سُرخ ہو گیا۔

دوسرا سپاہی:- صقلیہ کی شراب کی طرح۔

جولین:- اور تم اسی طرح ملکہ رہو گی۔

ملکہ:- تم میرے اختیارات چھین لینا چاہتے ہو۔

جولین:- نہیں ملکہ۔

ملکہ:- تم مجھ سے اس لئے شادی نہیں کر رہے ہو کہ میں خوبصورت ہوں۔ تمام طلیطلہ میں سب سے زیادہ خوبصورت! بلکہ تم یہ چاہتے ہو کہ میری سلطنت پر قابض ہو جاؤ۔ مجھ پر قابض ہو جاؤ۔ میرے حسن پر قابض ہو جاؤ۔ میرے شباب پر قابض ہو جاؤ۔ میں تم سے ہرگز شادی نہیں کرونگی........ میں کسی مرد سے شادی

نہیں کروں گی۔ عورت کو اختیار ہے کہ وہ شادی کرے یا نہ کرے۔

جولین:۔ لیکن ملکہ یہ تو بتاؤ پھر عورت اور مرد کی دنیا میں کیا ضرورت ہے؟

ملکہ:۔ مرد بڑا ظالم ہوتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ عورت پر قبضہ کر لینے کے بعد کبھی نہیں چھوڑتا۔ وہ اس باز کی طرح ہے جو خوبصورت قمری کو اپنے پنجوں میں پکڑ لینے کے بعد اسکے پر و بال نوچ ڈالتا ہے۔ اس کا گوشت کھا لیتا ہے۔

پہلا سپاہی:۔ ہم تو اس ملکہ سے پریشان ہو گئے۔

دوسرا سپاہی:۔ کسی سے شادی ہی نہیں کرتی۔ سلطنت کے کام اگر عورت ہی کر لیا کرتی تو پھر مرد پیدا ہی نہ ہوتے۔

پہلا:۔ اس کو کسی طرح مار کے جولین کو بادشاہ بنا لیا جائے۔

دوسرا:۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ڈانڈلو ہمیں کھا جائے گا۔

ملکہ:۔ مرد اس چڑیا کی طرح ہے جو اپنے انڈوں کی حفاظت صرف اسی وقت تک کرتی ہے جب تک ان میں سے بچے نہیں نکل آتے۔ مرد اس پیاسے کی طرح ہے جو پانی کو محض پیاس بجھانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ بچے ہوئے پانی کو پھینک دیتا ہے۔ مرد عورت کو کلی کی طرح مسل ڈالتا ہے۔ میں شادی نہیں کرونگی۔

جولین:۔ ملکہ۔ مرد عورت کو کلی سمجھ کر مسلتا نہیں ہے بلکہ پھول سمجھ کر سونگھتا ہے۔

ملکہ:۔ پھول! تم مجھے پھول سمجھتے ہو؟ پھول تو پریشان کلی کو کہتے ہیں۔ پھول تو شکستہ دل غنچے کی ایک شکل ہے پھول تو کلی کے حسن کی آخری بہار کا نام ہے۔ میں پھول نہیں۔ میں ایک کلی ہوں۔ میری تمام نزہتیں میرے سینہ میں پوشیدہ ہیں۔ تم ان نزہتوں کو چرا لینا چاہتے ہو۔ تم مجھے اپنے سینے سے لگاؤ گے۔ مجھے بھینچو گے۔ مجھے پیار کرو گے۔ اور میری تمام پاکیزگی۔ ساری دوشیزگی برباد ہو جائے گی۔ میں شادی نہیں کرونگی۔

(ملکہ کی نگاہ یکایک سڑک پر جاتے ہوئے کیٹس پر پڑ جاتی ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر سامنے سے گزر رہا ہے۔

ملکہ:۔ (قصر کے نیچے سڑک پر اشارہ کر کے) یہ کون جا رہا ہے؟

جولین:۔ مجھے خبر نہیں۔

ڈانڈلو:۔ ملکہ یہ طلیطلہ کا ایک پاگل یہودی ہے۔

ملکہ :- پاگل یہودی ! سب یہودی پاگل ہوتے ہیں۔ وہ کسی ایسے خدا کو مانتے ہیں جسے انہوں نے کبھی نہیں دیکھا اور پھر اس سے ڈرتے بھی ہیں۔

جولین :- (غلام کی طرف طیش سے دیکھ کر) اسے فوراً یہاں سے نکال دو۔ یہ ان دیکھی چیزوں پر اعتقاد رکھتا ہے۔

ملکہ :- (تحکمانہ لہجے میں) نہیں۔ اسے یہاں بلا لو۔

جولین :- یہ پاگل ہے۔

ملکہ :- تم بھی تو پاگل ہو۔ پھول کی خوشبوئیں چرانا چاہتے ہو۔ کیا یہ پاگل پن نہیں ؟

ڈانڈلو :- ملکہ وہ یہودی ہے۔ اس کا نام کیٹس ہے۔

ملکہ :- تو بھی تو یہودی ہے۔

ڈانڈلو :- میں یہودی نہیں ہوں۔ میں تو ملکہ کا غلام ہوں۔

ملکہ :- اچھے اسے یہاں بلا لو۔

جولین :- ہرگز نہیں !

ملکہ :- تم خاموش ہو جاؤ۔

جولین :- نہیں وہ یہاں نہیں آ سکتا۔

ملکہ :- (سپاہیوں کی طرف دیکھ کے) اس پاگل کتے کو اپنی ڈھالوں سے کچل ڈالو۔

(سپاہی بڑھتے ہیں اور جولین کو اپنی ڈھالوں کے نیچے رکھ لیتے ہیں)

جولین :- (ڈھالوں کے نیچے سے خوشامدانہ آواز میں) ملکہ میں اس یہودی کو یہاں بلا لاؤں گا۔

ملکہ :- ڈانڈلو۔ اس یہودی کو یہاں لے آؤ۔ (ڈانڈلو چلا جاتا ہے)

ملکہ :- سپاہیو جولین کا سر اپنی تلوار سے جدا کر دو۔

پہلا سپاہی :- ملکہ وہ ہماری ڈھال کے نیچے ہے۔

دوسرا سپاہی :- ہم اسے دبا کے مار ڈالیں گے۔

ملکہ :- تم دونوں جاکر اس یہودی کو بہت جلد یہاں لے آؤ۔ میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

پہلا سپاہی:۔ اور جولین؟

ملکہ:۔ اسے ڈھالوں کے نیچے پڑا رہنے دو۔ (سپاہی چلے جاتے ہیں اور ان کے جاتے ہی جولین ڈھالوں کے نیچے سے نکل کر بھاگ جاتا ہے)

ملکہ:۔ (ڈھالوں کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتی ہے) تجھ میں اتنی بھی قوت نہیں کہ ان ڈھالوں کو سرکا کے باہر نکل سکے۔ تو ایک ملکہ کو کیسے گود میں لے سکتا ہے۔ تو ان ڈھالوں کے اندر اوندھے منہ پڑا ہے اور پھر چاہتا ہے کہ طلیطلہ کی ملکہ تیرے سینے سے چپٹ جائے اور تیرے اس منہ کو چومے اور اس منہ سے پھر چومی جائے جو اس وقت زمین کو چوم رہا ہے۔ ابھی تلوار تیرا گلا چومے گی اور بجائے میرے تجھ سے سیاہ موت ہم آغوش ہوگی اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ کسی ملکہ سے محبت کرنا کیسا ہے میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں اور تو مجھ سے لپٹتا ہے میں تجھے کتے کی طرح دھتکار دیتی ہوں مگر تو ہے کہ ....

(سپاہی یہودی کو لیکر حاضر ہوتے ہیں۔ ملکہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو جاتی ہے)

ملکہ:۔ (یہودی کی طرف دیکھ کر) تو آ گیا۔ تیرا کیا نام ہے۔

یہودی:۔ میرا کوئی نام نہیں۔

ڈانڈلو:۔ اس کا نام کیٹس ہے۔

ملکہ:۔ اس کا نام کیٹس ہے! جتنا یہ خود حسین ہے اتنا ہی پیارا اس کا نام بھی ہے (کیٹس کی طرف دیکھ کر) کیٹس!

ڈانڈلو:۔ اسے جانے دیجئے۔ یہ پاگل ہے۔

پہلا سپاہی:۔ ملکہ اس پر عاشق ہو گئی ہے۔

دوسرا سپاہی:۔ اسی لئے تو جولین منع کرتا تھا۔

پہلا سپاہی:۔ جولین ڈھالوں کے نیچے سے نکل گیا۔

دوسرا:۔ جانے دو۔ ملکہ پاگل ہے۔

ملکہ:۔ کیٹس!

کیٹس:۔ طلیطلہ کے محل میں عورت حکومت نہیں کر سکتی۔

پہلا سپاہی :- اس کی شامت آئی ہے۔

دوسرا :- بیچارہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔

ملکہ :- (مسکرا کر) کیٹس! تو کتنا حسین ہے۔

کیٹس :- عورت کو ہر مرد حسین نظر آتا ہے۔

ملکہ :- میں جولین سے نفرت کرتی ہوں۔

کیٹس :- میں اسے نہیں جانتا۔

ملکہ :- مگر تو جولین سے کتنا مختلف ہے۔

کیٹس :- تو تاریک غار کی طرف جا رہی ہے۔

ملکہ :- میں تجھ سے محبت کر سکتی ہوں۔

کیٹس :- لیکن میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔

ملکہ :- کیٹس! میں تجھ سے محبت کرتی ہوں۔

کیٹس :- سیاہ آندھیاں چل رہی ہیں۔

ملکہ :- تو کیا کہہ رہا ہے۔

کیٹس :- تو اس سانپ کی طرح ہے جو کینچلی میں لپٹا ہوا ہو۔

ملکہ :- آہ!

ڈانڈلو :- ملکہ تو چمیلی کی نازک شاخ ہے۔ بادام کی پھوٹی ہوئی تازہ کونپل اور یہ پاگل ہے۔

ملکہ :- میں تجھ سے محبت کرتی ہوں کیٹس!

ڈانڈلو :- تو صندل کی سفید شاخ ہے ملکہ اور یہ سیاہ افعی۔

ملکہ :- آہ! کیٹس تو کتنا خوبصورت ہے۔

ڈانڈلو :- ملکہ تو ایک نوجوان نئی نئی پرواز کرنے والی قمری ہے جس کے پروں سے پاکیزہ ہوا نکلتی ہے اور یہ یہودی۔

ملکہ :- آہ! کیٹس تیرے بال کتنے خوبصورت ہیں۔

ڈانڈلو:۔ ملکہ تو بنفشہ کی ایک نیم خوابیدہ کلی ہے اور کیٹس وہ تیز ہوا ہے جو۔۔۔۔۔۔۔۔

ملکہ:۔ آہ! تیرے سیاہ گھونگھر والے بال۔

ڈانڈلو:۔ ملکہ تو ایک کنج حنا ہے اور۔۔۔۔۔۔۔۔

ملکہ:۔ تو کتنا لاغر ہے۔ زمانے کا سلوک تیرے ساتھ بڑا ظالمانہ ہے۔ (کیٹس گھبرا کے ادھر اُدھر دیکھتا ہے)

ملکہ:۔ وقت کے پنجے کیسی بیرحمی سے انسان کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ تو بھی تو انسان ہے۔ فرشتہ تو نہیں! جس طرح ہوا برف کو پگھلا دیتی ہے دنیا کے تفکرات نے شاید تجھے گھلا دیا ہے۔ لیکن میں تجھے ان سے آزاد کر سکتی ہوں۔

کیٹس:۔ ہاں! تو مجھے آزاد کر سکتی ہے؟ (ہنستا ہے)

ملکہ:۔ تجھے یقین نہیں آتا۔ جیسے میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔

ڈانڈلو:۔ تو سچ کہہ رہی ہے ملکہ۔

ملکہ:۔ جس طرح کلی سے اس کی نکہتیں لپٹی رہتی ہیں۔ اسی طرح میں تجھ سے لپٹنا چاہتی ہوں۔

کیٹس:۔ تو موت سے کیوں نہیں لپٹ جاتی۔

ملکہ:۔ جب میں چھوٹی سی تھی ایک دن صبح کو میں چشمے کے کنارے سو گئی تھی۔ سبزہ میرے نیچے تھا اور میرے اوپر جھکی ہوئی انگور کی بیل مجھ پر اپنے خاموش بوسے برسا رہی تھی۔ میں نے اس دن خواب میں ایک شکل دیکھی تھی۔ کیٹس وہ تیری شکل تھی۔ آج تو مجھے مل گیا۔ آہ میں کب سے تیرے لئے بیتاب تھی۔ آ۔ اور مجھ سے لپٹ جا۔

کیٹس:۔ تو کیوں اتنی بیتاب ہے؟ (تمسخر آمیز لہجے میں)

ملکہ:۔ میں کیوں اتنی بیتاب ہوں؟ ستارے نورِ سحر سے ہمکنار ہونے کے لئے فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ رات بھر اس امید میں چمکتے ہیں کہ سپیدۂ سحری میں گم ہو جائیں۔ دوشیزۂ مغرب کو پہلو میں لینے کے لئے سورج دن بھر کی لمبی مسافت طے کرتا ہے۔ شام چاند کو اپنی آغوش میں گھسیٹ لینے کے لئے صبح سے اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ شب دنیا کو اپنے پہلو میں سلا لینے کے لئے سیہ روئی تک کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے۔ جب دنیا کی ہر چیز ذوقِ ہمکناری

سے بیتاب ہے جب کائنات کا ہر ذرّہ کسی میں جذب ہو جانے کے لئے اپنی ہستی مٹا دینے کو تیار ہے تو پھر میں تجھ میں گم ہو جانے کی تمنا کیوں نہ کروں؟ آہ! میری روح تیری روح میں تحلیل ہو جانا چاہتی ہے۔ کیٹس مجھے اپنے سینے سے لگا لے۔

کیٹس:۔ تو میں کیا کروں؟

ملکہ:۔ تو میرے قریب آجا۔

کیٹس:۔ میں ڈرتا ہوں۔

ملکہ:۔ کس سے۔

کیٹس:۔ تجھ سے! تو چمیلی کی ایک گھنی شاخ ہے جس کے نیچے سانپ نے انڈے دئے ہوں۔

ملکہ:۔ آہ! کیٹس تیرے ہونٹ کتنے سرخ ہیں۔ میں انہیں چوموں گی۔

کیٹس:۔ تو اب موت کے ہونٹ چومے گی۔

ملکہ:۔ آہ! تیرا یوکلپٹس کی طرح سفید اور سیدھا قد!

ڈانڈلو:۔ ملکہ . . . .

ملکہ:۔ تیری رفتار! آہ میں نے ابھی تجھے قصر کے نیچے چلتے ہوئے دیکھا تھا۔

ڈانڈلو:۔ ملکہ تیرے لئے یہ زیبا نہیں ہے۔

ملکہ:۔ آہ! تیری رفتار گویا کسی بہترین نظم کی سلاست اور روانی۔

ڈانڈلو۔ ملکہ آج کی رات کتنی خوشگوار ہے۔ ایسی رومانوی راتیں کم ہوا کرتی ہیں۔

ملکہ:۔ ہاں واقعی ایسی رومانوی صورتیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ کیٹس! تو چاند سے زیادہ پاکیزہ ہے۔

کیٹس:۔ اور تو اس کے سینے کے داغ سے زیادہ نجس ہے۔

ملکہ:۔ آہ! تیری آنکھیں۔ جیسے بنفشہ کی کلیوں پر برف جم گئی ہو اور وہ اس کے بوجھ سے جھک گئی ہوں تیرے پپوٹے تیری خوبصورت آنکھوں پر اسی طرح جھکے ہوئے ہیں۔

کیٹس:۔ اور تو ان کلیوں پر اپنے سفید جذبات کی برف اور جما دینا چاہتی ہے۔ کیوں؟

ملکہ:۔ آہ! تیرے ہونٹ کتنے سُرخ ہیں۔ شباب کی طرح سُرخ۔ مجھے انہیں چوم لینے دے۔ صرف ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار

کیٹس:۔ طلیطلہ میں زلزلہ آ رہا ہے۔

ملکہ:۔ تیرے سُرخ ہونٹ! یہ شاخ مرجاں معلوم ہوتے ہیں۔ رنگین۔ آہ! رنگین شاخ مرجاں جنہیں ماہی گیر نیلے پانی میں سے نکال لاتے ہیں تیرے ہونٹ سرخ ہیں قسطالہ کی کھنچی ہوئی شراب بھی اتنی سُرخ نہیں ہوتی...... طوطے کی چونچ بھی اتنی زیادہ سُرخ نہیں ہوتی۔ ہاں۔ یہ لعل ہیں مگر وہ سخت ہوتے ہیں پتھر کی طرح سخت۔ نہیں۔ لعل پتھر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن تیرے ہونٹ نرم ہیں اور گرمیوں کی دوپہر میں کھلنے والے گلاب سے زیادہ سُرخ۔ آہ! سُرخ اور ان کے نیچے تیرے سفید دانتوں کی قطار۔ معلوم ہوتا ہے کہ انار کے دانے سفید ہوگئے ہیں۔ اُف یہ سُرخی؟ کتنی تیز! تیز جتنی قرنا کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز بھی نہیں ہوتی۔ یقیناً تو نے انہیں خون سے رنگا ہے۔ کبوتر کا خون ہوگا شاید؟ مگر نہیں خون سے رنگے ہوئے ہونٹوں میں یہ نزاکت یہ سادگی۔ اور یہ نرمی کہاں سے آئی۔ آہ! میں نے ابھی تک تیرے ہونٹوں کو چھوا نہیں ہے لیکن سمجھتی ہوں کہ یہ نرم ہونگے۔ کسی حسین عورت کے بازوؤں سے زیادہ نرم....... نرم کسی کنواری لڑکی کے ہونٹوں سے بھی زیادہ اور یہ گرم بھی ہیں۔ مجھے انہیں ایک بار چوم لینے دے۔

کیٹس:۔ (خود ہی) یہ عورت دیوانی ہوگئی ہے۔

پہلا سپاہی:۔ اس یہودی کو کون دیوانہ کہتا ہے۔

دوسرا:۔ اس سے زیادہ دیوانگی اور کیا ہوگی کہ ملکہ اس پر عاشق ہوگئی ہے اور یہ التفات بھی نہیں کرتا۔

ملکہ:۔ کیٹس! تو کتنا سخت دل ہے۔ بلّوس بلّور بھی اتنا سخت نہیں ہوتا اور ہاں تو خود بھی تو اس سے زیادہ سفید اور صاف ہے۔ مگر یہ تیرے سرخ ہونٹ نہیں میرے سینے کی آگ کے شعلے ہیں۔ میں ان کی پرستش کروں گی اُف! یہ سرخ ہونٹ جیسے دودھ میں دو باریک باریک سرخ ڈورے ڈال دئے گئے ہوں۔ انار کی وہ قرمزی کلیاں بھی اتنی سُرخ نہیں ہوتیں جو سبز باغوں میں پھولتی ہیں۔ آہ! کتنا گہرا رنگ ہے سرخ! میری امیدوں سے زیادہ۔

کیٹس:۔ (ابروؤں پر بل پڑ جاتا ہے) تیری امیدیں کہیں تجھے جلا نہ دیں۔ لوہا زیادہ گرم ہو جانے کے بعد سفید ہو جاتا ہے

پہلا سپاہی:۔ دیکھو اس کے چہرے پر غصّے کے آثار نمایاں ہیں۔
دوسرا:۔ کہیں کوئی آفت نہ آجائے۔

ملکہ:۔ سُرخ! تیرے ہونٹ! .... میرے بھی تو ہونٹ اتنے سرخ نہیں ہیں۔ صرف تیرے ہی سرخ ہیں کیٹس! صرف تیرے ہونٹ۔ یہ سُرخی میرے دل کو کھائے جاتی ہے۔ یہ کیا تیرے تبسم کو بھی کھا گئی۔ اس نے تیرے شیریں تبسم کو نگل ہی لیا۔ آہ تو بتا تا کیوں نہیں؟ .... اچھا مت بتا کہ تیری ہنسی کیا ہوئی۔ مت مُسکرا اپنے ابروؤں پر ایک نہیں کئی کئی بل ڈال لے اور میرے پاس چلا آ .... آ میرے پیارے میں اس آتش گویا ۔نہیں یہ خاموش ہے۔ اس آتش خاموش کو چوموں گی۔ آ۔ تو میرے قریب آ۔

کیٹس:۔ ....

ملکہ:۔ آہ! تو جنبش کیوں نہیں کرتا۔ کیا تو کوئی ہاتھی دانت کا مجسّمہ ہے جس کے سر پر آبنوس کا تاج پہنا دیا گیا ہو؟ کیا تو کوئی سنگ مرمر کی مورت ہے جس کے سر میں سنگِ موسیٰ کا سیاہ طرّہ لگا ہو؟ یا تو وہ خاموش صبح ہے جس کے سر پر سیاہ آسمان منڈلا رہا ہو؟ یا تو وہ مبہوت چاند ہے جس میں ابھی آدھا گہن لگا ہو؟

کیٹس:۔ ہاں میں ایک بت ہوں۔ مجھے سنگِ حیرت سے تراش کر بنایا گیا ہے۔
پہلا سپاہی:۔ ملکہ دیوانی ہوگئی ہے۔ ایک راہ چلتے ہوئے یہودی پر مر رہی ہے۔
دوسرا سپاہی:۔ اور جولین کو ہمیشہ دھتکار دیتی ہے۔
پہلا سپاہی:۔ وہ بڑی چالاک ہے سمجھتی ہے جولین سلطنت پر قابض ہو جائے گا۔
دوسرا سپاہی:۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار۔
ملکہ:۔ کیٹس تیرا چہرہ اداس کیوں ہے۔ آ۔ میں تیری اُداسی کو خوشی سے بدل دوں گی۔ میں تیرے منہ کو ایک مرتبہ چوموں گی۔ بس ایک دفعہ۔ پھر دیکھ لیجو کہ تو کتنا بشاش ہو جاتا ہے۔ میں تجھے اس سلطنت کا بادشاہ بنا سکتی ہوں۔

(سپاہی حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں)

کیٹس:۔ ہاں۔ جب انسان پاگل ہو جاتا ہے تو ایسی ہی باتیں کرنے لگتا ہے۔

(ڈانڈلو غصّے سے کیٹس کی طرف دیکھتا ہے)

پہلا سپاہی :- آؤ کیٹس ہی کو نہ بادشاہ بنالیں۔ اس خودکام ملکہ سے چھٹکارہ ملے۔

دوسرا سپاہی :- یہ یہودی ہے! تم آستین میں سانپ پالنا چاہتے ہو!؟

ملکہ :- آہ! تو باسی چاند کی طرح اُداس ہے۔

کیٹس :- فاحشہ تیرے گناہوں کا کفارہ ممکن نہیں ہے۔

ملکہ :- تو رخصت ہونے والی شام کی طرح اداس ہے۔

کیٹس :- اور تیری گفتگو پرانی شراب کا ابال ہے۔

ملکہ :- تو تھکے ہوئے دن کی طرح اُداس ہے۔

کیٹس :- ہاں اُداس ہوں۔ پھر تجھے کیا۔

ملکہ :- کیٹس!

(کیٹس گھور کے دیکھتا ہے)

ملکہ :- آ میں تجھے اپنی آرزوؤں کی طرح اپنے سینے سے لگا لوں۔

کیٹس :- ....

ملکہ :- آ جس طرح چاندنی اپنے دامن میں رات کی سیاہی کو چھپا لیتی ہے میں تجھے اپنے دل میں چھپا لوں۔

کیٹس :- ....

ملکہ :- مگر تو بولتا کیوں نہیں ہے تجھے کیا ہو گیا؟

کیٹس :- ....

ملکہ :- تو ابھی تک بول رہا تھا پھر چپ کیوں ہو گیا۔ تیرے تکلم میں ایک لذت ہے۔ تیری آواز میں ایک موسیقی ہے۔ آہ! بول۔ پھر بول۔ اپنی شیریں آواز میں۔ جیسے کوئی حسین چشمہ خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں گنگنا رہا ہو۔ تو چاہے زہر اگل چاہے پھول برسا۔ لیکن بول۔ خدا کے لئے بول۔

کیٹس :- ....

ملکہ :- کیا تو یونان کے صنم کدوں میں کوئی کیوپڈ کا بت ہے؟ ـــــ آہ نہیں ـــــ وہ تو اندھا ہے۔ مگر تیری سیاہ

آنکھیں۔ آہ۔ یہ وحشت خیز آنکھیں! مجھے ان سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

پہلا سپاہی: ۔ ملکہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔

دوسرا سپاہی: ۔ پاگل ہی جو ٹھہری۔

پہلا سپاہی: ۔ مگر کیٹس کو سب پاگل کیوں کہتے ہیں؟ وہ تو بڑے ہوش کی باتیں کر رہا ہے۔

دوسرا سپاہی: ۔ وہ بالکل ہوش کی باتیں نہیں کر رہا ہے جو کچھ کہتا ہے سب مہمل۔ وہ بالکل پاگل ہے۔ ملکہ سے زیادہ پاگل

ملکہ: ۔ آہ! تیری سیاہ آنکھیں! دو تاریک کنوئیں اور اُن میں کالی لوڑیاں . . . .

کیٹس: ۔ کیوں بیکار بک رہی ہے۔

ملکہ: ۔ اُف یہ اندھی نہیں ہیں۔ یہ اپنے گھونگٹ کی اوٹ سے دیکھتی ہیں ——— دیکھتی ہیں اور دیکھ کے اندھی بنتی ہیں جیسے تیرے کان ہر سنی ہوئی بات کو اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ لیکن میں تو صرف تیرے پتلے پتلے ہونٹوں پر مرتی ہوں

کیٹس: ۔ تو پھر مر کیوں نہیں جاتی۔ تیرا وجود سلطنت اور اہل سلطنت کے لئے ایک عذاب ہے۔

پہلا سپاہی: ۔ اسے موت نہیں آسکتی۔

دوسرا سپاہی: ۔ تو اسے مار ڈال جولین کو بادشاہ بنالیں گے۔

پہلا سپاہی: ۔ تو ہی کیوں نہیں اس کا خاتمہ کر دیتا۔

دوسرا سپاہی: ۔ میں؟ ——— مجھے تو ڈر لگتا ہے یہ کوئی معمولی عورت تو ہے نہیں۔ ملکہ ہے۔ ملکہ۔

پہلا سپاہی: ۔ ہاں ملکہ کا مارنا بڑا خطرناک کام ہے۔

دوسرا سپاہی: ۔ یہی تو میں کہتا ہوں۔ خطرناک ہی نہیں بلکہ . . . . ملکہ کو ماروں؟ (کانپ کے) مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔

کیٹس: ۔ (قہقہہ لگاتا ہے) سنہری ناگن نہ پالی جاسکتی ہے اور نہ ماری ہی جاسکتی ہے۔

ملکہ: ۔ میں تیرے ہونٹوں کو ضرور چوموں گی ——— میں اسی پر بس نہیں کروں گی بلکہ تجھے میں خود تھپکیاں دیدے کے سلایا کروں گی ——— سلایا کروں گی اور پھر تیری پوجا کیا کرونگی، اپنی خوابیدہ تمنا سمجھ کر میں تجھے پوجونگی۔

کیٹس: ۔ تو فضا میں اپنے ناپاک تنفس سے کیوں زہر پھیلا رہی ہے؟ اپنی بے باک گفتگو کو کسی اور وقت کے لئے

رکھ چھوڑ۔

ملکہ :- دیکھ تو بچوّں کی سی ضد کر رہا ہے۔ مچل رہا ہے میں تجھے مناتی ہوں اور تو نہیں مانتا ۔آ۔ تو میرے قریب آ۔ بھولے بچےّ کی طرح اپنا سر میری آغوش میں رکھدے میں تجھے جی بھر کے چوم لوں اور اپنا جی ٹھنڈا کر لوں۔

کیٹس :- مجھے ؟ (آنکھیں نکال کے) چومے گی ؟ ! اور تو ؟ ؟ (حقارت کی ہنسی ہنستا ہے) اچھا آ ــــــ لیکن قبل اس کے کہ تو مجھے یا میرے ہونٹوں کو چومے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ (کیٹس جانے لگتا ہے)

ملکہ :- (سپاہیوں سے) اسے روک لو۔ مت جانے دو۔

(سپاہی راستہ روک لیتے ہیں)

کیٹس :- یہ کیا مصیبت ہے ! ؟

ملکہ :- میں انہیں جی بھر کے چوموں گی ــــــ چوموں گی۔ آہ ان ہونٹوں کو! ان باریک لبوں کو جو ایک سرخ لکیر معلوم ہوتے ہیں۔ برف پر خون کا کوئی قطرہ بھی ٹپک جانے کے بعد اتنا سُرخ نہیں ہوتا جتنے یہ تیرے ہونٹ ہیں میں کوئی تیری سرخی تو نہیں چھین لوں گی۔ تیرے ہونٹوں کی نزاکت تو نہیں لیلوں گی۔ مجھے تو صرف انہیں چومنے کی تمنا ہے۔ آہ! ابھے انہیں چوم لینے دے۔ ظالم تو کتنا بے درد ہے! مگر کچھ پروا نہیں۔ میں تیرے منہ کو ضرور چوموں گی۔ ضرور کیٹس اس آئینہ کو جس پر سُرخ خراش پڑگئی ہے۔ تو اپنی آنکھیں بند کر کے میرے سینے پر اپنا سر رکھدے اور مجھے اپنے ہونٹوں کو جی بھر کے چوم لینے دے ــــــ چوم لینے دے ان ہونٹوں کو جو قمری کے پیروں سے زیادہ سُرخ ہیں۔ ہندوستانی شاما کے نغموں سے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ جن میں اس نوعریاں سے زیادہ حدّت اور گرمی ہے جو محفل میں اپنی گرم گفتاری دکھاتے دکھاتے خود ہی جل کے فنا ہو جاتی ہے۔ آہ! ان میں اس موسیقار کے نغموں سے بھی زیادہ گرمی ہے جو عرب کے ریگستان میں اپنے نغموں کی حدّت اور تپش سے اپنے پروں میں آگ لگا لیتا ہے۔

کیٹس :- (دل ہی دل میں) کمبخت کتنی چرب زبان ہے۔

ملکہ :- آہ! پھر میں تیرے لبوں کو سرخ موسیقار ہی کیوں نہ کہوں ؟

کیٹس :- ملکہ تو جل جائے گی۔

ملکہ:۔ آہ میں جل ہی رہی ہوں۔ میں نے جب سے تجھے خواب میں دیکھا ہے آج سے سولہ سال پہلے جب میں ایک چھوٹی سی گڑیا تھی آہ تب ہی سے، ہاں اسی وقت سے جب سے میں نے تجھے خواب کے دھندلکے میں اپنی نظروں میں اس طرح تحلیل ہوتے دیکھا ہے جس طرح سورج کی سرخی دور اُفق میں نیلی پہاڑیوں کے پیچھے آسمان کے رنگ میں تحلیل ہوجاتی ہے، اس زمانہ سے میں اپنے سینے میں ایک دبی ہوئی چنگاری محسوس کرتی ہوں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ وہ چنگاری ایک شعلہ کی صورت میں بھڑک اُٹھے ——— بھڑک اُٹھے اور مجھے جلا کر خاکستر کردے۔ ظالم ہو دی وہ دبی ہوئی آگ صرف تیرے سینے کی گرمی سے شعلہ زن ہو سکتی ہے۔ (تیز نگاہوں سے کیٹس کی طرف دیکھتی ہے)

کیٹس:۔ آہ! تو کیوں اپنی نگاہوں کی نکیلی سنانوں کو میرے دل میں گڑائے دیرہی ہے۔ (منہ پھیر لیتا ہے)

ملکہ:۔ مگر میں تیرے ہونٹوں کو ضرور چوموں گی۔

پہلا سپاہی:۔ آخر کیٹس کو کیوں اتنی ضد ہے۔

دوسرا:۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔

پہلا سپاہی:۔ وہ اس ملک کا بادشاہ بن سکتا ہے۔

دوسرا:۔ ہاں اور کیا۔ وہ بادشاہ بن سکتا ہے لیکن نہیں بننا چاہتا۔ اس وقت طلیطلہ کی سلطنت اس کے سامنے مسکرا رہی ہے اور وہ اُدھر توجہ بھی نہیں کرتا۔

پہلا سپاہی:۔ وہ شاید سلطنت پسند نہیں کرتا۔

دوسرا سپاہی:۔ نہیں۔ یہ صرف اس کا پاگل پن ہے دیوانوں کے بھی سینگ ہوتے ہیں۔

پہلا سپاہی:۔ اور ملکہ بھی تو دیوانی ہے۔

دوسرا:۔ ہاں ہاں۔ دونوں دیوانے ہیں۔ (آسمان پر ابر چھا جاتا ہے)

ملکہ:۔ سن کیٹس! میں تجھ سے شادی کروں گی۔

کیٹس:۔ شادی ؟ ایک جائز گناہ!

ملکہ:۔ میں نے اپنے بھائی جولین سے شادی نہیں کی لیکن ....

پکاسو   ماں اور بچہ   ۱۹۰۱

کیٹس :- (آنکھیں پھاڑ کے) بھائی سے شادی!؟
ملکہ :- ہاں اپنے سگے بھائی کو میں نے دھتکار دیا۔ دیکھ وہ ڈھالوں کے نیچے پڑا ہوا ہے۔ مگر میں تجھے کیا کہوں جو اس وقت مجھے دھتکار رہا ہے۔
کیٹس :- لعنت ہے ایسی ہوسناک عورت پر۔
پہلا سپاہی :- یہ یہودی کیا کہہ رہا ہے؟
دوسرا سپاہی :- نہ معلوم اس کا کیا مطلب ہے۔
پہلا سپاہی :- عورت مرد کے لئے ہے اور مرد عورت کے لئے۔ بھائی بہن۔ باپ بیٹی سب ایک دوسرے کے لئے ہیں
دوسرا سپاہی :- ہاں میرا اور میری ماں کا باپ ایک ہی ہے۔
پہلا سپاہی :- اور میں نے بھی اپنی ماں سے شادی کر لی ہے۔ ابھی پرسوں ہی تو وہ میرے ساتھ شراب سے نہائی ہے۔
کیٹس :- آہ! ...... اے الیاس کے خدا۔ یہ لوگ کونسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ جہاں ماں۔ بہن۔ بیوی۔ بیٹی کسی میں کچھ فرق ہی نہیں ہے۔
دوسرا سپاہی :- سنو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ انہیں باتوں سے سب اسے دیوانہ کہتے ہیں۔
پہلا سپاہی :- مگر کوئی یہودی اپنی ماں بہنوں سے شادی نہیں کرنا چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں۔ ان کے سینوں میں دل ہی نہیں ہوتا۔
دوسرا سپاہی :- میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ اپنے خدا کو چھوڑ کے کیٹس الیاس کے خدا کو پکار رہا تھا۔
پہلا سپاہی :- تمہیں نہیں معلوم۔ الیاس کے خدا میں یہودیوں کے خدا سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔
دوسرا سپاہی :- تمہیں خبر بھی ہے الیاس کسے کہتے ہیں۔
پہلا سپاہی :- کیوں نہیں۔ جس کے خدا کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں اسے الیاس کہتے ہیں اور ان یہودیوں کا خدا تو بالکل بے دست و پا ہے۔
دوسرا سپاہی :- اچھا اس نے جب ہی الیاس کے خدا کو آواز ......
ملکہ :- (سپاہیوں کی طرف دیکھ کر) تم دونوں کیوں بک رہے ہو؟ میں کیٹس کے ساتھ شادی کرونگی (کیٹس کی طرف

دیکھ کر) کیٹس مجھے اپنا منہ چومنے دے۔

کیٹس :۔ شاید تیری ماں بھی ایسی ہی بدکار تھی۔

ملکہ :۔ ہاں تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری ماں نے بھی اتنے سرخ ہونٹ نہیں دیکھے۔ جولین کہا کرتا ہی کہ میرے باپ کے ہونٹ بہت سرخ تھے۔ مگر میں نہیں مانتی۔ آہ! تیرے ہونٹ کیسے سُرخ ہیں!

(بادل زور سے گرجتے ہیں اور ملکہ سہم کر پیچھے ہٹ جاتی ہی)

کیٹس :۔ ملکہ تیری ہوسناکیوں پر آسمان غضبناک ہو رہا ہی۔ دیکھ بادل کتنے زور سے چنگھاڑ رہے ہیں۔

ملکہ :۔ انہیں چنگھاڑنے دو۔ ان کی چنگھاڑ اتنی ڈراؤنی نہیں ہی جتنے فرحناک تیرے ہونٹ ہیں۔ آہ! تیرے سُرخ اور باریک ہونٹ!!

کیٹس :۔ کاش تیری تر زبانی دعاؤں کے لئے ہوتی۔

ملکہ :۔ ظالم کیٹس! تیرے سُرخ سرخ ہونٹ۔ یہ گلابی نہیں ہیں۔ یہ لال نہیں ہیں۔ اور نہ یہ نارنجی ہیں۔ یہ نہ تو قرمزی ہیں اور نہ ارغوانی۔ یہ تو سرخ ہیں سرخ اور ساتھ ہی نہایت باریک۔ کوئی چابک دست سے چابکدست سنگتراش بھی اپنے عقیقوں کو اتنا باریک نہیں چھانٹ سکتا۔ یہ گلاب کی سرخ پنکھڑیاں ہیں۔ عرب کے نیلگوں کبوتر کی سرخ آنکھیں! خونی!! آہ وہ آنکھیں بھی اتنی سرخ نہیں ہوتیں۔ اور ان کے باریک ڈوروں سے زیادہ باریک تیرے لب ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ نگاہیں ڈورے ڈالتی ہیں مگر اس وقت مجھ پر تو تیرے لب ڈورے ڈال رہے ہیں...... یہ لب نہیں ہیں بلکہ کپک کی آنکھوں کی گرد کے حلقے ہیں جو سرخ ہوتے ہیں اور باریک۔ مجھے ان لبوں کو چوم لینے دے ——— آہ! چوم لینے دے!!......

(یکایک بجلی چمکی اور ملکہ نے ایک چیخ ماری)

کیٹس :۔ تو اس بجلی سے ڈرتی ہی اور اس سے نہیں ڈرتی جس کا یہ تازیانہ ہے!؟

ملکہ :۔ لیکن یہ تازیانہ بھی تیرے ہونٹوں کی برابر سرخ نہیں ہی۔

کیٹس :۔ آہ! (آسمان کی طرف دیکھ کر) اس عورت کی گفتگو کتنی بیہودہ ہے۔ (ملکہ سے مخاطب ہو کر) تیری اس ہرزہ سرائی کا نتیجہ ....

ملکہ:- اچھا تو مجھے اپنے لب نہیں چومنے دیتا۔ اپنا منہ نہیں چومنے دیتا۔ کیا میں تیرے بال بھی نہیں چوم سکتی؟.......
کیوں؟ اس میں کیا ہرج ہے؟ کسی بھیگی ہوئی رات کا بوسہ لینا تڑپتے ہوئے دل کے سکون کا باعث ہے۔ میں
تیرے لمبے لمبے بالوں میں اپنا منہ چھپالوں گی ـــــ چھپالوں گی اور ان کی نمی سے اپنی آگ بجھالوں گی۔
کیٹس:- ابھی تو اپنے دل کی چنگاری کو شعلہ زن کرنے کی تمنا تھی اور اب تو اسے بجھانا چاہتی ہے۔ اتنی ہی دیر میں گھبرا گئی
ملکہ:- میں نہیں گھبرائی۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ یہ آگ بھڑکے ـــــ بھڑکے اور بجھ جائے اور پھر ایک نئے طریقے
سے بھڑک اُٹھے۔ جیسے زخم محبت کا لطف اس میں ہے کہ وہ مندمل ہو کر پھر رسنے لگے ـــــ وہ رسے اور پھر
اس کے اندمال کے سامان مہیا ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح میرے سینے کی آتشِ عشق کو بھڑک کے بجھ جانا
چاہئے اور بجھ کے دوبارہ بھڑک اُٹھنا چاہیئے۔
کیٹس:- تیری آگ ابھی بھڑکی کہ نہیں؟
ملکہ:- آہ! وہ ابھی نہیں بھڑکی۔ وہ ابھی تک ایک دبی ہوئی چنگاری ہے۔ لیکن تیرے آتشیں لبوں سے بھڑک سکتی
ہے اور بجھ سکتی ہے تیری صندلی گردن پر پیچ و تاب کھانے والے سیاہ افعیوں سے جو میرے زخم دل کے لئے
سوادِ مشک کا اثر رکھتے ہیں۔
کیٹس:- (گردن ہلاتا ہے) ہاں!
ملکہ:- کیٹس میں نے کبھی سفید سرو نہیں دیکھا۔
کیٹس:- سرو چوبیست ناتراشیدہ۔
ملکہ:- میں نے کبھی سفید چاند کے گرد سیاہ ہالہ نہیں دیکھا۔
کیٹس:- ہاں چاند کو بچھو نگل لیتا ہے۔ تو بھی مجھے نگل لینا چاہتی ہے۔
ملکہ:- میں نے کبھی چمیلی میں سرخ پھول کھلتے نہیں دیکھا۔
کیٹس:- چمیلی میں شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔
ملکہ:- لیکن تیرا قد ایک سفید سرو ہے۔ تیرے بال چاند کے گرد سیاہ ہالہ اور تیرے ہونٹ چمیلی کا سرخ پھول ہیں
کیٹس:- تیری بینائی میں فرق آگیا ہے۔

پہلا سپاہی :- دونوں کیسی بے معنی گفتگو کر رہے ہیں۔

دوسرا سپاہی :- دونوں کے دماغ خراب ہیں۔

ملکہ :- میری ماں کہا کرتی تھی کہ "ایک مرتبہ ایک شخص مجھے مانگ لے گیا تھا۔ وہ اتنا سفید تھا کہ جب میں اس کا خیال کرتی ہوں تو سفید پڑ جاتی ہوں۔ اس کے بال اتنے کالے تھے کہ میں نے برسات کی اندھیری رات بھی اتنی سیاہ نہیں دیکھی! اور اس کے ہونٹ"؟ وہ کہتی تھی کہ "سویرے میرے تمام رخسارے سرخ ہو گئے تھے" مگر مجھے اس کا بالکل اعتبار نہیں۔ کسی کے ہونٹ اتنے سرخ نہیں ہو سکتے۔ لیکن تیرے ہونٹ اس سے بھی زیادہ سُرخ ہیں۔

کیٹس :- کیا بک رہی ہو بیحیا ماں کی بیحیا لڑکی۔ عورت بھی کوئی ایسی چیز ہی جو عاریتاً دیدی جائے۔

ملکہ :- ہاں دیدیتے ہیں۔ عاریتاً۔ اسی لئے تو میں نے اب تک شادی نہیں کی کہ مرد مجھ پر بلاؤں کی طرح منڈلائیں گے وہ مجھ پر قبضہ کرلیں گے۔

کیٹس :- جو لڑکی خود دوسروں پر بلاؤں کی طرح منڈلائے اس پر کوئی نہیں منڈلاتا تو خود ہی ایک بلائے بدرماں ہی پھر بلاؤں سے ڈرتی کیوں ہی؟

ملکہ :- لیکن میں تجھ سے شادی کر سکتی ہوں اس لئے کہ تو مجھے کسی دوسرے کے حوالے نہیں کرے گا اور اگر تیرا کوئی دوست تجھ سے مجھے مانگے گا بھی تو میں منع نہیں کرونگی۔

کیٹس :- (گھبرا کر) کس سے پالا پڑا ہے! ؟

ملکہ :- لیکن تیرے ہونٹ کتنے سرخ ہیں۔ کبھی شفق بھی ان سے زیادہ سُرخی لیکر نہ پھولی ہوگی۔

پہلا سپاہی :- ملکہ اس وقت کتنے جوش میں ہی دیکھو وہ کانپ رہی ہی۔

دوسرا سپاہی :- ہاں بید کی طرح۔

پہلا سپاہی :- نہیں بلکہ قیصر کی لچکدار تلوار کی طرح اس وقت وہ غصّے میں بھرے ہوئی ہی۔

ملکہ :- کیٹس! تو گھبرا گھبرا کے ادھر اُدھر دیکھتا ہی۔ تیری آنکھیں جیسے دو بیتاب روحیں آہ! ان آنکھوں سے شعلہ باری مت کر۔ تو کبھی اپنی نظر میرے چہرے پر گڑا دیتا ہی اور کبھی سپاہیوں کی طرف دیکھنے لگتا ہی۔ تو بس ایک

طرف دیکھ۔ آہ! تیری آنکھوں کی جنبش معلوم ہوتا ہے جیسے دو بجلیاں تڑپ گئیں۔ میں تجھے تیری جوانی کا واسطہ دیتی ہوں کہ تو اپنی گوندتی ہوئی بجلیوں سے میرے نخلِ محبت کو مت جلا۔ آہ! میں پھنکی جا رہی ہوں جیسے سورج کی تیز کرنیں شبنم کے دل میں در آتی ہیں۔ تیری نگاہیں میرے دل میں چبھی جا رہی ہیں۔ جیسے کوئی بیدرد بھونرا کسی کلی کے نازک لبوں سے اس کی حیات کا رس چوس لیتا ہے تیری نگاہوں کے تیز نشتر میرے دل کی ——— نہیں میری محبت کے پھول کی تمام لطافتیں چھیننے لئے جا رہی ہیں۔

کیٹس:۔ کلی کب تمنا کرتی ہے کہ بھونرا اس کے اوپر آکر بھنبھنائے۔

ملکہ:۔ لیکن میں تو چاہتی ہوں کہ تو مجھے اپنے سفید بازوؤں کے حلقے میں لے لے ——— تو مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لے اور میں تجھے اپنی محبت کے اچھوتے بوسوں کے حلقے میں لے لوں۔

کیٹس:۔ کاش میں آسمان ہوتا کہ تیرے اوپر پھٹ پڑتا۔ کوئی بجلی ہوتا کہ تیرے وجود سے دنیا کو پاک کر دیتا۔

ملکہ:۔ آہ! تو بجلی ہے مگر میرے پاس سے کترا کے گزر جاتا ہے۔

کیٹس:۔ اچھا لے میں خاموش کھڑا ہوں۔ تو خود ہی میرے پاس آ جا۔ (زیر لب مسکراتا ہے)

(ملکہ آگے بڑھتی ہے اور کیٹس پیچھے سرک جاتا ہے)

ملکہ:۔ کیٹس تو مجھے ایک مرتبہ ان سرخ تیتریوں کو چوم لینے دے۔ آہ! چوم لینے دے۔ تو نہیں چومنے دیگا؟ .... میں انہیں زبردستی چوموں گی (ملکہ جوش میں آگے بڑھتی ہے) ہاں! ان پر لانے چنار سے زیادہ آتش بار ——— نہیں ——— آتش خیز لبوں کو (پھر خود بخود رک جاتی ہے) تیرے ہونٹوں کو کیٹس! ان سرخ ہونٹوں کو تیرے!! ....کوئی اچھے سے اچھا مصور بھی اپنے بہترین قلم کار میں ان ہونٹوں سے بہتر خط نہیں لگا سکتا وہ نہ تو اتنا سرخ ہوگا اور نہ اتنا باریک۔ وہ بھدا ہوگا اور بھونڈا۔

ڈانڈلو:۔ ملکہ پانی برس رہا ہے۔ وہ دیکھئے بادل کے سرک جانے سے چاند بھی دکھائی دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی دوشیزہ نہا رہی ہو۔

ملکہ:۔ ہاں چاند بھی اتنا پاکیزہ نہیں کیٹس! تو اس چاند سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔ وہ کبھی تو زہرہ کے ساتھ نظر آتا ہے اور کبھی مشتری کے پہلو میں دکھائی دیتا ہے مگر.........

کیٹس :- اور تو زہرہ اور مشتری سے بھی زیادہ نجس ہے۔

ملکہ :- لیکن تیرے بال تجھ سے بھی زیادہ پاکیزہ ہیں اور تیرے ہونٹ تیرے بالوں کی پاکیزگی سے بھی زیادہ حسین۔ آہ! یہ کتنے خوبصورت ہیں۔ اُف! تیرے لب!! بس یہ اس قابل ہیں کہ ہر وقت چومے جائیں۔ ہر وقت چومے جائیں۔ مگر تیرے منہ کو چومنے کے لئے میں اتنے سرخ لب کہاں سے لاؤں۔

کیٹس :- موت تیرے لبوں کو اس سے بھی زیادہ سرخ بنا دے گی۔

ملکہ :- شاید تو اس سے زہر اُگل رہا ہے؟

کیٹس :- !!...................

ملکہ :- ؟ ؟

کیٹس :- !!!

ملکہ :- ؟ ؟ ؟

کیٹس :- !!!!!

ملکہ :- تو بولتا کیوں نہیں ہے؟ کس لئے خاموش ہو گیا چاند کے سینۂ عریاں کی طرح ساکت!۔ برف کی سخت چٹان کی طرح چپ!

پہلا سپاہی :- چاند کانپ رہا ہے۔

دوسرا سپاہی :- نہیں پانی برسنے سے وہ کانپتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

پہلا سپاہی :- نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ضرور مر جائے گا۔

دوسرا سپاہی :- ایسی بات مت کہو۔ کیٹس چاہے مر جائے لیکن ملکہ کو نہیں مرنا چاہیئے۔

پہلا سپاہی :- مرنا تو ملکہ ہی کو چاہیئے۔ وہ ہم لوگوں کے لئے ایک وبال ہے۔

دوسرا سپاہی :- تم بُری فال منہ سے نکال رہے ہو۔

پہلا سپاہی :- میں نے جب کبھی چاند کو کانپتے ہوئے دیکھا ہے ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت آئی ہے۔

دوسرا سپاہی :- یہ تمہارا خیال ہے۔

پہلا سپاہی :- خیال نہیں یہ واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ چاند کا پنا تھا تو میرا باپ مرلیا۔ دوسری مرتبہ میں نے چاند کو کانپتے ہو دیکھا تو (ملکہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ بلا ہمارے گلے پڑی۔ اور اب میں پھر دیکھ رہا ہوں کہ چاند کانپ رہا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ اس ملکہ ہی کو مرجانا چاہیئے۔

دوسرا سپاہی :- تم بڑے وہمی ہو۔

ملکہ :- میں اپنے لبوں کا مقابلہ تیرے لبوں سے نہیں کرسکتی مگر یاد رکھ ــــــ یاد رکھ کیٹس میرے ہونٹ تیرے ہونٹوں کی طرح باریک اور نازک تو نہیں ہیں۔ البتہ تجھے میرے لبوں کے سوا اپنے سے بہتر ہونٹ کہیں نہ ملیں گے۔ گلاب کی کلیوں کے پاس بھی میرے سے ہونٹ نہیں۔

ڈانڈلو :- ملکہ ہوا بڑی اچھی چل رہی ہے۔ اس کے جھونکے اس وقت بڑے خوشگوار ہیں۔ کیا میں کھڑکی کا پردہ سرکا دوں؟

ملکہ :- تو چاہے میرے ہونٹوں کو چوم چاہے مت چوم مگر مجھے اپنے یاقوتی لبوں کو چوم لینے دے ــــــ اپنے سرخ ہونٹوں کو جن سے زیادہ سُرخ آتش کدوں میں بلند ہونے والی آگ کے مقدس شعلے بھی نہیں ہیں۔ اس کے انگارے بھی اتنے سرخ نہیں ہیں۔

کیٹس :- کیا طلیطلہ کی مائیں ایسی ہی لڑکیاں پیدا کرتی ہیں۔

ملکہ :- آہ! تلواروں کی وہ شعلہ افشانی بھی اتنی سرخ نہیں ہے جس سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تلوار جو خون میں ڈوب کر نکلی ہو اس کی باریک اور سرخ دھار بھی تیرے ہونٹوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

کیٹس :- آہ! ہوس کار ماں کی ہوس کار بیٹی خاموش ہو جا۔ کیوں شور مچا رہی ہے۔ سارے محل کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔

ملکہ :- جنگلوں میں پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے بیر بھی اتنے سرخ نہیں ہوتے اور نہ اپنی بیل پر پکنے والی گھونچیاں ہی اتنی سرخ ہو سکتی ہیں۔ وہ کمبخت تو سیاہ رو ہوتی ہیں۔ صرف ان کی پشت سرخ ہوتی ہے۔ جیسے کسی مجرم کی پشت جس کے کوڑے لگائے گئے ہوں۔

کیٹس :- جب موت کا آتشیں تازیانہ تیرے گناہوں کی سزا تجھے دیگا تو تیری پشت اس مجرم کی بھی پشت سے زیادہ لال ہو جائے گی۔

ملکہ :- برسات میں پیدا ہو جانے والی سرخ بیر بہوٹی جو سفید چاولوں کو بھی سرخ کر دیتی ہے۔ آہ! اس پر بھی وہ مخملی نزاکت

اور سرخی نہیں جو تیرے ہونٹوں پر ہے۔

(ڈانڈ لوکھڑکی کا پردہ سرکا دیتا ہی۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آتا ہی۔ ملکہ جھجک کے پیچھے ہٹ جاتی ہی)

ملکہ:۔ مگر تو مجھے انہیں چومنے نہیں دیتا۔ میں چوم کے رہوں گی مجھے تو اپنے لبوں کو بس ایک بار چوم لینے دے۔

کیٹس:۔ تیری عادت بگڑ جائے گی۔ تو ہر آئے گئے کا منہ چوما کریگی۔

پہلا سپاہی:۔ اور یہ تو ملکہ کے لئے بڑے عیب کی بات ہی۔

دوسرا سپاہی:۔ معلوم ہوتا ہی کہ تم پر بھی یہودیوں کا اثر پڑ گیا ہی۔

ملکہ:۔ مگر میں تیرے ہونٹوں کو چوموں گی۔

کیٹس:۔ آہ! تو کیا بک رہی ہے؟ تو دیوانی تو نہیں ہو گئی ہے؟ میرے ہونٹوں کو چومے گی!؟ پاگل لڑکی!!

(ہنستا ہے)

ملکہ:۔ ہاں ایک مرتبہ اور! تیری ہنسی کسی شیریں ترنّم سے کم نہیں۔ ہاں اسی طرح ایک مرتبہ اور ہنس دے۔

(کیٹس اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے)

ملکہ:۔ ہنس! ہاں پھر ہنس! ایسی ہی بیباک ہنسی جیسے ابھی تو ہنسا تھا۔ غنچے بھی اس طرح نہیں مسکراتے۔ ہاں نہیں مسکراتے فطرت بھی یوں متبسّم نہیں ہوتی۔

(جولین داخل ہوتا ہی اور سپاہیوں کے پاس کھڑا ہو جاتا ہی۔ حیرت سے ملکہ کی طرف دیکھتا ہی)

جولین:۔ یہ کیوں چیخ رہی ہی۔ (فوراً کیٹس پر نگاہ پڑ جاتی ہی۔ اسے غور سے دیکھتا ہے اور گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگتا ہی)

پہلا سپاہی:۔ (چپکے سے) جولین کو پکڑ لو۔ یہ آ گیا۔

(دوسرا سپاہی آنکھوں کے اشارے سے منع کر دیتا ہی)

ملکہ:۔ میری رگوں میں دوڑنے والے خون سے زیادہ سرخ تیرے ہونٹ ہیں۔ اور شاید تیری رگوں میں بھی تیرے ہونٹوں سے زیادہ سرخ خون نہیں ہوگا۔ آہ! تیرے سُرخ ہونٹ!! میں چاہتی ہوں کہ میری تمام ہستی —— میرا شباب، میرا حسن، اور میں خود اس سرخی میں منتقل ہو جاؤں۔ تیرے سرخ لب شام کے ڈوبتے ہوئے اور صبح کے طلوع ہوتے ہوئے سورج سے بھی زیادہ سرخ ہیں۔ دیکھ مجھے ایک مرتبہ اپنے لبوں کو چوم لینے دے۔

(جولین کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے)

کیٹس :۔ کیوں مفت میں آسمان کو سر پہ اُٹھائے لیتی ہے۔

ملکہ :۔ تیرے ہونٹ نجس نہیں ہو جائیں گے!۔

جولین :۔ (سپاہیوں سے مخاطب ہو کر) یہ کیا کہہ رہی ہے۔

دوسرا سپاہی :۔ حضور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

ملکہ :۔ آہ! میں ابھی تک اتنی ہی پاک ہوں جتنے پاکیزہ تیرے لب ہیں۔ کئی سال ہوئے ایک مرتبہ صقلیہ کا شہزادہ یہاں آیا تھا۔ میری ماں نے مجھے بہت مجبور کیا کہ میں اس کی ہو جاؤں۔ لیکن میرے دل میں تو تو تھا۔ میں اس کی کیسے بن سکتی تھی۔ جب میں اس کے ساتھ شراب کے حوض میں کودی تو میں نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ اس کے بعد کسی نے مجھ سے شادی کرنے کی تمنا نہیں کی۔ پھر میرے بھائی نے مجھے اپنی آنکھوں کا شکار بنایا۔ (جولین نے شاہانہ طیش سے ملکہ کی طرف دیکھا) وہ مجھے نجس کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں مگر..........

جولین :۔ یہ میرے بارے میں گفتگو کر رہی ہے؟

پہلا سپاہی :۔ شاید۔

ملکہ :۔ ....مگر میں نے اس کا کہا نہیں مانا اور اسے ڈھالوں کے نیچے بند کرا دیا۔

جولین :۔ (مسکراتا ہے) اسے میرے جلنے کی خبر نہیں۔

کیٹس :۔ تو پھر عورت نہیں ہے ڈائن ہے۔

ملکہ :۔ سرخ! اُف تیرے ہونٹ! مجھے اپنا منہ چوم لینے دے۔ میں خود بڑھ کر چوم لیتی مگر میری ہمت نہیں پڑتی۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔ تو خود ہی میرے قریب آجا! اور مجھے اتنا موقع دیدے کہ میں اپنے لبوں کو تیرے لبوں سے پیوست کر دوں —— پیوست کر دوں اور پھر اتنے بوسے لوں، انہیں اتنا چوموں کہ ابتدائے آفرینش سے لیکر انتہائے آفرینش تک کے تمام بوسوں سے زیادہ میرے بوسوں کی تعداد ہو۔

(جولین دیوار سے سہارا لے لیتا ہے)

کیٹس :- تیرے دامن پر کتنے دھبے ہیں!؟

ملکہ :- میں انہیں چومنا چاہتی ہوں اور حدّتِ بوس سے ان کی سرخی میں اضافہ کرنا چاہتی ہوں۔ آہ اب مجھے اپنے منہ کو ایک مرتبہ چوم لینے دے۔ صرف ایک بار اپنے سرخ سرخ ہونٹوں کو جو کسی شہید کے پاک خون سے زیادہ سرخ ہیں!؟

جولین :- شہید کسے کہتے ہیں ؟

پہلا سپاہی :- یہ نیا لفظ ہے۔

دوسرا سپاہی :- اس کا کچھ مطلب ضرور ہے۔ (چہرے پر گویا انتہائی متانت پیدا کرلی)

جولین :- یہی تو میں پوچھتا ہوں۔

پہلا سپاہی :- اچھا اب مجھے یاد آگیا۔ میرے سامنے ایک دیوانے کی فصد کھولی گئی تھی۔ شاید اسے شہید کہتے ہیں۔

دوسرا سپاہی :- ہشت! شہید مرا ہوا آدمی ہوتا ہے۔

جولین :- بہت سے دیوانے فصد کھلنے کے بعد مر بھی جاتے ہیں۔

ملکہ :- کسی بے گناہ کے تابناک چہرے سے زیادہ سرخ۔

کیٹس :- پاک باتوں کا تذکرہ اپنی نجس زبان سے مت کر۔ دیوانی لڑکی!

ملکہ :- آہ! سرخ!! یہ تیرے ہونٹ!!! کیٹس تو کیوں اتنا سخت دل ہے؟

جولین :- (آہستہ سے) کیونکہ تو اتنی سخت دل میرے لئے ہے۔

ملکہ :- تیرا دل کیوں اتنا سیاہ ہے۔ سیاہ اور سخت آبنوس سے بھی زیادہ سیاہ۔

کیٹس :- ....

ملکہ :- کیا تیرے دل میں خون کا ایک بھی قطرہ نہیں ؟

جولین :- ڈانڈلو۔ شراب اور اخروٹ لاؤ۔ میری ماں نے مرتے وقت کہا تھا کہ زیادہ پریشانی میں شراب میں ڈبوئے ہوئے اخروٹ کھانے چاہئیں۔ میں اس وقت بےحد پریشان ہوں۔ میری بہن پاگل ہوگئی ہے۔ فوراً شراب لاؤ اور اخروٹ۔

ملکہ :- ہاں نہیں ہے میں جانتی ہوں نہیں ہے —— نہیں ہے کوئی قطرہ۔ ہاں سرخ خون کا کوئی قطرہ نہیں۔ تیرے بدن کے

تمام سرخ خون کا جوہر تیرے ہونٹوں میں ـــــــ ان بابیک سرخ ہونٹوں میں کھنچ آیا ہے۔ تیرے خون میں سرخی کہاں سے آئی؟

پہلا سپاہی:- ملکہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پاگلوں کا خون سفید ہوتا ہے۔

دوسرا سپاہی:- میں نے خود ایک پاگل کے اینٹ ماردی تھی اس کے سرخ خون نکلا تھا۔

پہلا سپاہی:- وہ پاگل نہیں ہوگا۔

دوسرا سپاہی:- نہیں وہ پاگل تھا۔

پہلا سپاہی:- تو پھر یہ اتفاق ہے۔

جولین:- یہ اتفاق نہیں ہے۔ خون سب کا سرخ ہوتا ہے۔

پہلا سپاہی:- جی۔ لیکن پاگلوں کا خون سفید ہوتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ لوگ کہتے ہیں فلاں شخص کا خون سفید ہو گیا ہے۔ اس سے ان کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔

جولین:- پاگلوں کا بھی خون سرخ ہی ہوتا ہے۔ دیکھو کیٹس ہی کو دیکھو اس کا بھی خون سرخ ہی ہے۔

پہلا سپاہی:- مگر آپ نے اس کا خون کہاں دیکھا؟

جولین:- وہ دیکھو اس کے ہونٹ اتنے سرخ کیوں ہیں؟ وہ زخمی تھے اس نے انہیں کھجا ڈالا ہے۔

دوسرا سپاہی:- یہی تو اس کا پاگل پن ہے۔

پہلا سپاہی:- اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔

جولین:- سب اسے دیوانہ کہتے ہیں۔

پہلا سپاہی:- میں بھی یہی جانتا تھا۔ مگر آج معلوم ہوا کہ یہ دراصل پاگل نہیں ہے۔ لوگوں نے یونہی مشہور کر دیا ہے۔

جولین:- یہ کیسے؟

پہلا سپاہی:- وہ بڑی سمجھ کی باتیں کر رہا ہے مگر ملکہ دیوانے پن کی باتیں کر رہی ہے وہ کہتی ہے "مجھے اپنے ہونٹ چوم لینے دے مجھ سے شادی کر لے" اور وہ اس کی طرف ملتفت بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بعض بعض باتیں وہ ایسی کہہ دیتا ہے جو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔

دوسرا سپاہی:۔ بس اسی لئے تو سب اسے پاگل کہتے ہیں۔

جولین:۔ (خوش ہوکر) کیا اسے معلوم ہے کہ میں ملکہ کو پیار کرتا ہوں؟ میں ملکہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا سپاہی:۔ ہاں ملکہ نے اس سے خود ہی کہا تھا۔

جولین:۔ تو میں کیٹس کو انعام دونگا۔ وہ میری بہن پر قابض نہیں ہونا چاہتا اس لئے کہ وہ میری بیوی ہونے والی ہے

کیٹس:۔ یہ کس جنگل کا جانور ہے جو اپنی بہن کو بیوی بنانا چاہتا ہے! (زور زور سے سانس لیتا ہے)

جولین۔ اس کے پاگل پن میں ذرا شک نہیں۔ یہ بالکل اپنے ہوش میں نہیں ہے۔

ملکہ:۔ تیرا خون سفید ہو گیا ہے اس میں محبت سرخی نہیں دوڑا سکتی۔ تب ہی تو تو عریاں چاند کی طرح سفید ہے آہ! ہاتھی دانت سے زیادہ سفید مجسمہ جس کے پیر سنہری ہیں۔ سر سیاہ ہے اور لب سرخ۔

دوسرا سپاہی:۔ یہ تو بڑی قیمتی چیز ہے۔

پہلا سپاہی:۔ تب ہی تو ملکہ اس پہ جان چھڑک رہی ہے۔

دوسرا سپاہی:۔ کوئی اسے چرا نہیں لیتا۔

پہلا سپاہی:۔ ملکہ کی حکومت میں چوری نہیں ہوئی۔

جولین:۔ شراب ابھی تک نہیں آئی (ڈانڈلو چاندی کے طشت میں شراب پینے کے ظروف لاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جولین اچھل پڑتا ہے، ڈانڈلو میری جوانی کو اس طشت میں اٹھائے لا رہا ہے!!

ملکہ:۔ آ، میرے قریب آ۔ اور مجھے موقع دے کہ میں تیرے لبوں کو چوموں —— چوموں ان لبوں کو جو حنا کے اثر سے بھی زیادہ سرخ ہیں۔ وہ سرخ ہی نہیں بلکہ ان میں آگ کی سی گرمی بھی ہے۔ اور میرے ہونٹ سرد ہو رہے ہیں۔ ٹھنڈے برف کی طرح۔ آہ وہ کانپ رہے ہیں۔ جاڑے کی وجہ سے تھرتھرا رہے ہیں۔ جیسے پانی کی ہلکی پھوار ان میں لرزاں ہے۔ تو میرے ہونٹوں کو اجازت دیدے کہ وہ تیرے لبوں کو چوم لیں —— چوم ہی نہیں لیں بلکہ تیرے ہونٹوں سے لپٹ کے سو جائیں۔ ہمیشہ کے لئے وہ سو جائیں۔

کیٹس:۔ یہ گناہ ہے کسی کے لبوں سے لپٹ کے سو جانا گناہ ہے۔

ملکہ:۔ گناہ؟ گناہ کسے کہتے ہیں؟ دنیا میں کوئی کام گناہ نہیں ہے اور ہر کام گناہ ہے ……….

مرد، مرد .... اچھا گناہ سہی! لیکن کس کا گناہ؟ تیرا گناہ!! تو مجھے ضرور معاف کر دے گا

کا بوسہ لے تو کیا ہرج ہی، عورت، عورت کو پیار کرے تو کیا قباحت ہے۔ اسی طرح اگر میرے لب تیرے لبوں

کو چومیں تو اس میں گناہ کیسا۔

کیٹس:- پھٹکار ہی تیری جیسی فطرت کی لڑکی پر۔

ملکہ:- ہاں بتا کیا یہ بھی گناہ ہی؟

کیٹس:- (خود ہی) کتنی جاہل ہی!

پہلا سپاہی:- ملکہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہی۔

دوسرا سپاہی:- ہاں۔

ملکہ:- میں تیرا منہ چوموں گی۔ ہاں چوموں گی کیٹس میں تیرا منہ!! نہیں نہیں تیرے سرخ لب جو کتّے کے گوشت

سے بھی زیادہ سرخ ہیں۔

جولین:- (اخروٹ کو شراب میں ڈوبتے ہوئے) ہاں انسان کا گوشت تمام جانوروں سے زیادہ سرخ ہوتا ہی۔

ملکہ:- کبوتر کے پیروں سے کہیں زیادہ سرخ! ——— گلنار ——— اس شمع کے شعلے سے زیادہ سرخ جو آتش زبان

ہو کر خاموش ہو جاتی ہی۔ یہ سرخ سرخ ہونٹ!! آہ!۔ انہیں کتنا سرخ کہوں۔ بس یوں سمجھ لے کہ سرخ رنگ

کا نام دنیا میں صرف تیرے ہونٹوں سے ہے۔

کیٹس:- یہ کمبخت آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہی۔

جولین:- اور یہ صقلیہ کی شراب بھی تو سرخ ہی۔

ملکہ:- آہ! تیرے لب اس دوشیزہ۔ اس عروس کے بدن سے بھی زیادہ سرخ ہیں جس نے صندل میں لپی ہوئی حنا

کی مالش کی ہو۔ ہاں۔ یہ اُن رخساروں سے بھی زیادہ سرخ ہیں جو شام عروسی کو حیا سے اور صبح عروسی کو

ندامت سے سُرخ ہوں آہ! یہ اس کیفیت سے بھی زیادہ سرخ ہیں جو اس شباب پر طاری ہو جاتی ہے

جو شبِ عروسی کی صبح کو مسلی ہوئی کلی معلوم ہوتا ہی۔ اس دفتر شرمندگی کی ساری شوخی تیرے ہونٹوں میں

کھنچ آئی ہے جس کی شیرازہ بندی کسی عروس کی نیچی نظریں کرتی ہیں۔ نہیں۔ تیرے ہونٹ اس سے بھی

زیادہ سرخ ہیں۔ شباب کے پہلے گناہ سے بھی زیادہ سرخ! بس تو مجھے انہیں چوم لینے دے اور میں ضرور چوموں گی۔

جولین:۔ (ایک دم سے چونک پڑتا ہے) اس دوشیزہ ملکہ کو کیا معلوم کہ شبِ عروسی کیا ہے۔

پہلا سپاہی:۔ یہ ہر عورت جانتی ہے۔

جولین:۔ ہر عورت جانتی ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ اندھا کیا جانے کہ روشنی کیا ہوتی ہے؟ دیوانے کو کیا خبر کہ ہوش کسے کہتے ہیں؟ ایک کنواری لڑکی کو کیا معلوم کہ شباب کا پہلا گناہ کیا ہے!؟ اور اگر اب دوشیزہ لڑکیاں بھی اس سے واقف ہونے لگی ہیں کہ ....

(ملکہ یکایک اپنی تقریر شروع کر دیتی ہے اور جولین آہستہ سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ اچھا میں ملکہ کو اس کے جرم کی سزا دونگا)

ملکہ:۔ ہونٹ ان موتیوں سے بھی زیادہ سرخ ہیں جو ارغوانی شراب کی تہ میں پڑے ہوئے چمک رہے ہوں۔ آہ! یہ دھوپ میں پکی ہوئی نارنگیوں سے بھی زیادہ سرخ ہیں۔ اس زبان سے بھی زیادہ سرخ جس نے خون چاٹا ہو۔ اس زخم سے بھی زیادہ سرخ جو شراب سے دھویا گیا ہو اس سنہری ساغر سے بھی زیادہ سرخ جس میں قرمزی رنگ کی شراب بھری ہو۔ آہ! سرخ تیرے ہونٹ!! تیرے اَن دیکھے خدا کے جلال سے بھی زیادہ سرخ!!!

کیٹس:۔ آہ! بدکار لڑکی کفر مت بک!

ملکہ:۔ اس کی شوکت سے بھی زیادہ سرخ!!

کیٹس:۔ میں کہتا ہوں تو اپنی ہوس میں کیوں اندھی ہوئی جا رہی ہے؟

ملکہ:۔ اس کی عظمت سے بھی زیادہ سرخ!!!۔ آہ یہ تیرے ہونٹ جنہیں میں چوموں گی۔

کیٹس:۔ شہوت پرست ملکہ کیوں کفر بک رہی ہے۔ خاموش ہو جا۔

ملکہ:۔ کیٹس! کیٹس! کفر کسے کہتے ہیں؟ میں کفر نہیں بک رہی ہوں۔

کیٹس:۔ فاحشہ عورت کیا جانے کہ کفر کسے کہتے ہیں۔

ملکہ:- میں جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔ مگر یہ کفر نہیں ہے۔ تم خود، تم اَن دیکھے اور اَن بوجھے خدا کے ماننے والو۔ تم ہی تو کہتے ہو کہ اس کی عظمت کا ثبوت یہ دینا ہے۔ مگر یہ تیرے ہونٹوں کی طرح سرخ نہیں۔

کیٹس:- چیخ رہی ہے۔ چلّا رہی ہے۔ بالکل وحشیوں کی طرح۔

ملکہ:- ہاں چیخ رہی ہوں۔ چلّا رہی ہوں بالکل وحشیوں کی طرح۔ مگر کیوں؟ ـــــــ صرف اس لئے کہ تو میرا کہا نہیں مانتا تو اپنے ہونٹوں کو بخیل کی طرح چھپاتا ہے۔ اپنے سرخ ہونٹوں کو جو اس سفید کبوتر سے بھی زیادہ سرخ ہیں جو احمریں شراب میں نہا کر نکلا ہو۔ اس بگلے سے بھی زیادہ سرخ ہیں جو خون میں لتھڑا ہوا پڑا ہو۔ سرخ ہیں آہ! اس قمری کے پیروں سے بھی زیادہ جو سرخ عقیق کے ڈھیر میں کھڑی ہو۔

کیٹس:- مفت میں گلا پھاڑ رہی ہے۔

پہلا سپاہی:- اپنے ہوش میں نہیں ہے۔

دوسرا سپاہی:- وہ بالکل پاگل ہو گئی ہے۔ دیکھو کیسی دیوانوں کی سی باتیں کر رہی ہے۔

جولین:- اور وہ ایسی باتیں کرتی کب نہیں تھی۔

ملکہ:- آہ! اس ہریل کی منقار سے بھی زیادہ سُرخ جو گولر کے سینے کو چاک کر رہا ہو۔ یہ سرخ ہیں اس شیر کے پنجوں سے بھی زیادہ جو اپنے شکار کو نوچ نوچ کے کھا رہا ہو۔ اس تیندوے کے جبڑوں سے بھی زیادہ سُرخ جس نے ابھی خون پیا ہو۔ میں چوموں گی آہ! ان سرخ ہونٹوں کو۔ میں چوموں گی۔ ضرور چوموں گی۔ تیرے آتشیں لبوں کو جو زحل سے زیادہ سُرخ ہیں۔ عطارد نے اس سے زیادہ سرخ کسی صحیفے پر اپنی مُہر نہیں لگائی ہوگی مریخ نے اس سے زیادہ سُرخ کوئی خونی منظر نہ دیکھا ہوگا۔

جولین:- (زور سے چلّاتا ہے) میری وحشت بڑھ رہی ہے۔ اس شراب اور ان اخروٹوں نے مجھے کچھ فائدہ نہیں کیا۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب کوئی مصیبت آنے والی ہوتی ہے تو اخروٹ اور شراب سے وحشت بڑھ جاتی ہے۔ ضرور کوئی بلا نازل ہوگی یقیناً ....

کیٹس:- اس خود کام ملکہ سے بڑھ کر اور کیا بلا نازل ہو سکتی ہے۔

جولین:- .... یقیناً کوئی مصیبت آئے گی اور سب اس ضدّی ملکہ کی وجہ سے (ملکہ جولین کی طرف

گھور کر دیکھتی ہے) ڈانڈلو تو کیا دیکھ رہا ہے۔ جا کر بھنے ہوئے سیب لا۔ (ڈانڈلو منہ بناتا ہوا چلا جاتا ہے)

ملکہ :- آہ! تیرے ہونٹ اس لال پرندے سے بھی زیادہ سرخ ہیں جو برف کی چٹان پر مرا ہوا پڑا ہو۔ اس سرخ دراج سے بھی زیادہ سرخ جو سفید مور سے لڑ رہا ہو۔ آہ! اس دل سے بھی زیادہ سرخ ہیں تیرے ہونٹ جو چاندی کے سفید طشت میں رکھا ہو۔ میں تیرے سرخ ہونٹوں کو چوموں گی۔

کیٹس :- چوموں گی! ؟ چوموں گی!!! ایک طوفان بپا کر رکھا ہے۔ اگر چوم سکتی ہے تو چوم کیوں نہیں لیتی (آنکھیں سکوڑ کے ملکہ کی طرف دیکھتا ہے)

ملکہ :- سرخ! آہ سرخ!! ہونٹ!!! کیٹس!!!! تیرے ہونٹ!!!! سرخ!!!!! ظالم!!!!!!

(ڈانڈلو بھنے ہوئے سیب لاتا ہے اور جولین کے سامنے رکھکر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے)

کیٹس :- ملکہ! کیٹس حاضر ہے لیکن ....

(جولین پیمانہ کو زور سے کیٹس کے منہ پر مارتا ہے اور ایک تیز قہقہہ لگاتا ہے)

ملکہ :- دیکھ تیرا خدا تجھے سزا دے رہا ہے۔ تو میرا کہا نہیں مانتا اس لئے اس نے اپنا پیمانہ تیرے منہ پر کھینچ مارا۔ میں پھر کہتی ہوں کہ سنگدل مت بن اور مجھے اپنے ہونٹوں کو چوم لینے دے۔ ایک دفعہ۔ صرف ایک بار۔ پھر میں کبھی اس کی خواہش نہ کروں گی۔ مجھے چوم لینے دے اپنے عقیقی لبوں کو۔

کیٹس :- (سپاہیوں کی طرف دیکھ کر) تم اس کمبخت سے کیسے نباہ کرتے ہو؟

(سپاہی کیٹس کا منہ دیکھ کر رہ جاتے ہیں)

ملکہ :- کیٹس تو درندہ ہے۔

(کیٹس ونیس (زہرہ) کے نیم عریاں بت سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

ملکہ :- تیرے سینے میں دل نہیں ہے۔ قدرت نے تجھے یہ سرخ ہونٹ دیکر بڑا ظلم کیا۔ مادرِ آفرینش نے بڑا ظلم کیا قسامِ ازل نے دھوکا کھایا۔ اس نے غلطی کی کہ تجھے یہ سرخ ہونٹ تو دیدئے لیکن دل نہیں دیا —— مگر نہیں تو تو سر سے پاؤں تک سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ تیرا قد چاندی کا ایک مجسمہ ہے جس پر یہ لب اس طرح چمک رہے ہیں جیسے سنگ مرمر کے بت میں لعل جڑ دیے گئے ہوں۔ دیکھ میں انہیں چومنے آتی ہوں۔ تیرے

ان سرخ لبوں نے اب مجھے دلیر بنا دیا ہے۔ (ملکہ ہاتھ پھیلا کے آگے بڑھتی ہے) ان سرخ ہونٹوں نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ اب میں انہیں زبردستی چوموں گی۔ ان وحشی تیتریوں کو جو ایران کے گلابوں کی سرخی چرا لائی ہیں

(کیٹس ملکہ کو قریب دیکھ کر ذرا سا سرک جاتا ہے۔ ملکہ اپنے جوش میں وینس کے بت سے چمٹ جاتی ہے۔ اس کے منہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتی ہے۔ اور چہرے پر بوسوں کی بوچھار کر دیتی ہے)

ملکہ:۔ آہ کتنے شیریں ہیں تیرے ہونٹ۔ نہیں نہیں۔ یہ تلخ ہیں۔ محبت تلخ ہی ہوتی ہے۔ مگر کچھ پروا نہیں یہ سرخ تو ہیں۔

(سپاہی حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں)

ملکہ:۔ چکور کی چونچ سے بھی زیادہ سرخ! تو تو کہتا تھا کہ میں اپنے ہونٹ نہ چومنے دونگا۔ اور جب میں نے تجھے اپنی گود میں پکڑ لیا تو کیسا مجھے سینہ سے لپٹا لیا ہے۔ (ایک مرتبہ پھر چوم کر) آہ! واقعی کتنے سرخ ہیں تیرے ہونٹ لیکن یہ بتا ان کی نرمی کیا ہوئی۔ ان کی گرمی کدھر گئی۔ یہ سرد کیوں پڑ گئے؟ کیٹس! بول......... آہ! بول کیٹس! اپنی میٹھی آواز میں بول؟ .... آہ! تو کیوں نہیں بولتا۔ کیا میرے بوسے شیریں نہیں ہیں؟

(جولین جھپٹ کر ملکہ کو اپنی گود میں اٹھا لیتا ہے)

جولین:۔ بالکل نہیں! تیرے بوسے بالکل شیریں نہیں ہیں۔ تو خونخوار شیرنی کی طرح ہے۔ تیرے بوسے کیسے شیریں ہو سکتے ہیں؟ دیکھ موت کے بوسے کتنے شیریں ہیں!

ملکہ:۔ مجھے چھوڑ دے جولین۔ تیرا کیا مطلب ہے؟ (جولین کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے اور سپاہی اور ڈوانڈلو جولین کی طرف تیزی سے لپکتے ہیں۔ یکایک ایک چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے جو پستی کی طرف ڈوبتی چلی جاتی ہے)

دوسرا سپاہی:۔ اس نے یہ کیا غضب کیا؟

پہلا سپاہی:۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔

دوسرا سپاہی:۔ جولین تو ملکہ سے محبت کرتا تھا۔

پہلا سپاہی:۔ ہاں! ہاں! محبت کرتا تھا لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ محبت اور نفرت میں بہت تھوڑا فرق ہے۔

جولین:۔ (قہقہہ لگا کر) ملکہ کا یہی علاج تھا۔

ڈانڈلو:۔ (جولین کے سینے میں خنجر بھونک کے) اور تیرا بھی یہی علاج ہے۔

(دونوں سپاہی آہستہ سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں)

جولین:۔ ڈانڈلو تو کتنا نمک حرام ہے۔

ڈانڈلو:۔ اس سے زیادہ نمک حلالی کون کر سکتا ہے۔ میں ملکہ کا غلام تھا تیرا نہیں میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔

جولین:۔ اچھا ....

ڈانڈلو:۔ (ایک ٹھوکر مار کے) اچھا!

(ستارے ڈوب رہے تھے۔ چاند پھیکا پڑ گیا تھا افق پر ہلکی ہلکی سرخی نمودار ہو رہی تھی اور کیٹس صبح کی دھیمی روشنی میں آہستہ آہستہ زینے سے نیچے اتر رہا تھا)

جگر پارے

(حضرت جگر مرادآبادی)

حال بھی، ماورائے حال بھی ہے
عشق ممکن بھی ہے، محال بھی ہے

پھر بھی تجھ سے ہزار شکوے ہیں
جانتا ہوں ترا خیال بھی ہے

کرتے جاتے ہیں صاف عذرِ کرم
اور پھر پرسشِ ملال بھی ہے

حسن کے ہر جمال میں پنہاں
میری رعنائیِ خیال بھی ہے

مجھ سے مطلب بھی کچھ نہیں اُن کو
اور میری ہی دیکھ بھال بھی ہے

چھائے جاتے ہیں دردِ دل بن کر
اُس پہ تاکیدِ ضبطِ حال بھی ہے

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں
کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

لاکھ رسوا سہی جگرؔ لیکن
خوش نظر بھی ہے، خوش خیال بھی ہے

(عبداللہ میاں)

روحِ نشاط

(حضرت اصغر گونڈوی)

اُف یہ میری فتادگی، اُف یہ کمالِ خستگی　　آئے وہ فرشِ خاک پر، عرش پہ جو پتا نہ دے

کیا جانوں میں حباب تھا یا عین بحر تھا　　موجوں سے کھیلتا ہوا موجوں میں مل گیا

نظّارے میں نگاہ بھی حاجب نہیں رہی　　اب وصل میں خیال بھی حائل نہیں رہا
تو نے نگاہِ لطف سے زینت عدم کو دی　　مجھکو بھی دیکھ میں کسی قابل نہیں رہا

کچھ اس انداز سے موجِ نسیمِ مشکبار آئی　　کہ اپنے پیرہن سے آج مجھکو بوئے یار آئی

حسنِ لیلیٰ ہے کہ ہو جاتا ہے سرگرمِ نمود
ورنہ دیوانے میں کچھ تھا اور نہ دیوانے میں ہے

تعلیم اور اسلامی معاشرت

خواجہ غلام السیدین بی۔اے (علیگ) ایم۔ای۔ڈی (لیڈز)

ہندوستان میں تعلیم قدیم کے نظام کو درہم و برہم ہوئے تقریباً ایک صدی ہو چکی ہے اور اس سے کچھ زیادہ عرصہ ہمارے یہاں انگریزی تعلیم کو شروع ہوئے گزرا ہے۔ تاریخ عالم میں اس زمانے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس عرصے میں دنیا میں بہت سے زبردست معاشرتی اور اقتصادی انقلابات ظہور پذیر ہوئے ہیں جنھوں نے نہ صرف مادی زندگی اور اس کے نظام کی کایا پلٹ کر دی ہے بلکہ انسانوں کے خیالات اور عقائد میں ایک تزلزل ڈال دیا ہے۔ اس کا جو اثر مغربی ممالک کی تہذیب اور تمدن پر پڑا اس سے بحث کرنے کی یہاں ضرورت اور موقع نہیں۔ لیکن ان انقلابات کی ایک مخصوص اور انوکھی صفت یہ ہے کہ انھوں نے تمام دنیا کو ایک ایسے شیرازے میں منسلک کر دیا ہے اور انحصار باہمی کو اس قدر شدید بنا دیا ہے کہ دنیا کا کوئی حصہ بھی ایسے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا جو دوسرے حصّوں میں کار فرما ہوں۔ لہٰذا ان تمام تبدیلیوں کا ردِ عمل ہمارے ملک پر بھی ہوا۔ ماہرینِ تعلیم کا فرضِ اول یہ تھا کہ وہ ان تبدیلیوں کی نوعیت کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے، ان کے اسباب اور نتائج سے بحث کرتے اور یہ معلوم کرتے کہ ان حالات میں تعلیم کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ ابتدا میں انگریزی تعلیم جن مقاصد اور اغراض سے شروع ہوئی وہ اب لوگوں کو بخوبی معلوم ہو چکے ہیں اور ان کی آنکھوں سے وہ خیرگی دور ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارے بعض پیش رووں کو اپنی تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت میں ہر چیز ناقص اور خام نظر آتی تھی اور نجات کی صورت محض یہی تھی کہ مغربی تمدن اور تعلیم کو بلا تنقید اور تمام و کمال قبول کر لیا جائے۔ لہٰذا اب قومی زندگی کے موجودہ دور میں یہ سوال نہایت شدت کے ساتھ اٹھنا چاہیئے تھا کہ ہم اس جدید تعلیم کے ذریعہ کس قسم کا نظامِ معاشرت وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اب تک صراحت کے ساتھ یہ اہم اور بنیادی مسئلہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انہیں پوری طرح اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ تعلیم اور نظامِ معاشرت کا کس قدر قریبی اور گہرا تعلق ہے اور جب تک ایک قوم اپنے سامنے کوئی معین اور واضح معاشرتی نصب العین نہ رکھے اس وقت تک وہ ایک زندہ اور اثر آفریں نظامِ تعلیم کی تشکیل نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے تعلیمی اصولوں اور طریقوں کی ہدایت کے لئے، اس کے اساتذہ کی ہمت افزائی کے لئے

کوئی بلند تخیل شمعِ راہ کا کام نہیں دیتا۔ امتحان پاس کرانا چند طلبہ کو سرکاری ملازمتوں کے لئے تیار کرنا، نوشت وخواند کو عام کرنا، یا بحد کمال قوم میں علوم کی اشاعت کے لئے سعی کرنا یہ تمام مقاصد مقابلۃً سطحی اور سرسری ہیں۔ ان میں وہ قوت متحرکہ نہیں ہے جو قوموں اور افراد میں نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوتی ہے۔ ان کی بدولت یہ ممکن ہے کہ بعض افراد ذاتی وجاہت حاصل کرسکیں، یا قوم میں بحیثیت مجموعی مادی اعتبار سے ترقی کی صورت پیدا ہو جائے لیکن قومی زندگی میں اعلیٰ اخلاقی اصولوں اور قدروں کی کارفرمائی نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم حقیقت سے بالکل ہٹی ہوئی ہے اور بجائے قومی زندگی اور معاشرت کی اصلاح اور تعمیر کرنے کے وہ ضمنی اور غیر اہم مقاصد میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اس لئے ماہرین تعلیم کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ جرأت کے ساتھ اس مسئلے پر غور کریں کہ موجودہ ناقص اور ناکمل نظام معاشرت کے بجائے کس قسم کی سوسائٹی قائم کرنا چاہئے اور اس کے قیام کے لئے کیا وسائل اور تدابیر اختیار کرنی ضروری ہیں۔ جب تک ہم اپنی تنگ نظری یا ذہنی جرأت کی کمی کی وجہ سے اس بنیادی مسئلے کو نہیں اٹھائیں گے۔ ہماری قومی تعلیم کی حیثیت ایک جسد بے روح سے بہتر نہیں ہوگی۔

تعلیم کا جو مقصد میں نے اس تمہید کے دوران میں پیش نظر رکھا ہے وہ کسی قدر صراحت کا طالب ہے کیونکہ وہ مروّجہ رسمی مفہوم تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ اگر ہم تعلیمی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ نظری اور عملی طور پر بالعموم تعلیم کا مقصد یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ انسانی تہذیب وتمدن کے تمام ورثے کو جو گزشتہ زمانوں میں حاصل ہوا ہے مناسب طریقہ پر نوخیز نسلوں کے سپرد کردے۔ یعنی وہ تمام علوم وفنون، ادب اور فلسفہ، سیاسی اور معاشرتی اصول اور روایات جو نسل انسانی نے اپنے ارتقا کے دوران میں مرتب اور مجتمع کئے ہیں ان کو نصاب تعلیم کے ذریعہ بتدریج طلبہ کے ذہن میں منتقل کردے۔ بیشک یہ ایک نہایت مفید اور ضروری خدمت ہے جس کے بغیر انسان بربریت کے دور سے گزر کر تمدن کے مدارج طے نہیں کرسکتا تھا۔ اس میں ذاتی اور نوعی تحصیلات کے تحفظ کا جذبہ اس قدر قوی ہے کہ خواہ تعلیم کا نظریہ کچھ بھی قرار دیا جائے اس کا ایک کام یہ ضرور ہوگا کہ وہ ان تحصیلات کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرے۔

لیکن یہ تعلیم کا صرف ایک پہلو ہے۔ اجتماعی زندگی کا دارومدار ایک طرف تو تمدنی اور ذہنی ورثے سے مستفید ہونے پر ہے اور دوسری طرف اس کی ترقی اور حیات کا راز اس امر میں پنہاں ہے کہ وہ مسلسل اس

ورثے کی تنقید اور تجزیہ کرتی رہے اور اس میں ان مناسب تبدیلیوں کو رائج کرے جو ضروریات زمانہ کے لحاظ سے مفید اور اہم ہوں۔ اگر سوسائٹی اور تعلیم جو سوسائٹی کے دماغ کا کام دیتی ہے، مروجہ تمدن اور اس کے تمام اصولوں اور اداروں کو تمام و کمال بغیر چون و چرا کے تسلیم کرلے اور انہیں ایک اٹل، نہ بدلنے والی چیز سمجھ کر بچوں اور نوجوانوں کو مقررہ سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرے تو اس میں رجعت پسندی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور وہ ترقی اور تخلیق پیہم کا وسیلہ نہیں بن سکتی دنیا میں ہر قسم کی علمی اور عملی ترقی کا راز ہمیشہ حریت فکر، جدت عمل میں پنہاں رہا ہے اور جیسا کہ میں آگے چل کر واضح کروں گا موجودہ زمانے میں بعض ایسی قوتیں بر سرِ کار آ گئی ہیں کہ گزشتہ تمام زمانوں سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں میں غور و فکر اور اجتہاد ذہنی کی صفات کی تربیت کی جائے تاکہ وہ زمانے کے سریع مطالبات کو پورا کر سکیں۔ اس وجہ سے تعلیم کا دوسرا اور نہایت اہم کام یہ ہے کہ وہ پیہم اس تمدنی ورثے کی تنقید اور ترتیب نو کرتی رہے۔ اپنے نصاب تعلیم اور تمام اثرات اور اداروں کے ذریعہ صرف اس کے بہترین عناصر اور قدروں کی اشاعت کرے اور تعلیم یافتہ جماعت میں یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ آزادی اور متانت کے ساتھ اس کے حسن و قبح پر نظر ڈال سکیں اور بجائے ہر چیز کو بے حس حیوانات کی طرح قبول کر لینے یا ہر چیز کو غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر مسترد کر دینے کے، قدیم اور جدید دونوں کو بہترین اصول اخلاق و عمل پر پرکھیں اور زندگی کی رہنمائی کے لئے ایسی عقل کی بہم رسانی کریں جو "ادب خوردہ دل بھی" ہو۔ یہ عقل جو شخصی اور اجتماعی مفاد دونوں کو پیش نظر رکھے گی تعلیم کے ذریعہ نہ صرف علوم و فنون کی اشاعت کرے گی اور افراد کو کسب معاش کے لئے تیار کرے گی بلکہ ایسے رجحانات اور قوتوں کو دعوت عمل دے گی جو نظام تمدن کی بنیاد زیادہ معقول اور منصفانہ اصولوں پر قائم کر سکتی ہیں۔

گزشتہ زمانوں میں آج کل کی نسبت انسانی زندگی میں تبدیلیاں زیادہ آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طریقہ پر ہوتی تھیں اور سوائے بعض نہایت انقلاب آفریں زمانوں کے مثلاً حضرت عیسیٰ یا آنحضرت کا زمانۂ بعثت جب نظام کہن لوگوں کے دیکھتے دیکھتے درہم و برہم ہو گیا تھا، بالعموم ان تبدیلیوں کی رفتار اس قدر سست تھی کہ لوگوں کو ان کے سمجھنے اور ان کی ضروریات کے مطابق اپنے خیال و عمل کو ترمیم کرنے میں چنداں دقت نہ ہوتی تھی۔ سوسائٹی کا "ہیولٰی" اپنی جگہ پر قائم تھا۔ لوگوں اور جماعتوں کی تقسیم اور امتیازات عام طور پر مسلمہ سمجھے جاتے

تے۔ زیادہ تر تبدیلیوں کا تعلق جزئیات سے ہوتا تھا بنیادی امور سے ان کو تعلق نہ تھا۔ ایسی حالت میں یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ تمدن کی محافظت کو تعلیم کا فرض اول قرار دیا جائے اور وہ اسے کم و بیش جوں کا توں آئندہ نسل کے سپرد کردے۔ لیکن گزشتہ دو سو برس میں سائنس کی ترقی نے اس مقابلۃً پرامن و پرسکون دنیا میں ہلچل مچادی ہے اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے نہ صرف ان کی مادی زندگی اور وسائل معاش میں بلکہ ان کے خیالات اور عقائد ان کے نظریوں، ان کے رسوم و روایات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ جہاں تک زندگی کے خارجی نظام کا تعلق ہے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان دو سو برس کے عرصے میں جس قدر تبدیلیاں اس میں ہوئی ہیں وہ اس سے پہلے دو ہزار برس میں بھی نہیں ہوئیں۔ ان تیز رفتار تبدیلیوں کا تقاضا یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں میں اس قسم کی صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ نئے حالات کے اقتضا کو سمجھیں اور دانش مندی کے ساتھ ان نئی قوتوں کو استعمال کرنا سیکھیں جو سائنس نے رام کی ہیں۔ سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی نے جہاں ایک طرف ہمیں یہ بتایا ہے کہ غافل جماعتیں فطرت کی اٹل اور زبردست طاقتوں کا شکار ہو جاتی ہیں وہاں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اگر ان کو سمجھ کر استعمال کیا جائے تو انسان خود اپنی تقدیر اور اپنے مستقبل کا معمار بن سکتا ہے۔ اور گویا خالقِ کائنات کا شریک کار بن کر اس دنیائے آب و گل کی تعمیر میں ایک نمایاں حصہ لے سکتا ہے۔ اگر سائنس کی حقیقت نما روشنی میں آپ عالم کے کارخانے پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی مکمل چیز نہیں ہے بلکہ ابھی ناتمام اور ناپختہ کار ہے اور خالق کائنات نے اپنی مصلحت سے اس میں یہ گنجائش رکھی ہے کہ انسان اپنی کوششوں سے اس کے نظام کو زیادہ مکمل اور زیادہ معنی خیز بنائے۔ اگر وہ اس کو ہر لحاظ سے کامل بنا دیتا تو انسانی سعی اور جدوجہد کے لئے کیا موقع رہ جاتا؟ شاید اسی نکتے کو غالب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

لہٰذا اس دور ارتقاء میں جہاں سائنس کی حرکت آفریں حکمرانی ہے ہمیں سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم جس نظام تمدن کے سائے میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ کوئی اٹل نہ بدلنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس میں بے اندازہ ترمیم اور اصلاح کی گنجائش ہے اور انسان کا ناخنِ تدبیر اس کی بہت سی ایسی گتھیاں سلجھا

سکتا ہے جن کی وجہ سے انسان صدیوں سے مختلف قسم کی محرومیوں، ناکامیوں اور مظالم کا شکار رہے ہیں۔ اگر سائنس کی قوتوں کے ساتھ اخلاق اور مذہب کے سچے اصول مشعلِ راہ بن جائیں تو ہم اس دنیا کے کہن کی جدید تعمیر عدل اور انسانیت کے اصولوں پر کر سکتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کا قرآن السعدین ہونا لازم ہے۔ مغرب نے اپنی جد وجہد کی بدولت ان دونوں چیزوں میں سے ایک چیز یعنی سائنس کو حاصل کر لیا ہے اور اس کے ذریعے اس نے تقریباً تمام عالم مادی اور اس کی زبردست قوتوں کو اپنا خادم بنا لیا ہے لیکن ان قوتوں کے استعمال میں افراد اور جماعتوں نے اصول اخلاق کی پیروی نہیں کی اور بسا اوقات ان کو تعمیر اور خدمت کے بجائے تخریب اور تظلم کا آلہ بنا لیا۔ اس کا نتیجہ ہم آج یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تمام قوتیں جو انسانی زندگی کے لئے رحمت ثابت ہو سکتی تھیں عذاب بن گئی ہیں اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں ہم آہنگی رواداری اور سلوک پیدا ہونے کے بجائے باہمی مخالفت اور کشمکش اور ظلم کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال کے :-

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے	حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے	سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت	پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس	کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟

لیکن یورپ میں جس قدر بڑے بڑے اہل فکر ہیں وہ خود اس صورت حال سے مشوش اور بیزار ہیں اور ان کی یہ خواہش اور کوشش ہے کہ وہ اس ہلاکت آفریں نظام تمدن کے بجائے کسی بہتر نظام کی بنا ڈالیں مگر ہمارے ارباب فکر و عمل کو بہ حیثیت مجموعی ابھی اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور ہماری معاشرت کی تنظیم بالقصد ہونے کے بجائے فطرت کی ان بوجھی بے جانی قوتوں کے ماتحت ہو رہی ہے۔

اگر ہم اپنے ملک کی طرف متوجہ ہو کر اس کے نظام تمدن و معاشرت پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ایک عبرت انگیز نقشہ نظر آئے گا۔ میرے خیال میں کسی سوسائٹی کی حالت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے بہترین معیار یہ ہے کہ آیا اس سوسائٹی کے تعلقات اور مراسم اصول عدل پر قائم ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی ملک یا معاشرہ علم اور دولت اور قوت اور فنون لطیفہ کے اعتبار سے معراج کمال کو بھی پہنچ جائے لیکن اس کے افراد اور جماعتوں کے تعلقات میں عدل، اخوت

اور مساوات کی کارفرمائی نہ ہو تو اس کا تمدن اور تہذیب دونوں ناقص اور ناپائدار ہیں۔ یونان کی تہذیب سے لیکر موجودہ مغربی تمدن تک تاریخ اس صداقت کی تائید کرتی ہے اور اسلام کا سب سے بڑا احسان عالم انسانیت پر یہی ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ وضاحت کے ساتھ اور عملی شکل میں اخوت، مساوات عدل کا ایک عالم گیر پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس قدر مدت گزر جانے کے بعد نہ صرف ہندوستان میں جو ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہے بلکہ خالص اسلامی ممالک میں بھی اسلام کے تمدنی نصب العین کے رخ روشن پر خود غرضی جاہ پسندی اور بے انصافی کی خاک جم گئی ہے۔ آج ہم اپنے اس ملک میں باوجود ہر قسم کی اصلاحی کوششوں کے لوگوں کو مختلف معاشری اور اقتصادی جماعتوں میں تقسیم پاتے ہیں جو ایک دوسرے کو لفظی یا معنوی اعتبار سے اچھوت سمجھتی ہیں، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق غصب کرکے اپنی قوت کو ناانصافی کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہاں دولت کو امانتِ الٰہی یا خدمت خلق کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے محض ذاتی منفعت اور اقتدار کا وسیلہ بنا لیا گیا ہے۔ اور اس کی مدد سے ہر قسم کی جائز اور ناجائز مراعات حاصل کی جاتی ہیں اور ہر قسم کے مظالم اور حق تلفیوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بے اندازہ ثروت اور ناگفتہ بہ افلاس پہلو بہ پہلو موجود ہیں یہاں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی تمام زندگی حیوانوں کی طرح محض اپنے اور اپنے مالکوں کے لئے کسب معاش کی جدوجہد میں صرف کر دیتے ہیں اور ان پر علم اور تعلیم تہذیب اور فنون لطیفہ، فرصت اور آسائش کے دروازے قطعاً بند ہیں۔ اندھی تعلیم اور مذہب کی طرف سے بے پروائی نے تعلیم یافتہ، نوکری پیشہ طبقے اور عوام میں ایسا فصل پیدا کر دیا ہے کہ ہم تھوڑے سے لوگوں کو جو مقابلۃً آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ ہماری اس فارغ البالی کی قیمت وہ تاریک زندگیاں ہیں جو ہمارے باقی تمام ابنائے جنس اور ہم وطن بسر کر رہے ہیں۔ مذہب بنی نوع انسان کی یک جہتی اور اخوت کا احساس پیدا کر سکتا تھا مگر اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہے اور تعلیم نے ایسے تخیل کی تربیت نہیں کی جو دوسروں کے اور اپنے دکھ درد کے امتیاز کو مٹا دے جو پیغمبر اسلام صلعم کے اس ارشاد کو مسلمانوں کا جزو عمل بنا دے کہ :

"اس شخص کا ایمان ہرگز پختہ نہیں جو اپنے لئے ایک چیز پسند کرتا ہے اور اپنے بھائیوں کے لئے نہیں کرتا"۔

اسی معاشری ابتری کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہمارے یہاں آج تک "شرفا" اور محنت پیشہ مزدوروں میں تفریق

اور امتیاز کیا جاتا ہے اور جس مذہب نے الکاسب حبیب اللہ کی انقلاب آفریں تعلیم دی تھی اس کے پیرو عملاً یہ سمجھتے ہیں کہ شرافت کی پہچان دولت یا سرکاری نوکری اور ہاتھ کا کام نہ کرنا ہے! گویا جو شخص جوتا بنائے وہ ذلیل ہے جو جوتا پہنے وہ شریف، جو شخص کپڑا بنے وہ ذلیل ہے جو اسے زیب تن کرے وہ شریف۔ ان تمام خلاف عقل اور خلاف عدل تفرقوں کی وجہ سے ہماری سوسائٹی کا شیرازہ بالکل منتشر ہو گیا ہے اور جب تک اس کی تنظیم جدید اس طرح نہ کی جائے کہ اس کے مختلف عناصر میں یک جہتی پیدا ہو اور امیر و غریب، عالم اور جاہل میں جو افتراق مقاصد راہ پا گیا ہے اس کا تدارک کیا جائے موجودہ صورت حال کی اصلاح نہیں ہو گی۔ اور جو خون رُلانے والا نقشہ حالی مرحوم نے اپنی نظم میں کھینچا تھا وہ جوں کا توں قائم رہے گا یعنی :۔

جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوع بشر تھا — اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی — اس دین میں اب فقر ہی باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی — منعم ہے سو مغرور ہے، مفلس سو گدا ہے
دولت ہے نہ عزت، نہ فضیلت نہ ہنر ہے — ایک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے
جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت — اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے

اس وقت بھی خواہانِ قوم و ملک اور ماہرین تعلیم کے سامنے اہم ترین مسئلہ یہی ہے کہ اس تمدن کی تعمیر نو کس طرح کی جائے جس کی بنا بقول حالی کے "پانی پر ہے"!

اس مختصر مضمون کی حدود میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں لہٰذا بہت اختصار کے ساتھ گویا بطور متن کے چند ضروری امور کی طرف اشارہ کرنا کافی ہو گا۔

پہلی بات جو اقوام مشرق کو بالعموم اور ہمیں بالخصوص طے کرنی ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہم مغربی سائنس اور اسی کے جزو لازم یعنی موجودہ صنعت و حرفت کے نظام کو قبول کریں یا مسترد۔ ایک مخلص اور ذی اثر طبقہ ملک میں ایسے لوگوں کا ہے جو اس جدید بدعت کو ترک کرنے اور زندگی کے قدیم سادہ نظام کو قائم رکھنے کی تلقین دیتا ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ یورپ میں نظام سرمایہ داری اور سائنس کی قوتوں نے کس قدر فساد اور ظلم برپا کیا ہے۔ لیکن یہ خیال

میرے نزدیک قابلِ عمل نہیں اول تو سائنس کی نئی ایجادات اور ترقیوں نے تمام دنیا کے ممالک کو اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور وابستہ کر دیا تھا کہ کوئی ملک دنیا کے عام رجحانات اور اثرات سے خود کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ مشورہ ایک شکست پسند ذہنیت پر دلالت کرتا ہے جو سائنس جیسے قابل قدر عطیۂ فطرت کو محض اس کے ضمنی خطرات سے خوف زدہ ہو کر مسترد کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ انسانی کمال اور کامرانی اس میں ہے کہ ہم سائنس کی قوتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں لیکن ان کو انسانی خدمت اور بہبود کے لیے استعمال کریں اور انہیں کے ذریعے انسانوں کو انسانوں کی چیرہ دستی اور تظلّم سے محفوظ رکھیں۔ اسلام کی مخصوص تعلیم بھی یہی ہے کہ انسان اس عالمِ آب و گل کی زندگی اور اس کی کشمکش اور جد وجہد میں پورا پورا حصہ لے اور اس کی قوتوں اور خطروں کو مردانہ وار زیر کرے کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دنیا "مایا کا جال" نہیں بلکہ مزرعۃ الآخرۃ ہے۔ اور اس کی تسخیر کا راز مطالعۂ فطرت اور فکر و تدبر میں پنہاں ہے۔ لہذا ایک سچا مسلمان کسی حالت میں بھی ترک دنیا پر قانع نہیں ہو سکتا اور اگر وہ شعارِ "ترک" اختیار کرتا ہے تو وہ جس کی شان یہ بتائی گئی ہے کہ:۔

؎ کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری!

یہاں تک اسلامی تمدن اور مغربی تمدن کا راستہ ایک ہی ہے کیونکہ اس بارے میں مغربی تمدن نے ان اصولوں سے خوشہ چینی کی ہے جو اسلام نے عرب کی سنگلاخ زمین میں بوئے تھے اور جن کے پھل پھول مصر اور ہسپانیہ شام اور بغداد کی تہذیبوں میں رونما ہوئے لیکن یہاں پہنچ کر دو راستے ہو جاتے ہیں ایک راستہ وہ ہے جس پر مغرب کے جدید تمدن کی ارتقا ہوئی ہے' وہ راستہ جو مجنونانہ خود غرضی اور باہمی رقابت کی طرف لے جاتا ہے جس میں بعض چالاک' بے اصول اور کج راہ لوگوں اور جماعتوں نے سائنس کی قوتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر باقی انسانوں کے حقوق تلف کر کے انہیں اپنا غلام بنا لیا ہے۔ دوسرا راستہ وہ ہے جو اسلام نے ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے دکھایا تھا اور جس کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مستقبل کی معاشرت کی تعمیر کامیابی کے ساتھ صرف اسی راستے پر چل کر ہو سکتی ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے کیوں ایک شکست خوردہ' معذرت آمیز انداز اختیار کر رکھا ہے جیسے وہ ایک بالکل پس ماندہ اور تہی مایہ جماعت ہوں جن کے پاس ہندوستانی تہذیب کے کیسے کے لئے کوئی

پیش بہا عطیہ نہ ہو" اور جن کے جدوجہد او تخیل کی حد پرواز یہی ہو کہ وہ دوسروں کے دسترخوان کے گرے ہوئے ٹکڑوں میں سے جتنا مل سکے جھپٹ لیں مسلمان اپنی موجودہ حالت سے خائف اور رنجیدہ ہو کر یہ بھی بھول گئے کہ وہ ایک ایسے بلیغ اور تخلیقی پیغام کے امین ہیں جس میں دنیائے جدید کی تعمیر کا بھید پنہاں ہے اور وہ تمام خصوصیات جو ایک متحرک، ترقی پذیر اور عادل سوسائٹی میں ہونی چاہئیں اسلامی تمدن کا جزو لازم ہیں۔ میں اشارۃً بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خصوصیات کیا ہیں؟

اوّل۔ اسلام نے انسانی زندگی کا جو آئیڈیل پیش کیا ہے اس کا سب سے پہلا تقاضہ یہ ہے کہ ہم سائنس کی ان جدید قوتوں کو ذاتی جلب منفعت کے لئے نہیں بلکہ منشائے الٰہی کی تکمیل کے لئے استعمال کریں یعنی دنیا میں عدل اور اخوت، ہمدردی اور خدمت کے حیات بخش اصولوں کی اشاعت اور تبلیغ کریں۔ اسلام کے لفظی معنی ہیں کہ انسان رضائے الٰہی کے سامنے اپنا سر تسلیم جھکا دے اور ایک سچے مسلمان کا سب سے برتر اور بلند دعویٰ یہی ہو سکتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ اگر یہ دعویٰ کوئی معنی رکھتا ہے اور محض زیب داستان کے لئے نہیں ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اسلامی تمدن میں سائنس کو اسی طرح استعمال کیا جائے کہ اس کی وساطت سے علم اور دولت صحت اور فرصت اور تمام مادّی اور ذہنی آسائشوں کی تقسیم سوسائٹی کے افراد میں عدل اور مساوات کے اصول پر ہو۔ سائنس کی مدد سے انسانی تاریخ میں اب پہلی مرتبہ اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ عوام کی زندگی کو اس بیماری اور جہالت اور بے اطمینانی سے پاک کر دیا جائے جو ابتدائے عالم سے آج تک اسی پر مسلط رہی ہیں اور انہیں مختلف خلاف عقل توہمات اور اندیشوں سے آزاد کر دیا جائے۔ مجھے حال کے ایک امریکن مصنف سے اتفاق ہے کہ "سائنس آرٹ اور قوت فکر کی ترقی نے پہلی مرتبہ انسان کے قبضے میں ایسے وسائل دئے ہیں جن کی بدولت وہ آزاد ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ زمانوں میں عوام کی غلامی کے ذریعہ صرف معدودے چند خواص آزادی حاصل کر سکتے تھے (کیونکہ ہر قسم کے وسائل محدود تھے) اور چونکہ کوئی شخص بھی باقی تمام انسانوں سے جدا نہیں ہے لہٰذا اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ آزاد بھی گرفتار تھے۔ اور ان آزادوں کی تہذیب بھی (جو ہمارے اس معیار کی رو سے غیر اسلامی تہذیب تھی)، اس غلامی کے اثرات سے آلودہ تھی۔ اب مشین کی بدولت (جو سائنس کا کارنامہ ہے) اور انسان کی نئی خادم ہے سب لوگ آزادی حاصل کر سکتے ہیں" لیکن شرط یہی ہے کہ ان جدید قوتوں کو امانت الٰہی سمجھ

عوام کے فائدہ کے لئے استعمال کیا جائے۔

دوم۔ جہاں تک اقتصادی اور معاشرتی تنظیم کا تعلق ہے اسلام پہلا عالمگیر مذہب ہے جس نے عملاً نسل اور رنگ اور جماعت اور طریقۂ معاش کے باطل امتیازات کو یک قلم مٹا دیا اور تمام بنی نوع انسان کی اخوت اور یک جہتی کو ایک ایسے زمانہ میں تسلیم کرایا جب خدا کے بندے بیشمار گروہوں اور جتھوں میں منقسم تھے۔ اس نے عدل کو "اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" قرار دیا اور مساوات کے انقلاب آفریں اصول کی حمایت کی۔ جو سوسائٹی ان اصولوں کو صداقت اور خلوص سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں راہ دے گی اس کے لئے لازم آئے گا کہ اپنے تمام افراد کے لئے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے دروازے کھول دے تاکہ وہ سب اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کر سکیں اور اپنی شخصیت کی تکمیل اور تربیت کر سکیں۔ یہ نہ صرف انصاف کی رو سے ضروری ہے بلکہ عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے کیونکہ جو قوم اپنے تمام افراد کے جوہر ذاتی کی تربیت نہیں کرتی وہ علمی اور مالی اعتبار سے کبھی پوری ترقی نہیں کر سکتی۔ سائنس نے تمام افراد اور جماعتوں میں اس قدر گہرا اور حقیقی اتحاد مقاصد قائم کر دیا ہے اور انہیں اس قدر مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کہ وہ تمام اثرات جو امیر اور غریب، جاہل اور تعلیم یافتہ، بیکار اور مزدور میں فصل پیدا کرتے ہیں بلکہ ان تمام امتیازات کو قائم رکھتے ہیں جو بعض جماعتوں کے لئے دولت، فرصت، علم اور فنون لطیفہ کی تخصیص اور باقی کے لئے افلاس، جہالت اور حیوانوں کی سی محنت کو عام کرتے ہیں انفرادی اور قومی ترقی کے لئے سم قاتل ہیں۔ اگر سوسائٹی کا نظام اقتصاد و معاشرت عدل اور مساوات کے اسلامی اصولوں پر قائم ہو جائے تو جماعتوں کے تعلقات میں مروجہ چھین جھپٹ اور جبر و تشدد کی کارفرمائی نہ رہے گی بلکہ لوگوں کے محرکاتِ عمل بہتر ہو جائیں گے اور وہ بجائے مجنونانہ مسابقت اور جنگ و جدل اور دست درازی کے ذوقِ خدمت اور اشتراکِ عمل کے ساتھ کام کریں گے۔

موجودہ زمانہ میں انسانوں کی زندگی میں سب سے زیادہ شدید اور زبردست محرکِ عمل اقتصادی ہے اور کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ باہمی مقابلہ اور رقابت۔ یہ صورتِ حال حد درجہ افسوس ناک ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ اس کو دنیاداری کا خطاب دے کر لوگوں کو عذابِ آخرت سے ڈرایا جائے یا انہیں ایک افسردہ قناعت کی تعلیم دی جائے۔ جو لوگ مدت سے اپنے حقوق سے محروم ہیں اُن کے لئے ان حقوق کی خواہش اور ان کی خاطر جد و جہد کرنا عین فطرت انسانی ہے جس کو اسلام نے ان الفاظ میں صریحاً تسلیم کیا تھا "وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا" (اور دنیا میں اپنے حصہ کو مت بھولو) لہذا اصلاح کی اصل صورت نظامِ اقتصادی کی تبدیلی ہے۔

سوئم۔ جس طرح اسلامی تمدن نے اجتماعی تنظیم کے لئے شعائر قرار دیئے ہیں اسی طرح افراد کی تہذیب نفس کے لئے بھی ایسے اصول قائم کر دیئے ہیں جن کے اثرات بہت دور رس ہیں جس سوسائٹی کے افراد توحید کو اصولِ دین میں سب سے مقدس سمجھتے ہوں اُن کے لئے لازم آتا ہے کہ وہ سوائے ذات الٰہی کے کسی دوسری طاقت کے اور سوائے صداقت کے کسی چیز کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم نہ کریں اسلام نے توحید کی تعلیم دیکر نہ صرف پتھر کے بتوں کی بیخ کنی کر دی بلکہ اُن تمام بتوں کا خاتمہ بھی کر دیا جن کے سامنے ہمیشہ سے انسانوں کی گردنیں جھکتی رہی ہیں یعنی دولت اور ثروت کے سونے کے بُت اور ملکی اور سیاسی قوت اور تشدد کے لوہے کے بُت سے

ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست!

لہٰذا اس اسلامی سوسائٹی کے قیام کے لئے جو تعلیم دیجائے گی اسے افراد میں حقیقی جرأت اور خودداری اور ایثار پیدا کرنا چاہئے جس تعلیم کی بنیاد خوف اور بزدلی اور جبیں سائی کی عادت پر رکھی جائے۔ وہ سراسر روحِ اسلام کی منافی ہے۔

چہارم۔ اسلامی تمدن کی آخری خصوصیت جس کی طرف میں یہاں اشارہ کروں گا یہ ہے کہ وہ عالمگیر رواداری اور سچی بین الاقوامی ذہنیت کا حامی ہے۔ وہ قلعہ بند اور تنگ نظر قومیت کے نصب العین کو مسترد کرتا ہے۔ اس کی نظر میں تمام بنی نوع انسان باوجود اپنے جغرافی اور تاریخی امتیازات کے، باوجود نسل و رنگ کے تفرقوں کے، باوجود مذاہب و قبائل میں تقسیم ہونے کے ایک خالق کی مخلوق اور ایک خدا کے بندے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسا نظام تمدن جو ان کو مستقل طور پر جنگ آزما اور مخالف جماعتوں میں تقسیم کر دے اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق کی نفی کرتا ہے۔

اسلام اس بات کا روادار نہیں کہ لوگ قومیت اور وطنیت کے سیاسی تصور کو ایک مقدس بت بنا کر اس کی پرستش کرنے لگیں کیونکہ یہی وہ خطرناک جذبہ ہے جس سے فائدہ اٹھا کر آج دنیا کا بہت بڑا حصہ بے اصول مطلق العنان جابروں کے قبضہ میں آ گیا ہے اور لوگوں کے لئے جائز آزادی اور اظہار خودی کے راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ موجودہ "تہذیب کے آذر" نے جو بت تراشوائے ہیں سے

اُن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

حضرات! یہ ہے اس تمدن کا مختصر اور ناقص سا خاکہ جو اسلام کی تعلیم میں مضمر ہے اور جس کے لئے مستقبل حسنیہ براہ ہے جس کی اس پُر آشوب، امن ناآشنا، ہلاکت آفریں زمانہ میں تمام قوموں کو اشد ضرورت ہے عام اس سے کہ وہ اسلام کو بحیثیت ایک مذہب کے قبول کریں یا نہ کریں۔ اس تمدن کو دنیا کے سامنے پیش کرنا جس کی بنیاد سائنس اور

معاشری عدل کے ستونوں پر قائم ہوگی، ہمارا فرض ہے کیونکہ ہم رسولِ عربیؐ کے پیغام کے امین ہیں۔ لیکن ہم اس تمدن کو ہرگز ایک زندہ اور قابلِ عمل حقیقت نہیں بنا سکتے جب تک ہماری تمام اصلاحی اور تعمیری کوششوں میں ان اصولوں کی کارفرمائی نہ ہو اور ہمارے راہ نما اور معاشری انجمنیں اپنے جمود، اپنی خودغرضی اور اپنی جاہ پرستی کو چھوڑ کر اس معاشرے کی تنظیم کے لئے اپنی تمام جدوجہد کو وقف نہ کردیں۔ ان تمام ذرائع میں سب سے زیادہ بااثر اور وقیع ادارہ تعلیم کا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہم اپنی نوخیز نسلوں میں ان بہتر اور صحیح تر خیالات اور قدروں کی اشاعت کر سکتے ہیں۔

میں یہاں یہ بحث نہیں کر سکتا کہ تعلیم پر اس تمدنی نصب العین کے اثرات کیا ہوں گے لیکن ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ بقول علامہ اقبال مدظلہ العالی کے۔

"زندگی اپنے حوالی میں کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

حضرات! زندگی کی گہرائیوں میں اس انقلاب کا پیدا کرنا اور انسانوں کے ضمیر میں ایک نئی دنیا کا متشکل کرنا تعلیم کا اہم ترین اور مقدس ترین فرض ہے اور جب تک ہماری تعلیم اس طرف متوجہ نہیں ہوگی اس میں اور قومی زندگی میں کوئی حیات پرور رشتہ قائم نہیں ہوگا اور وہ ایسی ہی سرسری، اور بے روح اور مصنوعی رہے گی جیسی اب ہے لیکن اگر تعلیم نئی دنیا اور نئے آدم کی تخلیق میں خلوص اور یک جہتی کے ساتھ کوشاں ہو تو اب انسان کے قبضۂ قدرت میں ایسے وسائل اور ذرائع موجود ہیں جن کی مدد سے اُس خواب کی تعبیر پوری ہو سکتی ہے جو بڑے بڑے حکیم اور فلسفی اور شاعر اور صوفی دیکھتے آئے ہیں اور جس کا نشان بڑے بڑے مصلحوں اور پیغمبروں نے بتایا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام ۔۔۔ یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ عالمِ افلاک
تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے ۔۔۔ وگرنہ آگ ہے مومن جہاں خس و خاشاک
جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی ۔۔۔ مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

پکاسو　　　　قلندر　　　　آئیل پینٹنگ ۱۹۰۹

نظم نگاری کی اہمیت

اختر انصاری بی اے آنرز بی ٹی (علیگ)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں شاعر حشرات الارض کی طرح غیر محدود تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہمارے اسکولوں میں شاعر بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ وہاں نہ صرف طلبہ کی کوئی ہمت افزائی نہیں کیجاتی بلکہ اُن کو شعر کہنے سے باز رکھا جاتا ہے۔ شاعری کی اُن کے سامنے مذمت کیجاتی ہے اور یہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس منحوس اور فضول شغل سے بچیں۔ اور اپنا وقت زیادہ اچھے مشاغل میں صرف کریں۔ میں اس کے برعکس یہ کہتا ہوں کہ اسکول ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر فرد کو شاعر ہونا چاہئے' جہاں کے ہر طالب علم کو شعر گوئی (جس کے معنی غزل گوئی نہیں ہیں) سے شغف رکھنا چاہئے' اس لئے کہ طلبہ کے واسطے یہ مشق بے حد ضروری اور بے حد مفید ہے۔

ایک زمانہ تھا جب دنیا نوجوان تھی۔ جب تاروں میں موسیقی تھی' چاندنی میں سرشاری تھی' مینھ کی پھواروں میں نکھار تھا' ہواؤں میں مستانہ پن تھا' جب دن اور رات کسی جادو نوا مغنّی کی دو حسین تانیں تھیں' غرضکہ موجودات کی ہر شے میں شعریت اور رومانیت پائی جاتی تھی۔ اُس وقت کا انسان اگرچہ تہذیب سے ناآشنا تھا لیکن فطرت سے زیادہ قریب تھا۔ اُس کی زندگی پر خود ساختہ تمدن کا جھول نہیں چڑھا تھا' منطق اور فلسفے کی الجھنوں سے وہ آزاد تھا لیکن جذبات و تاثرات سے اُس کا قلب لبریز تھا۔ اور چونکہ جذبات کے اظہار کا فطری ذریعہ (کسی نامعلوم سبب کی بنا پر) منظوم زبان ہے' اُس کی زندگی میں شاعری اور موسیقی کو بہت دخل تھا۔

بچّوں کی ذہنیت زمانۂ قدیم کے اِس غیر متمدن انسان کی ذہنیت سے بہت مشابہ ہوتی ہے۔ وہ بھی جذبات و احساسات کی دنیا میں رہتے ہیں۔ منطقی استدلال سے ناواقف ہوتے ہیں اور "غور و فکر" کی بجائے "محسوس" کرتے ہیں۔ قلبی کیفیات اُن کی زندگی کی روح ہوتی ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا جذبات کا اظہار ہمیشہ منظوم زبان میں ہوتا ہے۔ ایسی زبان میں جو ایک مخصوص وزن کے ماتحت ہو اور جس میں ردیف و قافیہ کا بھی التزام ہو۔ بچّے اِسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچّوں میں مبالغے کی عادت بھی پائی جاتی ہے' وہ تشبیہات اور استعارات بھی اکثر استعمال کیا کرتے ہیں۔ ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ شعر گوئی جس طرح قدیم غیر متمدن

انسان کی فطری زبان تھی اُسی طرح ہمارے بچّوں کے لئے بھی ایک قدرتی ذریعۂ اظہارِ خیال ہے۔

چنانچہ ضروری ہے کہ اسکولوں میں طلبہ کو شعر کہنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس میں اُن کی خاطر خواہ رہبری اور ہمت افزائی کیجائے۔ اس سلسلے میں چند اہم امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اوّل تو یہ کہ اُن کو کسی خاص موضوع کا پابند نہیں کرنا چاہئے۔ اسکول میں طلبہ کو مضمون نگاری کے لئے جو عنوان دئے جاتے ہیں وہ عام طور پر استاد کی دنیائے خیال سے وابستہ ہوتے ہیں، بچّوں کے عالمِ جذبات سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بچّے اُن عنوانات کے ماتحت جو کچھ لکھتے ہیں وہ اُن کے سچے اور فطری جذبات کا اظہار ہرگز نہیں ہوتا۔ یہاں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے طلبہ کو اجازت ہونی چاہئے کہ وہ جس موضوع پر چاہیں آزادی کے ساتھ اپنے احساسات کو رقم کریں۔ دوسرے یہ کہ طلبہ اشعار کی تحسین یا تخلیق میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک شعرا کے کلام کا بکثرت مطالعہ نہ کریں چنانچہ اُن کے لئے شاعری کے بہترین نمونوں کا وسیع اور ذاتی مطالعہ بہت ضروری ہے۔ تیسرے یہ کہ طلبہ شعر کا مفہوم پانے کی کوشش میں اُس کی موسیقیت کو فراموش نہ کر جائیں حقیقت یہ ہے کہ شعر میں یہی دو چیزیں پائی جاتی ہیں، موسیقیت اور مفہوم (یا وہ خیال جس کا اظہار کیا گیا ہے) موجودہ طریقۂ تدریس کے ماتحت استاد زیادہ وقت اور زیادہ زور شعر کا مطلب سمجھانے میں صرف کرتا ہے۔ اگر پانچ منٹ طلبہ شاعر کے الفاظ کو سنتے ہیں تو پچاس منٹ اپنے اُستاد کے الفاظ کو جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کو شعر کی موسیقیت کا، اُس کی حقیقی روح کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا، اور جب تک وہ اس چیز سے محروم رہتے ہیں اُن کے مذاقِ سامعہ کی بیت نہیں ہوتی اور وہ شعر کی تحسین و تخلیق سے عاجز رہتے ہیں اس لئے لازمی ہے کہ استاد جب نظم پڑھائے تو طلبہ کو اُسے بار بار سننے کا موقع دے تاکہ اُن کے کان اُس کی موسیقی سے آشنا ہوں۔ اور اس بات کا خیال رکھے کہ اشعار کی غیر ضروری تشریح و توضیح اس عمل میں حائل نہ ہونے پائے۔

طلبہ کی ان شعری مصروفیات پر دو اعتراض کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ نوعمر طلبہ ان مشقوں کے اہل نہیں، وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے یہ کہ یہ کام تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں طلبہ کو اپنا وقت دوسرے مفید مطلب مشاغل میں صرف کرنا چاہئے پہلا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ صرف نظم ہی بچوں کے لئے اظہارِ خیال کا

فطری اور بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک میں اربابِ تعلیم و تعلّم نے اپنے تجربوں سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچا دی ہے کہ اگر اساتذہ کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی طلبہ کے شاملِ حال ہو تو وہ کم از کم اسّی فیصدی کی تعداد میں شعر کہنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ اُن کے اشعار ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں، عروض کی غلطیوں سے لبریز ہوتے ہیں اور شاعری کے معیار پر کسی طرح پورے نہیں اُترتے لیکن دیہاتی گیتوں کی مانند اُن میں برجستگی اور بے ساختہ پن ضرور پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ طلبہ نظم لکھنے میں نثر کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور غبی سے غبی لڑکا بھی نثر کے مقابلے میں نظم اچھی لکھ لیتا ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ اسکول کا ہر طالبِ علم شاعر بن جائے گا۔ شاعری اکتسابی نہیں وہبی ہے، ایک عطیۂ فطرت ہے، ایک خداداد ملکہ ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور ہر شخص کو نہیں ملتا۔ اسکول میں نظم نگاری کو فروغ دینے کا صرف یہی مقصد ہے کہ اُس معمولی فن کارانہ اور تخلیقی قوت کو بروئے کار لایا جائے جو کم و بیش ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔

دوسرے اعتراض کے جواب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ شعر گوئی اور نظم نگاری کی مشق طلبہ کے لئے ہرگز غیر مفید نہیں۔ اُس کے فائدے بے شمار ہیں، جن میں سے چند مختصر طور پر یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

شعر کہنے کے لئے بہت کافی دماغی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جب شعر موزوں ہو جاتا ہے تو ایسی روحی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ جو اُس کاوش کو بالکل بھلا دیتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ کو دماغی محنت کرنے اور پسینہ بہانے کی عادت ہو جائے گی۔ کام کرنا اور کام کی شدت سے مسرت و عیش حاصل کرنا ایک ایسی ذہنی خاصیت ہے کہ جو انسان کو ترقی کی معراج تک پہنچا دیتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ جب فنِ شعر کی پابندیوں سے مجبور ہو کر مختلف اسالیبِ بیان پر غور کریں گے تو اُن کو اس حقیقت سے آگاہی ہو جائے گی کہ کسی بات کے بیان کرنے کے بہت سے طریقے ہیں لیکن بہترین طریقہ صرف ایک ہی ہے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جو اکثر لوگ عمر بھر نہیں سیکھ سکتے، طلبہ اس راز کو شعر گوئی کے ذریعہ بہت جلد پا لیں گے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ شعر کہنے کے لئے ہم کو اپنے الفاظ کے پوشیدہ ترین خزانے کھنگالنے پڑتے ہیں اور اس عمل میں بہت سے ایسے الفاظ کا استعمال آ جاتا ہے جن کو ہم جانتے تھے لیکن کبھی اپنی تقریر و تحریر میں نہ لاتے تھے۔ چنانچہ شعر موزوں کرنے کی مشق سے طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں معتدبہ اضافہ ہوگا۔ چوتھے یہ کہ طلبہ میں کثیر التعداد الفاظ ترا[illegible]

اور محاورات میں سے بہترین کو انتخاب کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اور پھر اُن کو استعمال کرنے کا طریقہ سیکھ جائیں گے۔ اسی طرح شعر گوئی کی مشق اُن کی نثر کو سنوارنے اور خوبصورت بنانے میں بے انتہا معاون ہوگی۔ پانچواں اور نہایت وقیع فائدہ یہ ہے کہ جب وہ شعر کہنے کی مشق کریں گے تو اُن کے مذاقِ سامعہ کی تربیت ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نثر میں بھی موسیقیت کے جویا ہوں گے' نثر کو بھی سماعت کی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ اور اس امر کی کوشش کریں گے کہ اُن کی تحریروں میں ایک روانی' ایک ترنّم پایا جائے اور جملوں کی ساخت ایسی ہو جو کانوں کو بھلی معلوم ہو۔ اس چیز کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو نثر کو خوبصورت اور مترنم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور طلبہ تو اس سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اردو کے اساتذہ قواعد زبان پر اپنی تمام قوت صرف کر دیتے ہیں۔ اور طرز یعنی سٹائل کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ لڑکوں کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ طرزِ بیان کا دلکش اور حسین ہونا قواعد زبان کی پابندی سے کم وقیع نہیں ہے۔ اور فقروں کا بے جوڑ اور اُلجھا ہوا ہونا اور الفاظ کا بھدے طریقے پر استعمال کیا جانا اُتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا کہ قواعد کی غلطیاں کرنا۔ اچھی نثر نگاری سیکھنے کا بہترین ذریعہ شعر گوئی کی مشق ہے۔ چھٹا اور آخری اور سب سے زیادہ اہم فائدہ یہ ہے کہ شعر گوئی کی مشق سے طلبہ کی قوتِ تحسین میں اضافہ ہوگا۔ وہ آرٹ اور ادب سے حظ اندوز ہونے کے زیادہ اہل ہو جائیں گے۔ اُن کی وجدانی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ یہی حقیقت میں شعر گوئی کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ طلبہ نہ تو شعر گوئی سے عاجز ہوتے ہیں اور نہ یہ شغل اُن کے لئے غیر مفید ہے۔ وہ اس کام میں انتہائی دلچسپی اور سرگرمی کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے اُن کو بے شمار فائدے ہوتے ہیں۔ چنانچہ امید کیجاتی ہے کہ اسکولوں میں اردو زبان کے اساتذہ اس طرف توجہ کریں گے اور اُردو کی تدریس کو حقیقی معنوں میں کامیاب بنانے کے لئے اس قسم کی کوششوں سے غافل نہ ہوں گے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم اونچی جماعتوں میں طلبہ کی طرف سے اس سلسلے میں کافی دلچسپی اور سرگرمی کے اظہار کی توقع کیجا سکتی ہے۔

اُردو اور اُس کے بعض تاریخی ماخذ

محمد ابو لیث صدیقی بدایونی متعلم بی اے آنرز (اُردو)
سکرٹری انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اُردو کی ابتدا کے بارہ میں ایک فاضل کا قول ہے۔

"چوں بیشتر جائے عیش سلاطین تیموریہ دار الخلافہ شاہجہاں بودہ است فصیحاں و بلیغاں و علمائے عالی قدر فریقین و دیگر ارباب فنون لطیفہ و اصحاب علوم شریفیہ درآں شہر دل نواز آرام گاہ برائے خود ساختہ بودند ہر چند کہ لاہور و ملتان و اکبرآباد ہم مسکن بادشاہان صاحب قدرت و شوکت بود و عمارات بلند سر بفلک رسانیدہ دریں شہر ہا موجود اند لیکن برابر ہمیتواں گفت زیرا کہ دریں شہر سلاطین عالی از جا ہائے دیگر تشریف داشتہ اند۔ خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبان ہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ و در بعضے عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبان تازہ سوائے زبانہائے دیگر بہم رسانیدند و بہ اُردو موسوم ساختند[1]۔

اسی طرح میر امّن نے "باغ و بہار" کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر آکر حضور میں جمع ہوئی لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال و جواب کرتے کرتے ایک زبان اُردو مقرر ہوئی[2]۔

متذکرہ صدر دونوں اقوال سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان درحقیقت مختلف زبانوں کے "دلچسپ" الفاظ کے اختلاط سے پیدا ہوئی اور یہ واقعہ دار السلطنت ہند (شاہجہان آباد) میں پیش آیا۔ لیکن طرز بیان سے شبہ ہوتا ہے کہ مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ لسانی تبدیلی جلد اور نہایت آسانی سے دہلی میں یکایک انجام پا گئی، لیکن بقول سرسیّد۔

"اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا۔ مسلمان اپنی گفتگو فارسی

---

[1] انشاء اللہ خاں۔ دریائے لطافت [2] میر امن "باغ و بہار" ۱۲۱۵ھ

زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پھر جب بھی امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں کے زمانے سے یعنی حضرت مسیح کی تیرہویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا الفاظ ملانا شروع کئے تھے اور کچھ پہیلیاں' مکرنیاں' اور نسبتیں اس زبان میں کہی تھیں جن میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو' مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جا سکے۔

جب کہ شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۵۸ھ ہجری مطابق ۱۶۴۸ء عیسوی میں شہر شاہجہاں آباد آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا اُس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بسبب کثرت استعمال کے تغیّر و تبدل ہو گیا غرض کہ لشکر بادشاہی اور اردوئے معلّیٰ میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اسی سبب سے زبان کا اُردو نام ہوا اور پھر کثرت استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اُردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب و آراستگی ہوتی گئی یہاں تک کہ تخمیناً ۱۱۰۰ھ ہجری میں یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا"[1]

جہاں تک اُردو کی اصلیت کا تعلق ہے سرسیّد اور انشا دونوں متفق ہیں کہ زبان اُردو مختلف زبانوں سے بنی۔ لیکن انشا کا یہ بھی قول ہے کہ مختلف زبانوں سے دلچسپ الفاظ علیحدہ کر کے نئی زبان بنا لی گئی لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ زبانوں کی ابتدا یوں نہیں ہوا کرتی۔ لسانی انقلابات اکثر و بیشتر مختلف تمدنوں کے باہمی آویزش سے بروئے کار آتے ہیں جس کا نتیجہ ابتداً ایک مخلوط یا "ملغوبہ" زبان کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس انقلاب کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ شاہجہاں آباد میں جمع ہونے والے "خوش بیان" اگر اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتے تب بھی یہ انقلاب پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ سر سیّد نے اسی حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر اُردو کی ابتدا و آفرینش میں زمان و مکان کے عنصر میں کافی گنجائش رکھی ہے اور اس کی ابتدا عہد خلجی سے کی ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ انقلاب اور تبدیلی رفتہ رفتہ ہوئی اور عہد شاہجہانی میں اس نے ایک مخصوص انداز و صورت کی بناء پر اُردو نام پایا۔

سر سیّد کے ساتھ بعض دیگر تذکرہ نویس بھی مختلف راستوں سے عہد خلجی تک پہنچے ہیں اور آج ہمارے

---

[1] سر سید احمد خاں۔ آثار الصنادید ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء مطبوعہ نامی پریس۔

سامنے اس عہد کے کافی ایسے نمونے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہانی عہد سے تین سو سال قبل اُردو کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کا فارسی آمیز ہندی کلام نہ صرف اُس عہد کی زبان کا ایک اچھا اور مستند نمونہ ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ زبان ہماری موجودہ زبان سے اسلوب و ماہیت کے اعتبار سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ علاوہ خالق باری کے جس کا مشہور شعر ہے ؎

بیا برادر۔ آؤ رے بھائی بنشیں مادر۔ بیٹھ ری مائی

ان کی دو غزلیں اور ملتی ہیں :۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس کے بعد دو شعر اور ہیں اور پھر یہ مقطع :۔

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

ایک دوسری غزل کا مطلع ہے :

خوار شدم زار شدم لٹ گیا در غم ہجر تو مکر ٹوٹا ہے

اس کا مقطع یہ ہے :

گاہ زخسرو تو نگفتہ کہ بیٹھ وہ چہ کند کہ بھاگ مراپھوٹا ہے

دو شعر متفرق ہیں :

زرگر پسرے چو ماہ پارا کچھ گھڑ لے سنوارے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست پھر نہ کچھ گھڑا نہ کچھ سنوارا

پروفیسر آذر اسلامیہ کالج لاہور کے پاس ایک قدیم بیاض ہے جو تیرھویں صدی ہجری کی ابتدار

میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ذیل کی غزل خسرو سے منسوب ہے ؎

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر   ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر
جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا   حقا الٰہی کیا کیا آنسوں چلے بھر لائے کر
توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے   تجھ دوستی بسیار ہے یک شب ملو تم آئے کر
جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں   تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملو تم آئے کر
میرا جو من تم نے لیا تم نے اٹھا غم کو دیا   غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر

خسرو کہے باتاں عجب دل میں نہ لاوے کچھ عجب
قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا دل لائے کر

یہ غزل جس رنگ میں ہے امیر خسرو سے جدا ہے اور مجھے اس کی صحت میں تامل ہے۔ اسی بیاض سے ذیل کے اشعار بھی ہیں:

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار   آپے پار اتر گئے ہم تو رہے اردار
بھائی رے ملاحو ہم کوں اتارو پار   ہاتھ کا دیووں گی مندرا گل کا دیوں ہار
دیکھیں اپنے حال کو روؤں زار نزار   بن کن ذنتا بہت ہیں ہم ہیں اوگنہار
چکوا چکوی دو جنے ان کوں مارو نہ کو   اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو
تازی چھٹا دیس میں قصبے پڑی پکار   دروازے دیتے رہ گئے نکس گئے اسوار
گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس   چل خسرو گھر آپنے سانجھ پڑی چو دیس ؎

بعض فقرے تو زبان و بیان کے اعتبار سے بالکل غیر مانوس نہیں معلوم ہوتے مثلاً گوشت کیوں نہ کھایا؟ ڈوم کیوں نہ گایا؟ گلا نہ تھا۔

ان فقروں میں جیسی کچھ روانی اور گھلاوٹ ہے اور اس عہد سے ہم کو جو بُعد زمانی حاصل ہے اس کی بنا پر مجھے یہ ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ یہ فقرے اس زمانے کی ٹکسال سے برآمد ہوئے ہونگے

؎ پنجاب میں اردو - از مولانا محمود شیرانی۔

یہ یا اس قبیل کے دوسرے فقروں کا غیر مانوس نہ ہونا ہی اس اشتباہ پر دال بھی ہے کہ یہ فقرے اس عہد کے نہیں ہیں اور میرے تعجب میں اور اضافہ اس وقت ہوا جب میری نظر سے شاد مرحوم کے حسب ذیل فقرے گزرے :

میں نے ایک قدیم بیاض میں دو تین سطروں میں ایک نظم دیکھی تھی جو امیر خسرو کے سینکڑوں برس قبل کی تھی - اس کا ابتدائی مصرع مجھ کو یاد ہے - ع

"چمن میں آئی ہے کیسی یہ رت مرے نین سے کوئی نہارے"[۵۱]

امیر خسرو سے سینکڑوں برس قبل کی زبان کا اس درجہ صاف ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا -

مغل اور اردو

اس امر میں شک کی گنجایش نہیں ہے کہ اردو کی ابتدا شاہجہاں کے زمانے میں نہیں ہوئی بلکہ اس سے قبل ہو چکی تھی - خسرو کے کلام سے قطع نظر شاہجہاں آباد کے آباد ہونے سے قبل اکثر تصانیف کا پتہ چلتا ہے جو اس کی سند ہیں - ان میں سے ایک محمد افضل جھنجانوی (المتوفی ۱۰۳۵ھ) کی تصنیف "بارہ ماسہ" ہے جس کا نمونہ یہ ہے -

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی — بھئی ہوں عشق کے غم سوں نمانی
نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا — برہوں کی آگ سیں سینہ جراتا
تمامی لوگ مجھ بوری کہیں ری — خرد گم کردہ مجنوں کہیں ری
نہیں اس درد کا دارو کسی کن — بھئے حیراں سبھی حکما رذوفن
اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا — سیاناں دیکھ اس کوں دور بھاگا

. . . .

اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے — کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے
کہ جس کے بیچ یہ آتش پری ہے — وہی دن رین سلگت ہے ہری ہے

---

۵۱ فکر بلیغ - مصنفہ شاد عظیم آبادی - مرتبہ عبدالحمید حمید عظیم آبادی -

برہوں کی آگ تن من میں دگی ہے   وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے[1]

عہدِ مغلیہ کے دوران میں اُردو کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں بابر کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی   فقرا اہلیغہ بس بولغوسیدور پانی و روٹی[2]

تزک بابری میں کچھ متفرق الفاظ بھی ملتے ہیں مثلاً ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کیلا، کروندا، چرونجی، گلہری، مور، دوہبر وغیرہ - ان سب سے ہمیں اکثر اسمار، اور افعال کا پتہ چلتا ہے -

صاحب جلوۂ خضر نے یہ رباعی اکبر کی طرف منسوب کر دی ہے[3] :-

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت   تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت   ساعت کا بہانہ نہیں خوشی ہر ساعت

ان کی زبان اتنی صاف اور رواں ہے کہ یہ تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ یہ کلام اس عہد کا ہو سکتا ہے چنانچہ یہ شک اس درجہ بدیہی تھا کہ راقم السطور نے اس کی تلاش و تحقیق شروع کر دی - چنانچہ دورانِ مطالعہ

---

[1] "پنجاب میں اُردو" - میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں اس "بارہ ماسہ" کا ذکر کیا ہے - لکھتے ہیں: "محمد افضل، افضل تخلص، از قدیم است، کدام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ بر و عاشق شدہ حسب حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کھتریاں و گانیاں مشتاق او می باشند نصفے ہندی و نصفے فارسی دارد - لیکن قبولیت داد الہٰی است بر دلہا اثر می کند از دست :

پڑی ہے گل میں میرے بیم پھانسی   مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی
مسافر سے جنہوں نے دل لگایا   انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

تعجب ہے کہ یہ کلام سامنے رکھتے ہوئے میر حسن اور اُن کے ہمعصر تذکرہ نویسوں نے دلّی میں ریختہ کی ابتدا ولی کے دہلی آنے سے کی - گلزار ابراہیم صفحہ ۲۰ علی ابراہیم خاں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے" محمد افضل از قدمات بر گوپال نامی عشق ورزیدہ حسب حال خود بارہ ماسہ مشہور بہ بکٹ کہانی منظوم نمودہ ایں بیت از انجاست ؎ مسافر سے جنہوں نے دل لگایا ؛ اُنھوں نے سب جنم روتے گنوایا -

[2] یہ شعر بابر کی خود نوشتہ "تزک بابری" کے قلمی نسخہ موجودہ شاہی کتب خانہ رام پور میں موجود ہے -

[3] تذکرہ جلوۂ خضر صفحہ ۴۰ - اس رباعی کا قصہ یوں ہے کہ ابو الفضل کے قتل کے بعد جہانگیر مدتوں باپ کے ڈر سے روپوش رہا - آخر معافی کا خواستگار ہوا اور ملنے کی اجازت چاہی - اسی سلسلہ میں حسب دستور قدیم اور رواج زمانہ نیک ساعت مقرر کرنے کی درخواست کی - اکبر نے جواب میں یہ رباعی لکھوا دی -

میں "تزکِ جہانگیری" مرتبہ سرسید احمد خاں - دیباچہ نوشتہ مرزا محمد ہادی صفحہ ۱۱) میں اکبر ہی سے منسوب حسبِ ذیل اشعار فارسی کے ملے :-

اے جستہ زما بہم عادت ساعت — ادراک وصال راچہ حاجت ساعت
از وصل کند کسب سعادت ساعت — ساعت چہ کنی بہانہ ساعت ساعت

اس سے یہ نتیجہ صریح برآمد ہوتا ہے کہ جن بزرگ نے تزک کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔ انھوں نے ان اشعار کا بھی منظوم اُردو ترجمہ کر دیا۔ غلطی سے اسی ترجمہ کو اکبر سے منسوب کیا گیا۔ صاحب جلوۂ خضر اور اُن کے اتباع سے نصیر حسن خیالؔ وغیرہ بھی اسی مغالطہ میں مبتلا رہے۔

چنانچہ اسی طور پر جلوۂ خضر میں یہ اشعار نور جہاں سے منسوب کئے گئے ہیں:-

دیں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صدچاک میں ہم — دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بُتِ بیباک میں ہم
نقشِ پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق — تیرے قدموں سے جُدا ہو کے ملے خاک میں ہم

لیکن راقم السطور کو اُن کے مستند ہونے میں بھی کچھ شبہ تھا اس لئے اُن کی تفتیش شروع کی اور نتیجہ حسبِ دلخواہ برآمد ہوا۔ میر حسن نے ان اشعار کو نہایت خفیف ترمیم کے ساتھ معین الدین معینؔ بدایونی کا بتایا ہے اور اس سلسلہ میں ایک اور بھی شعر دیا ہے؎[۱]

دیں جگہ تیری جفا کو دلِ صدچاک میں ہم — دیکھیں گر کچھ بھی وفا تجھ بتِ بیباک میں ہم
نقشِ پا کی نمط اے راحتِ جانِ عاشق — تیرے قدموں سے جُدا ہو کے ملے خاک میں ہم

---

[۱] جلوۂ خضر سے اکثر دیگر تذکروں میں بھی یہ اشعار منقول ہیں مثلاً "مغل اور اردو"۔

حالات معینؔ بدایونی۔ تذکرہ سخن شعرا صفحہ ۵۱۴ (مولفہ نساخ)، نساخؔ نے ان کے دو شعر اور لکھے ہیں:

قمری ہے فدا باغ میں شمشاد کی دھج پر — ہم صدقے ہیں اے سروِ رواں تیرے اکڑ کے
اے ابرِ بہاری شبِ ہجراں میں خبردار — دامن ترا اس آگ کے شعلہ سے نہ بھڑکے

تذکرہ گلزارِ ابراہیم مؤلفہ علی ابراہیم خاں خلیل صفحہ ۲۳۵

"معینؔ بدایونی۔ شیخ معین الدین، از تلامذہ مرزا محمد رفیع سوداؔ ست، فکرش در اقسام ریختہ قادر و رغبت طبعش در مناظرہ وافر۔ الحال کہ سال یک ہزار و صد و نود و یک و شش ہجریست شنیدہ شد در لکھنؤ بسر می برد"

لختِ دل نہیں ہے جو رونے نکلے ہیں تن تا قاصد اشک ۔ پرزے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈاک میں ہم[1]

مغل اور اُردو[2] میں "جلوۂ خضر" ہی کے حوالہ سے زیب النسا کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ذیل کے اشعار اُس کے رشحات فکر ہیں :

جُدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے ۔ خدا کسی کے تئیں دوست سے جُدا نہ کرے

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی ۔ پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے ۔ خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

مجھے یہاں بھی یہ ماننے میں تامّل ہے کہ یہ اشعار زیب النسا کے ہو سکتے ہیں۔ اس عہد کی اُردو میں وہ روانی اور صفائی عنقا ہے جو ان اشعار میں ملتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صاحب جلوۂ خضر کو یہاں بھی کوئی مغالطہ ہُوا ہو۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے فارسی کے ساتھ ہندی لفظوں کے نگینے بھی بٹھائے ہیں اور تزکِ جہانگیری میں ایک کہاوت مذکور ہے :

پچ ہزار کنکا بھلیاں، دھن کھو پگائیں ۔ سور سکیرتی گھوڑ بھلے اور مشت نگر کی دھائیں

اس کے بعد اورنگ زیب کے عہد کی زبان کا جائزہ لینا چاہئے۔ عالمگیر نے دکن پر چڑھائی کی اور دہلی سے اپنی فوج لے کر گیا۔ سپاہیوں کو دکن میں برسوں گذر گئے۔ ان کی عورتوں کو جب گھر پہ مدتیں گذر گئیں تو انھوں نے اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا۔

چھپّر ہو گئے پُرانے اور کڑکن لاگن بانس ۔ آؤں آؤں کہ گئے اور بیت گئے بارہ ماس

دلی سہر سہاونا اور کچھن بر سے نیر ۔ سب کے کنت بٹور کے لے گئے عالمگیر

اس کا جواب یہ ملا :۔

بیٹھی رہو کرار سے اور من میں راکھو دھیر ۔ اب کے بچھڑے تب ملیں جب بوہریں عالمگیر

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو۔ میر حسن (مرتبہ "انجمن ترقی اردو" مطبوعہ مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ۱۳۴۱ھ)
میر حسن نے مبین بدایونی کی بہت تعریف کی ہے اور ان کا ذکر دورِ متاخرین میں کیا ہے جس کی ابتدا بقول اُن کے عہد محمد شاہ سے ہوتی ہے۔

[2] "مغل اور اُردو"۔

اس کے بعد کی زبان تو اور بھی صاف ہو گئی۔ اور میر جعفر زٹلی اور مرزا عبدالقادر بیدل کی زبان بالکل غیر مانوس نہیں۔ میر جعفر نے اپنے وقت کا شہر آشوب لکھا ہے:

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی۔ عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اُتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی۔ جو بیگانہ چمن گھر کی
بھلادی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

مرزا بیدل کے دو شعر بہت مشہور ہیں:۔

مت پوچھ دل کی باتیں اب دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

مرزا بیدل کا انتقال ۱۱۳۳ھ ہجری میں ہوا اور جعفر زٹلی نے ۱۱۲۵ھ ہجری میں وفات پائی یہ زمانہ شاہجہانی عہد سے صرف پچاس سال بعد کا ہے کیا دو زبانیں مل کر اس قدر کم عرصہ میں ایک ایسی صاف اور شستہ زبان تیار کر سکتی ہیں اور کیا کسی زبان میں اس کی پیدائش کے صرف پچاس سال کے اندر اتنی دلکش شاعری ہو سکتی ہے اس لئے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اردو کی ابتدا شاہجہاں کے عہد سے ہوئی۔

دکن اور اُردو

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس عہد کی زبان کے بکثرت نمونے دکن میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے سب سے قدیم ہیں۔ گنج العلمؒ کی پیدائش ۷۰۶ھ ہجری میں ہوئی۔ بعض مصنفین ان کو اُردو کا قدیم ترین نمونہ بتاتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ دکن کو اردو تالیف و تصنیف میں اوّلیت حاصل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دکن میں اس دور کی تصانیف بکثرت دستیاب ہوتی ہیں لیکن شمالی ہند میں بھی بالکل ناپید نہیں ہیں۔ مثلاً "رسالۂ تصوف و اخلاق" مصنفہ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ جس کا سنہ تصنیف ۷۰۸ھ ہے سال وفات اور سنہ تصنیف میں پوری ایک صدی کا فرق ہے جس کی بنا پر ممکن ہے اس کی صداقت پر کچھ شبہ ہو لیکن خواجہ صاحب موصوف کی عمر ۱۲۰ سال ہے۔ آپ کی پیدائش ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء میں اور وفات ۸۰۸ھ ۱۴۰۵ء میں ہوئی۔ اس طرح اس کتاب

کی صداقت میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی[1]۔ شمالی ہند کی دوسری تصنیف جو موجود ہے محمد افضل افضلؔ جھنجھانوی کا "بارہ ماسہ" ہے جس کا ذکر "مغل اور اُردو" کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

شیخ عین الدین کے بعد دکن کے جن قدیم مصنفوں کا حال معلوم ہے ان میں سید محمد گیسو درازؒ اور سید عبداللہ حسینی ہیں۔ گیسو دراز المتوفی سنہ ۸۲۵ھ کی کتاب معراج العاشقین اُردو کی سب سے قدیم کتاب ہے جو شائع ہوئی زبان کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

"پیر طبیب کامل ہونا، نبض پچھان کر دوا دینا، پیر منع کئے سو پرہیز کرنا، طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرے تو اُنے بھی طبیب ہووے گا[2]۔"

اس کے بعد وجدیؔ قابل ذکر ہیں۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کو دکن کا اولین شاعر کہا ہے ان کی تصانیف میں "تحفۂ عاشقاں" بہت مشہور رہی جس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۱۵ھ ہے[3]۔ سید عبداللہ حسینی کی تصانیف میں نشاط العشق مصنفہ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی کا ترجمہ بہت مشہور ہے۔

دکن کے مشہور شعراء میں سلطان قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء - ۱۶۱۲ء) کا بھی شمار ہے۔ سلطان خود شاعر، شاعر نواز اور شاعری کا دلدادہ تھا۔ اس کا ایک اُردو دیوان بھی ہے جو اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے سنہ ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا[4]۔ اس عہد کی اردو شاعری کا نمونہ حسب ذیل ہے :

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا	کہ اس بن نہین ہیں ٹک دل قرارا
پیا ہوں حضرت کے ہت آب کوثر	تو شاہاں اپر مجھ کلس کر بنایا

---

[1] رسالہ یادگار رسالنامہ سنہ ۱۹۳۳ء مضمون میر نذر علی درد کاکوروی	عالمگیر خاص نمبر سنہ ۱۹۳۵ء مضمون از حامد حسن قادری

[2] معراج العاشقین - مرتبہ "انجمن ترقی اردو"

[3] - اس جگہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ "پنچھی باچھا" مصنفہ سنہ ۱۱۵۵ھ کو وجدی مصنف "تحفۂ عاشقاں" کی تصنیف بتایا جاتا ہے لیکن جیسا کہ مصنف "دکن میں اردو" نے بھی لکھا ہے۔ یہ تصنیف دوسرے وجدی کی ہے۔ جو ولیؔ اور سراجؔ کے ہم عصر ہیں۔

[4] یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اسی کا دوسرا نسخہ عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری مولف "شعرائے دکن" کے پاس تھا۔

مومنوں خوشیاں کروہے آج دن مولود کا — مرتضیٰ بارہ اماماں عید ہے معبود کا

مکھ تیرا دیکھ کر میں آج مست — تیرے مکھ کے تئیں ہوا ہوں بت پرست

دنیا کا حکمت نا پوچھیں ہر گز حکیماں علم سوں — گا دو ترنا عیش کا نس دن پیا کے نام پہ

تمہارے عکس تے روشن ہوا ہے چاند جگ میں — وگرنہ زنگ کا ٹھکرا ہے تج بن خاک سر پر کر

دارو کرتے ہزار وضع طبیب — توں دکھا غمزہ نازسوں یک بار

اس دیوان میں مثنویاں، قصائد، اخلاقی شاعری، مذہبی شاعری، نیچرل شاعری سب کے سب موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن میں اُردو عہد اکبری ہی میں اس درجہ تک ترقی کر چکی تھی کہ اس میں ہر صنف شاعری پر طبع آزمائی کی جا سکے۔ اور ظاہر ہے یہ صرف اُس وقت ہوتا ہے جب زبان بہت سی ابتدائی اور ارتقائی منازل طے کر چکی ہو۔ سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کی زبان کا نمونہ یہ ہے:

پیا سانولا من ہمارا بھلا ما — نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

ساقیا آ شراب ناب کہاں — چندر کی پیالی میں آفتاب کہاں

محمد قطب شاہ کا جانشین عبداللہ قطب شاہ تھا اس کا یہ شعر ہے ؎

اے پری پیکر ترا مُکھ آفتاب — دیکھتا ہوں نور ہے نا مجھ میں تاب

ابوالحسن تانا شاہ کا مشہور شعر ہے ؎

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ پھل بھرا ہے — اک بات کئے ہونگے سجن یاں جی ہی پارہ پاٹ ہے

نصرتی[1]۔ نام شیخ نصرت تھا اور وطن بیجاپور، علی عادل شاہ کا درباری شاعر تھا اور "ملک الشعرا" کے خطاب سے سرفراز۔ ان کی تصانیف میں حسب ذیل مشہور ہیں:

۱۔ علی نامہ یا شاہنامہ دکن۔ سلطان علی عادل شاہ کی فتوحات و مجالس عیش و طرب اور قصائد مدحیہ کا مجموعہ ہے۔ اسی کا یہ انتخاب ہے۔

---

[1] نصرتی کی وفات ۱۰۹۵ھ میں ہوئی۔ وہ سنی المذہب تھا اور بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید جیسا کہ اُس کے شعر سے ظاہر ہے

جیسے ناؤں عالم میں بندہ نواز — محمدؐ حسینی ہے گیسو دراز

نادان سے نصیحت کی بچن بول نکو — پانی ہَنے کھاری تو شکر گھول نکو
تجہ عشق کے دریا میں جن تیر گیا ہے — وہ گوہر مقصود کماں کر یو لیا ہے

حمد باری۔

سرانا سری اس سکت دار لوں — کہ ادّھار ہے اُن ترا دھار لوں
دیا اور ستم کے پنجہ میں زور — پڑیا ڈرتے جب دل میں ڈریائے شور
کرنہار سرکش کو مغلوب دے — طلب کا پتہ طالب کی مطلوب دے
بزرگی جسے دیکھ پستی دیا — ظفر میں پیش دستی دیا
جسے توں دیا زور شمشیر کا — نہ سر پنجہ ہوئے تسکی سم شیر کا

توہیں اے شہنشاہ دنیا و دیں — شجاعت کی ہر صف کا کرسی نشیں

تیرا نور بے مثل گوہر کا آب — تیرا روح بے شبہ گل کا گلاب

خاتمہ میں کہتا ہے :-

سخن کا بڑا قدر ہے شہ کے پاس — کہ جوہر پرکھتا ہے جوہر شناس
کتا ہوں سخن مختصر بے گماں — کہ یو شاہ نامہ دکن ہے جان

دوسری تصنیف "گلشن عشق" ہے[۱] ۔ منوہر اور مدمالتی کے عشق کی منظوم داستان ۔ چار ہزار اشعار پر

لہ یہاں میں جناب نواب محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (صدر یار جنگ بہادر) کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس کا ایک قلمی نسخہ آپ کے کتب خانے میں موجود ہے جو راقم السطور کی نظر سے گزرا، اس کی تاریخ کتابت یہ ہے:

"کاتب الحروف شیخ طاہر محمد بن شیخ آدم تحریر فی التاریخ بستم شہر ذوالقعدہ بروز دوشنبہ بوقت عصر انصرام شد" ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۱۱۶۸ھ

ہر کہ خواند دعا طمع دارم — زانکہ من بندۂ گنہگارم
من نوشتم صرف کردم روزگار — من نمانم خط بماند یادگار

(بقیہ بر صفحہ آیندہ)

مشتمل ہے۔ تاریخ تصنیف یہ ہے ؎

دھریا اس کی تاریخ کا جب خیال — وہیں ہاتفِ غیب معجز مقال
کیا اس کی تاریخ ہاں ہجرتی — مبارک یو ہے ہدیۂ نصرتی

۱۰ ھ ۶۸

تیسری تصنیف معراج نامہ ایک سو اکیس اشعار حالات معراج پر ہیں۔ مصنف گل رعنا نے لکھا ہے:۔
"ایک پرانی بیاض میری نظر سے گزری جس میں نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل کیا ہے۔ تاریخ کتابت ۲۲ر محرم سنہ ۱۰۸۳ ہجری اس میں درج ہے اور اکبرآباد میں لکھا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نصرتیؒ کا کلام انھیں کی زندگی میں اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس کی نقلیں بیجاپور سے اکبرآباد تک پہنچ گئیں"۔[۱]

ہاشمی :۔ سید میراں، بیجاپور کے رہنے والے اور سید شاہ ہاشم بیجاپوری کے مرید تھے۔ مرشد کی فرمائش سے یوسف زلیخا[۲] اردو میں منظوم کی۔ چھ ہزار ابیات ہیں۔ ابتدا یوں کی ہے:

ثنا حمد اس کو سزاوار ہے — سگل عشق جس کا یو ستار ہے

تاریخ تصنیف ہے:

مرتب کیا میں یہ قصہ کو تو — ہزار اک برس پر تھے نو دیو نو

۱۰ ھ ۹۹

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) یہ تاریخ سنہ ۱۱۶۸ھ ہے یعنی سال تصنیف سے پوری ایک صدی بعد کتب خانہ حبیبیہ ہی میں مجھے ایک پند نامہ ملا اور میرا خیال ہے کہ یہ چیز ارباب علم و ادب کی نگاہوں سے اب تک مخفی تھی۔ انشاء اللہ آئندہ صحبت میں اس پر مزید خیالات پیش کروں گا

[۱] نصرتی کے کلام اور حالات کے لئے:۔

(۱) تذکرہ گل رعنا (۲) تذکرہ شعرائے دکن جلد دوم (۳) "نگار" جنوری سنہ ۳۵ھ (۴) لسان العصر جلد ۱ (۵) دتاسی (۶) اسٹوارٹ (۷) مارسے (۸) اسپرنگر (۹) ولسن (۱۰) "دکن اور اردو" (۱۱) یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[۲] ۔ اس کا ایک نسخہ شمس اللہ قادری مولف اردوے قدیم کے پاس تھا۔ تاریخ کتابت ۱۵ ربیع الاول سنہ ۱۱۷۱ھ ہے۔ دو نسخے جرمن اورینٹل سوسائٹی میں محفوظ ہیں۔ ان کی غزلیات کا ایک دیوان بھی تھا جو اب نایاب ہے۔ اس میں ریختی کا کلام بھی شامل تھا۔

ہاشمی۔ کے حالات و کلام کے لئے:

(۱) شعرائے دکن (۲) گل رعنا (۳) اردوئے قدیم (۴) یورپ میں دکھنی مخطوطات (۵) لسان العصر جلد ۱

شاہ ملک بیجاپور کے باشندے تھے اور علی عادل شاہ کے معاصر۔ انھوں نے بعض مذہبی مسائل اپنی کتاب احکام الصلوٰۃ میں منظوم کئے ہیں۔ یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ سنہ ۱۰۷۷ھ میں تمام ہوا جیسا خود لکھتے ہیں:

یو مسلیاں کو دکنی میں کیا اس سبب — فہم کر کے دل میں کرے یاد سب
سو یو شیس الف ہے ویم لام کاف — فرس کو دکنی میں لو لیا ہے صاف
ش ا م ل ک (= شاملک) — فارسی
سنہ ایک ہزار ہور ستر پو سات — کیا تھا اسی سال میں یو نکات
۱۰ ھ ۷۷

شاہ امین ۔ شیخ امین الدین اعلیٰ ۔ اولیائے کبار بیجاپور میں سے ہیں صرف تصوف ہی سے متعلق اشعار کہتے تھے۔ "رسالۂ قربیہ" اور رسالۂ وجودیہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ جواہر الاسرار آپ کے ارشادات کا مجموعہ ہے جسے آپ کے مریدوں نے مرتب کیا۔

ابن نشاطی[۵۱] ۔ گولکنڈہ کے باشندے اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ فارسی کتاب بساتین کا منظوم ترجمہ کر کے پھول بن نام رکھا ہے سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے تاریخ یوں کہی ہے:

اتھا تاریخ لایو تو یوں گلزار — اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پو چار

غواصی ۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں اُن کے متعلق فرمایا ہے۔

"غواص تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ (سنہ ۱۰۱۴ھ - سنہ ۱۰۳۷ھ) بود طوطی نامہ نخشبی[۵۲] را نظم نمودہ است بہ زبان قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی بطور ریکٹ کہانی ۔ سرسری دیدہ بودم شعران نظم یاد نیست۔

غواصی نے اس کی تاریخ یوں کہی ہے:

---

[۵۱] "اردوئے قدیم" ۔ انھوں نے ملا ضیاء الدین نخشبی بدایونی کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ بھی کیا جس کا ایک نسخہ مکتوبہ سنہ ۱۱۹۳ھ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ فہرست کتب خانۂ آصفیہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۰۰

[۵۲] ملا نخشبی بدایونی ۔

غواصی کے حالات کے لئے ۔ "میر حسن" ۔ "اردوئے قدیم" ۔ "دکن اور اردو" ۔ "یورپ میں دکھنی مخطوطات"

برس ایک ہزار ہور چالیس پہ نو[۹۹] ہوئے تھے یو موتیاں پرویا ہوں تو

۱۰   ۴   ۴۹

انھیں غواصی نے الف لیلہ کے فارسی ترجمے کے مشہور افسانہ "سیف الملوک و بدیع الجمال" کا ترجمہ کیا۔ تاریخ یہ ہے:

برس ایک ہزار ہور پنج تیس میں   کیا ختم یو نظم دن تیس میں

۱۰   ۴   ۳۵

طبعیؔ۔ گولکنڈہ کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ہمعصر تھے۔ نظامیؔ نے ایران کے ساسانیہ خاندان کے چودھویں بادشاہ بہرام کی حکایت "ہفت پیکر" لکھی ہے۔ طبعی نے اس سے ماخوذ قصہ بہرام وگل اندام نظم کیا ہے۔ دیباچہ راجو حسینی مرید حضرت سید محمد گیسو دراز کے نام سے ہے۔ خاتمہ پر ابو الحسن تاناشاہ جانشین عبداللہ قطب شاہ کی ستایش ہو۔ ابتدا میں یہ بیت ہے۔

الٰہی بچن کا مجھے تاب دے   مری جیب کی تیغ کوں آب دے

اس کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۸۱ھ ہے۔

فائزؔ۔ گولکنڈہ کے شاعر ابو الحسن تاناشاہ کے ہمعصر تھے۔ سنہ ۱۰۹۴ھ میں قصہ رضوان شاہ و روح افزا[۱] لکھا۔ ابتدا یوں کی ہے

اوّل نام حق کا لے بولوں سجن   بندوں اس کی توحید کھولوں دہن

خاتمہ پر یہ بیت ہے:

ہوا قصہ رضوان شاہ کا تمام   نبی ہور ولی پر ہزاروں سلام

تاریخ یوں کہی ہے

---

[۱] اس کا ایک قلمی نسخہ سنہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور ایک نہایت عمدہ اور مصور نسخہ منولال لائبریری گیا میں موجود ہے۔ اس پر میرے عزیز دوست زین العابدین (جماعت اُردو آنرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا مفصل مضمون سہیل کے اوراق میں ملے گا۔

اتھا جس وقت سال ہجرت ہزار ۱۰۰ اس اوپر نود اس کے اوپر چہار

۹۴ ھ ۱۰

ان کے علاوہ ملا قطبی - نوری - شاہی - رسمی - امین - سیوا - مومن - مرزا - وجہی - عاجز بھی مشہور شعرائے دکن میں سے ہیں[1]۔

یہ تو تھے عہد مغلیہ میں دکن اور شمال میں اُردو کے نمونے جن کے مطالعہ کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاہجہاں تو درکنار اردو عہد مغلیہ سے بھی قبل ظہور میں آچکی تھی۔ کیونکہ اگر یہ صحیح ہے کہ اردو فارسی و ترکی و عربی اور ہندوستانی زبانوں سے مرکب ہو کر عالم وجود میں آئی تو یہ ظاہر ہے کہ یہ چیز مغلوں سے بہت پہلے عہد تغلق ہی میں دکن میں ترکیب پا رہی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اردو مسلمان اور اہالیان ہند کا ایک لسانی مفاہمہ ہے اور کوئی سبب نہیں کہ اس کو صحیح تسلیم نہ کر لیا جائے تو اس میں بھی شک نہیں کہ اس مرکب کا نسخہ اُس وقت تیار ہوا ہوگا جب اہل ہند اور مسلمان پہلی مرتبہ باہم ملے ہوں گے اس موقع پر ناسخ کا بیان قابل توجہ ہے:

"زبان اُردو روزمرّہ شہر دہلی کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں قدیم الایام سے برابر زبان ہندی مروج تھی ہر شخص اسی زبان میں کلام کرتا تھا۔ جب ۵۸۸ھ میں سلطان معز الدین مشہور بہ شہاب الدین محمد غوری نے ملک ہند پر چڑھائی کی، اہل ہند کو شکست دی، رائے پتھورا کا کام تمام کیا، تمام ملک سلاطین غور کے اقتدار میں آیا۔ رفتہ رفتہ زبان قدیم میں لفظ فارسی و عربی و ترکی ملتا گیا۔ جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو باشندگان دہلی پر یہ ایک تازہ ظلم کیا کہ اُن کو شہر میں رہنے نہ دیا۔ دیوگیر المعروف بہ دولت آباد میں بھیج دیا۔ اور پھر قبل اپنی سلطنت کے زوال کے ان لوگوں کو دہلی میں بلا لیا۔ اس نقل و حرکت کے باعث بہت سے الفاظ دکنی بھی زبان دہلی میں مل گئے۔ یہی انداز گفتگو آخر عہد جہانگیر بادشاہ تک رہا لیکن جب شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۴۸ھ میں شہر شاہجہاں آباد کو آباد کیا تو شاہ جہاں آباد میں اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد لوگ مجتمع ہوئے۔ قدیم ہندی متروک ہونے لگی۔ محاورے میں فرق ہونے لگا۔ زبان اُردو کی

---

[1] ان کے مفصل حالات کے لئے:- (۱) "اردوئے قدیم" مولفہ شمس اللہ قادری (۲) "دکن اور اردو" "یورپ میں دکھنی مخطوطات" مرتبہ نصیر الدین ہاشمی (۳) تذکرہ شعرائے دکن (۴) فائل رسالۂ اردو۔ ان کے علاوہ مضمون کے آخر میں شغلی دکھنی کا بھی ذکر ہے۔

کی ترقی شروع ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔[1]

اُردو کے قدیم نمونے

اس کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس زبان کی ابتدا مسلمانوں کی آمد کے عہد سے وابستہ ہے دوسرے یہ کہ اس زبان کو سمجھنے اور بولنے والے دکن پہنچے مسلمانوں اور ہندوؤں کا ارتباط اور اختلاط سلاطین غوری کے عہد سے شروع ہوگیا تھا۔ جس وقت محمد غوری ہندستان پر حملہ آور ہوا دہلی کے تخت پر چوہان خاندان کا چشم و چراغ پرتھوی راج حکمراں تھا۔ پرتھوی راج کے دربار میں چندر کوئی نامی ایک شاعر تھا جس نے پرتھوی راج راسا لکھی ہے جو حقیقتاً اس عہد کی ایک قابلِ قدر تاریخ ہے۔ اس کی تصنیف کا زمانہ ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء ہے زبان کا نمونہ یہ ہے:

پتر پائے گھال پرتھی راج بانہہ دیں سلطانگ
کر سلام تہہ بارہ پری انگل سلطانگ

پتر پرور دگار پیگام رتئے لاہ کریم کے بار سرطان
جلال دیں جابا سرطان سہاب الدین اللہ پایا مسلمان

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لگت چوٹ چوہان کی ادرت تیلیس من گاری
بارہ بانس بین گج ۔ اونگل چار پہر مان

اس میں سلطان، سلام، پروردگار، پیغام، کریم، اللہ، مسلمان، فرمان وغیرہ اکثر الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اس عہد میں یقیناً سمجھے اور بولے جاتے ہوں گے۔

اب تک بیشتر مورخین اردو کا خیال یہ تھا کہ یہ کتاب اُردو کی اولین یادگار رہے لیکن جدید ترین کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۱۵۵ء میں نرپت لال نے جو ایک اَن پڑھ شاعر تھے ایک کتاب "ویسل دیو راسو" نظم کی تھی جسے ناگری پرچارنی سبھا نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ ذیل کے فارسی و عربی الفاظ استعمال میں آئے ہیں:

"کلا (کلاہ)، کبائی (قبا)، جرہ (ذرہ)، نیجا (نیزہ)، کرسانڑ (خراسان)، لواجا (لوازمہ)، تاجی (تازی)، پائگا (پائگاہ)، کتمگ (قسمت)، باجا باجا (بعض بعض)، چابکو (چابک)، تاجنڑو (تازیانہ)"[2]

اس کے بعد ہم عہد خلجی میں حضرت امیر خسرو کے کلام سے نمونے پیش کرچکے ہیں۔ عہد تغلق سے متعلق ہمارے پاس

---

[1] رسالہ "تحقیق زبان ریختہ" مولفہ عبدالغفور خاں نساخ۔ مولفہ ۱۲۸۵ھ مطبوعہ ۱۸۹۰ء

[2] اردو سہ ماہی رپورٹ ۱۹۲۷ء (ہندستانی اکیڈمی۔ یو۔ پی۔ الہ آباد)

دو شہادتیں موجود ہیں اور یہ دونوں اس عہد کی فارسی تاریخی کتب ہیں۔ ایک تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیائے برنی اور دوسری تاریخ فیروز شاہی مصنفہ عفیف سراج، ان میں اکثر ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے ثابت ہے کہ فارسی اور ہندی الفاظ کی آمیزش شروع ہو گئی تھی جس نے آگے چل کر اُردو کی مستقل شکل اختیار کر لی۔ ان دونوں تاریخوں میں جس قدر ہندی الفاظ آئے ہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں:

تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیائے برنی۔

ٹھگ (صفحہ ۱۸۸) ٹیکہ ہندواں (صفحہ ۲۲۰) منڈل (صفحہ ۲۱۶) گھٹی (صفحہ ۲۰) بہی پٹواریاں (صفحہ ۲۸۸) ڈھولک (صفحہ ۴۵۷) چبوترہ (صفحہ ۳۲) مٹھ (صفحہ ۳۴۴) منڈی غلہ (صفحہ ۳۰۴) ماش موٹھ (صفحہ ۳۵) ریوڑی (صفحہ ۳۱۶) تھانہ (صفحہ ۳۳) موڑا (موڑھا صفحہ ۳۷۳) چودھری (صفحہ ۲۸۸) بی بی (صفحہ ۳۷۳) بھٹی (صفحہ ۳۱۶)

تاریخ فیروز شاہی از عفیف سراج

راج (معمار صفحہ ۳۳۱) سوندھار (سنار (صفحہ ۳۳۱) بھیڑ۔ چھتر (صفحہ ۱۰۸)

لت (لات صفحہ ۳۷) گھڑیال (صفحہ ۳۴) درخت سینبل (صفحہ ۳۱۱) چونہ (صفحہ ۳۱) گھڑیال خانہ (صفحہ ۲۷۱)

اس کے بعد کبیر۔ گرونانک وغیرہ کا زمانہ ہے۔ ان کی زبان بھی اس امر کی شہادت ہے کہ یہ زمانہ مخلوط زبان کا تھا۔ کبیر[51] کی تصانیف سکندر لودی کے عہد کی زبان کا نمونہ ہیں:

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لئے بنائے | تا چڑھ ملّا بانگ دے کیا بہرا ہوا خدائے
کبیر سر پر سر ائے ہے کیوں سوئے سکھ چین | کوچ نگارہ سانس کا باجت ہے دن رین
دین گنوایو دنی سے دُنی نہ آیو ہاتھ | پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ[52]

گرونانک بھی کبیر کے ہمعصر تھے اور سکھ مذہب کے بانی۔ اُن کے دوہوں میں بھی فارسی و عربی کے

---

[51] چند غزلیں بھی کبیر سے منسوب ہیں مگر ان کی تاریخی سند مشتبہ ہے۔ ایک غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے ؎

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا | رہیں آزاد یا جگ میں ہمیں دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے | جو چلنا راہ نازک ہے ہمن کو بوجھ بھاری ہے

(عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء) حامد حسن قادری)

[52] "آب حیات" صفحہ ۱۶۔

الفاظ موجود ہیں مثلاً

ساس ماس سب جیو تمھارا — تو ہے کرا پیارا
نانک شاعر یو کہت ہے — سچے پروردگارا

تاریخ داؤدی میں ایک جگہ بابر اور سلطان ابراہیم کی جنگ کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جب ابراہیم کا سر کاٹ کر لایا گیا تو کسی نے یہ شعر پڑھے:

نو سے اوپر تھا بتیسا[۳۲] — پانی پت میں بھارت ہوا
آٹھیں رجب سکروار — بابر جیتا براہیم ہارا[۱]

اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ عہد خلجی اور عہد تغلق میں ایک مخلوط زبان رواج پانے لگی تھی۔ اس سے ہم ایک حد تک یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بیرونی الفاظ کو زبان میں داخل ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اگر یہ سچ ہے کہ اردو کی تخلیق ہندی اور اسلامی تمدن کے باہمی آمیزش و آویزش کا نتیجہ ہے تو ہم کو یہ امر بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اسلامی تمدن ہندوستان پر غوری سلاطین سے قبل ہی اثر انداز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس موقع پر شمس اللہ قادری صاحب مؤلف "اُردوئے قدیم" کا بیان نہایت اہم ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل سبکتگین کے زمانہ میں اُردو کی ابتدا ہوئی اس زمانہ میں مسلمانوں و ہندؤں میں بہت زیادہ میل جول ہوا[۵۲]"

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ غوری سے پہلے سلطان محمود غزنوی اقلیم ہند پر سترہ مرتبہ حملے کر چکا تھا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس نے یہاں کوئی مستقل حکومت قائم نہیں کی لیکن یہ یقینی امر ہے کہ اتنی آمد و شد کے سبب سے اکثر الفاظ جو ان مسلمانوں کے ساتھ ہونگے یہاں کی سرزمین پر باقی رہ گئے ہونگے۔ مثلاً ترک جس کو ہندی شاعری میں بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

ترکوا[۵۳] نے چھولئی گاگریا — کیسے کروں موری سا سریا

اس امر کا تاریخی ثبوت تاریخ فرشتہ سے ملتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندی زبان اور ہندی شعرا کی قدر افزائی کی۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:
"آنند بزبانِ ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستادہ، سلطان آنرا بفضلائے ہند و عرب و عجم

---

[۵۱] عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء مضمون حامد حسن قادری [۵۲] اردوئے قدیم [۵۳] دیباچہ فرہنگ آصفیہ مؤلفہ سید احمد دہلوی۔

کہ در ملازمت او بودند نمودہ، ہمگی تحسین و آفرین کردند۔"

یہ آنند جس کی بابت فرشتہ نے ذکر کیا ہے کالنجر کا راجہ تھا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۱۳ھ کا ہے۔

اسی طرح ہم محمد غوری سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر عہد غزنوی تک پہنچ جاتے ہیں۔ سلطان محمود کی وفات کے بعد جب مسعود بن محمود (سنہ ۴۲۱-۴۳۲ھ) تخت پر بیٹھا تو آلِ سلجوق نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی میراث پر اپنا سکہ جمایا۔ چنانچہ مودود بن مسعود بن محمود (سنہ ۴۳۲-۴۴۰ھ) کے زمانہ میں تو صرف ہندوستان اور افغانستان آلِ محمود کے زیرِ نگیں رہ گئے۔ آلِ سلجوق کی دراز دستی سے محفوظ رہنے کے لئے محمود کی اولاد امراء اور دیگر متوسلین نے جو وسط ایشیا کی دلفریب فضاؤں میں پلے تھے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ہندوستان کا رُخ کیا اور پنجاب میں ڈیرے ڈال دئے۔ ہندی و اسلامی تمدن کے ربط ضبط میں اب مستقلاً اضافہ ہونے لگا۔ چنانچہ فارسی شعرا بھی اکثر اپنے کلام میں ہندی الفاظ استعمال کرنے لگے۔ مولف اُردوئے قدیم کے حوالے سے علامہ سید سلیمان ندوی نے مسعود سعد سلمان اور ابو عبداللہ النکتی (عہد سلطان ابراہیم سنہ ۴۵۱-۴۹۲ھ) کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ فارسی کے مشہور شاعر گزرے ہیں اور ہندی شعر بھی کہتے تھے۔ حکیم سنائی غزنوی (سنہ ۵۴۵-۵۷۰ھ) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھے اپنے ایک قصیدے میں زبانوں کے اختلاف کو غیر اہم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎[۱]

تو بہ مرگ ہرگز بجائے نہ یابی	ز تنگِ نعمت ہائے امیتی و آنی
اسامی دریں عالم است ار نہ حاشا	چہ آب و چہ نان و چہ میدہ چہ پانی

اس میں میدہ اور پانی ہندی ہیں۔ پانی تو یقیناً ہندی ہے لیکن میدہ اکثر فارسی لغات میں بھی ملتا ہے لیکن علامہ موصوف (سلیمان ندوی) کا خیال ہے کہ موجودہ شعر میں لف و نشر غیر مرتب کی مناسبت سے یہ یقیناً ہندی ہے۔ اسی طرح مولف "پنجاب میں اردو" نے مسعود سعد سلمان کے دیوان کے ایک شعر کا ایک مصرعہ یوں نقل کیا ہے۔ ع

برآمد از پسِ دیوار حصن مارا مار

---

[۱] کلیات سنائی مطبوعہ بمبئی صفحہ ۹۶

اس میں مارا مار ہندی ترکیب ہے ۔ چنانچہ اسی حقیقت کو مدنظر رکھ کر آزاد لکھتے ہیں:

"اسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیے کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو کی طرف منسوب ہو گئی ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیاں ہوئیں اُن سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اپنا اثر شروع کر دیا ہوگا ۔ چند گوئی کا کلام مل گیا ۔ اس میں الفاظ موجود ہیں ۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے"[1]

اُردو کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُسے تشنہ کہا جا سکتا ہے لیکن اس کی تاریخی حیثیت قطعاً مسلّم ہے اور اس میں شک کی گنجایش نہیں ہے ۔ اس سلسلہ میں بعض مورخین کی خیال آرائی بھی کافی دلچسپ ہے ۔ مثلاً :-

(۱) سیّد انشا نے عہد شاہجہانی پر اکتفا کی ۔

(۲) میر امّن عہد اکبر تک پہنچے ۔

(۳) میر امّن کی شہادت نے بین اور گریرسن کو گمراہ کیا ۔ بین (Bean) نے میر امن کی باغ و بہار پر نظر کرتے ہوئے دیباچہ کتاب میں اردو کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں جو کچھ دیکھا اور پڑھا اس پر ایک اچھا خاصا نظریہ قائم کر دیا یعنی

"اکبر کے زمانے میں (سنہ ۱۰۱۴-۹۶۳ھ) جب راجہ ٹوڈر مل نے طریق مال گزاری کو رواج دیا تو ہندوؤں کو فارسی زبان سیکھنا لازم آیا اور اُسی عہد سے ہندی میں فارسی الفاظ کی آویزش اور آمیزش شروع ہوئی اور اس طرح ایک جدید زبان اُردو کی بنیاد پڑی"[2]

گریرسن نے سر چارلس لائل کو اس وادی کا امام مان کر (جنھوں نے ۱۸۸۰ء میں میر امن کی تحقیقات کو یورپ کے سامنے پیش کیا) ان کی پیروی کی اور اردو کی ابتدا کا زمانہ عہد اکبری قرار دیا اور اُسی فرسودہ خیال کو کہ اُردو حقیقتاً لشکر کی زبان تھی لشکر یا بازار میں بنی اور لشکری زبان یعنی اُردو زبان کہلائی اپنی مستند

---

[1] آب حیات [2] Bean's—A Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages of India. (PP. 15)

کتاب لنگوئسٹک سروے آف انڈیا[1] Linguistic Survey of India یعنی جائزہ لسانیہ ہندیہ میں ظاہر کیا ہے۔ سرسید نے لسانیات کے ایک ادنیٰ اصول کو مدنظر رکھ کر اپنے آپ کو اس غلطی سے بچا لیا جو اُن کے پیش رووں نے کی تھی۔ اُن کے ذہن نے اُن کی رسائی عہد خلجی تک کرائی۔ مغربی تذکرہ نویسوں نے اپنے اپنے قیاسات کی بنا پر مختلف حدود قائم کیں۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ[2] (Dr. Gilchrist) نے اُسے تیمور کے حملے کے وقت سے جا ملایا (یعنی ۸۰۰ھ–۱۴۰۰ء) ڈاکٹر کیلبروک[3] (Dr. Calebrook) نے بیان کیا کہ اس کی ابتدا پندرھویں صدی میں ہوئی۔ ایک دوسرے مورخ ڈاکٹر ونٹرنیز[4] Dr. Winternitz نے اُسے بارہویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان میں رکھا۔ عبدالغفور خاں نساخ[5] اسی حقیقت کی تلاش میں سلاطین غور تک ہماری رسائی کرا دیتے ہیں لیکن ہنوز دلی دور است کے مصداق آزاد[6] اور شمس اللہ قادری[7] اسی منزل کو دو چار قدم اور آگے بڑھا کر غزنوی عہد سے ملا دیتے ہیں اب ایک حیثیت سے ہمارے سلسلے کی سب کڑیاں مل جاتی ہیں اور واقعات کی یہ زنجیر یکساں ہو جاتی ہے۔ اُردو، ہندی اور اسلامی تمدن کے ربط سے پیدا ہوئی اور یہ ربط تاریخی حیثیت سے سلطان محمود غزنوی کے عہد سے شروع ہوا۔ لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ اُردو کی ابتدا بھی اسی عہد سے ہوئی۔

اہالیان عرب و فارس کے ہند سے تجارتی تعلقات اور اُردو کی داغ بیل

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد و شد محمود سے بہت قبل ہندوستان کے سواحل پر شروع ہو گئی تھی جس کو مدنظر رکھ کر علامہ سید سلیمان ندوی[8] اور نواب محمد حبیب الرحمن خاں صاحب

---

[1] Grearson's—Linguistic Survey of India, Vol. I, Part I. (PP. 164)

[2] Dr. Gilchrist's—Hindoostani Philology.

[3] Dr. Calebrook's—Asiatic Researches, Vol. III.

[4] Dr. Winternitz's—Geschichte der Indischem Litteratur, (PP. 139)

[5] نساخ۔ رسالہ در تحقیق زبان ریختہ۔

[6] آزاد۔ آب حیات

[7] شمس اللہ قادری۔ اُردوئے قدیم

[8] و [9] "مقالات اردو" مرتبہ انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شروانی نے اُردو کی داغ بیل مسلمانوں کی اوّلیں آمد (یعنی فتوحات سندھ) سے وابستہ کردی لیکن سوال یہ ہے کہ ہر زمانہ کو صرف مسلمانوں کے حملوں سے کیوں وابستہ کیا جائے۔ طلوع اسلام سے قبل اہالیان عرب و فارس بحیثیت تجار سواحل ہند پر وارد ہوتے رہے اس لئے جہاں تک عربی فارسی اور ہندی الفاظ کے خلط ملط ہونے کا تعلق ہے اس کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے نہیں بلکہ عربی اور فارسی تجار کی آمد سے کرنا چاہیئے۔

عرب سے ہند کے تعلقات جس قدر وسیع تھے ان کا بیان اس جگہ ممکن نہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی مشہور تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات"[۵۱] میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے جس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ عربوں کے یہ تعلقات طلوع اسلام سے بہت قبل دراز ہو چکے تھے۔ یہاں اس امر کو بھی خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں بعض ایسے الفاظ بھی راہ پا گئے ہیں جن کی اصل ہندی ہے اور جن اشیاء پر ان کا اطلاق ہوتا ہے وہ صرف ہندوستان میں پائی جاتی ہیں مثلاً صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کرن پھل) وغیرہ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو قدیم تجارتی تعلقات کے دوران میں ہندوستان سے منتقل ہو کر عرب پہنچے اور کثرت استعمال سے عربی کے جزو بن کر رہ گئے۔ جب یہاں کے الفاظ وہاں کی زبان میں منتقل ہوئے تو یہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہاں کے الفاظ یہاں کی زبان میں دخیل ہوئے ہونگے لہذا اُردو کی تار و پود کا زمانہ میرے نزدیک اسی عہد کو قرار دینا چاہیئے۔

اوّلیں مسلمان اور اُردو

مسلمان حملہ آوروں نے زبان کے بڑھتے ہوئے پودے کو مزید تازگی بخشی جو مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر اُردو کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

مسلمانوں کی یہ آمد امیر المومنین حضرت عمر (۱۳-۲۳ھ) کے عہد سعادت ہی سے شروع ہو گئی تھی[۵۲]۔ ۱۵ھ میں عثمان بن عاصی الثقفی نے جو عمان اور بحرین کے حاکم تھے سواحل ہند پر حملہ کیا۔ ان کے جنگی جہاز بمبئی کے قریب تانہ پر لنگر انداز ہوئے۔ اس کے چند ماہ بعد دو اور مہیں ہندوستان کی جانب روانہ ہوئیں جن کے افسران مغیرہ اور حکم تھے۔ مغیرہ نے دیبل پر اور حکم نے بروص (بھروچ) پر یورش کی لیکن ان کا کوئی کامیاب

---

۵۱ "عرب و ہند کے تعلقات" مطبوعہ اردو اکاڈیمی یو۔پی (الہ آباد)

۵۲ اُردوئے قدیم مؤلفہ شمس اللہ قادری۔

نتیجہ نہیں نکلا۔ ۲۲ھ میں فتح ایران کے بعد مسلمان عراق سے خراسان تک تمام ممالک پر قابض و متصرف ہوگئے تھے۔ ایران کے وہ ممالک جو ہندوستان سے ملحق تھے مثلاً مکران، سیستان، تخارستان، زابلستان وغیرہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں (۲۳-۳۵ھ) مفتوح ہوئے۔ ۴۲ھ میں امیر مہلب بن ابی صفرہ نے کابل کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ کیا اور لاہور تک پہنچ گئے۔ اس مہم میں ملتان سے کابل تک کے تمام ممالک اسلامی تصرف میں آگئے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بیس سال تک سندھ پر پے بہ پے حملے کئے اور بہت سے سرحدی اور ساحلی مقامات کو فتح کر لیا۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۵-۸۶ھ) کے زمانہ میں جب حجاج بن یوسف ثقفی عراق کا گورنر ہوا تو اس نے سندھ پر کئی مہمیں روانہ کیں ان میں سے ۸۶ھ کی مہم نہایت کامیاب ہوئی، اس کا افسر محمد بن قاسم تھا جس نے سب سے پہلے دابل فتح کیا۔ پھر فتوحات کا دروازہ کھل گیا اور محمد بن قاسم نے ملک کے اندر قدم بڑھانا شروع کیا۔ ۹۶ھ تک بھمن آباد، الور اور ملتان فتح ہوگئے اور سندھ پر مسلمانوں نے بالاستقلال قبضہ کر لیا، اس کے بعد محمد بن قاسم معزول ہو کر دربار خلافت میں چلا آیا اور اس کی بجائے تمیم سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔

فارسی اور انگریزی مورخین کا یہ بیان بالکل غلط ہے کہ محمد قاسم کے بعد سندھ کی اسلامی حکومت تباہ ہوگئی اور ملک پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا۔ بلکہ عربی تاریخوں سے ثابت ہے کہ خلیفہ الواثق باللہ (۲۲۷-۲۳۳ھ) کے زمانہ تک دربار خلافت سے سندھ میں گورنر مقرر ہو کر آتے تھے اور منصورہ ان کا مستقر حکومت تھا، جب خلافت بغداد پر انحطاط طاری ہوا تو سندھ میں خلفاء کی حکومت برائے نام رہ گئی اور ملک میں عربوں کے جو قبائل موجود تھے ان کے سرداروں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کریں، یہ حکومتیں کشمیر کی سرحد سے بحر فارس اور سیستان و مکران تک پھیلی تھیں، اور ان کے حکمراں ملک سندھ پر قابض و متصرف تھے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر جس قوم اور جس ملک کو سب سے پہلے پیام توحید پہنچایا وہ اہالیانِ سندھ اور سرزمین سندھ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے تمدن اور ان کی زبان نے بھی جو نیرنگیاں دکھائیں ان کی ابتدا اسی ایک خطہ سے ہوئی ہوگی، اس سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی اور نواب صدر یار جنگ محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے اپنے مقالات[۱] میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری رہبری قدیم سیاحوں کے سفر نامے

---

[۱] "مقالات اردو" یعنی مجموعہ مقالات سید سلیمان ندوی و محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرتبہ انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کرتے ہیں، جن میں حالات سفر کے ساتھ ہی ساتھ ممالک کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے، انھیں میں سے بغداد کا سیّاح اصطخری ہے جو ۳۴۰ھ میں یعنی سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ سال پہلے سندھ اور ملتان آیا، وہ لکھتا ہے:-

"منصورہ (موجودہ بھکّر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی و سندھی ہے اور مکران والوں کی زبان مکرانی اور فارسی ہے"۔ (سفرنامہ اصطخری طبع لیڈن صفحہ ۱۷۷)[۱]

ابن حوقل ۳۵۰ھ میں آیا، وہ بیان کرتا ہے کہ

"ولسان اہل المنصورۃ وملتان و نواحیھا العربیۃ والسندیۃ ولسان اہل المکران الفارسیہ والمکرامیۃ" (سفرنامہ المسالک والممالک)

۳۷۵ھ میں بشاری مقدسی ملتان آیا۔ بیان کرتا ہے کہ :-

"دیبل سمندر کے ساحل پر ہے اور اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں، اکثر غیر مسلم ہندو ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر ٹکراتا ہے، یہ سب سوداگر ہیں اور ان سب کی زبان سندھی اور عربی ہے۔

سندھی اور اُردو

اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سندھ میں ایک مخلوط بولی رائج تھی جو دیسی زبانوں اور عربی و فارسی کے اختلاط باہمی سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اُردو کی طرح سندھی بھی فارسی اور عربی الفاظ کی گراں بار احسان ہے، اور سندھی کا رسم الخط بھی قطعاً عربی نسخ ہے (جو اُردو کے قدیم دکھنی نمونوں کا بھی ہے) اور عربی و فارسی الفاظ مثلاً جبل بمعنی پہاڑ اور بصل بمعنی پیاز سندھی میں موجود ہیں، اور اکثر الفاظ مثلاً محبت، عشق، عداوت، قرب وغیرہ جس طرح اُردو میں مستعمل ہیں سندھی میں بھی ہیں، اس بیان سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اردو سندھی کی شاخ ہے بلکہ حقیقتہً ایک ملغوبہ زبان مختلف صوبوں، مختلف زبانوں سے مختلف زمانوں میں تشکل ہوتی رہی جس نے بالآخر عہد شاہجہانی میں اُردو نام پایا۔ ملتانی اور سندھی اور پنجابی بہت کچھ ملتی جلتی نظر آتی ہیں اور اُردو بھی ان سے غیر مانوس نہیں ہے لیکن یہ کہنا کہ اُردو[۲] اُسی زبان کا نام ہے جو مسلمان پنجاب سے ساتھ لے کر دہلی گئے، دیگر الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ اُردو پنجابی سے ماخوذ ہے

---

[۱] ماخوذ از "مقالات" [۲] "پنجاب میں اُردو" مولفہ محمود شیرانی۔

یا اسی سے ترقی یافتہ ایک نمونہ ہے، مجھے اس سے اختلاف ہے۔

پنجابی اور اُردو

اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب میں بہ نسبت دہلی کے مسلمان پہلے پہنچے اور پنجاب ہی سے ایک زبان لے کر دہلی آئے، لیکن وہ زبان خالصتہً پنجاب کی نہ تھی۔ میرا خیال یہ ہے (جیسا کہ میں بیان بھی کر چکا ہوں کہ اُردو کی تخم ریزی سندھ سے اور سندھ میں ہوئی۔ سندھی، ملتانی اور پنجابی اپنی قواعد میں بہت کچھ ملتی جلتی نظر آتی ہیں پہلے سندھی پر فارسی عربی اثر غالب ہو کر ایک ہیولیٰ تیار ہوا ادھر غزنوی حملہ آور اور مہاجرین کی فارسیت کا اثر پنجاب پر ہوا دونوں علاقوں کے "ملفوبے" حضرت خواجہ مسعود فریدالدین شکر گنج جیسے بزرگوں کے کرم سے مل گئے حضرت موصوف ملتان میں پیدا ہوئے اور لاہور میں آبسے، سندھ کی مخلوط زبان پر حاوی تھے۔ ادھر مخلوط پنجابی پر بھی قدرت حاصل کی اور جب شمس الدین التمش نے ۶۱۵ھ میں ملتان اور سندھ کو بھی دہلی میں ملا لیا تو مخلوط سندھی اور مخلوط پنجابی ممزوج ہو کر دہلی آئی اور بالآخر اُردو کہلائی۔

دکن میں اُردو کی داغ بیل

دوسری طرف محمد تغلق نے دہلی اجاڑ کر دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا۔ دلّی والوں کے ساتھ ان کی زبان بھی پہنچی۔ زمین قسمت سے شاداب مل گئی تھی، ترقی کی اور ایسی ترقی کہ دلی سے پہلے اور کہیں زیادہ پھل وہیں آئے۔ یہی برگ و ثمر دہلی میں آکر کچھ کے کچھ ہو گئے جن پر فی الحال مزید خیال آرائی کا موقع نہیں، ارباب بصیرت خود دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔"
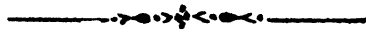
اس سلسلہ میں میں نے جن مقالات یا تذکروں سے مدد لی ہے اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

(۱) تذکرہ نکات الشعراء میر تقی میر (۲) تذکرہ ریختہ گویاں، گردیزی (۳) تذکرہ شعرائے اُردو، میر حسن (۴) تذکرہ گلزار ابراہیم، علی ابراہیم (۵) تذکرہ گلشن ہند، مرزا علی لطف (۶) گلشن بیخار، مصطفےٰ خاں شیفتہ (۷) تذکرہ شعرائے گجرات، فائق (۸) سخن شعراء، عبدالغفور خاں نساخ (۹) تذکرہ شعرائے دکن، عبدالجبار صوفی ملکاپوری (۱۰) گلِ رعنا، عبدالحی (۱۱) آبِ حیات، آزاد (۱۲) مخزنِ نکات، قائم چاندپوری (۱۳) چمنستان شعراء، شفیق (۱۴) تذکرہ ہندی گویاں، مصحفی (۱۵) طبقات الشعراء، کریم الدین (۱۶) جلوۂ خضر، صفیر بلگرامی

(۱۷) تاریخ ادب اردو، مصنفہ سکینہ مترجمہ عسکری (۱۸) پنجاب میں اردو، محمود شیرانی (۱۹) اردوئے قدیم شمس اللہ قادری (۲۰) نمونۂ منشورات، احسن مارہروی (۲۱) اردو سروے رپورٹ، ضامن علی (۲۲) مقالات اردو سلیمان ندوی و حبیب الرحمان شروانی (۲۳) دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی۔ (۲۴) یورپ میں دکھنی مخطوطات نصیر الدین ہاشمی (۲۵) مغل اردو، نصیر حسن خیال (۲۶) تذکرہ گلستان سخن، قادر بخش صابر (۲۷) تذکرۂ شعرائے دکن، سردار علی حیدرآبادی (۲۸) تذکرہ گلستان سخن، صہبائی (۲۹) تذکرہ بزم سخن، سید علی خاں (۳۰) تذکرہ طور کلیم، نور الحسن خاں۔

مذکورۂ بالا تذکرے تقریباً سب ایسے ہیں جو طبع ہو چکے ہیں اگرچہ اُن میں سے اکثر نایاب ہیں۔ اردو تذکروں سے براہِ راست مستفید ہونے کے لئے صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کی ایما و ہدایت سے مجھے تعطیلوں میں حیدرآباد جانے کا موقع ملا جہاں قدیم اردو پر کافی مواد جمع ہے۔ اس سفر میں مجھے اکثر چیزیں ایسی ملیں جو اب تک صرف حوالہ کی حد تک تھیں اور جن کی اہمیت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ اُن کو منظرِ عام پر لایا جائے، اُن میں سے بعض یہ ہیں:۔

تحفۃ الشعراء اس کے مصنف محمد افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی ہیں تذکرے کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو شعراء کے اولین تذکروں میں ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے "تذکرہ شعرائے اردو" کو اردو کا اولین تذکرہ قرار دیا ہے لیکن یہ بات تحقیق ہو چکی ہے کہ میر حسن سے برسوں پہلے میر تقی نے ۱۱۶۵ھ میں "نکات الشعراء" تصنیف کی نظر بران اب تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ میر کے بعد میر حسن ہی نے سب سے پہلے تذکرہ لکھا۔ میر حسن کے اس تذکرے کی ترتیب ۱۱۸۸-۹۲ھ کے درمیان ہوئی۔ افضل قاقشال کا زیر نظر تذکرہ ۱۱۶۵ھ کی تصنیف ہے یعنی میر حسن کے تذکرے سے ۲۳ سال پرانا۔ اس کی تاریخ غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھی ہے:

قدردانِ صاحبانِ معنی افضل بیگ خاں — کرد تالیفے مرتب از پئے اربابِ شعر

کلکِ او بر لوحِ گیتی بست نقشِ تازۂ — میشود تاریخ سالش تحفۂ اصحابِ شعر

۱۱۶۵ھ

دوسری تاریخ عارف الدین خاں عاجز نے کہی:

نسخۂ تازہ چو مرزا افضل — کرد تالیف بنامِ شعراء

سال اتمام سخن عاجز گفت   تحفۂ روح کلام شعراء

جہاں تک مجھے علم ہے دکن میں اس سے پہلے کوئی اور تذکرہ نہیں لکھا گیا البتہ اسی سنہ (یعنی ۱۱۶۵ھ) میں ایک اور تذکرہ تالیف ہوا یعنی گلشن گفتار مرتبہ خواجہ خاں حمید۔

مجھے قاقشال کے تذکرے کے دو نسخے ملے، پہلا نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۱۷۱ صفحات پر مشتمل ہے، ایک سطر مشکوک ہے۔ "تحت الکتاب بعون الملک الوہاب بتاریخ......." اس طرح اس نسخہ کی تاریخ کتابت معلوم نہ ہو سکی بہت تلاش کے بعد اسی کا ایک دوسرا نسخہ ملا جس پر تاریخ کتابت اس طرح درج ہے:۔

"تمام شد نسخۂ تحفۃ الشعراء بتاریخ بست وہفتم شہر ذیقعدہ ۱۱۸۰ھ"

تاریخ کتابت بھی میر حسن کے تذکرے کی تاریخ تکمیل سے پہلے کی ہے اس میں فارسی گو شعرا بھی شامل ہیں کل تعداد شعرا کی ۵۶ ہے اس میں شعرا کے حالاتِ زندگی اور کلام کا نمونہ دونوں شامل ہیں۔ نمونتاً سراج الدین اورنگ آبادی کا حال نقل کرتا ہوں:

"شاہ سراج الدین اورنگ آبادی، سید صحیح النسب، اجدادش مشائخیں بودند.......

تا ہفت سال بروضۂ منورہ حضرت شاہ برہان الدین غریب قدس سرہٗ دیوانہ وش ماندو بحالت بے اختیاری بکوہ وصحرا می گشت بہ صحبتِ فقرا می نشست، ترک لباس نمودہ بہ لذت درویشی آشنا گردید طبع موزوں داشت و در فکر ریختۂ ہندی صاحب قدرت، بہ سبب شوق اشعار ریختہ ہجوم امردانِ خوبصورت در کلبہ اش می باشد رسول خاں نامی از منظوران او دیوانِ ریختہ ترتیب دادہ، فکر اشعار فارسی ہم می نماید"۔

علاوہ اردو اشعار کے فارسی کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔

یاد رکھ اے دل خوں گشتہ کہ جیوں تکمۂ لعل   جامہ زیبوں کے گریباں کا گلوگیر نہ ہو

ہوا ہے دست بیعت خاں وادی ہیں تیری غم کی   رہے گا سلسلہ آنسو کا جاری روز محشر تک

شعر رنگین کی غزلوں کو کیا صید سراج   رشتۂ دام ہے تارِ نگہ چشم خیال

دونوں نسخوں کا مقابلہ، ان تذکروں سے شعرا قدیم کے حالات پر جو روشنی پڑتی ہے اور جن نئی باتوں کا

انکشاف ہوتا ہے میری رپورٹ متعلق سفر حیدرآباد میں ذکر ہوگا۔

(۲) بہار و خزاں مرتبہ میر بہاء الدین عروج اورنگ آبادی یہ وہ نایاب تذکرہ ہے جس کا حوالہ اکثر جگہ ملتا ہے مگر اصل نسخہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بہت جستجو کے بعد مجھے یہ تذکرہ بھی مل گیا' صاحب تذکرہ اس کی ترتیب کے وقت ہی ۱۲۳۰ھ میں انتقال فرما گئے اور عرصہ تک یہ پڑا رہا۔ مرحوم کے صاحبزادے نے اس کو ترتیب دیا۔

چھوٹی تقطیع کے ۱۲۶ صفحات پر ہے' اس سے اکثر شعراء کے متعلق ایسی معلومات ہوتی ہیں جو دیگر تذکروں میں عنقا ہیں' نمونتاً ایک شاعر کا حال نقل ہے:

"صاحبِ والا فطرت حضرت سید عبد الولی عزلت پسر سید سعد اللہ قدس سرہٗ اصلش از معمورۂ بریلی است و مولد و منشایش بندر سورت' کتب متداولہ عربیہ ہمہ آموختہ است و از فارسیہ نیز بہرہ اندوختہ' خوشگو و خوش صحبت ست کہ خدایش سلامت دارد"

کم و بیش ۹۷ شعرا کا حال درج ہے۔ اکثر ایسے ہیں جن کا پتہ اس کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا سنا ہے اس کا ایک اور نسخہ بھی تھا جو دریائے موسیٰ کی طغیانی میں برباد ہو گیا۔ اس وقت جہاں تک مجھے علم ہے اس کا صرف ایک نسخہ موجود ہے' یہ بھی بہت بوسیدہ ہو چکا ہے اور اگر طباعت کی جلد نوبت نہ آئی تو شاید بالکل مٹ جائے گا۔

(۳) تذکرۂ ریاض حسنی مرتبۂ عنایت اللہ فتوت' مصنف نے تاریخ ترتیب اس رباعی سے نکالی ہے'

تاریخ بنائے این ریاض حسنی — جستیم ز فیض آلِ مدنی
از روئے سر بدل ہاتف بر گفت — گلدستۂ ریحان بہارِ معنی

اصل نسخہ میں ۱۱۵۰ھ ہیں مگر اس مصرعہ سے صرف ۱۱۶۶ھ نکلتے ہیں پہلے مصرعہ کے بدل کی ب کا تمیہ ہو کر ۱۱۶۶ھ ہونا چاہیئے' اس نسخہ میں ۲۱۲ صفحے ہیں اور تقریباً ہر صفحہ میں بارہ سطریں ہیں' کم و بیش ۱۰۲ شعراء کا حال درج ہے' اکثر شعراء کے متعلق نئی باتیں ملتی ہیں نمونہ:

"نصرتی' سخن طراز دکن است' مسکنش بیجاپور۔ اکثر قصہ ہا و دیوان ہا بزبان ہندوی مرتب ساختہ و در آں تلاشہا بسیار کردہ داد معنی یابی دادہ و قتیکہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی

انا لاللہ بر ہانہ ولایت دکن را در تسخیر درآورد و حکم نفاذ داد کہ سخن سنجان ایں ملک را در نظر گزرانند بموجب حکم گزرانیدند، کلام نصرتی را برہمہ افضل فرمود، بہ خطاب "ملک الشعرائے ہند" سرفرازی یافت چنانچہ در مدح عاشق شہ باز بلند پرواز سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بکمال خشوع و خضوع می سراید"

اس کا یہ نسخہ خواجہ اکرم کے ہاتھ کا لکھا ہے جن کی فرمائش پر قتوت نے اس کی ترتیب شروع کی تھی، اس وجہ سے یہ کافی مستند ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے اس کا صرف ایک ہی نسخہ اس وقت موجود ہے۔

(۴) طبقات الشعراء

مرتبہ قدرت اللہ شوق سنبھلی، دکن میں جس قدر تذکرے لکھے گئے اُن میں سب سے اہم اور قابل قدر یہ تذکرہ ہے، جس قدر شعراء کے انتخاب کلام اور ذکر حال پر یہ تذکرہ حاوی ہے اس زمانہ میں اور کوئی تذکرہ نہیں، مصنف نے لکھا ہے یہ ۱۱۸۸ھ کی تصنیف ہے، اس کا کاتب فیض علی اور سنہ کتابت ۱۲۱۰ھ ہے دوست محمد خاں خلف الصدق خاں صاحب نصرت خاں حاکم کی فرمائش پر لکھا گیا، اس کا اصول بھی جداگانہ ہے۔ قدیم طرز یہ تھا کہ ردیف وار حالات درج ہوتے عام طور پر صرف نام تخلص عام حالات اور نمونۂ کلام پر اکتفا کی جاتی اکثر صرف تخلص اور ایک شعر ملنے پر شاعر کو شاعروں کے طبقہ میں جگہ مل جاتی، سب سے پہلے قائم نے دور قائم کئے، پھر میر حسن نے اسی طرح عام رواج ہو گیا لیکن تاریخی پہلو پر کوئی تذکرہ خصوصیت سے روشنی نہیں ڈالتا۔ یہ تذکرہ ان عیوب سے پاک ہے اور اپنی قسم کا سب سے پہلا اور سب سے آخری تذکرہ ہے۔

طبقۂ اوّل۔ در بیان ایجاد شعر ریختہ و ذکر شعرائے دکھنی و بعضے معاصران آنہا اس میں لکھا ہے کہ بعض سعدی شیرازی کو موجد ریختہ کا قرار دیتے ہیں اور بعض سعدی دکھنی کو لیکن چونکہ امیر خسرو پر اتفاق ہے لہٰذا اُن کے نام سے شروع کیا ہے پھر ولی۔ سعدی دکھنی عبدالولی عزلت، ملا نوری دکھنی، فخری، میر عبداللہ تجرد، عظام، عطا جعفر زٹلی، عبدالقادر بیدل وغیرہ کا ذکر ہے (۲۱ شعرا)

طبقۂ دوم۔ شاعرانِ ایہام گو۔ (۲۰ شعراء)

لکھتے ہیں:۔ "بعد از طبقہ شاعران دکھن کہ معاصران ولی بودند رواج ایہام بسیار شد و ایہام عبارت است

از لفظے کہ دو معانی داشتہ باشد قریب و بعید البعید منظور شاعر باشد و قریب متروک'

طبقۂ سوم۔ در ذکر شعرائے متاخرین و بعضے نو مشقان دیگر۔ (۴۸ شعراء)

لکھتے ہیں "میگویند کہ اوّل کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ فی الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروّج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقۂ پیغمبر مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر......"

طبقۂ چہارم۔ در ذکر شعرائے تازہ گو و بعضے نو مشقان دیگر مشتمل بر پنج مقالات۔

مقالۂ اوّل۔ در ذکر بعضے تازہ گویاں (۵۵ شعراء)

مقالۂ دوم۔ در ذکر بعضے سلاطین روزگار و وزرائے نامدار و امرائے والا تبار و بعضے منصبداران سرکار فیض آثار و مصاحبان (اس میں شاہی خاندان کے افراد کا ذکر ہے) (۲۱ شعراء)

مقالۂ سیوم۔ در ذکر بعضے امرائے افغانان ایں دیار۔ (۲۰ شعراء)

مقالۂ چہارم۔ در ذکر بعضے عزیزان و یاران ہمدم و دوستداران ثابت قدم۔ (۱۱ شعراء)

مقالۂ پنجم۔ در ذکر بعضے برادران و خویشاں و دوستداران و یاران دل ریشاں و بعضے نو مشقاں کہ چنداں مایۂ شاعری ندارند و بہ سبب موزونی طبع خود را از خود زیادہ پنداشتہ در جرگۂ شعراء می شمارند (۱۹ شعراء)

سب سے آخر میں اپنا حال اور نمونۂ کلام درج ہے، کل ۲۰۷ شعرا کا حال ہے۔ تاریخی واقعات جسقدر اس تذکرے میں ہیں اور کہیں نہیں ملتے۔ شعراء کے کلام پر اصلاح، اُن کی غلطیاں اور اُن کی مدح اپنی جگہ پر موزوں ہیں بیجا مدح و ستایش سے گریز ہے یہ تذکرہ بہت اہم ہے اس کے اور دیگر تذکروں کے متعلق مفصل حالات میری رپورٹ سفر حیدرآباد میں دیکھیے۔

(لیث)

ہجر، اور برسات کی ابتدا

(حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

چھا گئی برسات کی کالی گھٹا، اب کیا کروں
خوف تھا جس کا وہ آپہونچی بلا، اب کیا کروں

ہجر کو بہلا چلی تھی گرم موسم کی سموم
ناگہاں چلنے لگی ٹھنڈی ہوا، اب کیا کروں

آنکھ اُٹھی ہی تھی کہ ابرِ لالہ گوں کی چھاؤں میں
درد سے کہنے لگا کچھ جھٹپٹا، اب کیا کروں

اشک ابھی تھمنے نہ پائے تھے کہ بیدردی کے ساتھ
بُوندیوں سے بوستاں بجنے لگا، اب کیا کروں

زخم ابھی بھرنے نہ پائے تھے کہ بادل چرخ پر
آگیا انگڑائیاں لیتا ہوا، اب کیا کروں

آچلی تھی نیند سی غم کو کہ موسم ناگہاں
بحر و بر میں کروٹیں لینے لگا، اب کیا کروں

چرخ کی بے رنگیوں سے سُست تھی نبضِ فراق
یک بیک ہر ذرّہ گلشن بن گیا، اب کیا کروں

قفلِ بابِ شوق تھیں ماحول کی خاموشیاں
دفعتہً کافر پپیہا بول اُٹھا، اب کیا کروں

آنکھ جھپکانے لگی تھی دل میں یادِ حسنِ یار
مور کی آنے لگی بن سے صدا، اب کیا کروں

ہجر کا سینے میں، کچھ کم ہو چلا تھا پیچ و تاب
بال بکھرانے لگی اُودی گھٹا، اب کیا کروں

گھٹ چلا تھا غم کہ رنگیں بدلیوں کی آڑ سے
اُن کا چہرہ سامنے آنے لگا، اب کیا کروں

آ رہی ہیں ابر سے اُن کی صدائیں "جوشؔ، جوشؔ"
اے خدا اب کیا کروں، بارِ خدا، اب کیا کروں

پال گوگان   تہتی کی دو عورتیں

غزل گوئی پر ایک نظر

مولانا اقبال احمد سہیل ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

تنقید نگاری اور وہ بھی اپنے ہمعصروں کے نتائج فکر پر۔ ممکن ہے کسی کے لئے دلچسپی کا باعث ہو، مگر میرے خیال میں
تو اس سے زیادہ صبر آزما اور حوصلہ شکن کوئی ادبی مشغلہ نہیں ہے، یہی ایک صنعت تحریر ہے جس میں حق و باطل برابر درجے کی معصیت
ہیں، اور یہی ایک دنیا ہے جہاں صدق و کذب یکساں طور پر داخل جرائم ہیں، بے غرضانہ ستائش اور بے لوث اعتراف
حق، اخلاق انسانی کا ایک شرف ہے، مگر دیار تنقید کی آب و ہوا میں اس کی ماہیت بدل جاتی ہے، اور اس کا لقب یا تو قصیدہ
خوانی دیا فروتنی ورنہ کم سے کم غلط بخشی رکھا جاتا ہے، خردہ گیری اور ناتواں بینی کہیں اور مذموم ہو تو ہو مگر اس بزم مغاں
کے فیض سے یہی عیب دفعتہً ہنر بن جاتا ہے، غضب ہے خدا کا، مشاعرے میں جہاں ایک نومشق اور بر خود غلط متشاعر آپ
کے سامنے قوالی یا بزم رقص کی نقالی کرتا ہے، اس کی ہر لایعنی ہرزہ سرائی پر جھوٹی واہ واہ کے شور و غل سے ہنگامۂ قیامت
برپا کر دینا تو تہذیب سخن فہمی کا ضروری رکن ہے، مگر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اور شاعر کے پس پشت اس الہام شعری پر جو
شاعر یا راوی کے جنبش چشم و ابرو اور نغمہ سرائی سے بے نیاز ہے، زبان قلم سے اضطراراً بھی حرف تحسین نکل جانا ایک
ایسی معصیت ہے جس کا کوئی کفارہ نہیں، ایک طرف تو ممدوح خود بھی خوش نہیں ہوگا، کیونکہ آپ جو کچھ کہیں گے، اس کے
توقعات سے فروتر ہوگا۔ دوسری جانب تمام مدعیان شاعری آپ کے نام سے بیزار ہو جائیں گے، اسی کو کہتے ہیں۔
ازیں سو رانده وازاں سو درمانده، یہاں تک تو مصائب تنقید نگاری کی قسط اول ہے، آگے چل کر جو مرحلہ پیش آتا ہے،
وہ اور بھی حوصلہ فرسا ہے، اگر ایک بار استحقاقاً آپ سے تنقید نگاری کی غلطی سرزد ہو گئی تو مدۃ العمر کے لئے اخلاقاً اس کا
اعادہ آپ پر فرض ہو گیا، جماعت انسانی میں اختلاف مذاق فطری ہے، اور اس سے بھی زیادہ فطری ہے خود بینی اور
خوشامد پسندی۔ فطرت کے ان دو متضاد مقتضیات کا باہمی تصادم تنقید نگار کے لئے عذاب الیم ہو جاتا ہے، اگر آپ نے
اپنے ذوق کے مطابق کسی کے تصنیف یا شعر کے محاسن قلمبند کر دئے، تو مصنف اور شاعر کے سوا بقیہ ارباب فن اس کو
شاعرانہ مبالغہ سمجھیں گے، اور ہر شخص اپنے نتائج فکر کی نسبت اسی مداحی کا متمنی ہوگا، یہاں تک کہ تقاضوں سے آپ
گھبرا اٹھیں گے، اب اگر موضوع تنقید کو ناقابل اعتنا سمجھ کر یا عدیم الفرصتی کی بنا پر آپ نے خاموشی اختیار کی تو روابط اخلاص
کا خون ہوا، اور اگر اپنا عزیز وقت ضائع کر کے آپ نے حتی الوسع محتاطانہ انداز میں اپنی سچی رائے کا اظہار کر دیا، تو شکریہ

کیسا الٹی شکایت مول لی۔

الغرض نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن مخلص محترم حضرت اصغرؔ گونڈوی کے (نشاط روح) کے متعلق محض وجدان صحیح سے مجبور ہو کر زبان قلم سے جو حرف حق تراوش کر گیا تھا اُس کی تلخی کا شکوہ اب تک فضا میں گونج رہا ہے، محب مکرم جناب نیازؔ فتحپوری (?) موہانی نے جس نکتہ سنجی کے ساتھ غالبؔ مرحوم کی مدافعت کی تھی، اس کی داد نہ دینا انصاف کی جان پر ستم تھا۔ مگر اس پر بھی چہ میگوئیاں ہوئیں، اس لئے میں نے تو عہد کر لیا تھا کہ آیندہ تنقید نگاری جیسی سعی غیر مشکور سے دامن بچاؤں گا، اور اعتراف کمال کے فطری اقتضا کو ضبط تحریر میں لا کر ارباب ادّعا کو دعوت مباہلہ نہ دوں گا، لیکن مذکورۂ بالا تنقیدی مضامین میں ضمناً بعض فنی مباحث پر جو خفیف اشارات کئے گئے تھے وہ ارباب نظر کے ایک مختصر حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے، اس لئے خیال تھا کہ کسی مناسب موقع پر صنف غزل کی نسبت اپنے خیالات کو مختصراً قلمبند کر دیا جائے، مگر مشاغلِ زندگی نے فرصت نہ دی، اور ایک مستقل مقالہ کے لئے جس وسعت مطالعہ اور دقت نظر کی ضرورت ہے، وہ یہاں نصیب بھی نہیں، البتہ ایک سرسری اور ضمنی نظر کے لئے روشنی اور حرارت کا وہی تھوڑا سا سرمایہ کافی ہو جاتا ہے، جو آج سے ۳۰ و ۳۲ برس بیشتر ایک آفتاب کمال کے فیض آستاں بوسی سے دل و دماغ نے جذب کر لیا تھا، خوش قسمتی سے اس کا موقع ہاتھ آ گیا ہے یعنی سراپائے اخلاص حضرت ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہاں پوری کا دیوان جو "نغمۂ دل" کے نام سے شائع ہوا ہے، زیر نظر اور طالب نظر ہے، دیوان اچھا خاصا حجیم ہے، اور صاحب دیوان اپنے تخلص کی طرح اُردو شاعری کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں، دیوان کے ساتھ دو مشاہیر کی تقریظیں بھی شائع ہوئی ہیں، اس لئے اب کسی مزید تفصیلی ریویو کا نہ محل ہے نہ امکان، البتہ چونکہ حضرت دلؔ کا دیوان تغزل کی تمام اسالیب کا ایک معتدل نمونہ ہے، اس لئے اگر ضمناً اس صنف نظم کی نسبت کچھ اظہار خیال کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا، اور اظہار نیاز کے ساتھ ہی خدمت فن کا بھی فرض بقدر استطاعت ادا ہو جائے گا، اب اگر تخلص کی تاثیر نے اس پر بھی کسی صاحب کو شکایت کا موقع دیا تو مجبوری ہے۔

معنوی یا لغوی حیثیت سے تو غزل اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں عشق کی داستان، درد خود عاشق کی زبان سے ادا کی جائے، اور عشق بھی وہ جو باصطلاح مولانائے روم وفسادِ خوردنِ گندم ہے" یعنی صنف قوی کا جنسی رابطہ صنف نازک سے" عرب کا تغزل اور ہندوستان کا گیت اسی حد تک محدود تھا البتہ اختلاف آب و ہوا سے اس قدر

فرق ضرور ہوا کہ جس ملک میں جو چیز کمیاب تھی وہ حصول اقتصاد کی بنا پر گراں تر اور محبوب و مطلوب قرار پائی، اور ملکی آب و ہوا نے جن صنفی جذبات کو زیادہ برانگیختہ کیا یا جس صنف کی اکثریت پیدا کر دی وہ صنف عاشق و طالب کی حیثیت میں آ گئی یہی وجہ ہے کہ عرب میں مرد عاشق اور جنس لطیف معشوق ہے اور ہندوستان میں قضیہ برعکس ہو گیا ہے ایران کی سر زمین ہمہ تن حسن و رنگینی ہے، اور جغرافیائی حیثیت سے بھی بین العرب والہند ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں نہ صرف زبان میں تذکیر و تانیث کا فرق مفقود ہے بلکہ آغاز عہد شباب تک چہرہ کی ساخت میں بھی صنفی لطافت و خشونت میں امتیاز کرنا دشوار ہے لہٰذا اس دنیا میں آ کر عشق و محبت نے اور عموم اختیار کر لیا ہے اور زلف گرہ گیر کے ساتھ خط سبز بھی نگاہ محبت کا مرکز بن گیا یہ اختلاف آب و ہوا محض عاشق کی صنف تک محدود نہیں ہے بلکہ جذبات عشق کے ظہور کا انداز اور اظہار کا لہجہ فطری طور پر متفاوت ہے عربی غزل میں آپ کو مردانہ بلند آہنگی۔ خودداری، اور استغنا کی شان ملے گی جذبات کے اشتعال میں بجلی کی تڑپ اور پروانے کی بیقراری نظر آئے گی۔ برعکس اس کے ہندی تغزل صنف لطیف کی نزاکت جذبات عجز و نیاز، صبر و رضا بیکسی و بیچارگی کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے اس میں آپ کو شبنم کی اشک فشانی اور شمع کا سوز و گداز ملے گا۔ ایران میں ذرا اعتدال کے ساتھ یہ دونوں انداز پہلو بہ پہلو ملیں گے بلکہ یہاں تو تغزل دو بالکل متضاد حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اگر شاعر کا موضوع سخن اسی عشق کا اظہار ہے، جس کو جنون شباب کہتے ہیں، تب تو غزل بداخلاقی کی آخری حد تک پہونچ جاتی ہے، اور صنفی امتیاز تک مٹ جاتا ہے، اور اگر شاعر بلند نظر اور حسن مجرد کا پرستار ہے تو وہ ایک فطرت پرست فلسفی یا خدا پرست صوفی کی شکل میں نظر آتا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ موجودہ فارسی غزل گوئی کی بنیاد ابتداءً تصوف کے مبارک ہاتھوں نے ڈالی، ایران میں غزل کو ایک مستقل صنف نظم کی حد تک پہلے پہل جس نے پہونچایا، وہ حکمت ایمانی کے مشہور مبلغ اور فن تصوف کے امام حضرت مولانائے روم ہیں، اس کے بعد شیخ سعدی شیرازی جیسے متصوف نے فارسی غزل گوئی کو سوز و گداز، صفائی، برجستگی درد اور تاثیر کی اس حد تک پہونچا دیا جس پر آج تک بھی کوئی اضافہ نہ ہو سکا سعدی کے رنگ کو امیر خسرو نے وجد و شوق کا اضافہ کر کے اور بھی چمکا دیا، یہاں تک کہ خواجہ حافظ شیراز نے سوزش و سرمستی کا چھینٹا دیکر اس شراب کو دو آتشہ کر دیا، اس سے آگے ترقی کا امکان نہ تھا، اور غزل کی دنیا محدود تھی، اس لئے اب ارباب کمال نے دوسری کروٹ لی اور بابا فغانی اور ان کے متبعین نے پیرایۂ بیان میں ندرت پیدا کر کے ایک طرز نو ایجاد کیا، بعد کو حکمت و فلسفہ، پند و موعظت، حقائق و اسرار کے نکتے بھی غزل ہی کی زبان میں ادا کئے جانے

لگے، اور ہندی شاعری کے اتباع میں تمثیلی شاعری بھی شروع ہو گئی، اور اس کا نام خیال آفرینی رکھا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسیر و بیدل کے عہد تک غزل محض چیستاں ہو کر رہ گئی۔ غرضیکہ اب معنوی حیثیت سے غزل اس صنف نظم کا نام ہے جس میں بلا ترتیب و تخصیص دنیا بھر کے سارے مضامین یہاں تک کہ فسق و فحاشی سے لیکر عالم ملکوت کے اسرار تک ایک ہی نظم کے مختلف اشعار میں ادا کئے جا سکتے ہیں، اب آیئے! حیثیت صوری پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، میرے خیال میں جہاں تک ہیئت ترکیبی کا تعلق ہے تمام اصناف نظم میں غالباً غزل کا موزوں کر لینا سب سے زیادہ آسان ہے۔ صورت ظاہری کے اعتبار سے قطعات و قصائد بھی غزل کے ہمشکل ہیں، مگر اوّل الذکر اصناف میں خیال کا تسلسل قائم رکھنا پڑتا ہے، اور غزل میں اس سے بھی آزادی ہے، ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے کے اعتبار سے آپ ایک غزل کے اشعار کو ایک ہی نظم کے اجزائے ترکیبی کہہ لیں، مگر حقیقتاً ایک غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مستقل دنیا ہے، اور ماسبق کو مابعد کے ساتھ کسی ربط معنوی کی ضرورت نہیں ہے، اگر ایسی غیر مربوط گفتگو نثر میں کیجائے تو یقیناً متکلم کو مجنوں سمجھا جائے گا، لیکن یہی مجذوب کی بڑ تغزل کا معیار ہے۔ دوسری آسانی غزل میں یہ ہوتی ہے کہ شاعر کے ذہن میں پہلے سے کسی خیال کا موجود رہنا ضروری نہیں ہے، قافیے کے اعتبار سے وہی خیالات جو کئی ہزار بار ادا کئے جا چکے ہیں، تھوڑے سے لفظی رد و بدل کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں، طرحی مشاعروں کے رواج نے ایجاد زمین کی زحمت بھی رفع کر دی، ایک مصرع طرح مل گیا، قافیہ اور ردیف متعین ہے، آٹھ دس قوافی اکٹھا کر لئے، اور کسی طرح باندھ دیا، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے، سانچہ پہلے سے موجود ہی مسالہ بنا بنایا تیار ہے، بس ڈھال دینا شاعر کا کام ہے، البتہ جتنی مشق بڑھی ہوتی ہے ڈھلائی اتنی ہی صاف ہوگی اور مسالے کے وزن میں مذاق کے مطابق کمی و بیشی ہو جائے گی، جو شعرا بازاری بول چال اور روزمرہ پر جان دیتے ہیں، وہ چاوڑی اور چاندنی چوک کے محاورے بہ قدر استعداد نظم کر دیں گے، اور جو ذرا بلند ادبی مذاق رکھتے ہیں وہ فارسی ترکیبوں میں ادائے خیال کریں گے اس طرح تھوڑی سی دماغی کاوش کے بعد بہ ادنیٰ فرق مراتب ہر موزوں طبع انسان شاعری کا مدعی بن سکے گا، اب ہزاروں بلکہ لاکھوں میں کہیں دو چار ایسے ہوں گے جو مخصوص فطری استعداد لیکر آئیں گے اور یا تو غیر معمولی صفائی، برجستگی اور روانی کی بنا پر شہرت حاصل کریں گے، جیسے میرزا داغ دہلوی اور ریاض خیرآبادی مرحوم۔ یا ندرت ادا۔ زور بیان۔ بلندی خیال اور دقت آفرینی میں امتیاز پیدا کریں گے، جیسے قدما میں غالب و مومن اور دور جدید میں فانی و اصغر وغیرہ۔ مگر یہ دونوں بزرگ افراط و تفریط سے خالی نہ تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول الذکر مذاق

کی نقالی نے ابتذال، سوقیت اور فحاشی کی اشاعت کی تو دوسرے رنگ کے اتباع نے چیستاں گوئی اور الفاظ بے معنی کی طلسم سازی کو رواج دیدیا، بہر حال غزل کی بدولت اردو زبان میں ایک ایسا بے معنی دفتر مرتّب ہوتا جارہا ہی، جو بقول خواجہ شیراز غرق مے ناب ہونے کا مستحق ہی۔

ہمارے لٹریچر میں صنف غزل کی یہ ہر دلعزیزی طرحی مشاعروں کی یہ وبائے عام اور غزل گو شعرا کی یہ غیر معمولی فراوانی اس وجہ سے نہیں ہی کہ غزل بجائے خود ادبی حیثیت سے کوئی زیادہ قابل قدر اور ممتاز صنف نظم ہی' یہ صحیح ہی کہ جذبات شباب کا حیوانی پہلو جو غزل کا مایۂ خمیر ہے فطرتِ انسانی کی ایک ضروری اور عالمگیر کمزوری ہی جس سے کوئی رند و پارسا محفوظ نہیں ہی، لہذا یہ بھی ایک سبب غزل کی مقبولیت کا ہو سکتا ہی، لیکن انھیں جذبات کا اظہار مثنوی مسدس اور دوسرے اصناف نظم میں بھی تو ممکن ہی، پھر محض غزل کی یہ کثرت کیوں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہی قسم نظم ہر شخص کے بس کی ہی، آج اگر آپ ایک مصرع طرح مشتہر کردیں تو ایک معمولی قصبے میں بھی اتنے شعرا جمع ہوجائیں گے کہ پورے ۲۴ گھنٹے بھی غزلخوانوں کے لئے کافی نہ ہوں گے، اور ہر مبتدی اپنے ہاتھ میں ایک دفتر لئے اکھاڑے میں کرتب دکھانے کے لئے بیتاب، اور مچھروں کی طرح اپنا نغمہ سنانے پر مصر نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اس کے بجائے ایک یا چند عنوان نظم کے دیدیں، اور مضامین بھی وہی ہوں، جو غزل کے موضوع جان ہوتے ہیں تو بھی شاید ایک دو سے زائد شعرا آپ کو کسی بڑے سے بڑے شہر میں نہ ملیں گے، اور اگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی جائے کہ مثنوی۔ مسدس، یا مستزاد کی شکل میں نظم کی ترتیب دینی ہوگی، تو ایک دو بھی شاید زحمت نہ فرمائیں، یہ خصوصیت کچھ آج ہی نہیں ہی ہمیشہ سے چلی آتی ہی، ایران میں بھی تخمیناً سات سو برس کے اندر صرف چند باکمال شعرا مثنویاں لکھ سکے، اور ہندوستان میں تو مثنوی گویوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہی، لیکن غزل گویوں کی محض فہرست مرتب کی جائے، تو بجائے خود ایک بار شتر سے کم نہ ہوگی، عرفی جیسے باکمال کے لئے کہا گیا ہی۔ مثنویش رنگ فصاحت نداشت * کاں نمک بود و ملاحت نداشت ۔ اور غالباً یہی وجہ ہی کہ شیخ ابو الفضل کو عرفی کے بارے میں یہ کہنا پڑا "غنچۂ استعدادش نہ شگفتہ پژمرد" اس موقع پر کہا جاسکتا ہے کہ سہولتِ نظم فی نفسہٖ کونسا عیب ہی کہ وجہ شکایت ہو اور نظم کی دشواری کونسا ہنر ہے کہ قابل تعریف ہو، اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہی کہ غزل گوئی کی اس سہولت اور رواج نے زبان اردو کی ترویج میں جو مدد دی ہی، مجھے اس سے انکار نہیں ہی، لیکن شاعری یعنی قافیہ سنجی کونسا ایسا کمال ہی کہ سرمستانِ ازل کے سوا ہر کس و ناکس کو اس میکدہ میں

بادہ پیمائی کی دعوت دیجائے اور ایسی ہی سہولت پسندی ہے تو کیوں نہ انگریزی کی طرح نثر مرجز یعنی نظم غیر مقفی کو رواج دیا جائے، بہرحال سہولت نظم کو ہنر اس وقت قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ اس سے اور نقصانات نہ پیدا ہوں، اور غزل گوئی نے تو اردو ادب کو وہ عظیم الشان نقصان پہونچایا ہے جس کی تلافی صدیوں میں ممکن نہیں، ایک طرف تو اس غزل گوئی کی بدولت روز بروز ایک سخیف اور گندے لٹریچر کا انبار لگتا جاتا ہے، اور تخریب اخلاق کے لئے جو اور اسباب موجود تھے ان پر ایک مزید محرک کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے، دوسری جانب قوم کے بہت سے افراد جن کو قدرت نے شاعر پیدا نہیں کیا تھا محض موزوں طبعی کے دھوکے میں اپنے آپ کو فطری شاعر سمجھکر وقت ایسی قیمتی چیز کو شاعری جیسے بیکار شغل میں ضائع کر رہے ہیں، کاش یہی وقت کسی تصنیف تالیف یا دوسرے کارآمد اور مفید شغل میں صرف ہوتا۔

ان نقصانات کے علاوہ جو سب سے بڑا نقصان ہے، وہ یہ ہے کہ شعرا اور ادبا کی دماغی صلاحیت اصول فطری کے مخالف چلکر ضائع ہوتی جارہی ہے، اور یہی سلسلہ کچھ دنوں قائم رہا تو بہتر لٹریچر پیدا کرنے کی قابلیت شاید آیندہ نسلوں سے مفقود ہو جائے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ الفاظ محض ادائے معنی کا ذریعہ ہیں، نہ کہ تخلیق معانی کا سبب۔ اس لئے بلحاظ ترتیب عمل انسانی دماغ میں پہلے خیال آنا چاہیے، پھر اس کے لئے موزوں عبارت اور موثر پیرایۂ بیان تلاش کرنا چاہیے، جس طرح ایک مصوّر پہلے اپنے دماغ میں تصویر کے تمام خال وخط کو متعین کر لینے کے بعد تصویر بناتا ہے، اور مناسب رنگ بھرتا ہے، یا ایک افسانہ نگار قصہ کے تمام پلاٹ اور تفصیلات کو ذہن کے سامنے رکھکر افسانہ کو مرتب کرتا ہے، اسی طرح شاعر کا فرض ہونا چاہیے کہ پہلے ایک خیال کو معہ اس کی ضروری تفصیلات اور اجزائے ترکیبی کے اپنے ذہن میں متعین کرے اور پھر اس خیال کی مناسبت سے وزن۔ بحر اور صنف نظم کا انتخاب کرے، مثنوی اور مسدس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہاں یہ طریق عمل ناگزیر ہے، لیکن غزل میں الٹی گنگا بہائی جاتی ہے یعنی قافیہ پہلے دماغ میں آتا ہے، پھر اس قافیہ کا چراغ ہاتھ میں لیکر اندھیرے میں مضمون ٹٹولا جاتا ہے، اگر اتفاق سے ہاتھ لگ گیا تو اکثر شعرا پہلے مصرع ثانی مرتب کرتے ہیں، اس کے بعد اس مصرع ثانی سے عقد نکاح کے لئے موزوں جوڑا مصرع اول کا تلاش کرتے ہیں جو کبھی نصیب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں، دوسرے الفاظ میں غزل گوئی کی وہ دنیا ہے جہاں لفظ اپنے لئے معانی کی تلاش کرتا ہے، یہ طریقہ خلاف فطرت ہونے کے علاوہ اتنا مصنوعی ہے کہ ہر کس وناکس تھوڑی سی محنت کے بعد شاعر ہو جاتا ہے، اب حقیقی شعرا اپنا امتیاز قائم کرنے کے لئے ایک قافیہ لیکر پہروں کیا ہفتوں تلاش معانی میں سرگرم رہتے ہیں اور علاوہ اردو

خیالات کو مسترد کرتے جاتے ہیں، اگر اتفاق سے کوئی جدید مضمون ہاتھ آگیا تو فہو المراد، اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو انہیں فرسودہ خیالات کو دلکش ترکیبوں یا جدید اسالیب بیان کے ذریعہ سے جدت کا رنگ دیتے ہیں، اکثر یہ بھی ہوتا ہی کہ خیال کافی وسیع ہی اور بحر چھوٹی جس میں پوری بات سما نہیں سکتی تو اب دریا کو کوزہ میں سمونے کی کوشش کی جاتی ہی، جو کبھی اشارات وغیرہ کے ذریعہ سے کسی حد تک کامیاب ہوتی ہی، اور اور کبھی معنی الشعر فی بطن الشاعر کا مصداق بنجاتی ہی، بہرحال اس میں شک نہیں ہی کہ جس طرح معمولی غزلیں کہہ لینا آسان ترین کام ہی اسی طرح عام سطح سے بالاتر اور ممتاز غزل گوئی حد درجہ مشکل ہی جو ۹۹ فی صدی مدعیان شاعری کے امکان میں نہیں ہی ہر زمانہ میں صرف معدودے چند اس کڑی کمان کو زہ کر سکے ہیں مگر ان حضرات نے اظہار کمال کے اس طریقہ سے جتنا فائدہ لٹریچر کو پہونچایا ہی اس سے زیادہ اپنے دماغ پر ظلم کیا ہی حقیقت یہ ہی کہ چنے کی دال پر سورۂ اخلاص مع بسم اللہ و نام کاتب لکھنے کی سعی لاحاصل ہے اچھے اچھے خوشنویسوں کی بھی صلاحیت کتابت جاتی رہتی ہی، اور تیلی کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں عمر گزار دینے سے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں، اس طرح بہت سے بہترین دل و دماغ ضائع ہو گئے، اور ضائع ہوتے جا رہے ہیں، مگر اس مدت العمر کی جگر کاوی اور ضیاع وقت کے بعد جو سرمایہ ہاتھ آتا ہی وہ صفر کے برابر۔ آپ غالب سے لیکر موجودہ عصر کے کسی بہتر سے بہتر غزل گو شاعر کا مجموعۂ کلام اُٹھالیں، اور خیالات کے اعتبار سے اشعار کی فہرست مرتب کریں، اور جن خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہی، ان کو یکجا کر دیں تو غالباً عنوانوں کی تعداد کہیں بھی پچاس تک نہ پہونچے گی۔ اب سخن فہم طبقے کو لیجیے، تو وہ بھی اس طرز شاعری کے اثر بد سے محفوظ نہیں ہیں جس طرح تیز مرچوں کا عادی سادہ اور لطیف غذائیں پسند نہیں کرتا اور انہیں کو چیکی لئے بغیر چین نہیں پڑتا، اسی طرح ہمارے سخن فہم حضرات جو بیدل و غالب کے دلدادہ ہیں، ان کو سادہ اور لطیف نظموں میں مزا نہیں آتا، اور غزل جیسی ادنیٰ ترین صنف نظم کو کمال شاعری کا معیار قرار دیتے ہیں، یہاں تک تو جو کچھ ذکر کیا گیا، وہ خواص سے متعلق تھا، عام شعرا و سامعین کا تو ذکر ہی کیا، وہاں تو محض قافیہ پیمائی کا نام شاعری ہے، مشاعروں میں داد بھی اسی طرح کی دی جاتی ہی۔ سبحان اللہ گریبان آپ ہی کا حصہ ہے، بسمل کا قافیہ تو آپ نے اپنا کر لیا، واہ کیا ردیف کہپائی ہی وغیرہ وغیرہ اب سے کچھ پیشتر تو سب سے بڑا کمال یہی تھا کہ مشکل طرحوں میں غزلیں کہی جائیں، اسی بد مذاقی کا نتیجہ تھا کہ باغ قافیہ کے ساتھ (سے دور اور شکستہ پر) کا دُم چھلا بطور ردیف لگا کر غزل کہی گئی، یا شراب میں سانپ۔ جوڑا سانپ کا۔ نفس کی تیلیاں۔ جنگل دوش پر۔ زحل کی مکھی۔ تصویر پشت آئینہ وغیرہ وغیرہ مہملات سے دواوین پُر کیے گئے۔

اس تمہید کا یہ مدعا نہیں ہے کہ میرے نزدیک غزل یکلخت قابلِ ترک چیز ہے، مقصود صرف اس قدر ہے کہ طرحی مشاعروں کو قطعاً بند کر دینا چاہئے، اور غزلیں اگر کہی جائیں تو اس طرح کہ یا تو کوئی مکمل خیال پیش نظر رکھکر ایک مسلسل غزل کہی جائے، تاکہ تصویر کے تمام ضروری پہلو سامنے آجائیں، یا منفرد، حکیمانہ خیالات کو لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ مختصر غزلوں میں یکجا کر دیا جائے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نہ ہو کہ فلسفہ۔ سائنس۔ یا تصوف کی مصطلحات و مبادی کو بجنسہٖ نظم کر دیا جائے، بلکہ اسرار و حقائق، فلسفہ و سیاست کو گل و بلبل کی داستان اور حسن و عشق کا افسانہ بنا کر پیش کیا جائے، اور اگر کوئی خاص پہلوئے بلاغت پیش نظر نہیں ہے، یا محض مخصوص سخن فہموں سے خطاب مقصود نہیں ہے تو حتی الوسع پیرایۂ بیان سہل اور سادہ اور عبارت لطیف و شیریں رکھنی چاہئے، اور ان سب کے باوجود محض غزل پر سرمایۂ شاعری کو محدود کرنا نہ چاہئے، بلکہ اور اصناف کے رواج پر صرفِ توجہ لازمی ہے، خیر یہ تو آیندہ کے لئے محض ایک تمنا ہے جس کا وجود میں آنا کسی ایک فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے، نہ اصول نفسیات کے مطابق فوری اصلاح ممکن ہے۔

البتہ موجودہ زمانہ میں تدریجی طور پر غزل کی جو اصلاح ہو رہی ہے بہت کچھ قابل قدر ہے اور اس میں سب سے زیادہ حصہ حکیم مومن خاں مرحوم کے سلسلے یعنی اصغر علی خاں نسیم دہلوی اور ان کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی اور پھر ان کے مشہور تلامذہ حسرت و فانی و اصغر کا ہے۔ یہ حضرات کچھ تو استاد کی صحت مذاق اور زیادہ تر اپنی فطری استعداد کی بدولت عام بد مذاقی سے علیٰحدہ رہ سکے، پھر بھی حسرت کے ابتدائی کلام میں معاملہ بندی اور فانی کے زمانہ قیام لکھنؤ میں میّت و جنازہ کی کثرت خواہ وہ کسی حد تک لطیف کیوں نہ ہو غلط ماحول کے نتائج اور قابل حذف عناصر ہیں۔ بہرحال فانی و اصغر تو پھر تغزل کے مہر و ماہ ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں موجد طرز کہے جا سکتے ہیں مگر ان کے علاوہ بھی اچھی خاصی تعداد ان غزل گو شعراء کی ہے جنھوں نے قدامت پر جدت کا رنگ چڑھا کر اور عام شاہراہ سے الگ ہو کر اچھا خاصا نمونہ غزل گوئی کا پیش کیا ہے، مثلاً جگر مراد آبادی، بیخود موہانی، مرزا جعفر علی خاں اثر، جوش ملیح آبادی، مرزا یاس عظیم آبادی عیاں میرٹھی اور یا دش بخیر حضرتِ دل شاہجہاں پوری۔

ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہاں پوری اپنے تخلص کی طرح اردو شاعری کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں موصوف کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہیں پھر بھی "آنکھیں دکھانے والے" سے وہ "الگ باندھ کر" رکھا ہوا مال دکھانے کی تمنا نہیں کرتے۔ آپ کا پورا دیوان اس طرح کی عریانی مذاق سے مبرا ہے۔ کہیں

کہیں قدیم رنگ کی جھلک ضرور ہی مگر الشاذ کا لمعدوم اور تبنی بھی ہی وہ ابتذال سے خالی اور رکاکت سے پاک۔

حضرت دل کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال مذاق ہی صفائی سلاست اور برجستگی کے ساتھ کہیں کہیں لطیف فارسی ترکیبیں بھی آتی ہیں۔ صحت زبان کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہی۔ خیالات نہ تو عامیانہ ہیں نہ اسقدر دقیق و عمیق کہ پتہ نہ چل سکے۔ بلندی ہی مگر اسی حد تک کہ ہر شخص دیکھ سکے۔ اتنا اونچا اڑنا پسند نہیں کرتے کہ دوسروں کو دوربین لگانی پڑے۔ حسن و عشق کی داستان میں کہیں کہیں تصوف کا رنگ جھلکتا ہی اور شاذ و نادر فلسفہ و حکمت کے اشارات بھی ملتے ہیں۔ سوز و گداز، سوزش و سرمستی سبھی کچھ ہی۔ مگر اتنی ہی جیسی دال میں نمک۔ دیوان سے کچھ اشعار سرسری انتخاب کے بعد پیش کئے جاتے ہیں۔

نغمۂ دل کا انتخاب

کسی کی رہگذر میں جان دینے کا یہ حاصل ہی
کہ ہر عشرت کدہ میں ہو رہا ہی آج غم میرا

نارسائی کا سبب کیا ہی؟ یہی جوشِ طلب
بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا

قفس میں بھول گیا ہم کو لطف آزادی
خیال تک نہیں آتا اب آشیانے کا

مل گئی راحت ہمیشہ کے لئے نیند آگئی
چارہ گر رخصت ہوئے بیمار اچھا ہو گیا

خوشا قسمت کہ رخصت ہو گئی جانِ حزیں پہلے
کوئی کہتا خدا حافظ تو اک محشر بپا ہوتا ✓

یہ حجز و بھی ہو شاملِ حالاتِ مصیبت
ان سے نہ سنا جائے گا افسانہ کسی کا

کہتے ہیں لوگ حضرتِ دل بھی ضمیر کو
یہ دوسرا ہی نام اسی بیقرار کا

گو کوچۂ بتاں میں صدمے اٹھائے پیہم
لیکن مری زباں پر قسمت ہی کا گلا تھا

چند آبلہ پا وحشی کہتے ہوئے گزرے ہیں
کانٹا کوئی صحرا کا بیکار نہیں ہوتا

ہاتھ رکھ کر وہ دل پہ کہتے ہیں
اب نہ کہنا کہ بیقرار کیا

کیا سنائیں سرگزشتِ زندگیٔ پر الم
آشیاں اب تو قفس ہی اس سے پہلے دام تھا ✓

میکش تو ہیں اندیشۂ امروز سے غافل
واعظ کی ہی فردائے قیامت پہ نظر آج

بہارِ گل ہے کتنی فرحت انگیز — جھکی پڑتی ہیں شاخیں آشیاں پر

اُف رے جنوں کا جوش کہ تلوؤں کے آبلے — دیوانہ وار ٹوٹ پڑے نوکِ خار پر

کیا ہے اس اقرار کا مطلب دلِ حسرت نصیب — مسکرا کر وہ یہ کہتے ہیں ضرور آئیں گے ہم

مجھے در پر جو دیکھا بول اُٹھے لے دل وہ درباں سے — یہ کیا کہتے ہیں کیا مطلب ہے کیوں بیکار بیٹھے ہیں

تجھ پہ او وعدہ فراموش مری جان نثار — ہاں پھر اک بار یہ کہدے مجھے اب یاد نہیں

دفعتہً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد — ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

اب یہ صورت ہے دلِ زار کے بہلانے کی — ذکر ناکامیِ اربابِ وفا کرتے ہیں

وہ اک پیامِ اجل تھا مریضِ غم کے لئے — کسی کا آہ یہ کہنا خدا کو یاد کرو

ہے جنوں میں بھی لطافت کا خیال — خاکِ صحرا آج چھانی جائے گی

پہ سچ ہی میری بات کا کیا اعتبار — سچ کہوں گا جھوٹ مانی جائے گی

دل کی امید بر نہیں آتی — ہم کو آتی نظر نہیں آتی

عالمِ خواب میں بھی وہ صورت — نظر آتی نظر نہیں آتی

تھی اجل کی امید حضرتِ دل — وہ بھی آتی نظر نہیں آتی

حیرت میں ہوں کشاکشِ امید و بیم سے — طاقت سکوت کی ہے نہ جرأت سوال کی

حرم بھی اہلِ طلب کا ہے اک مقامِ تلاش — ادھر بھی ہم نکل آئے ہیں جستجو کرتے

اک بےخبرِ ہوش کا عالم ہی جدا ہے — نالے ہیں نہ آہیں نہ اثر ہے نہ دعا ہے

ہم نہیں ہجر کی شب بھی تنہا — درد اُٹھتا ہے غش آجاتا ہے

آج تک وہ نظر نہیں آئے — دوستی اُن سے غائبانہ ہے

محفل تری اے ساقی میخواروں کی جنت ہے — رنگینیٔ ساغر سے، رعنائیٔ مینا سے

انصاف شعار جج

(دبیر حسن رضوی (علیگ)

"واقعہ یہ ہے کہ میں نے انصاف شعار جج دیکھے ہیں" جین مارٹیو نے کہا "اور ایسا اتفاق ایک تصویر میں ہوا۔ قصہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ مجھے بلجیم جانا پڑا اور اس سفر کی غایت یہ تھی کہ میں ایک متشکک و بدگمان مجسٹریٹ کی زد سے محفوظ رہنا چاہتا تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ میں بغاوت پسندوں سے ساز باز رکھتا ہوں۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ میں اور میرے بغاوت پسند رفقا ایک دوسرے سے ناآشنائے محض تھے لیکن یہ چیز مجسٹریٹ کے راستہ میں حائل نہیں ہوسکی اور اسے کسی قسم کا تردد یا تذبذب نہ ہوا۔ شہادتوں کو جانچنا پرکھنا اس کا روزانہ کا کام تھا لیکن اس کے کھوٹے کھرے کے معیار میں قطعاً کسی قسم کی بالیدگی راہ نہ پاسکی تھی۔ میں اُس کی اس ہٹ دھرمی سے کچھ ایسا سراسیمہ ہوا کہ مجھے بھاگ کر بلجیم میں پناہ لینی پڑی۔ اور اینٹ ورپ پہنچ کر ایک بساطی کے یہاں ملازم ہوگیا ایک مرتبہ اتوار کو میں نے نگارخانہ میں ایک تصویر دیکھی۔ یہ میبیوس کا قلمکار تھا۔ تصویر دو ایسے انصاف شعار ججوں کی تھی جن کی نوع اب عنقا ہے۔ میرا مطلب اُن ججوں سے ہے جو گھوڑے پر چڑھ کر علاقے میں دورے کیا کرتے تھے اور پیدل سپاہی قلم لئے ہوئے اُن کے ہمراہ ہوتے تھے۔

قدیم فلیمش بائبل کے بادشاہوں کی مانند ان ججوں کے داڑھی اور پٹے تھے۔ سر پر ٹیڑھی خوبصورت ٹوپی جو دیکھنے میں کلاہِ شب خوابی بھی معلوم ہوتی تھی اور تاجِ شاہی بھی۔ اُن کی مطلّا و مرصّع پوشاک صرف کیشر سے تیار کی گئی ہوگی۔ باکمال مصوّر نے تصویروں میں متانت، شرافت اور بردباری کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی اُن کے گھوڑے بھی اُنہی جیسے حلیم و سلیم معلوم ہوتے تھے۔ بایں ہمہ یہ دونوں جج سیرت و خیالات میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اور یہ اختلاف آپ بیک نظر معلوم کرسکتے تھے۔ مثلاً ایک اپنے ہاتھ میں کاغذ لئے ہوئے ہے اور اپنی اُنگلی سے اُس کے متن کی جانب اشارہ کناں ہے۔ دوسرے کا بایاں ہاتھ زین کے ہرنے پر رکھا ہے اور دایاں ہاتھ بلند ہے جس سے تحکم سے کہیں زیادہ فیاض منشی نمایاں ہے۔ انگوٹھے اور انگشت شہادت کی گرفت میں وہ ایک غیر محسوس سفوف سا لئے ہوئے معلوم ہوتا ہے اور اُس اونچے ہاتھ کے اس انداز سے زیرکی اور زود فہمی ہویدا ہیں۔

دونوں منصف مزاج ہیں مگر ایک ظاہری حالات پر نظر رکھتا ہے اور دوسرا باطنی پہلو پر گویا اُس کٹہرے پر جو عدالت

اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہو جھک کر اُن کی گفتگو سننے لگا:۔

پہلا جج - میں لکھی ہوئی بات کا پابند ہوں۔ سب سے پہلا قانون پتھر پر اس لئے لکھا گیا تھا کہ رہتی دنیا تک قائم رہے

دوسرے جج نے جواب دیا "ہر ایک قانون لکھے جانے پر پرانا ہوجاتا ہے کیونکہ وہ رفتار زمانہ کے دوش بدوش نہیں چل سکتا۔ لکھنے والے کا ہاتھ سست ہوتا ہے درآں حالیکہ انسان کا دماغ پھرتیلا اور اس کے مقدرات غیر متعین ہیں"۔

اِن دونوں نیک منش اور کہن سال بزرگوں نے اپنی پُر معنی اور مختصر بحث شروع کی:۔

پہلا جج - قانون مستقل و محکم ہے۔

دوسرا جج - قانون بندھا ٹکا نہیں ہوتا۔

پہلا جج - قانون خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اس لئے ناقابل نسخ ہے۔

دوسرا جج - قانون فطرتاً سوسائٹی کی پیداوار ہے اس لئے وہ ہماری اس زندگی کے بدلنے والے حالات کا پابند ہے۔

پہلا جج - حیثیت ایزدی دائم و قائم ہے۔

دوسرا جج - عزیمت انسانی ہمیشہ منقلب و متغیر ہوتی رہتی ہے۔

پہلا جج - مشیت الٰہیہ (قانون) حدوث آدم سے قدیم ہے اور اس سے ارفع و اعلیٰ۔

دوسرا جج - قانون زائیدہ انسان ہے اور اُسی کی مانند ضعیف البیان اس لئے انسان ہی کی مانند حسن تکمیل کا منتظر اور سزاوار ممکن التکمیل بھی۔

پہلا جج - اپنی کتاب کھولئے اور پڑھئے اُس میں کیا لکھا ہے؟ خدا نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا ہے۔

دوسرا جج - گزشتہ نسلوں کا لکھا ہوا موجودہ زمانے والے مٹا دیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو ماضی حال پر حکمرانی کرے گا یعنی مردہ بدست زندہ کی بجائے زندہ بدست مردہ۔

پہلا جج - اگلے وقتوں کے لوگوں کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی موجودہ زمانہ والوں پر فرض ہے۔ خدا کے سامنے مرے جیتے برابر ہیں۔ موسیٰ سیرلیس قیصر جسٹینن اور شہنشاہ المیسن اب تک ہم پر حکمران ہیں کیونکہ

ہم ابدیت مآب کے سامنے اُن کے ہمعصر ہیں۔

دوسرا جج - جو زندہ ہیں وہ زندہ مقننوں کے وضع کردہ قوانین کے پابند ہیں۔ حرام و حلال ممنوعات و موجبات کے بارے میں زرتشت اور نیوما پومپی پس مینٹ گڈل کے موچی کے مقابلے میں کمتر درجے پر ہیں۔

پہلا جج - اولین قوانین ہم پر "عقل لامحدود" نے نازل کئے۔ اس لئے بہترین قانون وہ ہیں جو اس منبع سے قریب ہیں۔

دوسرا جج - کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہر روز نیا قانون بنتا ہے اور آئین و ضوابط میں بلحاظ زمان و مکان اختلاف پایا جاتا ہے۔

پہلا جج - نئے قوانین پرانے ضوابط سے ماخوذ ہوتے ہیں یہ ایک ہی درخت کی نئی شاخیں ہیں جن کی نشوونما پرانے ہی درخت کے نمش سے ہوتی ہے۔

دوسرا جج - قانون کے کہن مایہ درخت سے کڑوا کسیلا رس نکلتا ہے اور اسی لئے اُس درخت پر مسلسل تیشہ زنی ہوتی رہتی ہے۔

پہلا جج - قانون کے جواز یا عدم جواز کا پرکھنا جج کے فرائض میں داخل نہیں ہے کیونکہ قانون کا فی نفسہٖ بجا ہونا لازمی ہے۔ جج کا فرض تو صرف قانون کو ٹھیک طور پر برتنا ہے۔

دوسرا جج - یہ تحقیق کرنا ہمارے فرائض میں ہے کہ جس قانون کو ہم بر سرِ کار لا رہے ہیں اس کا نفاذ جائز بھی ہوگا یا نہیں اگر ہم اس کو ناجائز پاتے ہیں تو ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم اُس کے نفاذ میں جس کے لئے ہم کو مجبور کیا جاتا ہے اصلاح و ترمیم کر سکیں۔

پہلا جج - قوانین ہم سے جس احترام کا مطالبہ کرتے ہیں اس اعتبار سے قوانین پر نکتہ چینی قوانین کے مطالبات کی خلاف ورزی ہے۔

دوسرا جج - اگر ہم قانون کی سختی کو تسلیم نہ کریں تو پھر اُسے اعتدال پر کیسے رکھ سکتے ہیں۔

پہلا جج - ہم تو جج ہیں۔ مقنن یا فلسفی نہیں۔

دوسرا جج۔ ہم انسان ہیں۔

پہلا جج۔ ایک انسان دوسرے انسان کو پرکھنے سے معذور ہے۔ ایک جج جب کرسی عدالت پر متمکن ہوتا ہے تو اپنی بشریت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور حامل الوہیت ہو کر رنج و راحت کے تاثرات سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا جج۔ دلسوزی سے معرا ہو کر انصاف سفاکی بن جاتا ہے۔

پہلا جج۔ عدل مکمل ہے اگر لغوی ہو۔

دوسرا جج۔ انصاف ہیچ ہے اگر روحانی نہیں۔

پہلا جج۔ اصول قوانین میں الوہیت مضمر ہے اور اُن کے عواقب بھی کچھ کم الٰہیانہ نہیں ہوتے۔ لیکن اگر قانون کلیتہً خدا کا نہ ہوتا اور آدمی کا بنایا ہوا ہوتا تب بھی اُس کو حرف بہ حرف بجا لانا ضروری ہوتا کیونکہ حرف قائم ہے اور تاویل گریزپا۔

دوسرا جج۔ قانون قطعاً انسان کا ساختہ پرداختہ ہے۔ انسانی تعقل و ادراک کے اوّلیں دھندلکوں میں جو روجہالت سے ہمکنار قانون نے آنکھ کھولی۔ لیکن اگر اس کا امتزاج جوہر قدس سے بھی ہوتا پھر بھی اُس کی عبارت نہیں بلکہ تاویل و تعبیر قابل قبول ہوتی۔

اس گفت و شنود کے بعد وہ دونوں منصف مزاج جج گھوڑے سے اُترے اور موکبۂ جلوس کے ساتھ حق بحقدار پہنچانے کے لئے عدالت العالیہ میں داخل ہوئے۔

اُن کے گھوڑے جو اِیلم کے درخت کے نیچے ایک کھونٹے سے بندھے ہوئے تھے آپس میں گفتگو کرنے لگے۔

پہلے جج کا گھوڑا پہلے بولا۔ جب کرۂ ارض پر گھوڑوں کا تسلط ہوگا (اور یقیناً ایک دن زمین گھوڑوں کی وراثت ہوگی کیونکہ لاریب گھوڑا مقصودِ آخریں اور اشرف المخلوقات ہے) جب ہم اپنی مرضی کے موافق کام کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ ہم بھی مثل انسانوں کے قوانین کے تحت میں رہیں گے اور اپنے ہمجنسوں کی قید اور پھانسی اور اُن کی پوست و استخواں کی شکست و ریخت سے لطف اندوز ہوں گے۔ ہم صاحب

اخلاق ہوں گے جس کا ثبوت اس دار و رسن اور طوق و سلاسل سے ہوگا جو ہم اپنی بستیوں میں رواج دیں گے۔ گھوڑے ہی قانون ساز بھی ہونگے۔ کیوں روسن کیسی رہی گی۔

روسن نے جو دوسرے جج کا گھوڑا تھا جواب دیا کہ اُس کی رائے میں گھوڑا افضل ترین مخلوق ہے اور اُس کو کامل توقع ہے کہ کبھی نہ کبھی زمین پر گھوڑے کی بادشاہت ہوگی" اور جب ہم شہر آباد کر چکیں گے بلانچیٹ!۔ اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔" تو پھر جیسا کہ تمہارا خیال ہے ہم پولیس کا محکمہ بھی قائم کریں گے۔ اس عہد میں ہم کو گھوڑوں کی صلاح و فلاح سے متعلق قوانین بھی فرسیاتی نقطۂ نظر سے وضع کرنے پڑیں گے۔

"تمہارا اس سے کیا مطلب ہے"؟ بلانچیٹ نے دریافت کیا۔

"میرا مطلب سیدھا سادا ہے یعنی ہر گھوڑے کا دانہ گھاس اور ہر گھوڑے کی اصطبل میں جگہ ازروئے قانون متعین اور متیقن ہو جائے اور ہر گھوڑا اس کا مجاز ہوگا کہ مخصوص فصل میں وہ اپنی مرضی کے مطابق عشق و محبت کر سکے کیونکہ تم جانتے ہو ہر چیز کے لئے ایک وقت ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ میں گھوڑوں کے قوانین فطرت کے عین مطابق چاہتا ہوں"

"میں امید کرتا ہوں"۔ بلانچیٹ نے جواب دیا۔ کہ "ہمارے قانون بنانے والوں کے خیالات تمہارے ارادوں سے رفیع تر ہوں گے۔ وہ اُس آسمانی گھوڑے کی مشیت کے مطابق جس نے سب گھوڑوں کو پیدا کیا ہے قانون وضع کریں گے۔ وہ خیر مطلق ہے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے۔ نیکی اور قدرت اُسی کی صفات ہیں۔ اُس نے پہلے ہی سے اپنے بندوں کی قسمت میں لکھ دیا تھا کہ محنت شاقہ برداشت کریں باگ ڈور کے اشارے پر چلیں۔ ہمیز کھائیں اور چابک کھاتے کھاتے جان بحق ہو جائیں۔ میرے دوست! تم رحم و کرم کا ذکر کرتے ہو اور اُس کو یہ منظور تھا کہ ہم میں سے بہت سے اختہ کئے جائیں یہ اس کا فرمان ہے۔ قوانین اس فرمانِ واجب الاحترام کو برقرار اور برسرِ کار رکھنے پر مجبور ہیں۔

روسن نے پوچھا" مگر میرے دوست! کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ یہ ساری سیہ کاری اُس آسمانی گھوڑے کی ذات سے وابستہ ہے جس نے ہمیں خلعتِ وجود عطا کیا ہے اور اس کی ذمہ داری انسان پر جو اُس کی ادنیٰ درجہ

کی مخلوق ہی مطلق عائد نہیں ہوتی؟"

بلاپجیٹ نے جواب دیا۔" انسان آسمانی گھوڑے کے وزراء اور مقربین ہیں۔ اُس کی مشیت ہر وقوعہ میں کارفرما ہی۔ چونکہ وہ ہمیں برائی میں مبتلا کرتا ہے اس لئے وہ برائی اچھائی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہی کہ اگر قانون سے مستفید ہونا ہی تو قانون کے شدائد میں مبتلا ہونا بھی لازم آتا ہے چنانچہ گھوڑوں کی بادشاہت میں ہم کو آسمانی گھوڑے کو خوش کرنے کے لئے آئین ضوابط۔ قواعد۔ قانون، فیصلے، سزا، غرض ہر قسم کی پابندیاں اور کلفتیں جھیلنی پڑیں گی۔

بلاپجیٹ نے کہا۔" روسن! تم گدھے ہو جو سمجھتے ہو کہ گھوڑا دنیا میں دکھ سہنے کے لئے لایا گیا تھا اور اگر وہ تکلیف نہیں اُٹھاتا تو وہ تقدیر کے لکھے کو پورا نہیں کرتا۔ خوشحال گھوڑوں سے خدا منہ پھیر لیتا ہی۔"

(اناطول فرانس)

مضطر خیر آبادی

سید جان نثار حسین اختر علیگ بن مضطر متعلم بی اے آنرز

وہ مضطر یکہ تازِ عرصۂ نظم　　وہ مضطر شہسوارِ ملکِ معنیٰ

زباں جن کی گل افشانِ فصاحت　　بیاں جن کا بہارِ ملکِ معنیٰ

جلیل مانکپوری

مشہور انگریزی نقاد ڈاکٹر جانسن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ بقائے دوام کا تاج اکثر عوام کی قبولیت پر منحصر ہوتا ہے اگر یہ صحیح ہے تو اس میں بھی شک نہیں کہ لوگ مضطر سے بذاتِ خود واقف ہوں یا نہ ہوں ان کے کلام سے ہندوستان کے تمام اُردو داں طبقے پورے طور پر آشنا ہیں، کون ہے جس نے ان اشعار کو نہ سنا ہو یا خود نہ گنگنایا ہو:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں　　جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا مجھے کوئی سن کے کرے گا کیا　　میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا وقت مجھ سے بچھڑ گیا　　جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں

اسیر پنجۂ عہدِ شباب کرکے مجھے　　کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے

کسی کے دردِ محبت نے عمر بھر کے لئے　　خدا سے مانگ لیا انتخاب کرکے مجھے

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت　　کریم تو ہی بتادے حساب کرکے مجھے

علاجِ دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا　　تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں　　مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

اے عشق عطا کردے ایسا مجھے کاشانہ　　جو کعبہ کا کعبہ ہو بت خانے کا بت خانہ

یہ چشمِ حقیقت ہیں کیا دیکھے سوا تیرے　　سجدے سے ہمیں مطلب کعبہ ہو کہ بت خانہ

مضطر قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لیکر آئے تھے آپ کی تعلیم و تربیت تمام تر آپ کی والدہ ہی نے فرمائی جو مولانا فضل حق خیر آبادی کی بیٹی اور شمس العلما عبدالحق خیر آبادی کی چھوٹی بہن تھیں، اُردو، فارسی اور عربی کی زبردست شاعرہ اور فقہ اور منطق کی جلیل القدر عالمہ تھیں۔ آپ نے اپنی والدہ ہی سے تمام علوم درسیہ کی تحصیل و تکمیل فرمائی اور اُنہیں سے شاعری کے رموز سے آشنا ہوئے۔ مولانا عبدالحق خیر آبادی اپنی بہن سے فرمایا

کرتے تھے کہ اگر تو لڑکا ہوتی تو خیرآباد کا نام روشن ہوتا۔ دس سال کی عمر سے مضطر نے شعر کہنا شروع کیا اور ان ابتدائی غزلوں پر اپنی ماں ہی سے اصلاح لی۔ آپ کی پہلی غزل کا مطلع تھا:

ڈھونڈتے ہم کیوں دوائے دردِ دل
تم اگر ہوتے بجائے دردِ دل

اس پر دادی مرحومہ نے حسب ذیل اصلاح فرمائی:

ڈھونڈتے ہم کیوں دوائے دردِ دل
کاش تم ہوتے بجائے دردِ دل

والدہ کے انتقال کے بعد آپ نے اپنی ایک غزل منشی امیر احمد صاحب کو بغرضِ اصلاح بھیجی، امیر مینائی نے صرف مطلع کے مصرعۂ اول میں الفاظ کو مقدم و موخر فرما کر غزل واپس فرما دی اور ساتھ ہی اُس کے یہ بھی تحریر فرمایا کہ یہ اصلاح محض استحساناً تھی آپ بغیر اصلاح غزل پڑھ سکتے ہیں۔ مطلع یہ تھا:

داغ ہیں سیکڑوں نہاں دل میں　　طُرفہ پھولا ہے گلستاں دل میں

اصلاح ملاحظہ ہو ؎

سیکڑوں داغ ہیں نہاں دل میں　　طُرفہ پھولا ہے گلستاں دل میں

مضطر نے دوبارہ کوئی غزل اصلاح کے لئے نہ بھیجی۔ حضرت امیر مینائی کی وفات کے بعد اُن کے اکثر شاگردوں نے "جانشینِ امیر" ہونے کا دعویٰ کیا اور اس میں شک نہیں کہ بعض کا دعویٰ حق بجانب تھا مثلاً ریاض، جلیل، کوثر وغیرہ، مگر مضطر نے کبھی اس طرف التفات نہیں فرمایا۔ والد فرمایا کرتے تھے کہ شاعر کی جانشینی کا مسئلہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک دفعہ کسی صاحب نے والد سے بذریعہ تحریر سوال بھی کیا کہ آخر آپ اپنے کو جانشین امیر کیوں نہیں لکھتے جس کا جواب مرحوم نے یہ لکھا کہ "نہ میں جانشین امیر ہوں، نہ میں سجادہ نشین فقیر ہوں، میں اک مضطر گوشہ گیر ہوں آپ مجھے ان کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہیں" حضرتِ داغ دہلوی کے انتقال کے بعد جب اُن کی جانشینی کا مسئلہ زیرِ غور تھا تو مدیر "نیرِ اعظم" مراد آباد نے مضطر کا نام پیش کیا۔ جناب عیش بھوپالی نے ایک مختصر سی کتاب "معرکہ" کے نام سے شائع کی جس میں امیر اور اُن کے ممتاز شاگردوں اور خاصکر مضطر پر حاسدانہ تنقید کی گئی تھی۔ والد

کو جانشینی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور پھر امیر کے شاگرد تھے داغ کے جانشین کیوں ہوتے البتہ حضرت عیش کی زیادتی کا جواب مضطر نے ضرور دیا لیکن نہایت سنجیدگی اور شگفتگی کے ساتھ، فرمایا "خدا مجھے اعتراض کرنیوالوں میں سے نہ اٹھائے بلکہ اُن میں سے جن پر اعتراض کیا جاتا ہے" مضطر کے بعض اشعار پر لوگوں نے جا و بے جا اعتراضات بھی کئے مگر آپ نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ وہ اعتراض کرنے والوں کی ذہنیت اور قابلیت دونو کو خوب سمجھتے تھے۔ مضطر کے اس شعر پر کہ ؎

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لیلوں گا محمدؐ سے

کیا کچھ طوفان نہ اُٹھا مگر آپ نے سوائے اس کے اور کچھ نہ کہا کہ "میرا یہی ایمان ہے اور خدا اسے برقرار رکھے" ایک مرتبہ کسی نے والد کے روبرو اُن کے ایک شعر پر اعتراض کیا، وہ شعر یہ تھا ؎

سوئے ساقی کیفِ بدمستی میں ما تھا ٹک گیا
ایک سجدے میں ادا کر لی نمازِ میکدہ

اعتراض یہ تھا کہ نماز ایک سجدہ میں کیونکر ادا ہو سکتی ہے جب ایک ہی رکعت میں دو سجدے ضروری ہیں۔ والد نے فرمایا کہ "غالباً آپ نے اس غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ نہیں فرمایا ؎

صرف جھک جاتے ہیں پی کر جانبِ پیرِ مغاں
بادہ کش پڑھتے ہیں بے سجدہ نمازِ میکدہ

ادب ایک بڑی حد تک زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ زندگی اور معاشرت کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے جذبات و خیالات ہی نہیں بلکہ سوسائٹی کے جذبات و خیالات کی عکاسی جان بوجھ کر کرتا اور بے جانے بوجھے بیشتر کرتا ہے۔ مضطر کے زمانہ کے اشخاص حقیقت سے دوچار ہونا گوارا نہ کر سکتے تھے اس لئے شباب کی کیفیات سے سرشار رہنا چاہتے تھے۔ زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے جب انسان ؎

این دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ۔ کہکر آنے والی مصیبت کو ٹالنا چاہتا ہے۔ یہ عین مقتضائے فطرت ہے، ایک دور ہے جو چند روزہ ہے، ایک نشہ ہے جو کچھ عرصہ میں اتر جاتا ہے اور اس کے بعد انسان زیادہ سختی سے جدید لبغا کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ مضطر کی ابتدائی شاعری میں جو عشق کی رنگینی پائی جاتی ہے وہ اسی نشہ کی کیفیت ہے مضطر کا سارا کلام جدت و بے ساختگی، لطفِ زبان، حسنِ ادا اور لطافتِ فکر سے یکسر مملو ہے۔ یہاں کچھ مختلف اشعار نمونتاً پیش کرتا ہوں۔

اپنے عہدِ وفا کو بھول گئے — تم تو بالکل خدا کو بھول گئے
اُن سے دو دن بھی جا نبھ نہ سکی — مضطرِ بے نوا کو بھول گئے

جفا سے وفا مسترد ہو گئی — یہاں ہم بھی قائل ہیں حد ہو گئی
نگاہوں میں پھرتی ہے آٹھوں پہر — قیامت بھی ظالم کا قد ہو گئی

نہ بلوایا نہ آئے روز وعدہ کر کے دن کاٹے — بڑے وہ ہو کہ تم نے اچھا اچھا کر کے دن کاٹے
تمہارا کیا کھلے بندوں رہے چاہا جسے دیکھا — کمال اُس نے کیا مضطر کہ پردا کر کے دن کاٹے

اُٹھے اُٹھ کر چلے، چل کر رُکے، رُک کر کہا ہو گا — "میں کیوں جاؤں بہت ہیں اُن کی حالت دیکھنے والے"

کسی بُت کی ادا نے مار ڈالا — بہانے سے خدا نے مار ڈالا
مصیبت اور لمبی زندگانی — بزرگوں کی دُعا نے مار ڈالا

دردِ دل اب خدا کرے کہ نہ ہو — کوئی ایسی دوا کرے کہ نہ ہو
تم سلامت رہو قیامت تک — اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو
وصل سے انتظار ہی اچھا — یہ تو مضطر خدا کرے کہ نہ ہو

سُنا ہے آج کل وہ غیر کی محفل میں رہتے ہیں — خدا جانے یہاں کیا کیا تصور دل میں رہتے ہیں

میرے سر زلفِ سیہ فام ہوئی جاتی ہے — بے جگہ ہائے مجھے شام ہوئی جاتی ہے

کس نے بیمار تمہیں ڈال دیا اے مضطر — کون یہ کہہ کے سدھارا تھا کہ اچھے رہنا

ہائے ظالم بُری نظر ڈالی — میری مٹی خراب کر ڈالی

دل چرائے ہوئے دزدیدہ نظر جاتا ہے — کوئی لوٹے ہوئے اللہ کا گھر جاتا ہے ؟

جو پوچھا تیری صورت یا ہماری عاشقی اچھی — کہا میں کیا بتاؤں جس کو تم چاہو، وہی اچھی

کوچۂ جاناں میں جانا ہو گیا — مرنے جینے کا ٹھکانا ہو گیا
ہائے وہ دل جس کو پالا ناز سے — تیرِ مژگاں کا نشانا ہو گیا
میری اُن کی رسمِ الفت اُٹھ گئی — مدتیں گزریں زمانا ہو گیا

دل دادگانِ حسن سے پردہ نہ چاہیئے
دل پیکے چھپ رہے ہمیں ایسا نہ چاہیئے

دل کام کا نہیں تو نہ لو جان نذر ہے
اتنی ذرا سی بات پہ جھگڑا نہ چاہیئے

آئینہ دیکھ کر عمر و فضول
بات وہ کر جو دوسرا نہ کرے

میں مسیحا اُسے سمجھتا ہوں
جو مرے درد کی دوا نہ کرے

مضطرؔ اُس نے سوالِ الفت پر
کس ادا سے کہا خدا نہ کرے

آپ سے مجھکو محبت جو نہیں ہے نہ سہی
اور بقول آپ کے ہونے کو اگر ہے بھی تو کیا

"شبابیات" کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو گیا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دلِ صد چاک کی یہ بتذل قاش فروشی اکثر اُن دھندلے، گھٹے ہوئے اور پست جذبات کی غمازی کرتی ہے جن کی نکاسی کی کوئی اور صورت نہیں ہوتی مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ جنسیت کے ولولہ کو دبا دبا کر رکھنا اُتنا ہی ناممکن ہے جتنا خواہشاتِ جوعی کو۔ اس لئے جو جذبات سلیقہ کے ساتھ بیان کئے جائیں اور جنہیں فطرت کے مطابق تسلیم کرنے میں کوئی عار نہو اُن کا بیان اشعار میں بُرا نہیں ہو سکتا اس نقطۂ نظر سے ہمیں مضطرؔ کی رنگینی میں بھی اچھے پہلو ملتے ہیں۔ اُن کی رنگینی شباب کی رنگینی ہے اور شباب بعض وقت حدود سے باہر بھی نکل جاتا ہے، شباب پھر شباب ہے، مکدر کیوں ہو جئے۔

لڑائی ہے تو اچھا رات بھر یوں نہیں بسر کر لو
ہم اپنا منہ ادھر کر لیں تم اپنا منہ اُدھر کر لو

لذتِ وصل جوانی میں جو وہ جان گئے
پھر تو جس بات پہ روٹھے تھے وہی مان گئے

کون نکلا یہ مرے پاس سے کہہ کر مضطرؔ
ان سے اللہ بچائے جو وفا کرتے ہیں

نکالنی بھی پڑے گی کسی کی حسرتِ دل
یہ تم نے کہہ تو دیا ہے کہ ہاں نکلتی ہی

دور کی عاشقی گناہ نہیں
دیکھ لیتے ہیں دیکھ بھال کا کیا

آپ کے بہت سے عاشقانہ قطعات بھی ہیں جن میں یہی رنگ نمایاں ہے۔ مضطرؔ جب ریاست ٹونک کی طرف سے وکیل مقرر ہو کر آ گئے تو حضرت بیخودؔ بدایونی سے آپ کی ملاقات ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں دوستی کی بنیاد مستحکم ہو گئی۔ رات دن کا اُٹھنا بیٹھنا رہتا۔ ایک دن آپ نے ایک قطعہ کہا اور شام کو جب بیخودؔ آپ سے ملنے

تشریف لائے تو انہیں سنایا۔ بیخودؔ نے بہت پسند کیا اور اسی وقت اُس کی نقل لیتے گئے۔ دوسرے دن انہوں نے اُس قطعہ کی تضمین کی اور مضطرؔ کو لا کر سنایا، کچھ دنوں بعد یہ تضمین "صبر و شکیب کی لوٹ" کے نام سے شائع بھی ہوئی جس کی ایک کاپی میرے ایک عزیز دوست سعید احمد ہاشمی کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ تضمین تو یاد نہیں البتہ مضطرؔ کا قطعہ پیش کرتا ہوں۔

اک نیا حال سناؤں کہ شبِ دوشینہ
میں جو لیٹی پئے آرام بچھا کر بستر

پتلیاں خواب سے بولیں ارے چل پیرا ڈے
نیند نے بند کئے دیدۂ بیدار کے در

دیکھتا کیا ہوں کہ اک شوخ ادا پردہ نشیں
فتنہ خو، خانہ بر اندازِ جہاں، عربدہ گر

چمپئی رنگ، چھریرا سا بدن، پھول سی گل
سروِ بُستاں سے کہیں قامتِ موزوں بہتر

بالیاں کانوں میں پہنے ہوئے پیاری پیاری
بجلیاں دو تو چمکتی ہوئی رخساروں پر

مانگ صندل سے بھری، ماتھے پہ ٹیکے کی پھبن
ڈھل کے آیا ہوا ابرو پہ جڑاؤ جھومر

پلٹنیں غمزہ و انداز کی ہمراہ لئے
ساتھ چالاکی و شوخی و ادا کا لشکر

چلی آتی ہے دبے پاؤں اُٹھائے چھاگل
دیکھتی جاتی ہے مڑ مڑ کے اِدھر اور اُدھر

آتے آتے مرے بالیں کے قریب آ پہونچی
اور کہا ہنس کے کہ ہاں اے مری دزدیدہ نظر

کام کر کام کہ موقع ہے یہی شب خوں کا
اس کے سینہ میں کسی طرح سے کر اپنا گزر

شوق و حسرت نظر آ جائیں تو دے خوب سزا
پھر جو کچھ مال ہو وہ لوٹ لے بے خوف و خطر

سن کے یہ بات نظر بولی کہ مشکل کیا ہے
کھولے دیتی ہوں میں سینے کے کواڑوں کو مگر

غمزۂ و ناز و ادا کو مرے ہمراہ کرو
کہ میں ساماں اُٹھاؤں تو یہ دے لیں باہر

آپ جانیں یہ بھرا گھر ہے سبھی کچھ ہوگا
میں اکیلی اسے لاؤں گی یہاں تک کیونکر

اور سوا اس کے جو کچھ نیکی بدی ہو جائے
تو میں چلتی ہوئی تلوار ہوں اور یہ سپر

سن کے یہ بات وہ کہنے لگی اچھا اچھا
اور دیا حکم کہ سب جائیں نظر جائے جدھر

اُس کے منہ سے یہ نکلنا تھا کہ بس دوڑ پڑا
باندھ کر غمزۂ بیباک حمایت پہ کمر

نگہِ شوخ نے کھولے مرے سینہ کے کواڑ — اور گئی غمزۂ سفاک کو لیکر اندر
پہلے سب مال لیا تاب و توانائی کا — اور پھر ہوش کے صندوق لئے بارِ دگر
دوش پر راحت و آرام کے بستے رکھے — صبر و تسکین و تحمل کا لیا سب زیور
لینے دینے میں اس اسباب کے آہٹ جو ہوئی — نیند سے چونک پڑی حسرتِ وصلِ دلبر
پہرے والوں کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر بولی — کون اُٹھا ہی ابھی دور ہے ہنگامِ سحر
جب تلک وہ یہ کہے غمزۂ انداز و ادا — باندھ کر پوٹ میں سب مال روانہ ہوئے گھر
پھر وہی ظالمِ اظلم نگہِ دزد دیدہ — لیکے چٹکی یہ پکاری کہ ارے او مضطر
دیکھ تو گھر میں ترے چوروں نے چوری کرلی — ایسا غافل کوئی سوتا ہی ذرا غور تو کر
سن کے یہ بات اُٹھا میں تو یہ میں نے دیکھا — کہ حقیقت میں مجھے لوٹ گئے غارت گر
اپنی بے جرمی پہ آنسو نکل آئے میرے — اُس کی بے رحمی پہ آنکھوں سے بہا خونِ جگر
یہ مثل ہوگئی صادق کہ ارے او بندے — کر تو ڈر ورنہ خدا کے غضب و قہر سے ڈر

ایک مدت تک مضطر کی عاشقانہ شاعری کا یہی رنگ رہا، آخر کار رجحانئے شوخی کے سنجیدگی پیدا ہوگئی جس نے بڑھکر ایک حد تک قنوطیت کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن کلام کی سلاست اور روانی میں فرق نہیں آیا گویا ایک دریا ہے جو کوہستان کی ناہموار فضاؤں سے نکل کر ابھی میدان میں آیا ہے اور خراماں خراماں اپنی عظمت اور برتری کے احساس کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ جذبات و خیالات، اندازِ بیان کے ساتھ اس طرح مل گئے ہیں کہ مے دوآتشہ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ان میں سے بعض اشعار تو زبان زد خلائق ہیں اور اُن کی قبولیت اب ہمیں اُن کی مخصوص لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتی ؎

تیرے جانے سے چمن تصویرِ وحشت ہوگیا — موسمِ گل کا زمانہ خوابِ عبرت ہوگیا
اے چمن زارِ محبت یہ تری بربادیاں — موسمِ گل ساتھ لیکر کون رخصت ہوگیا
کیا مری بربادیوں میں کچھ جھلک اُن کی بھی تھی — یہ بگولہ کیوں نثارِ خاکِ تربت ہوگیا
چمنِ محبت و عشق میں کئی سال خوب فضا رہی — مگر اُس نے آنکھ جو پھیر لی تو نہ گل رہے نہ ہوا رہی

وہ زمانہ مضطرِ بے نوا فقط ایک خواب و خیال تھا — وہ مٹا تو کچھ بھی نہیں رہا جو رہی تو ذاتِ خدا رہی

لطفِ زندگی کھویا دفعتاً جدا ہو کر — یار نے دیا دھوکا عمرِ بے وفا ہو کر ✓

کیئے ہم کہاں جائیں کس طرح گزارا ہو — منہ چھپا لیا اُس نے صورت آشنا ہو کر ✓

شبِ جدائی نے آ کے لوٹا سکون و صبر و قرار میرا — نہیں مصیبت کا کوئی ساتھی نہ موت میری نہ یار میرا

میری تربت پر تو جبھی گراں ہونے لگی — اُن کی ٹھوکر بھی نصیبِ دشمناں ہونے لگی

فصلِ گل میں بخت بھی چمکا تو چمکا اس طرح — برق آئی اور نثارِ آشیاں ہونے لگی

ہوش میں آ جاؤ مضطر ہو چکا خوابِ شباب — اب تو جاگو صبحِ پیری کی اذاں ہونے لگی

فنا ہو کر ادا کیا خاک رسمِ عاشقی ہو گی — تمہیں جب موت بن بیٹھے تو کیونکر زندگی ہو گی

تمنا اک طرح کی جان ہے جو مرتے دم نکلے — جدائی اک قسم کی موت ہے جو بے جیتے جی آئے

ہے یہی مضطر جو رنگِ انقلابِ انجمن — ایک دن ہم خوابِ چشمِ دوستاں ہو جائیں گے

نہ وہ عمر رہی نہ شباب رہا نہ وہ وقت رہا نہ زمانہ رہا — اُنھیں میری وفا سے غرض نہ رہی مجھے اُن کی جفا کا گلا نہ رہا

غمِ ہجر میں گزرے ہیں اتنے برس مجھے بھول گئی گلِ تر کی ہوس — ترا خانہ خراب ہو قیدِ قفس کہ خیال چمن کا ذرا نہ رہا

خمریات کو حضرت ریاضؔ کا حصّہ کہا جاتا ہے مگر مضطر بھی اس میکدے میں برسوں "خراب ہوش" رہے ہیں۔ ریاضؔ نے "مئے خیام" کا رنگ قبول کیا اور مضطرؔ "بادۂ حافظ" سے سیراب ہوئے بعض جرعے ملاحظہ ہوں:

میخانۂ وحدت میں جب ہوش سنبھالا تھا — اُس وقت مرا ساقی اللہ تعالیٰ تھا

میکدے میں پی گئے مے اوّل تو چپ رہنا پڑا — بات جب نکلی تو ساقی کو خدا کہنا پڑا

توبہ کو مانگتا ہوں سرورِ شراب میں — ساغر لئے کھڑا ہوں خدا کی جناب میں

ساقی کی محبت میں دل صاف ہوا اتنا — جب سر کو جھکاتا ہوں شیشہ نظر آتا ہے

اک یادگارِ مالکِ میخانہ ساتھ ہے — پہلو میں دل نہیں ہے یہ پیمانہ ساتھ ہے

جلوۂ رخسارِ ساقی ساغر و مینا میں ہے — چاند اوپر ہے مگر ڈوبا ہوا دریا میں ہے

غمِ ساقی میں اترا ساخلاص مے پرستی ہوں — وہ دو رہے ہو چکے اب یادگارِ رنگِ مستی ہوں

فرانس مارک   گھوڑے   آئل پینٹنگ

مدہوشی میں ساقی کے قدموں پہ نظر رکھنا
اے لغزشِ مستانہ بہکوں تو خبر رکھنا

حضرت ریاض مرحوم ایک مرتبہ گوالیار تشریف لائے تو والد نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ حسب معمول طرح تجویز ہوئی مگر اسی کے ساتھ جدت یہ کی گئی کہ ہر اک کی غزل کے لئے ایک موضوع مخصوص کر دیا گیا۔ مضطر نے ریاض کے لئے شراب کا مضمون تجویز فرمایا مگر ریاض نے مجبور کیا کہ اس موضوع پر آپ غزل لکھیں۔ چنانچہ مضطر نے تمام غزل میں شراب ہی کا مضمون باندھا اس غزل کا صرف ایک شعر مجھے یاد ہے ؎

ہمارے میکدے میں خیر سے ہر چیز رہتی ہے
مگر اک تیس دن کے واسطے روزے نہیں رہتے

جب والد نے غزل ختم کی تو ریاض نے مضطر کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ اس غزل کی داد تو یہی ہو سکتی ہے۔

مضطر اول اول غزل تحت اللفظ ہی پڑھنے کے عادی تھے مگر بعد میں بالحن پڑھنا شروع کیا، نہایت خوش الحان تھے فنِ موسیقی پر کمال عبور حاصل تھا۔ ناممکن تھا کہ مضطر کے پڑھ لینے کے بعد کوئی اپنا رنگ جما سکے۔ یوں تو آپ نے سینکڑوں مشاعرے سر کئے مگر رامپور کے مشاعرے کی سرخروئی نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ مضطر کو اس وقت بھی تمام ہندوستان جانتا تھا مگر اس کامیابی نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ مشاعرہ جناب شرر رامپوری نے نہایت وسیع پیمانہ پر منعقد فرمایا تھا۔ دو رات مسلسل مشغلۂ سخن جاری رہا، ہندوستان کے تمام باکمال شعرا کا مجمع تھا ایک سے ایک بڑھ کر کہنے والا موجود تھا مگر مضطر یہاں بھی آفتاب بنکر چمکے۔ سائل کے پڑھ چکنے کے بعد رنگ جمانا مضطر ہی کا کام تھا۔ اولاً آپ نے خلد آشیاں نواب حامد علی خاں صاحب کی شان میں ایک سو ایک شعر کا طرحی قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

شامِ غم گزری نمایاں ہو چلے آثارِ صبح
اوڑھ لی لیلائے شب نے چادرِ زرتارِ صبح

اس کے بعد طرحی غزل پڑھی اور تمام لوگوں کے اصرار سے کچھ غیر طرحی کلام بھی سنایا، جب مضطر پڑھ چکے تو حضرت شرر رامپوری آپ کو گود میں اٹھا کر بیچ محفل میں لائے اور بآوازِ بلند فرمایا کہ اس مشاعرہ کا انعقاد میں نے صرف اس لئے کیا تھا کہ آپ لوگ جان لیں کہ میں کیسے استاد کا شاگرد ہوں۔

دوسری ہی شب نواب مرحوم نے "حامد منزل" پر ایک مخصوص صحبتِ مشاعرہ قرار دی، والد کی طرحی غزل کا مطلع تھا ؎

غمزے چھری لئے ہیں نازِ امتحان پر ہیں
سنتو ہاتھ ہیں قضا کے جو ایک جان پر ہیں

مضطر نے کبھی کوئی شعر تعلّی کا نہیں کہا سوائے اُس غیر طرحی غزل کے مقطع کے جو انہوں نے اس رات کو پڑھی۔
اسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

توہی کوٹھے پہ تو کترا کے نکلتی ہے گھٹا　　کالے بادل ترے بالوں سے دبے جاتے ہیں

مقطع میں فرمایا ؎

بارہوں دیدۂ اربابِ سخن پر مضطر　　مدّعی میرے کمالوں سے دبے جاتے ہیں

جب نواب حامد علی خاں مرحوم نے مضطر کو مہاراجہ گوالیار سے مانگا اور وہ والد رامپور تشریف لائے تو حضرت شرر نے ایک مشاعرہ کیا جس کی طرح تھی کہ ؎ شررتم کو مبارک ہو کہ مضطر رامپور آئے
دو تین اشعار مضطر کے یاد ہیں ؎

الٰہی خیر زوروں پر بتانِ پُرغرور آئے　　کہیں ایسا نہ ہو ایمان عالم میں فتور آئے
یہی صورت وہاں تھی بے ضرورت بتکدہ چھوڑا　　خدا کے گھر میں رکھا کیا ہے ناحق اتنی دور آئے
محبت ایک شے ہوتی ہے اتنا سن تو اب رکھو　　سمجھ اُس وقت لینا جب جوانی میں شعور آئے

آپ کا ابتدائی زمانۂ حیات ریاست ٹونک میں گزرا، مختلف گرانقدر خدمات کے صلہ میں ریاست سے خان بہادر اعتبار الملک اقتدار جنگ کے خطابات حاصل کئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

بنایا اعتبار الملک مضطر　　عنایت ہے خلیل[1] قدرداں کی

حضرت بسمل خیرآبادی کے انتقال کے بعد نواب ابراہیم علی خاں والد کے شاگرد ہوئے اور اُستاد خاص کا لقب مرحمت فرمایا گیا۔ ایک دفعہ لوگوں نے مضطر کی طرف سے نواب صاحب کے خیالات خراب کرنا شروع کئے اور نواب صاحب مرحوم نے بھی کشیدگی کا اظہار کیا تو مضطر نے نہایت استغنا کے ساتھ ملازمت سے استعفا دیدیا۔ نواب صاحب نے استعفا نامنظور فرمایا اور آپ کو جانے نہ دیا۔ یہ استعفا منظوم ہے، کہیں کہیں سے اس کے اشعار نقل کرتا ہوں:

عالی جناب دیدۂ حق بیں ذرا ادھر　　پہچان لیں گے آپ تماشا نہیں ہوں میں
....　　..................

---

[1] نواب ابراہیم علی خاں مرحوم کا تخلص تھا۔

خاص ایک ہی طریق سے پشتیں گزار دیں — اب تک کسی نگاہ سے اُترا نہیں ہوں میں
میرے ہنر بھی عیب بنے میرے واسطے — اچھا ہوں شاید اس لئے اچھا نہیں ہوں میں
مشکوک بنکے رہنے کی عادت نہیں پڑی — میں اس طرح سے ہوں بھی تو گویا نہیں ہوں میں
وہ دن تو اب کہاں کہ جو آکر گزر گئے — کیا دیکھتا نہیں کہ سمجھتا نہیں ہوں میں
خوشنودیٔ مزاجِ مبارک کی چاہ ہے — واللہ روزگار کا بھوکا نہیں ہوں میں
جب آپ بدگماں ہیں تو رہنا فضول ہے — سمجھیں بُرا جب آپ تو اچھا نہیں ہوں میں

....

آزاد کیجئے کہ اُڑوں مثلِ بوئے گل — کھٹکوں کسی نظر میں وہ کانٹا نہیں ہوں میں

....

ہر حال میں رہے گا تعلق حضور سے — جھٹکے سے ٹوٹ جائے وہ رشتا نہیں ہوں میں
رخصت کی نذر دینے کو صرف دُعا ہے دل — اس کے سوا کچھ اور تو رکھتا نہیں ہوں میں
سب کچھ ہوں میرے واسطے سب کچھ ہی ہر جگہ — پہلے میں کیا نہیں تھا اور اب کیا نہیں ہوں میں

مضطر جب ملازم ہو کر گوالیار آئے تو تھوڑے ہی دنوں میں وہاں شاعری کی فضا پیدا ہو گئی۔ بہت سے لوگ آپ کے شاگرد ہوئے اور شعر و سخن کا خوب چرچا رہا۔ مضطر جب مشاعرہ کرتے تو باہر کے نامور شعرا کو بھی مدعو کرتے۔ حضرت سائل دہلوی نے ہمیشہ آپ کی دعوت کو لبیک کہا اور بلا عذر شرکت کی جناب احسن مارہروی ایک مرتبہ گوالیار تشریف لائے تو والد نے ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا جس کی طرح انہوں نے یہ تجویز فرمائی ؎

بعد مدت کے ملے ہیں حضرتِ احسن سے ہم

مولانا احسن نے فرمایا کہ میں تو اس مشاعرے کی طرح یہ رکھونگا کہ

بعد مدت کے ملے ہیں حضرتِ مضطر سے ہم

ایک مرتبہ مضطر مشاعرے کی شرکت کے لئے مارہرہ شریف بھی تشریف لے گئے۔ آپ نے وہاں ایک غیر طرحی غزل پڑھ کر تمام محفل کو تڑپا دیا، مقطع اور مطلع ملاحظہ ہو ؎

جو پوچھا کیوں کئے لاکھوں کلیجے چیر کے ٹکڑے | تو بولے ڈھونڈتے پھرتے تھے اپنے تیر کے ٹکڑے
نہ جانے نقش کس کا مل گیا نقاش سے مضطرؔ | مصور خود کئے دیتا ہے ہر تصویر کے ٹکڑے

آپ کی چند نظمیں مثلاً "منہ دیکھی محبت" "نیکی کا بدلا بدی" "اللہ بس باقی ہوس" اور "دکھی کی پکار" کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ نے ایک مثنوی "فغانِ مضطرؔ" کے نام سے لکھی تھی وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئی۔

مضطرؔ نے حمد اور نعت بھی کثرت سے کہی۔ حمد کی مطبوعہ یادگار اُن کا دیوان "نذرِ خدا" موجود ہے۔ یہ ضخیم دیوان بھائی برترؔ کی کاوشِ ترتیب کا نتیجہ ہے۔ علاوہ اس دیوان کے والد کا اور بھی غیر مطبوعہ حمدیہ کلام موجود ہے جو اس دیوان سے کہیں زیادہ ہے۔

مضطرؔ کا نعتیہ کلام بھی قبولِ عام حاصل کر چکا ہے۔ یہ گرانقدر ذخیرہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُن کی نعتیہ شاعری مکمل طور پر ملک کے سامنے پیش کر دی جائے تو نقادانِ سخن مضطرؔ کو نعت کا امام تسلیم کر لیں گے۔ مضطرؔ کا یہ صنفِ کلام آج بھی ملک کے پیشِ نظر ہے، بعض بعض ٹکڑے حسبِ ذیل ہیں:

ملنا تھا تو مل جاتے اُس نورِ مجرد سے | کیوں جل کے چلے آئے دربارِ محمدؐ سے
اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے | جو کچھ مجھے لینا ہے لیلوں گا محمدؐ سے

سُن اے بادِ صبا تو جانبِ طیبہ اگر گزرے | تو جا کر تھامنا بابِ حریمِ خاص کے پردے
درِ اقدس پہ اپنا سر جھکا کر میری جانب سے | بصد آداب یہ کہنا کہ اے مالک مدینہ کے

جوارِ خاص میں دو گز جگہ مضطرؔ کو مل جائے
نہ ہو بعدِ فنا محتاج لاشہ کنجِ مرقد کا

اور اُس کے ساتھ ہی کہنا کہ اے محبوبِ جاں میرے | بڑے منجدھار میں ہوں دور ہے کشتی کنارے سے
ہوا بالکل مخالف چل رہی ہے اور دن کھوٹے | جو وہ پوچھے کہ پھر کیا چاہتا ہے صاف یوں کہدے

جوارِ خاص الخ..........

اگر پوچھے کہ اب کیا مانگتا ہے مانگ لے مجھ سے | تو کہنا آپ نے سب کچھ دیا اور دے چکے پہلے
گر قسمت بُری تھی بن گئے سب خار گل بوٹے | اب آخر وقت میں کیا چاہیے مجھکو سوا اس کے

جوارِ خاص الخ............

گزارش یہ بھی کرنا جب وہ میرا حال دل پوچھے | کہ یا شاہِ مدینہ زندگی کے دن بُرے گزرے
گلِ مقصود جتنے تھے وہ سارے بن گئے کانٹے | اگر پوچھے کہ پھر اب کیا ہوس ہے عرض یوں کرنے

جوارِ خاص الخ............

اگر پوچھے کہ مضطر کیوں ہے کہنا آپ کے پیچھے | اگر پوچھے کہ کیوں بیتاب ہے کہنا جدائی سے
اگر پوچھے کہ روتا کیوں ہے کہنا دن نہیں اچھے | اگر پوچھے کہ کیا خواہش ہے کہنا اے نبی پیاسے

جوارِ خاص الخ............

آپ کا نعتیہ مسدس " سبز گنبد کے مکیں میری مدد فرمائیے " ایسا نہیں کہ کسی نے نہ سُنا ہو۔ مضطر کا ایک اور نعتیہ مخمس ہے جس میں اُردو، ہندی، فارسی اور عربی زبان کا ایسا لطیف اشتراک پایا جاتا ہے کہ اس کی مثال بمشکل کہیں اور مل سکتی ہے ؎

وصفت زبشر ہمہ ناممکن ہستی ممدوحِ خدا جانا | من یا ہی بچار کرت نندن تو ہے پرکھن ہارے نے کیا جانا
کہتی ہے مگر چشمِ باطن میں نے تو تجھے یکتا جانا | لم یأتِ نظیرُکَ فی نظرٍ مثل تو نشد پیدا جانا
جگ راج کا تاج تورے سر سو ہے تجھکو شہِ دوسرا جانا

اے شافعِ عِوَہ روزِ جزا شد غرقہ بحرِ گنہ دلِ ما | من کو اُن روگ کا روگ لگا جن چاہے نہ آپ ملیں نہ خدا
کرتا ہوں یہی دن رات ندا اے ساقیٔ چشمۂ کوثر آ | الموج علے والبحر طغٰے من بیکس و طوفاں ہوش رُبا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا

من تیرہ نصیب و سیاہ عمل دارم ہمہ عقدۂ لاینحل | نہ تو کا ہو کی آس نہ کا ہو کو بل مورے چتر کو دھیر نہیں اک پل
اب تو چاہے تو ملے مجھے کل تر ہو سوکھی ہوئی کشتِ امل | لکَ بدرٌ فی الوجہِ الاجمل خط ہالۂ مہ زلف ابرِ اجل
تورے چندن چندر پڑو کنڈل رحمت کی بھرن برسا جانا

تا چند کشم بہ فراقِ تو غم تا کے خور و نوشم سرِ شک و الم | ہر راج کو راج بڑھے جم جم سُدھ کا ہے بسار دیئی پیتم
میں تشنۂ شوق ہوں تیری قسم تپ ہجر سے اب تو لبوں پہ ہے دم | انا فی عطشٍ وسخاک اتم اے گیسوئے پاک اے ابرِ کرم
برسن ہارے رم جھم رم جھم دو بوند ادھر بھی گرا جانا

وغیرہ وغیرہ

مضطر نے گویا اجاگر کر سات سالانہ محافل میلاد کے انعقاد کی ابتدا کی۔ یہ محفلیں دس شعبان المبارک سے سولہ شعبان تک بڑی دھوم سے ہوا کرتیں۔ والد نے سات جلدیں محفل میلاد کے لئے تالیف فرمائیں جن میں ابتدائے آفرینش سے لیکر آنحضرت صلعم کی وفات حسرت آیات تک کا مفصل حال درج ہے ان تذکروں کے درمیان مختلف مقامات پر آپ کی نعتیہ حمدیہ غزلیں پڑھی جاتیں اور یہ غزلیں والد ہر سال تبدیل فرما دیتے۔ نثر مضطر خود پڑھتے تھے نظم کے لئے کچھ میلاد خواں مخصوص تھے جن میں حافظ نبی محمد صاحب کا نام خاصکر قابلِ ذکر ہے۔ محفل کی جلدیں خود والدِ مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ حضرت علیا بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال نے ان تالیفات کی طباعت کا صرفہ منظور کرتے ہوئے والد سے ان کی اشاعت کے لئے اصرار کیا تھا مگر مضطر نے خدا معلوم کیوں ان جلدوں کو اپنے ہی محفل میلاد کے لئے مخصوص رکھا۔ آپ کو ان محفلوں سے ایک خاص لگاؤ تھا، ایک قلبی وابستگی تھی جس کا اظہار آپ کے ایک مقطع سے ہوتا ہے:

محفلیں ہونگی مگر میں نہ رہوں گا مضطر　　　چھوڑ جاؤں گا میں دنیا میں یہ چرچا اپنا

مضطر کی شاعری نے آخر عمر میں تصوف کا رنگ اختیار کر لیا جس کی مختلف وجوہ ہیں۔ مضطر اُس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس میں نہ صرف اکابر علما و فضلا گزرے بلکہ بہت سے صاحبِ ولایت بھی ہوئے۔ حضرت خواجہ مخدوم علاء الحق الدین سندیلوی اور شیخ المشائخ بندگی سید حسن سے آپ کا جدّی تعلق تھا حضرت معشوق علی شاہ قدس سرہٗ آپ کے پردادا مولٰنا محفوظ علی صاحب کے حقیقی بھائی تھے۔ خود آپ کے حقیقی بھائی محمد حسین بسملؔ[1] خیرآبادی بڑے صوفی منش اور صاحبِ طریقت بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نے اپنی ابتدائی زندگی اپنے بھائی کے زیرِ سایہ بسر کی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ تصوف کا مادّہ مضطر کی فطرت میں وراثتاً موجود تھا ایک جگہ لکھتے ہیں "میں ایک فقیر کا پوتا ایک فقیر کا بیٹا اور ایک فقیر کا بھائی ہوں اور اس لئے خود بھی فقیر ہوں" دوسرے جس چیز نے اس جذبہ کو اُبھارا وہ آپ کا خلوصِ اعتقاد تھا جو ہمیشہ آپ کو اولیا اکرام سے رہا۔ آپ مولانا حافظ کرم احمد سندیلوی رح کے مرید تھے۔ فرماتے ہیں ؎

بہت دن سے مقیمِ کوچۂ عشقِ مجازی ہوں　　　دکھا دے عالمِ بالا شہِ حافظ کرم احمد

---

[1] آپ کا مزار اجمیر شریف میں ہے۔ ایک چھوٹے پیمانہ پر آپ کا عرس بھی منایا جاتا ہے حضرت خواجہ غریب نواز سے بے انتہا عقیدت تھی۔

تھوڑے عرصہ بعد آپ حضرت حاجی وارث علی شاہ کے "طالب" ہوگئے۔ ایک جگہ اپنے اس جذبۂ ارادت کا اظہار کرتے ہیں ؎

آنکھوں سے کیوں نہ چوموں پائے جنابِ وارث ۔۔۔ بے وارثوں کے وارث آئے جنابِ وارث

حاجی وارث علی شاہ خیرآباد تشریف لائے اور قوالوں نے آپ کے سامنے یہ غزل پڑھی تو آپ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور اُسی دوران میں آپ نے کئی مرتبہ فرمایا کہ "بڑا نامی مضطر"۔ گوالیار کے زمانۂ قیام میں آپ کو بابا شیخ مسیح الدین نوراللہ مرقدہٗ سے بھی اک خاص لگاؤ پیدا ہوگیا۔ بابا آپ سے بہت اُنس رکھتے تھے اور میں کہونگا کہ یہ انہیں کی کشش ہے کہ آج مضطر آپ کے مزار مبارک کے قریب سوتے ہیں ؎ مضطر بمرد و ماند بہ دنیا فسانہ اش

جس چیز نے مضطر کی صوفیانہ شاعری کو جِلا دی وہ اُن کی "رندانہ جرأت" ہے کہ جو چاہا بے اختیار کہہ دیا اور دراصل یہی وہ کیفیت ہے جو شاعری کا کمال متعین کرتی ہے۔ آپ کی متصوفانہ شاعری کی یادگار "الہامات" کا مختصر سا مجموعہ ہے جس کی تدوین اور اشاعت بھائی نشتر نے فرمائی الہامات کے کچھ شعر نمونتاً پیش کرتا ہوں۔ تصوف کی چاشنی، ترکیب کا رقص اور بیان کی سلاست ملاحظہ ہو:

حجابِ خاص کے نقشے مٹے ہیں کیفِ مستی میں ۔۔۔ نہ جانے کس کی ہستی دیکھتا ہوں اپنی ہستی میں

یہ بات محبت نے اک دن مجھے سمجھائی ۔۔۔ تو خود ہی خدا اپنا پردہ ہے خود آرائی

وحدت نے مجھے تیرا آئینہ بنا ڈالا ۔۔۔ خودبینی کی خودبینی، یکتائی کی یکتائی

وحدتِ خاص نے کیا خوب یہ نقشہ کھینچا ۔۔۔ تیری تصویر میں ہوں مری تصویر میں تو

امتحاں گاہِ محبت میں نہیں جان کا غم ۔۔۔ یہ دعا ہے کہ چمکتا رہے شمشیر میں تو

دیر و حرم میں سب جگہ ڈھونڈھ لیا ملا نہیں ۔۔۔ یہ بھی کسی کی چھیڑ تھی اپنا غلط پتا دیا

حقیقت کا نشاں چشمِ تامّل سے نکل آیا ۔۔۔ ہمارے جزوِ ہستی کا پتہ کُل سے نکل آیا

بتایا حال یوں کوزے میں دریا کے سمانے کا ۔۔۔ کہ ساقی خود مجسم ساغرِ مُل سے نکل آیا

قناعت دوسرے کے آسرے کا نام ہے مضطر ۔۔۔ خدا ہے جو کوئی حدِ توکل سے نکل آیا

---

[۱] آپ کا عُرف چھنگا میاں ہے اور مزار آپ کا قلعۂ گوالیار پر ہے۔ آپ کے لوحِ تربت پر مضطر مرحوم کی کہی ہوئی حسبِ ذیل تاریخ کندہ ہے:

یہ ڈوبے ہیں خدا کی معرفت میں ۔۔۔ یہی لائے ہیں تہ سے دُرِّ ایماں

انہوں نے بارگاہِ حق سے مضطر ۔۔۔ لقب پایا غریقِ بحرِ عرفاں

تیرے رہنے کی حقیقت میں نشانی میں ہوں — تو جو باقی ہے تو تیرے لئے فانی میں ہوں

بزمِ ہستی میں بڑے صاحبِ اسرار ہیں ہم — رازِ وحدت کی شہادت کو نمودار ہیں ہم
عمر سب ذوقِ تماشہ میں گزاری لیکن — آج تک یہ نہ کھلا کس کے طلبگار ہیں ہم
ہستیٔ غیر کا سجدہ ہے محبت میں گنہ — آپ ہی اپنی پرستش کے سزاوار ہیں ہم

تجھی کو ڈھونڈھ رہا ہوں سمجھ گئے سب لوگ — بڑا ستم مرے اندازِ جستجو نے کیا

اب تک نہیں کھلا کہ حجابِ وجود میں — میں پردہ دار تھا کہ خدا پردہ پوش تھا

پردۂ وحدت میں قیدِ بندگی جاتی رہی — مجھکو اپنی ذات میں مولا نظر آنے لگا
ترکِ ہستی سے مری خانہ بدوشی مٹ گئی — لامکاں پہونچا تو گھر اپنا نظر آنے لگا

میں ملنا چاہتا ہوں تجھ سے ایسے طور پر جا کر — جہاں تیری تجلی بھی نہیں معلوم ہوتی ہے
تری برقِ تجلی کے چلن ہم سے کوئی پوچھے — چمکتی ہے کہیں لیکن کہیں معلوم ہوتی ہے

میں تو اک جوہرِ ذاتی تھا الٰہی تیرا — کیوں کیا اس تنِ خاکی میں مقید مجھکو
مرکے بھی شغلِ مے عشق ہے جاری مضطرؔ — میکدہ ہے مرا ٹوٹا ہوا مرقد مجھکو

مضطرؔ نے ہندی شاعری بھی کی، ملہار، ٹھمری، ہولی، دادرا، بسنت کیا کچھ نہ کہا، بعض چیزیں تو بیحد مقبولِ عام ہیں مثلاً اُن کی ٹھمری:

آؤ آؤ نگریا ہماری رے

یا پھر اُن کا وہ ملہار جو بلا شبہ ہندوستان کے برساتی گیتوں کی جان ہے:

چھا رہی اودی گھٹا جیرا مورا گھبرائے ہے
سن ری کوئل باوری تو کیوں ملہاریں گائے ہے

او پپیہا آ ادھر میں بھی سراپا درد ہوں — آم پر کیوں جم رہا میں بھی تو ویسی زرد ہوں
فرق اتنا ہی کہ اُس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے

....

مضطرؔ کی کچھ اور ہندی چیزیں مختصراً پیش کرتا ہوں:

ایسے دنن برکھا رت آئن گھر نا ہیں ہمرے شیام رے
آنبہ کی ڈال کوئلیا جو کو کے آئی گھٹا جھوم جھام رے
مضطرؔ پیا پردیس سدھارے سونا ہے گوکل دھام رے

پاپی پپیہرا جیرا کا بیری لیت پیا کا نام رے
اٹھری پیر جیہا کی سنگھا تن بارا کلیجوا تھام رے
دکھیا جان کے مجھ برہن کو جلدی ملیئو رام رے

پی کارن سگری پت کھوئی
اپنی بپتا پر برسن روئی

دوہا

لاگی آگ پریم کی تن من دینو پھوک
آئی یاد کرشن کی اٹھی کریجے ہوک

شعر

شبِ فرقت میں نہیں سوتی ہیں دم بھر آنکھیں
نیند کی جان کو روتی ہیں برابر آنکھیں

شعر

خوابِ دیدہ نیامد ز دل آزاریِ دل
وائے بر چشم و بر تازہ گرفتاریِ دل

اتنی عمر سکھ نیند نہ سوئی
پی کارن ....

دوہا

سب سکھیں کے سیام ہیں اور ہم دکھیا بن سیام
سب کا پی آرام ہے اور ہمرا پی ہے رام

شعر

نورِ دیدار سے ہیں سب کی منور آنکھیں
اک مجھی کو مرے اللہ نے دیں تر آنکھیں

شعر

ہمہ مصروفِ طرب از پئے غمخواریِ دل
منم و گریۂ دل، نالۂ دل، زاریِ دل

سب کے پی ہمرا نہیں کوئی
پی کارن ....

دوہا

اُونچی وا دیس کے جیتو پی کے تیر	کیتو ہری اور سے اب ناہیں ہے دھیر

شعر

ڈھونڈتی ہیں تجھے اے یار ستمگر آنکھیں	زندگی میری کئے دیتی ہیں دو بھر آنکھیں

شعر

تا کجا اے ستم ایجاد جفا کاریٔ دل	قابلِ رحم شدہ حالتِ بیماریٔ دل

بن تمہرے موہے کل ناہوئی

پی کارن ....

دوہا

بیدردی وہ پی ملے کہ مضطر حسن کا ناؤں	من بس کر کے تج دیا اور آپ براجیں گاؤں

شعر

پہلے دل لے گئے دکھلا کے فسوں گر آنکھیں	اب ملاتے نہیں اللہ اکبر آنکھیں

شعر

ثمر عیش نہ بخشید وفاداریٔ دل	در دلِ یار نیامد غمِ ناچاریٔ دل

بیچ دھار موری ناؤ ڈبوئی

پی کارن ....

ہولی

رات سپنے میں آئے پیا موسے کھیلن ہوری

کیسریا کیسں پر باندھے تا پر رنگ پڑوری

ہاتھ لئے رنگ پچکاری ابرا کی ڈارے جھوری

ڈبے پگ چوری چوری — رات سپنے میں ....

سووت ما نو ہے چیت دلائن چوم کے انکھیاں موری
جاگ پڑوں تو کچھ نہ پاؤں کا سے کہے مضطر، گوری!
ابھی کھیلت تے ہوری — رات سپنے میں......

ملہار

کہا مان لے پپہیا را نہ لے پیا کا نام
بالی عمریا کو دیکھ
سونی سجریا کو دیکھ
ہوک کی کوک کلیجوا میں لاگے
کوک سے پھونک نہ جیارا ——— نہ لے پیا کا نام
جاکے سنوریا کو دیکھ
کاری کمریا کو دیکھ
بنسی بجاوت بن میں پھرت ہے
باندھے ہے سیس پہ چیارا ——— نہ لے پیا کا نام
رات کی بیریا کو دیکھ
کھالی اٹریا کو دیکھ
مضطر سے کر جوڑ کے کہیو
آو تو میں باروں دیارا ——— نہ لے پیا کا نام

چند دوہے بھی ملاحظہ ہوں:

تن پایا تب من ملا اور من پایا تب پی
تن من دونو پی کے ہیں اور پی کا نام ہے جی
پی مورا میں پیو کی، پی دن ہیں میں رین
جیسے بجریا ایک ہے اور دیکھت کے دو نین
گوکل کی سی ناگری اور متھرا کا سا گاؤں
تم ہو مالک برج کے، کرشن تمہارا ناؤں

تن میٹے من وارئیے یہی پریت کی آن — جو اپنا آپا تجے سو داکا داسی جان

مالک ہی کے نام کی مالا پھیرت لوگ — مالک بسئے تب مٹے نیٹ بہت کا روگ

آپ جگت مہراج ہو اور مضطر آپ کا داس — جن حالن چاہو رکھو پر رکھنا اپنے پاس

مضطر نے اتنا کہا کہ اگر اُن کا تمام ذخیرہ مجتمع ہوتا تو میر کی پانچ کلیات تیار ہوتیں۔ لیکن اُن کی "شاعرانہ بے پروائی" نے غضب ڈھایا کہ دیوان کے دیوان ضائع کر دیئے۔ کبھی اپنے کلام کو یکجا کرنے کی کوشش ہی نہ کی، جو جہاں کہا وہیں چھوڑ دیا۔ کچھ یوں برباد ہوا کچھ اُن کی "شاعرانہ فیاضی" نے ستم توڑا کہ اُن کے ہمعصر شعراء نے جتنا کہا اُس سے زیادہ اُنھوں نے اپنے شاگردوں کو بانٹ دیا۔ مضطر اُن شاعروں میں نہ تھے جو پہلے دوسرا مصرعہ کہتے ہیں پھر اُس پر پہلے مصرعہ کی فکر کرتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ قابلیت کا کچھ وہی لوگ صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں جن کو اُن کے ساتھ رہنے یا اُٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن کے لئے دس مختلف الاوزان بحروں میں مختلف ردائف و قوافی کے ساتھ بیک وقت شعر کہنا ایسا ہی آسان تھا جیسا کہ ہمارا دس غزلوں میں سے متواتر ایک ایک شعر پڑھتے رہنا۔ کچھ لوگ اس کو مبالغہ سمجھیں گے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ اُن کی زود گوئی کا وہ معمولی اعجاز تھا جس کا مشاہدہ اکثر میری آنکھیں کر چکی ہیں۔ ایک دفعہ نواب ابراہیم علی خاں مرحوم کے محلِ خاص پر مشاعرہ تھا۔ مضطر حسبِ معمول وہاں پہونچے مگر یہ خیال نہ رہا کہ آج بزمِ مشاعرہ ہے۔ نواب مرحوم نے اصرار کیا کہ پہلی غزل اُستاد ہی پڑھیں گے۔ آپ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا جیب سے نکالا اور غزل پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ والد فرماتے تھے کہ جب تک لوگ میرے پہلے شعر کی تعریف کرتے میں دوسرا کہہ لیتا۔ جب پڑھ چکا تو نواب صاحب نے غزل مانگی میں نے وہی کاغذ جو اُس وقت میرے ہاتھ میں تھا پیش کر دیا۔ نواب صاحب نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا میں نے واقعہ عرض کر دیا۔ اسی طرح نواب حامد علی خاں مرحوم نے ایک مرتبہ آپ کی زود گوئی کی آزمائش کی مضطر دربار میں حاضر تھے۔ نواب صاحب نے مصحفی کا مطلع پڑھا:

دعویٰ کیا تھا گُل نے اُس رُخ سے رنگ و بو کا — دھولیں صبا نے ماریں، شبنم نے منہ پہ تھوکا

اور فرمایا کہ مضطر صاحب ان قوافی میں اس سے بہتر مطلع نہیں سُنا، والد آپ کا مافی الضمیر سمجھ گئے، کہنے لگے کہ اُستاد کے مطلع پر مطلع کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا جب نواب صاحب نے مجبور کیا اور حکم دیا کہ قلم دوات لائی جائے تو مضطر کہنے لگے کہ نواب صاحب دوات قلم لیکر خیرآباد کی لڑکیاں شعر کہتی ہیں، مرد نہیں، اگر سرکار مجبور کرتے ہیں

توغزل عرض کرتا ہوں چنانچہ آپ نے کھڑے ہوکر انھیں قوافی میں فی البدیہ گیارہ مطلع فرمائے اور غزل پوری کردی۔
آپ کا پہلا مطلع ملاحظہ ہو۔

گلشن میں سن کے چرچا اُس گل کے رنگ و بو کا　　غنچہ نے خار کھایا، لالہ نے خون تھوکا

آخر میں مقطع فرماتے ہیں۔

فرمانِ حامدی سے مضطرؔ غزل کہی ہے　　محمود بن گیا ہے انداز گفتگو کا

مضطرؔ کی عادت تھی کہ جب شعر کہتے دوسرے سے لکھواتے اور اس قدر جلد اور تیز کہتے کہ لکھنے والا پہلا شعر نہ لکھ پاتا کہ آپ دوسرا شعر فرما دیتے آپ نے اپنے ایک شاگرد کو جن کا تخلص نہایت غیر شاعرانہ ہے ایک مکمل دیوان پندرہ دن کے اندر لکھوا دیا۔ یہ تھی مضطرؔ کی شاعرانہ فیاضی اور پھر اس پر ظلم یہ ہوا کہ والد کے انتقال کے بعد اُن کے وہ شاگرد جن کے پاس مرحوم کے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اپنے کو تہی دست بتا کر ایک بڑی دولت ہضم کر بیٹھے۔

مضطرؔ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں سے شائق شاہجہاں پوری، عاشق گوالیاری، شاغل بہاری، واقف الہ آبادی، شرر رامپوری، قیس ٹونکی، دریا گوالیاری اور ساغر سندیلوی وغیرہ وغیرہ ممتاز ہیں مضطرؔ کی شاعری کا اثر وراثت اور ماحول دونوں اعتبار سے اُن کی اولاد پر پڑا اکثر ایسا ہوتا کہ والد کوئی مصرع طرح تجویز فرما دیتے اور ہم سب بھائی بہن اُس پر طبع آزمائی کرتے جس کی غزل سب سے اچھی ہوتی والد اُس کو کچھ نہ کچھ انعام ضرور عنایت فرماتے۔ ایک مرتبہ والد باہر تشریف رکھتے تھے آپ کے بہت سے شاگرد جمع تھے آپ نے ایک مصرعہ کہا اور فرمایا کہ جو کوئی اس پر سب سے بہتر گرہ لگائے گا اُس کو انعام ملے گا، مصرعہ یہ تھا:

اب خدا خوش ہے تو روٹھا ہے پیمبر ہم سے

شرط یہ تھی کہ مطلع ہو اور نعت میں نہ ہو، سب نے طبع آزمائی کی مگر سب سے بہتر مصرعہ بھائی برتر نے لگایا ؎

اُن کے پیغام چھپاتا ہے کبوتر ہم سے　　اب خدا خوش ہی تو روٹھا ہے پیمبر ہم سے

والد بہت خوش ہوئے اور بڑی تعریف فرمائی۔

مضطرؔ بڑے خوش طبع تھے آپ کے بائیں ہاتھ پر فالج کا اثر ہوا، مولوی اخلاق الحسن صاحب خیرآبادی نے آپ کی خیریت دریافت کی تو آپ نے اُن کی عیادت کا جواب ایک شعر کے ذریعہ دیا، شعر یہ ہے۔

بازو پہ رکھ کے سر جو وہ کل سات سو گیا
آرام یہ ملا کہ مرا ہات سو گیا

مضطرؔ جب نواب نصراللہ خاں مرحوم کے جوڈیشل سکریٹری مقرر ہوکر بھوپال آئے تو نواب صاحب نے شوکت محل کے دفتر کی عمارت آپ کو رہنے کے لئے عنایت فرمادی۔ والد نے اپنی آسائش کی خاطر کچھ تبدیلیاں کرائیں اور حسب الحکم اجرت کا بل سرکاری دفتر کے نام بھجوادیا، جب بہت دن گزر گئے اور رقم دستیاب نہوئی تو مضطرؔ نے ایک چار شعر کا قطعہ لکھا اور نواب صاحب کو لیجا کر سنایا، نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے اور فوراً رقم کے اجرا کا حکم جاری کر دیا، قطعہ سنئے۔

ٹھیکدار اب تو بہت سخت ستاتا ہے مجھے
زر نہیں پاس جو دیکر اُسے رخصت کردوں

اور رہنے میں تحمل بھی نہیں ہے اتنا
کہ تقاضے پہ اُسے وقفِ مروّت کردوں

یا تو سرکار کے اجلاس سے منظوری ہو
تاکہ بلوا کے حوالہ اُسے قیمت کردوں

یا یہ صورت ہے کہ اُس نے جو مرمت کی ہے
اُس کے بدلے میں میں اُس کی بھی مرمت کردوں

نواب نصراللہ خاں کے انتقال کے فوراً ہی بعد والد استعفا دیکر اندور چلے گئے۔ اندور کی آب و ہوا کچھ موافق نہ آئی، طبیعت ناساز رہنے لگی تو آپ رخصت لیکر گوالیار چلے گئے۔

آخر زمانے میں مضطرؔ نے مشاعروں کی شرکت بالکل ترک کردی تھی آپ کی طبیعت اب اچھی نہیں رہتی تھی، تبدیل آب وہوا کی غرض سے وطن تشریف لے گئے یہاں آپ نے اپنے پردادا حضرت معشوق علی شاہ صاحبؒ کا عرس مبارک نہایت دھوم سے کیا۔ انتقال سے کوئی بیس روز قبل مضطرؔ اندور سے گوالیار چلے آئے اس وقت آپ کی حالت بہت نازک ہوچکی تھی، علاج ہوتا رہا مگر کوئی فائدہ نہوا۔ ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ کو آپ نے رات کو نو بجکر بیس منٹ پر اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔

انتقال سے کچھ دن پہلے کاغذ کا ایک ٹکڑا یہ کہکر طلب کیا کہ لاؤ آخری غزل کہیں، مگر آپ نے صرف مطلع ہی تحریر فرماکر چھوڑ دیا یہ پرچہ میرے پاس احتیاط سے محفوظ ہے۔ مضطرؔ کا یہ شعر، آخری شعر ہے یہ بھی سن لیجئے۔

وہ آئے ہیں بیانِ کاوشِ دردِ دروں کرلوں
قضا اتنی تو مہلت دے کہ گردن یوں سے یوں کرلوں

نوائے آفریں

(سرودِ زندگی کی اشاعت پر)

محمد یحییٰ اعظم گڈھ

نوا سے کس کی برہم اب فضائے عالمِ جاں ہے
ترنّم میں یہ کس کے بجلیوں کا جوشِ طوفاں ہے

یہ کس کا نغمۂ رنگیں پیامِ شورشِ جاں ہے
یہ کس کا نالۂ خونیں نویدِ رقصِ وجداں ہے

چھلک آتی ہی یہ اک موجِ رنگیں کس کے ساغر سے
کہ شور انگیز جوشِ ہائے وہوسے بزمِ رنداں ہے

تڑپ اُٹھی ہی یہ موجِ نوا کس سازِ رنگیں سے
کہ صحرائے جنوں کا ذرّہ ذرہ مست و رقصاں ہے

یہ کس شوریدہ نے چھیڑا ہے یارب نغمۂ رنگیں
کہ رہ رہ کر ابھی تک فرقِ تعش تارِ رگِ جاں ہے

یہ کس رنگیں نوا شاعر کی شرحِ دردِ پنہاں ہے
کہ ہر صفحے کی سرخی، سرخیِ خونِ شہیداں ہے

یہ کس کی فطرتِ بے تاب ہی محوِ نوا سنجی
کہ بیتابی میں ہر اک حرف تصویرِ رگِ جاں ہے

تغزّل میں یہ کس نے شورشیں بھر دی ہیں صہبا کی
تخیّل میں یہ کس کے میکدہ کی روح پنہاں ہے

"نشاطِ روح" ہے یہ، یا پیامِ رقص و مستی ہی
"سرودِ زندگی" ہے یہ، کہ موجِ آبِ حیواں ہے

غزل ہے یہ کہ گنجینہ ہے اسرارِ حقیقت کا
حدیثِ عشق ہے یہ یا پیامِ عالمِ جاں ہے

نوائے راز ہے یہ نغمۂ رنگیں کے پردوں میں
حجابِ شیشہ و ساغر میں یہ صہبائے عرفاں ہے

وہ گلدستہ ہے یہ رنگینیٔ حسنِ تخیل کا
فدا جس کی بہار انگیزیوں پر باغِ رضواں ہے

صحیفہ ہے یہ وہ شعر و ادب کا دورِ آخر میں
جو رندانِ خمستانِ کہن کا عینِ ایماں ہے

مرقع ہے یہ وہ رعنائیٔ حسنِ محبت کا
کہ جس میں اشکِ گلگوں غازۂ رخسارِ جاناں ہے

یہ رنگ آرائیٔ ذوقِ نظر کا وہ تماشا ہے
کہ خود روحِ تماشا جس کی رعنائی پہ قرباں ہے

یہ دفتر ہے جنونِ عشق کے اس سرِ مخفی کا
جو روحِ آگہی ہے ماورائے علم و عرفاں ہے

یہ عقلِ مصلحت بیں کو سبق ہے درسِ مستی کا
یہ زہدِ معتکف کو دعوتِ خارِ بیاباں ہے

یہ ہوش و آگہی کو ہے صلائے شورش و مستی
یہ تمکین و خودی کو اک پیامِ کیفِ پنہاں ہے

یہی جیب و گریباں کو بشارت موسمِ گل کی
جنونِ شوق کو یہ مژدۂ فصلِ بہاراں ہے

بتائیں حرزِ جاں کیونکر نہ اربابِ نظر اس کو
کہ اس پردہ میں حسنِ شاہدِ معنی نمایاں ہے

کہاں ہوتے ہیں ایسے شاعرِ رنگیں نوا پیدا
بجا ہے سرزمینِ ہند اگر اصغر پہ نازاں ہے

روزِ جزا

عرصۂ حشر

سجاد علی انصاری (علیگ) مرحوم

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
(غالب)

پہلا منظر

فرشتوں کی ایک جماعت حمد و تسبیح میں مشغول ہے اُسی کے قریب اسرافیل اپنا صور لئے ہوئے
نہایت بے تابی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ اس اثناء میں جبرائیل میکائیل اور عزرائیل آ گئے

جبرائیل - اسرافیل تم جماعت میں کیوں نہیں شریک ہوئے۔ ہم لوگ تو محض اسی غرض سے حشر کا تمام کاروبار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ تم یہیں تھے پھر بھی تم نے شرکت نہیں کی۔ یہ کیوں؟ تمہارے چہرے پر یہ اضطراب کیسا!!

اسرافیل - میں سخت نادم ہوں کہ میرے صور کی وجہ سے آج یہ قیامت برپا ہو گئی۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی نے ایسی کش مکش نہ دیکھی ہوگی۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قیامت اس قدر فتنہ انگیز ہوگی ورنہ کبھی نفخِ صور کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیتا۔ آج میری پریشانیوں کا یہ عالم ہے کہ نہ میری سمجھ میں فرشتے آتے ہیں اور نہ شیطان۔ یہ وقت حمد و تسبیح کا ہرگز نہیں۔ یہ سادہ لوح جماعت عبادت میں اس طرح منہمک ہے گویا یہاں کوئی ہنگامہ ہی نہیں۔ تم لوگوں کا بھی اطمینان تعجب انگیز ہے۔

جبرائیل - تمہارا استعجاب تمہاری ناتجربہ کاری پر مبنی ہے تم کو آج تک دنیا میں قدم رکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا ورنہ آج کی قیامت سے تم اس قدر متاثر نہ ہوتے۔ دنیا میں جو قیامتیں روز اُٹھا کرتی تھیں اُن کو دیکھتے ہوئے آج کی شورشیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ میں دنیا میں اکثر گیا بارہا وہاں کی قیامت کبریٰ دیکھ چکا ہوں اس لئے آج مجھے نہ حیرت ہے اور نہ استعجاب۔

اسرافیل - یہ صحیح ہے کہ میں نے کبھی عالمِ انسانی کا تماشا نہیں دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اچھا ہوا ورنہ

خدا جانے میری کیا حالت ہوتی۔ آج جس وقت میں نے صور پھونکا ہے۔ میرے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس لئے نہیں کہ نفخ صور میں کوئی محنت شاقّہ تھی۔ ہرگز نہیں۔ البتہ میرے لئے وہ نظارہ ناقابل برداشت تھا جو دفعتہً صور کی آواز سے میرے سامنے آگیا۔ انسانوں کا ایک مجمع کثیر اس سراسیمگی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا کہ دیکھنے والوں پر ہیبت طاری ہوگئی۔ ایک فرشتہ بھی ایسا نہ تھا جو سراسیمہ نہ ہوگیا ہو۔

میکائیل - یہ میں نے بھی دیکھا کہ ہر شخص برہنہ تھا۔ برہنہ ہم لوگ بھی ہیں مگر ایسے نہیں۔ وہ لوگ تو اس قدر بے حس ہیں کہ اُنھیں اپنی برہنگی کا بھی ہوش نہیں۔ مگر میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں میں نے تقسیم رزق میں ضروریات کے متعلق کبھی کوئی بخل نہیں کیا۔

اسرافیل - برہنگی سے مجھے بحث نہیں۔ میں تو اُن چہروں کا تذکرہ کر رہا ہوں جن پر انسانی بداعمالیاں جھلک رہی تھیں۔ میری نگاہیں کسی طرح اُن کی متحمل نہ ہوسکیں۔

جبرائیل - انسانوں کو تم نے آج دیکھا ہے میں ہزاروں بار دیکھ چکا ہوں۔ مجھے آج اُن کی صورت میں کوئی خاص تغیر نظر نہیں آتا۔

اسرافیل - یہ میں تسلیم نہیں کرسکتا کہ انسان کو آج میں نے پہلی بار دیکھا ہے جس دن اُس کی تخلیق ہوئی اور اُس سے پیمانِ وفا لیا گیا۔ میں نے اُسے اُس دن بھی دیکھا تھا اور نہایت غور سے۔ غور سے اس لئے کہ اس کی وہ عظمت دریافت کرسکوں جس کی بنا پر اُسے دنیا میں نیابت الٰہی سپرد کی گئی تھی۔ اُس دن بھی مجھے کوئی ایسی خصوصیت نظر نہ آئی جو اُسے فرشتوں سے ممتاز کرسکتی۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس کا چہرہ معصوم تھا۔ اُس پر آج کی سی وحشت اور حیوانیت نہ تھی۔

عزرائیل - میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ انسان میں وہ کونسی خصوصیت تھی جس نے اُسے نیابت الٰہی کا مستحق بنا دیا۔ آدم یہاں جس طریقے سے رہے وہ ظاہر ہے۔ رہی اُن کی دنیاوی زندگی۔ وہ بھی کوئی راز نہیں۔ دنیا میں قدم رکھتے ہی انسان میں وہ تمکنت پیدا ہوگئی جس نے اُس کی معصومانہ دلآویزیوں کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔ مجھے تو نہ اُس کی صورت میں کوئی خصوصیت نظر آئی اور نہ سیرت میں حقیقت تو

یہ ہے کہ وہ ایک لایعنی ہستی تھی جس کا فنا ہو جانا ہی بہتر تھا۔ وہ صرف اس قابل تھا کہ اُس کی روح سلب کر لی جائے اُس کا کوئی دوسرا مصرف ہی نہ تھا۔

جبرائیل۔ آدم کو اپنی حقیقی عظمت کا احساس اُس وقت ہوا جب کارکنانِ قضا و قدر نے اُن کی شخصیت کا اعتراف کر کے دنیا کی حکمرانی اُن کے سپرد کر دی۔ اُسی وقت سے انسان میں ایک قسم کی خودداری پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے انسانی چہرے کی عصمت تمکنت سے بدل گئی۔ تم اُسے حیوانیت کہتے ہو لیکن میں محرمِ راز ہوں میں خودداری کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ کثیف گناہوں نے اکثروں کی صورتیں مسخ کر دی ہیں ورنہ انسان عام طور پر قبیح صورت نہیں۔ یہ محض تعصب ہے کہ تم اُس کی عظمت کے قائل نہیں۔ اُس کی خودداری کو فرعونیت کہتے ہو۔

عزرائیل۔ انسان کو مجھ سے زیادہ تم نہیں جانتے۔ تم صرف چند برگزیدہ انسانوں سے ملے ہو۔ اس لئے تم کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ میں ہر انسان سے ملا ہوں اُس کی حیوانیت کا اندازہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ اس قدر مغرور تھا کہ اُس نے کبھی میری ہستی تسلیم نہیں کی۔ اُس کی زندگی کے آخری لمحوں تک اُس کا غرور قائم رہتا تھا اگر وہ موت کا قائل بھی ہوتا تھا تو یہ سمجھتا تھا کہ مرنا اُس کا حق ہے لیکن اُس نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ مرنا اُس کا فرض بھی ہے اور مجھے اس کا حق ہے کہ میں اُس کی جان لے لوں۔ اُس نے کبھی میرے اس حق کو نہیں مانا۔ یہ محض فرعونیت اور حیوانیت ہے اسے خودداری ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

میکائیل۔ میں بھی دنیا میں روز جاتا تھا میں انسان کا کافی تجربہ رکھتا ہوں وہ فطرتاً حریص اور طامع تھا۔ اُس کی چالاکیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں مختلف طریقوں سے اُسے رزق دیا کرتا تھا عام اس سے کہ وہ طریقے صحیح ہوں یا غلط لیکن وہ میرے تمام ذرائع کو خود اپنی ہی ذہانت کا نتیجہ سمجھتا رہا۔ وہ اس قدر بر خود غلط تھا کہ اُس نے کبھی اپنی ہستی کو ناچار محض تسلیم نہیں کیا۔ کیا یہ کفرانِ نعمت نہیں کہ وہ میری ہی دی ہوئی دولت کے ذریعے سے اپنی قوتوں کو میرے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اگر جبرئیل اسی کو خودداری کہتے ہیں تو مجھے اُن سے قطعاً اختلاف ہے۔

جبرائیل - انسان میں قوتِ ارادی اور قوّتِ عمل دونوں ودیعت کی گئی تھیں وہ اس کا مجاز تھا کہ اُنھیں اپنے فوائد کے لئے استعمال کرے۔ تم لوگ انسان کے ہر عمل کو فہرست جرائم میں داخل کرنا چاہتے ہو۔ یہ صریحی ناانصافی ہے۔ کم از کم فرشتوں کو یہ نہ چاہیئے کہ واقعات انسانی کی توضیح و تشریح میں افراط و تفریط کو جائز رکھیں۔

عزرائیل - آپ اس طرح فرشتوں کو نصیحت کر رہے ہیں گویا آپ خود فرشتہ نہیں آخر انسان سے اس قدر مرعوب ہونے کے کوئی معنی نہیں - دنیا کے ساتھ آج اُس کی نیابت بھی ختم ہو گئی۔ اب تو اُس کی وہ اہمیت بھی باقی نہیں رہی جس کی وجہ سے ہم لوگ آج تک خاموش رہے۔

جبرائیل - فرشتہ میں بھی ہوں لیکن تم سب سے زیادہ مشیتِ ایزدی سے باخبر ہوں۔ دنیاوی نظام کو سمجھتا ہوں انسانی کشمکش سے واقف ہوں اور اُن مجبوریوں سے بھی جو انسان کو نیک معاش اور بدمعاش بنا دیتی تھیں۔ اس لئے مجھے اُس سے ہمدردی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تعصبات بے جا فرشتوں کے دل و دماغ پر غالب آجائیں اُنھیں ذاتیات کو دخل نہ دینا چاہیئے۔

عزرائیل - ہماری عصمت نے ہم کو ہمیشہ غیر معصوم انسانوں سے ممتاز رکھا۔ اس لئے ہمارے لئے نہ حسد و رشک کا کوئی موقع ہے اور نہ ذاتیات کا کوئی پہلو۔

جبرائیل - انسان نیابت الٰہی کا سرمایہ دار ہے اُس کی دیرینہ عظمت کی روشن ترین دلیل یہی ہے کہ سب سے بڑا فرشتہ اُس کی شخصیت پر ہمیشہ کے لئے قربان کر دیا گیا۔ تم سب ایک بار اُس کو سجدہ کر چکے ہو۔ تمھارے احساسات کو اُس کے سجدہ سے صدمہ پہنچا ہوگا۔ تمھارے تعصبات کا باعث شاید یہی ہے۔

اسرافیل - یہ امر افسوس ناک ہے کہ انسان کے متعلق فرشتوں میں بھی اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا۔ مجھے اُس کی ہستی سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ اس لئے اُس کے واقعات سے بھی مجھے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اُس کی اُس سراسیمگی اور وحشت کا باعث کیا ہے جو آج اُس کے ہر انداز سے نمایاں ہے۔

میکائیل - انسان حریص ترین مخلوق ہے جب تک وہ دنیا میں رہا اُس نے تلاش معاش میں ہر طرح کی بداخلاقیاں کیں اگر وہ کامیاب ہوتا تھا تو یہ سمجھتا تھا کہ کارکنانِ قضا و قدر کو اُس نے ہمیشہ کے لئے شکست دیدی

اگر افلاس و غربت کے ذریعہ سے اُسے پابند کرنے کی کوشش کی جاتی تھی وہ مجھ پر بخل و تہی مائگی کا الزام رکھتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ اُسے ہر جرم کے ارتکاب کا حق حاصل تھا۔ اُس کی دنیاوی زندگی تمام تر حرص و طمع پر منحصر تھی۔ اگر اُس نے کبھی مذہبی اور اخلاقی فرائض کی طرف توجہ کی تو وہ بھی محض اجر و جزا کی حرص میں۔ یہی نہیں بلکہ جس قدر زیادہ وہ مذہب کی طرف جھکتا تھا اُسی تناسب سے اُس کی حرص میں اضافہ ہوتا تھا۔ بہرحال اُس کی آج کی سراسیمگی اُس کی گنہگار زندگی کا خمیازہ ہے۔

عزرائیل۔ یہ مسلّمہ ہے کہ انسان کی تمام عمر مکاّریوں اور حیلہ سازیوں میں گزری۔ لیکن وہ اس قدر ہوشیار ہے کہ جب کبھی مجھے دیکھتا تھا۔ فوراً توبہ و استغفار میں محو ہو جاتا تھا میں نے اکثر اس کی کوشش کی کہ اُس کو مع اُس کے گناہوں کے دفعتاً دنیا سے اُٹھا لوں تاکہ اُسے اپنی بدکرداریوں سے تائب ہونے کا موقع نہ مل سکے لیکن اُس نے بارہا مجھے شکست دی تاہم اُس کی بداعمالیوں کی جو شکنیں اُس کے چہرے پر پڑ چکی تھیں وہ کبھی مٹ نہیں سکتیں۔

اسرافیل۔ کیا ہر انسان بداعمالیوں میں مبتلا رہا۔

عزرائیل۔ صرف وہ چند منتخب ہستیاں پاک رہیں جن پر فرشتوں کی عصمت سایہ گستر تھی۔ ان کے علاوہ ہر انسان غیر معصومانہ حرکات میں مبتلا رہا۔ ایسے حرکات جو ہم فرشتوں کے تخیل کے لئے بھی باعثِ ننگ ہیں۔

آواز۔ روح نکالنے کے علاوہ ہر حرکت آپ کے نقطۂ خیال سے باعث ننگ ہے۔ آپ لوگوں میں کوئی خصوصیت نہیں۔ اس لئے آپ مجبور ہیں کہ محض اپنی عصمت کو معیار امتیاز سمجھتے رہیں۔ آپ کو اپنی بدمذاقیوں پر شرم نہیں آتی۔

اسرافیل۔ یہ کسی انسان کی آواز ہے۔؟

عزرائیل۔ اُس کے علاوہ اور کون اس قدر گستاخ ہو سکتا ہے۔

آواز۔ انسانی گستاخیاں آپ کی سنجیدگی سے وقیع تر ہیں۔ میں دیر سے آپ کی گفتگو سن رہا ہوں۔ انسانی زندگی پر میں نے آج آپ کی زبانوں سے عجیب عجیب اعتراضات سُنے۔ آپ کے نزدیک وہ تمام اعمال جن کے ارتکاب پر آپ قادر نہیں معصیت میں داخل ہیں۔ حمد و تسبیح کے علاوہ دوسرے مشاغل کو

آپ غیر معصوم سمجھتے ہیں۔ یہ انتہائی تنگ نظری ہے آپ فوراً اس کی اصلاح کیجئے۔ انسان کو ہمیشہ اپنی عظمت کا احساس رہا۔ اس لئے وہ فرشتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فرشتہ محض نقشِ اول ہے اور انسانی تصویر کا محض ایک نامکمل خاکہ۔ اگر انسان کی تخلیق مقصود نہ ہوتی تو فرشتوں کا وجود ہی لایعنی ہوتا۔ انسانی ہستی کے ضمن میں وہ پیدا کئے گئے انھیں ہمیشہ انسان کا مرہونِ منت رہنا چاہیئے۔ انسان اس راز کا محرم ہے۔ میکائیل اور عزرائیل ایسے فرشتے جذبۂ رقابت سے لبریز ہیں۔ انسان پر اُن کی انتقامانہ تنقید کا یہی باعث ہے وہ انسانی وقار وعظمت کو وحشت وحیوانیت سے تعبیر کرتے ہیں یہ کج نظری خود انھیں کے لئے اندیشہ ناک ہے۔

جبرائیل ۔ عزرائیل یہ انسان نہیں اُس فرشتے کی آواز ہے جو اپنی رعونت کی وجہ سے معتوب ہوگیا تھا۔ اس کی گفتگو گمراہ کن ہے اُس پر توجہ نہ کرو۔

آواز ۔ ہر حقیقت ناآشنائے راز کے لئے گمراہ کن ہوا کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں معتوب ہوگیا تھا لیکن اس وجہ سے نہیں جسے آپ ارشاد فرما رہے ہیں۔ میں تو صرف اس لئے آپ لوگوں کی جماعت سے علٰحدہ کردیا گیا تھا کہ آپ اُن حقائق کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے جو میری ظاہری بغاوت میں مضمر تھے۔ انسان محرم راز تھا وہ مجھ سے مانوس ہوسکتا تھا۔ وہ فرشتوں سے بلند تر ہستی تھی اس لئے میرے انکار کی حقیقت اُس پر منکشف ہوگئی وہ مجھ سے بیگانہ نہیں رہ سکتا تھا۔ فرشتوں پر یہ ظاہر کیا گیا کہ میں معتوب کردیا گیا ہوں اس کے علاوہ اُن سے اور کیا کہا جاسکتا تھا۔ اُن میں کچھ اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔

عزرائیل ۔ ہماری مقدس کائنات میں شیطان کو قدم رکھنے کی اجازت کس نے دی

{یہ نام سنتے ہی جماعت نے نماز توڑ دی تمام فرشتوں نے ہم آواز ہوکر نعوذ باللہ کا ورد کیا اور سراسیمگی کے ساتھ چاروں طرف دیکھنے لگے}

جماعت کا ایک فرشتہ ۔ یہ ملعون ہے اسے فوراً نکال دو اس کی آواز ہماری عبادت میں مخل ہو رہی ہے۔

آواز ۔ خدا نے میری ایک مستقل ہستی تسلیم کرکے مجھے ملعون قرار دیا۔ میری ایک حیثیت ہمیشہ کے لئے متعین ہوگئی۔ دنیا کی وسیع فضا میری آزادیوں کے سپرد کردی گئی میں پیامِ معصیت کا حامل قرار دیا گیا

مقاصد کائنات میں سے اہم ترین مقصد ہمیشہ میرے ہی نظام عمل میں رہا۔ آپ اسے حسد و رشک کی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ آپ کی تسلّی کے لئے محض آپ کی وہ عصمت تھی جس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ کوئی مفہوم آپ کا فرشتہ ہونا آپ کے لئے مایۂ ناز نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنے ارادہ و عمل سے فرشتہ نہیں ہوئے تھے آپ مامور ہیں کہ ہمیشہ اسی عالم میں رہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے رقیبانہ عداوت ہے لیکن میری عالی حوصلگی ذاتیات سے بالاتر ہے مجھے ہمیشہ آپ کے ساتھ ہمدردی رہی اور باوجود آپ کی تنگ ظرفیوں کے آج بھی وہی برادرانہ محبت ہے۔

عزرائیل ۔ ہم تری گستاخیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے خدا سنتا ہوگا کہ ہم مردود بارگاہ سے گفتگو کر رہے ہیں۔

آواز ۔ یعنی آپ کے اس جوش غضب کا باعث محض خوف اور تصنع ہے اگر فرشتوں کو یہ ڈر نہ ہوتا کہ خدا سن رہا ہے تو مجھ سے گفتگو کرنے میں اُنھیں کوئی جھجک نہ ہوتی۔ دنیا میں بھی مجھے اس قسم کی ہزاروں ہستیاں ملیں جن کی زندگی کا ہر لمحہ وقف تصنع تھا وہ احکام خداوندی کے صرف اس لئے پابند تھے کہ خدا نافرمانیوں کی سزا دے گا۔ انھوں نے کبھی اس مسئلہ پر غور نہیں کیا کہ خود اُس کے احکام میں کوئی حقیقت مضمر ہے۔ میں تو اس اطاعت پر نافرمانیوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ ممکن ہے مجھ میں غرور و تکبر ہو لیکن وہ کمزوریاں نہیں جو مجبورانہ زہد و اتقا سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں بزدل نہیں، میری شیطنت ریاکاریوں کی قائل نہیں میں تو صرف اس لئے آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ خدا سن رہا ہے۔

میکائیل ۔ فرشتے تم کو دخل در معقولات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ میں ایک لمحہ کے لئے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ تمھاری زہر آگیں گفتگو سے ہمارا تقدس برباد ہو۔

آواز ۔ مجھے جناب کی ذات سے اور عزرائیل سے خاص طور پر شکایت ہے۔ آپ دونوں نے بدمذاقیوں کی انتہا کر دی۔ آپ نے تو ہمیشہ بدصورت اور بدطینت انسانوں کی کفالت کی حسن کو آپ نے ہمیشہ پریشان رکھا آپ اس قدر بے حس تھے کہ حسن پر کبھی آپ کو رحم نہ آیا۔ حسن غیر فانی ہے اس لئے غربت و افلاس سے وہ فنا نہ ہو سکا۔ لیکن آپ نے اُس کی بربادیوں کی کوئی تدبیر اُٹھا نہ رکھی۔ آپ کو یہ سمجھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا کہ حسن کی آرائشوں کے لئے عیش و مسرت کی ضرورت ہے۔ آپ سے زیادہ عزرائیل کی سنگدلی

افسوس ناک تھی۔ موت کی بے رحمیاں حسن کے لئے نہیں تھیں لیکن انھوں نے انتہائی سفاکی کے ساتھ حسن انسانی کو غارت کیا۔ دنیا میں میں برابر دیکھتا رہا کہ یہ المنظر انسانوں کی زندگی کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے خوب صورت انسان عنفوان شباب ہی میں نذر اجل ہو جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ وحشت ناک امراض جن میں بدصورت اور خبیث فطرت انسانوں کو مبتلا ہونا چاہیئے تھا، اکثر خوب صورت انسانوں میں پیدا ہو جاتے تھے۔ کیا عزرائیل کی سنگدلی کی یہ انتہا نہ تھی کہ حسن کو ان مصائب میں ہمیشہ مبتلا رکھا۔ کیا اُن کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ جسم لطیف کی روح انتہائی لطافت کے ساتھ نکال لیں۔ بہر صورت میں آپ دونوں کے ان اعمال کو معاف نہیں کر سکتا۔

عزرائیل۔ تمھاری یہ گفتگو ہزار لعنتوں کی مستحق ہے۔ ایک بار کا ملعون کیا جانا تم ایسے ناقابل اصلاح شیطان کے لئے کافی نہ تھا تم کو ہزار بار ملعون کرنا چاہیئے تھا۔

آواز۔ بہرحال اب آپ اس فروگزاشت کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ مجھے آپ کی لعنتوں کی کوئی پروا نہیں۔ میں آپ لوگوں پر مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اسرافیل نہایت سادہ دلی سے انسانی مسائل کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں اُن کی نیک نیتی کا معترف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اُن کے شکوک کی تشفی کر دوں۔

اسرافیل۔ تم کو مجھ سے اس قدر بے تکلف ہونے کا کوئی حق نہیں اور نہ میں تمھاری خطرناک منطق کے ذریعہ سے کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی اس لاعلمی کو اُس علم سے بہتر اور مقدس تر سمجھتا ہوں جو تمھارے فلسفہ سے مجھے حاصل ہو۔

آواز۔ یہ تعصب قابل افسوس ہے۔ اسی کم نظری نے آج تک فرشتوں کو مقید رکھا۔ رسوم و قیود خواہ وہ عقائد میں ہوں یا اعمال میں۔ ارتقاء نفس کے دشمن ہیں۔ آپ لوگ واقعتاً مجھ سے متنفر نہیں بلکہ محض رسماً اور اصولاً۔ آپ اپنی بندشوں کے توڑنے کی کوشش کیجئے۔ میں نے وہ تمام بندشیں توڑ دیں جو میری شخصیت کو تباہ کر رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں حقیقتہً آزاد ہو گیا۔

جبرائیل۔ تمھیں مداخلت بیجا کا کوئی حق نہ تھا۔ تمھاری تعلیم و تلقین فرشتوں کے تقدس کو برباد کر رہی ہے۔ فرشتے تمھاری طرح نافرمانی کرنا نہیں چاہتے۔

[جماعت کے فرشتوں نے ایک ساتھ نعوذ باللہ کہا]

آواز۔ اطاعت و فرماں برداری مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ مجھے دیکھو میں خودداری کا ایک پیکر ہوں اور جرأت و بے باکی کا ایک مجسمہ مجھ سے تمھیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ اُن (شیطان مجسم نمودار ہوگیا۔ لبوں پر ایک بے نیاز تبسم چہرے پر حکیمانہ وقار۔ ہر انداز سے شگفتگی اور رنگینی ٹپکتی ہے،) معنوں میں نہیں جن میں مکتبی طلبا ر کو ایک بزدل متقی تلقین عبرت کرتا ہے بلکہ میری ہستی تمھارے لئے اس حیثیت سے سبق آموز ہے کہ مجھ میں مذاق سلیم تھا اور میں نے اُس کی برکتوں سے حقیقی آزادی اور حقیقی مسرت حاصل کرلی۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں بھی آزادی کی اُمنگیں تھیں لیکن تم ہمیشہ حسن عمل سے محروم رہے۔ نافرمانیاں تم بھی کرنا چاہتے تھے مگر تم میں جرأتِ ارتکاب نہ تھی اس لئے تم نے اطاعت و فرماں برداری کے دامن میں پناہ لی۔ برخلاف اس کے مجھ میں ذوقِ عمل بھی تھا اور جرأت ارتکاب بھی۔ میں نے جو چاہا وہ کرلیا۔ اس اعتبار سے میں اخلاقی حیثیت سے تم سے بلند ہوں۔

جبرائیل۔ ہم لوگ کسی حالت میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتے تم جاکر اپنے عقیدت مندوں کو تشفی دو اگر آج دے سکتے ہو۔ ہماری حمد و تسبیح کا ترنم تمھاری آواز سے برباد ہو رہا ہے۔

شیطان۔ میرے عقیدت مندوں کو آج کسی تشفی کی ضرورت نہیں اُن کے اعمال کی رنگینیاں ہی اُن کی تشفی کے لئے کافی ہیں۔

اسرافیل۔ میں نے تو آج کسی چہرے پر رنگینیوں کی جھلک نہیں دیکھی۔

شیطان۔ زاہدانِ خشک اور جوانانِ صالح حسنِ خیال اور حسنِ عمل دونوں سے محروم تھے۔ اس لئے آج بھی اُن کے چہرے پژمردہ اور اُن کے طبائع مضمحل ہیں۔ میں اُن کا ذمہ دار نہیں۔ البتہ میرے عقیدت مندوں کے چہرے دیکھو۔ نہایت بشاش اور نہایت شگفتہ۔ اُن میں معاصیِ لطیف کی رنگینیاں جھلک رہی ہیں۔ میرے عاصیانِ رنگین آج مسرور ہیں کہ اُنھیں اپنے لطیف گناہوں کی لطیف سزائیں ملیں گی۔ گناہوں کی رنگینیوں سے جب سزاؤں کی رنگینیاں مل جائیں گی اُن کے لئے ہزار جنتوں کا سرمایہ فراہم ہو جائے گا۔ وہ خود اپنی بہشت ہونگے اور خود اپنی بہشت کے کارفرما۔ معصیتِ رنگین کی ایک سزا محاسنِ خشک کی ہزار جزاؤں سے دل فریب تر ہے۔

اسرافیل۔ فرشتے کبھی یہ نہیں تسلیم کرسکتے کہ وہ انسان جنھوں نے فرشتوں کی طرح زندگی بسر کی آج اپنی جزا سے

محروم رہیں گے۔ میرے نزدیک تو انھیں غیر مطمئن ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بھی آج ہزاروں انسانوں کو میں نے پریشان و مضطرب دیکھا۔

شیطان ۔ انھیں لازماً پریشان ہونا چاہیئے۔ میں خود جانتا ہوں کہ آج ہر بزدل متقی پریشان ہے۔ اُس کی بزدلی اجر اعمال کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اُس کا نفس کبھی اپنے اتقا سے مطمئن نہ تھا۔ اس لئے آج وہ اپنی جزا سے بھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اُس کے عقائد و اعمال میں کبھی یکسوئی نہ تھی۔ اس لئے آج بھی وہ سراسیمہ ہے۔ محض مجبوریوں کے باعث اُس سے اعمالِ حسنہ سرزد ہو جاتے تھے۔ اُس کو اُن کی وجہ بھی نہیں معلوم تھی۔ آج وہ ڈر رہا ہے کہ خدا کو اپنی نیکیوں کا کیا جواب دے گا۔

اسرافیل ۔ اگر زہد و اتقا کی پریشانیوں کا یہ حال ہے تو تمھارے گنہگاروں کی پریشانیاں معلوم

شیطان ۔ میرے عقیدت مندوں کو پریشانی کی کوئی وجہ نہیں وہ دنیا میں اپنے اعمال سے بھی واقف تھے اور اجر اعمال سے بھی وہ اپنا حشر بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا مذاقِ لطیف کی بنا پر کیا اُن کے اعمال میں اُن کا اعتمادِ نفس شامل تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ آج اُن سے کیا سوالات کئے جائیں گے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انھیں کیا جوابات دینے چاہئیں۔ ذوقِ معصیت اور حسن ارتکاب نے دنیا میں اُن کی رہبری کی۔ آج وہ حسن سزا کی تجلیوں کے منتظر ہیں۔

جبرائیل ۔ اسرافیل تم شیطانی کرشموں سے واقف نہیں۔ اس طلسم کو تو صرف وہی فرشتے سمجھتے ہیں جو عالم انسانی کا کافی تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کرشمہ سازیوں کی معمولی مثال یہ ہے کہ تم باوجود اپنے ارادوں کے اس گفتگو میں مبتلا ہو گئے۔ تمھاری سادہ لوحی سے اندیشہ ہے کہ کہیں شیطانی منطق میں اُلجھکر گمراہ نہ ہو جاؤ۔

شیطان ۔ گمراہ ہونے کے لئے مذاقِ سلیم کی ضرورت ہے۔ تمھارا اندیشہ لایعنی ہے۔

اسرافیل ۔ کیا تم میرے مذاق سلیم کے قائل نہیں۔

شیطان ۔ میں تمھاری کشادہ دلی کا معترف ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمام فرشتوں میں تم ہی ایک ایسے صلاحیت پزیر ہو جن پر حقائق کا پرتو ڈالا جا سکتا ہے۔ تمھارے ہی شکوک کی اصلاح کے لئے میں نے وہ عزیز وقت صرف کیا جو لطیف تر مشاغل میں صرف کیا جا سکتا تھا۔ پند و موعظت سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی

عام اس سے کہ وہ محاسن کے سلسلہ میں ہو یا معاصی کے۔ پند و نصیحت تو اُن بدنصیب احمقوں کا پیشہ ہے جن کی فطرتیں حسن لطیف سے ہمیشہ بیگانہ رہیں۔ میری زندگانی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ میں نے بدمذاق انسانوں پر اپنا فلسفہ رائگاں نہیں کیا۔ البتہ میں اعلان حق سے باز نہیں رہ سکتا۔ یہی باعث ہے کہ میں اس وقت تم لوگوں سے گفتگو کرنے پر مجبور رہوگیا۔

جماعت کا ایک فرشتہ۔ تم اپنے کفر و الحاد سے فرشتوں کے ایمان و یقین کی اہانت کر رہے ہو۔ ہمارا تقدس تمھارے لئے باعثِ رشک ہے۔ اس لئے تم اس کے دشمن ہو۔

شیطان۔ تمھارا تقدس تمھارے لئے مایۂ ناز ہے اور میری شیطنت میرے لئے باعث افتخار۔ قدرت کا یہ محض تقسیم عمل ہے۔ تمھارے سپرد نیکیوں کا بارگراں کر دیا گیا تم اپنی بدمذاقیوں کی وجہ سے اس تکلیف دہ بار کو برداشت کر سکتے تھے اس میں زیادہ سے زیادہ ہم لوگوں کے صبر و تحمل کی داد دی جا سکتی ہے جو بذاتِ خود کوئی قابل داد صفت نہیں ہر وہ ہستی جو حسنِ خیال اور لطافتِ عمل سے محروم ہے، صبر و شکر پر مجبور ہو جاتی ہے۔ لیکن میری فطرت خود دار ہونے کے علاوہ رنگینیوں سے بھی معمور تھی۔ میں نہ کوئی غیر دلچسپ فرض انجام دے سکتا تھا اور نہ کسی غیر دلچسپ پیام کی تبلیغ کر سکتا تھا۔ اس لئے میرے سپرد نظامِ معصیت کیا گیا۔ فرشتے حقائق سے بے خبر ہیں۔ اُنھیں میرے ملعون قرار دیئے جانے کی حقیقی وجہ بھی نہیں معلوم۔ بہرحال آج تمام پردے اُٹھ جائیں گے۔ تم لوگوں نے میرے متعلق جو کچھ کہا اُسے تمھاری کج فہمیوں پر محمول کرتا ہوں اس لئے تمھیں معاف کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔ اس کے علاوہ میں کسی سے تم لوگوں کی طرح بغض و عداوت نہیں رکھتا تنگ نظری میری شان کے شایان نہیں یہ صرف تم لوگوں کے لئے موزوں ہے۔

(شیطان یہ کہکر غائب ہوگیا۔ جماعت کے فرشتے توبہ و استغفار کر کے نماز میں مشغول ہوگئے)

میکائیل۔ شیطان آج کوئی نیا فتنہ اُٹھانے والا ہے۔ ہم لوگوں کو فوراً اُس کا تدارک کرنا چاہیئے۔

عزرائیل۔ منتقمِ حقیقی سب کچھ سن رہا تھا وہ یقیناً اُس کی ہرزہ سرائیوں کی کوئی نہ کوئی سزا دے گا۔ کیا روح کی طرح اُس کی شیطنت سلب نہیں کی جا سکتی۔

اسرافیل - جب تک وہ باتیں کرتا رہا تم لوگ دم بخود رہے۔ کیا تمھارے پاس اُس کی منطق کا کوئی جواب نہ تھا؟ سوائے ملعون و معتوب کے تمھاری زبان سے کچھ نہ نکلا۔ میرا خیال تھا کہ تم دنیا کا تجربہ رکھتے ہو شیطان کے خلاف تمھارے پاس ہزاروں دلائل ہونگے لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔ رسوم و قیود خواہ وہ عقائد میں ہوں یا اعمال میں ارتقائے نفس کے دشمن ہیں نافرمانیاں تم بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر تم میں جرأت ارتکاب نہ تھی۔ شیطان کے وہ فقرے ہیں جن کا جواب نہیں ہوسکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان معموں کو کیونکر حل کیا جائے۔ باتیں یہ سب صحیح معلوم ہوتی ہیں مگر خدا نہ کرے کہ صحیح ہوں۔

جبرائیل - باتوں کے صحیح ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔ البتہ انداز بیان اور وہ شبہ جو اس سے پیدا ہوتا ہے وہ شیطانی ہے قیود و رسوم ارتقائے نفس کے دشمن ہیں مگر کیا شیطان نے انکار کے ساتھ ہی اپنے نفس کو مقید و محدود نہیں کردیا۔ انکار علمی و نافہمی کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اس میں صرف شوخی و گستاخی کا اضافہ ہوگیا اور بس آدم میں ایک حقیقت جامعہ و کاملہ پوشیدہ تھی جس کا حقیقی عرفان نہ فرشتہ سے ممکن تھا نہ شیطان سے چنانچہ اس لاعلمی و نافہمی کا اعتراف فرشتوں نے بھی کیا اور شیطان نے بھی۔ فرشتوں نے اپنے لاعلمی کے ساتھ علم الٰہی کی وسعتوں کا بھی اعتراف کیا۔ اس لئے وہ فرشتے کہلائے اور شیطان نے اپنے لاعلمی کے ساتھ اپنے محدود علم و نفس کی تصدیق پر اکتفا کر لیا اور اسی اصرار مقید کو آج جرأت ارتکاب سے تعبیر کرتا ہے اس لئے وہ شیطان ہے۔ مگر بہر حال مجھے جو اندیشہ تھا وہ بے جا نہ تھا۔ اسرافیل اپنی سادہ لوحی سے شیطان کی اس منطق میں اُلجھ ہی گئے۔ یہ صورت خطرناک ہے۔ انسانوں کو تو وہ حتی المقدور گمراہ کر ہی چکا آج اس کوشش میں ہے کہ فرشتوں کو بھی گمراہ کرے۔ میں ابھی بارگاہِ ایزدی میں جاتا ہوں اس فتنہ کو فوراً روکنا چاہیئے۔

{ جبرائیل عزرائیل اور میکائیل کو ساتھ لئے ہوئے چلے گئے۔ اسرافیل صور لئے ہوئے وہیں اپنے خیالات میں اُلجھے ہوئے بیٹھ گئے۔ }

عرصۂ حشر

دوسرا منظر

[آدم اور حوا ایک طرف بیٹھے ہوئے دور سے ہجوم انسانی کی کش مکش دیکھ رہے ہیں
آدم مضطرب ہیں۔ لیکن حوا کے لبوں پر مادرانہ تبسم ہے]

حوا - انسانوں کی یہ کثرت میرے لئے مسرت انگیز ہے۔ میری نسل کی یہ ترقی میری ابدی تشفی کے لئے کافی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میری دنیا اور عقبیٰ دونوں کامیاب ہوئیں۔

آدم - تم مسرور ہو لیکن میرے تفکرات کی کوئی انتہا نہیں۔ دیکھوں آج انسانوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔

حوّا - جو حشر ہونا ہوگا وہی ہوگا میں تو صرف یہ دیکھتی ہوں کہ میری دنیاوی زندگی اس قدر بار آور ہوئی۔ میری مسرت کے لئے یہی کافی ہے۔

آدم - تمھاری مسرت ناعاقبت اندیشی پر مبنی ہے۔ تم غور و فکر سے بیگانہ ہو۔ آج جزا و سزا کا دن ہے میری سمجھ میں نہیں آتا خدا میری نسل کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ شاید وہ تمام انسان جنھوں نے دنیا کو عقبیٰ پر ترجیح دی تھی دوزخ میں بھیج دیئے جائیں۔ مجھے دوزخ کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ جگہ کیسی ہے لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ شجرِ ممنوع وہاں نہیں۔ لیکن جنت کا تو مجھے نہایت تلخ تجربہ ہے۔

حوّا - میں یہ غور کر رہی ہوں کہ اگر ہم دونوں دوبارہ دنیا میں بھیجدیئے جائیں تمام مشکلات حل ہو جائیں گی وہاں کی فضا یہاں سے زیادہ خوشگوار تھی۔

آدم - مجھ میں اب اس قدر تحمل نہیں رہا کہ نئے سر سے زندگی کی ابتدا کروں۔ البتہ اگر میرے سامنے صرف دو صورتیں پیش کی جائیں جنت یا دنیا میں دنیا کو ترجیح دوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ آج ایک انسان بھی جنت میں قدم رکھے۔ انسان کے لئے یہ کسی طرح موزوں نہیں کہ اُس بہشت میں جائے جہاں سے میں ذلت و خواری کے ساتھ نکالا گیا تھا۔ اس کے علاوہ شجرِ ممنوع وہاں اب بھی ہوگا۔ اگر انسان وہاں گیا معلوم نہیں کیا واقعات پیش آئیں ممکن ہے میری طرح وہ بھی وہاں سے نکال دیا جائے۔ اُس کے بعد کیا ہوگا!!

حوّا - جنت کی تو میں بھی معرف نہیں۔ میں خود وہاں نہیں جانا چاہتی جس وقت میں نکالی گئی تھی مجھے حقیقی مسرت تھی۔ جنت سے میں عاجز آ گئی تھی۔ جب مجھے خیال ہوتا تھا کہ ابد تک یہیں زندگی گزارنی پڑے گی۔ میری عجیب حالت ہو جاتی تھی میں سمجھتی تھی کہ اس سے جہنم بہتر ہے۔ اس کے علاوہ بہشت کی آب و ہوا میری فطرت کے موافق نہ تھی مجھے کئی بار خیال آیا کہ ہم دونوں کسی جہت سے مانوس نہیں ہو سکتے۔ میرا دل ناقابلِ فہم تمناؤں کا ایک محشر بنا ہوا تھا۔ میں نے اکثر آبِ کوثر میں اپنا عکس دیکھا میرے چہرے سے اضطراب برستا تھا۔ میں یہ محسوس کرتی تھی کہ جنت میرے لئے کسی طرح موزوں نہیں اس لئے میں اُس سے نکلنا چاہتی تھی۔ تمھاری نافرمانیوں نے میری مشکلات حل کر دیں۔

آدم - میری نافرمانیاں! میں بالکل بے قصور تھا۔ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ گناہ کسے کہتے ہیں اور اُس کی سزا کیا ہے۔ جب خدا نے مجھے ثمرِ ممنوع سے آگاہ کیا میں سمجھا کہ ان اشاروں سے وہ مجھے اُس کی ترغیب

دے رہا ہے۔ اس میں بھی اُس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ اس لئے جوشِ اطاعت میں میں نے ایسا کیا۔ میں کسی طرح یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ خدا اپنے مصالح کی سزا مجھے دے گا۔ تم بھی میری غلط فہمیوں کو نافرمانیوں سے تعبیر کرتی ہو۔ مجھے اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔

حوّا ۔ نافرمانیوں سے میرا یہ مطلب نہیں کہ واقعی تم نے کوئی جرم کیا تھا۔ میں کبھی تم کو مجرم نہیں سمجھی اور اگر جرم تسلیم بھی کرلیا جائے تو اُس کی سزا کیا ہوئی؟ جنت سے نکال دیا جانا تو کوئی سزا نہ تھی۔ میں تو وہاں سے نکلنا چاہتی ہی تھی۔ میرے نزدیک تو بجائے سزا کے ہم دونوں کے لئے یہ بہترین جزا تھی کہ ایسی جنت سے نکال دیئے گئے تھے جس سے ہم اس قدر عاجز تھے۔ دنیا ہزار جنتوں سے بہتر ثابت ہوئی۔

آدم ۔ تمھاری بددلی کے وجوہ مجھے نہیں معلوم۔ ممکن ہے تم اُس کی یکرنگی سے گھبرا گئی ہو۔ لیکن اپنے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک میں جنت میں رہا مجھے کوئی خاص تکلیف نہ تھی۔ تاہم وہ جذبۂ مسرت کبھی مجھ پر طاری نہیں ہوا جو دنیا کی فضاؤں میں موجزن تھا۔

حوا ۔ یہ یقینی ہے کہ جنت میں میری طرح تم بھی غیر مطمئن تھے چاہے تم اسے محسوس نہ کرتے ہو۔ تم میں بھی خدا نے وہ تمنائیں پیدا کی تھیں جن کے حصول کے لئے بہشت کی معصوم فضا قطعاً موزوں نہ تھی۔ تم چاہتے تھے کہ ہم دونو اس خشک فضا سے نکل جائیں۔ اصل میں تمھاری یہی تمنا تھی جس نے تمھیں نافرمانیوں پر مجبور کیا۔ خدا نے ہم میں چند صلاحیتیں پیدا کردی تھیں جن سے ہم بے خبر رکھے گئے تھے لیکن ہماری بے دلی کا یہی باعث تھا اور اسی نے ہمیں آمادہ کیا کہ جنت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ تمھارا یہ خیال صحیح نہیں کہ تم نے جوش اطاعت میں ایسا کیا۔

آدم ۔ غالباً تم صحیح کہہ رہی ہو۔ لیکن میں یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ خود تمھاری فطرت نے ان نکات کو سمجھ لیا ہے یا کسی باخبر فرشتے نے تمھیں یہ رموز بتلائے ہیں یا پھر تم اُن تمام سازشوں میں شریک تھیں جو میری جنت سے نکالے جانے کی باعث ہوئیں۔ میں تو اب یہ سمجھ رہا ہوں کہ غالباً تمھاری تخلیق ہی اس غرض سے کی گئی تھی کہ میرے خلاف وہ تمام سازشیں مکمل ہوجائیں جن کی تکمیل شیطان اور فرشتوں کی متفقہ کوششوں سے بھی نہیں ہوسکی تھی۔ اگر یہ صورت ہے تو تنہا تمھاری ہستی میری ان تمام رسوائیوں کی ذمہ دار ہے جنھوں نے

میری زندگی تلخ کر دی۔

حوا - یہ کچھ لازمی نہیں کہ جو راز تم نہ سمجھ سکو اُس کے سمجھنے سے میری فطرت بھی قاصر رہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم رسوائیوں کا ذکر کیوں کر رہے ہو۔ جن رسوائیوں کا نتیجہ دنیا کی صورت میں ظاہر ہوا تھا وہ اُن تمام نیکیوں سے بہتر ثابت ہوئیں جن کے بنا پر جنت دی گئی تھی۔ اگر تم جنت میں کچھ دن اور رہتے تمھیں اُس سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو جاتی۔

آدم - یہ میں خود ہی تسلیم کرتا ہوں کہ دنیا نے ہزار جنتوں کی تلافی کر دی۔ جس وقت میں بہشت سے نکلا اُس وقت پریشان ضرور تھا غالباً اس لئے کہ مجھے اپنا مستقبل نہیں معلوم تھا لیکن دنیا میں قدم رکھتے ہی میں سمجھا کہ منزلِ مقصود کو پہنچ گیا ہوں۔ میرے دل میں ایک ناقابلِ اظہار مسرت تھی۔ مجھے اپنی عظمت کا احساس اُس وقت پہلی بار ہوا۔ بہرحال شیطان پر ان رموز کو افشا نہ کرنا چاہیئے کہ جنت سے نکالے جانے کا باعث خود ہماری بزدلی تھی ورنہ اُس پر اس امر کی کوئی اخلاقی ذمہ داری نہ رہے گی کہ آج ہماری نسل کی امداد کرے۔ وہ اب تک یہی سمجھتا ہے کہ ہماری بربادیوں کی وجہ خود اُس کی شیطنت ہے۔ میں آج اُس کا متلاشی ہوں دیکھوں وہ انسان کے لئے کیا کرتا ہے۔ دنیا میں اُس نے آج کے لئے ہزاروں وعدے کیئے لیکن مجھے کبھی تشفی نہ ہوئی مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ محض جھوٹے وعدوں سے تلافیِ مافات کرنا چاہتا ہے۔

حوا - میری نسل پر اُس کا بڑا احسان ہے دنیا میں انسانی زندگی کو اُس نے دلچسپ بنا دیا۔ ہزاروں انسانوں کو اُس نے اُن اعمالِ خشک سے روکا جن سے میرے خوب صورت لڑکے بدقوارہ اور میری خوب صورت لڑکیاں بدقطع ہو جاتیں۔ لیکن آج اُس سے اور انسانوں سے گناہوں کے وہ تمام رشتے ٹوٹ گئے جس کی بنا پر وہ ہم دونوں کا محرم ہو سکتا تھا۔ آج وہ میرا محرم نہیں رہا میں اُس سے پردہ کرنا چاہتی ہوں (شیطان آتا ہوا نظر آیا) لیکن وہ تو آ گیا ....

شیطان - میں ہمیشہ ایسے وقت پر آجایا کرتا ہوں جب کوئی مجھ سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ دنیا میں بھی میرا یہی انداز تھا۔ میں جانتا تھا کہ انسان میری رفاقت کا متمنی ہے۔ لیکن اُس کی بزدلی اور ریاکاری اُسے مجبور کر رہی ہے کہ بظاہر مجھ سے اظہارِ نفرت کرتا رہے۔ اس لئے میں نے اُس سے کبھی پیمانِ رفاقت نہیں توڑا۔ یہی

حالت آج بھی ہے۔ آج تمھیں اُس سے زیادہ میری ہمدردی کی ضرورت ہے جس قدر دنیا میں تھی لیکن تم مصلحتاً مجھ سے علٰحدہ رہنا چاہتے ہو۔ تمھیں اس کا بھی خوف ہے کہ میرے اور تم دونوں کے بے تکلفانہ مراسم پہ حشر کے اس ہجوم میں کہیں مضحکہ نہ ہو۔ کہیں میں بیوقوفوں کی طنز و تشنیع سے بے نیاز ہوں میں ہر مضحکہ کرنے والے پر ہنستا ہوں۔

آدم ۔ تم انسانی محاسن سے بے گانہ رہتے تھے لیکن اُس کے معائب پر تمھاری نظر لامحالہ پڑ جاتی تھی تمھیں اُس کی مجبورانہ ریاکاریوں کی گرفت میں اس قدر عبور ہے کہ اُس کی ہر روش کی کنہ و حقیقت فوراً سمجھ لیتے ہو تمھاری کامیابی کا یہی راز ہے ۔ ہر بڑی شخصیت کی کامیابی کا یہی ایک راز ہے۔ دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک ماہر نفسیات کی ضرورت ہے تم اس علم کے معلّم اول ہو۔

شیطان ۔ تمھاری شخصیت کوئی معمولی شخصیت نہیں تم نے اپنی قوتِ ارادی اور قوت عمل کو ارباب قضا و قدر کے قیود بے جا پر قربان نہیں کیا۔ میرے دل میں تمھاری حقیقی وقعت ہے تمھیں پورا استحقاق ہے کہ میرے افعال و اعمال پر آزادانہ تنقید کرو۔

حوّا ۔ میں دیکھتی ہوں کہ ایک دوسرے کی بے جا مدح سرائیوں نے تم دونوں کو بر خود غلط کر دیا ہے ورنہ جب تم ملعون قرار دیئے گئے تھے اور جب یہ بہشت سے نکالے گئے تھے تم دونوں کو اپنی شخصیتوں پر اس قدر اعتماد نہ تھا۔

شیطان ۔ عورت فطرتاً تمام قیود سے آزاد ہے۔ اُس کے دلائل پر منطقی پابندیاں بھی عاید نہیں کی گئیں جس طرح اُس کی مسرتیں اور اُس کے آلام بلاوجہ ہوتے ہیں اُسی طرح اُس کے خیالات اور اُس کی رائیں بھی۔ عورت کی دلیل کے توڑنے کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ اُسے تسلیم کر لیا جائے۔

حوا ۔ غالباً آج تم نے پہلی بار کسی کی دلیل تسلیم کی ہے ورنہ دنیا میں تم انسان کی ہر منطق کا مقابلہ کرتے رہے۔

شیطان ۔ تمھیں نہیں معلوم میں نے کبھی خوب صورت عورت سے بحث نہیں کی ہمیشہ میں نے اُس کے دلائل کو تسلیم کر لیا حسن نسوانی خود ہی ایک ناقابلِ تردید دلیل ہے وہ ہر محال کو ممکن ثابت کر سکتا ہے حسین عورت کے دلائل سے اختلاف کرنا دلیل بدمذاقی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اُس سے فطری انس ہے اُس نے میری

پکاسو　　　مے نوش　　　آئیل پینٹنگ

کائنات کے نظام کو ہمیشہ کے لئے مستحکم کردیا۔ حسنِ نسوانی نے دنیا کو دل فریبیوں سے معمور کردیا تھا آج عقبیٰ بھی اُس کی رنگینیوں سے معمور ہے۔

آدم ۔ خوب صورت عورت سے تم نے بحث نہ کی ہو لیکن تم اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ زاہد خشک پر تم نے ہر چند اپنے فلسفہ کی بارش کی مگر وہ قطعاً غیر متاثر رہا۔

شیطان ۔ یہ غلط ہے۔ میں نے بدقوارہ اور بد مذاق انسانوں کو کبھی قابلِ خطاب نہیں سمجھا اُس پر میں نے کبھی اپنی برگزیدہ منطق ضائع نہیں کی وہ میرے پیامِ رنگین کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ میں ہمیشہ اس کی کوشش کرتا رہا کہ زاہد خشک اور جوان صالح میری خوبصورت دنیا میں قدم نہ رکھنے پائے۔ ورنہ میری کائنات کی تمام رنگینیاں برباد ہوجائیں گی لیکن میری یہ کوشش بھی ناکامیاب رہی وہ فرشتوں کی طرف بھی بڑھ رہا تھا اور میری طرف بھی اُس کی حرص اُسے مجبور کررہی تھی کہ میری دنیا کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آج وہ فرسودہ جنت میں بھیجدیا جائے۔ اُس کی بہترین سزا یہی ہوسکتی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جنت کوئی عشرت سرا ہے اُس صورت میں بھی ایک صحیح انسان اُس کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ ایک تغیر پزیر جہنم ناقابلِ تغیر جنت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

آدم ۔ زاہد کے لئے تم انتقاماً ایسا کہہ رہے ہو لیکن مجھے افسوس ہے۔ میں نے نافرمانی اس لئے نہیں کی تھی کہ خود میری نسل جنت میں جاکر مجھے رسوا کرے۔ فرشتے طنز و تشنیع کریں گے کہ انسان بے حیا بن کر پھر اُسی جنت میں گیا جہاں سے وہ ان رسوائیوں کے ساتھ نکالا گیا تھا۔ جس انسان نے جنت کی تمنا میں عبادت و ریاضت کی تھی اُس نے اس اعتبار سے میری توہین کی۔

شیطان ۔ تمھاری یہ خودداری قابلِ تعریف ہے لیکن تمھیں اُن ناعاقبت اندیشوں کی پروا نہ کرنی چاہیئے جنھوں نے شانِ سعادت کو قائم نہیں رکھا اور اُس جنت کے متمنی رہے جس میں تمھارا یہ حشر ہوا تھا۔ مجھے تو تمھاری نسل کے اُن عاصیانِ رنگین سے واسطہ ہے جنھوں نے دنیا کو تمام جنتوں سے زیادہ دل فریب بنا دیا تھا آج جب میں اُن کی جزا کا خیال کرتا ہوں میرا دل مسرتوں سے لبریز ہوجاتا ہے۔

حوا ۔ میں تو سُنتی ہوں کہ آج اُن لوگوں پر سخت عتاب نازل کیا جائے گا جنھوں نے احکامِ خداوندی کی نافرمانیاں

کی تھیں۔

شیطان۔ یہاں کا قانون اُلٹا ہے۔ نافرمانیوں کی جزا ملتی ہے اور اطاعت شعاریوں کی سزا دی جاتی ہے۔ میں نے آدم کو سجدہ نہیں کیا صرف اس لئے کہ خدا میرا مسجود تھا۔ میرا انکار میرے جوشِ اطاعت پر مبنی تھا لیکن نتیجہ کیا ہوا میں ملعون قرار دیا گیا۔ آج ممکن ہے انسانوں کے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں لیکن اُس کی نیکیاں کبھی معاف نہیں کی جاسکیتں۔

آدم۔ تمھیں میرا سجدہ کرلینا چاہیئے تھا۔ تمھاری توحید کے لئے رضائے الٰہی کی پابندی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ اگر تم نے ضد نہ کی ہوتی تو نہ دنیا کی وہ کش مکش وجود میں آتی اور نہ عقبیٰ کا یہ ہنگامہ۔ تم نے اپنے انکار سے مجھکو تمام مصیبتوں میں مبتلا کردیا۔

شیطان۔ تمھاری یہ منطق محض خود پرستی اور خود غرضی پر مبنی ہے حقیقت یہ ہے کہ اربابِ قضا و قدر کا ذوق تفریح کوئی تماشا چاہتا تھا۔ پہلے مجھے تمھارے سجدہ کا حکم دیا وہ جانتے تھے کہ میں انکار کردوں گا۔ اصل میں وہ چاہتے بھی یہی تھے۔ اُس کے بعد تم سے ثمرِ ممنوعہ کا اشارہ کیا۔

آدم۔ تم کو کوئی حق نہیں تھا کہ اس تماشے میں حصہ لینے سے پرہیز کرو۔ آخر میں نے کیوں انکار نہیں کیا۔

شیطان۔ میں اپنی موحد ہستی کو اس تماشا گاہ میں مضحک بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے صاف انکار کردیا خدا کے فرشتوں کو میری جسارت پر رشک آیا اور وہ مجھ سے متنفر ہوگئے۔ لیکن مجھے اُن کے تنفر کی کوئی پروا نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ناآشنائے راز ہیں۔ نفرت میں نفرت کئے جانے والے کی مسلّمہ شخصیت کا اعتراف مضمر ہوتا ہے۔ اس لئے میں اپنے عزم و استقلال کو تمھارے اُس توبہ و استغفار پر ترجیح دیتا ہوں جس نے انسانی بے بسی اور ناچارگی کا راز ساری کائنات پر افشا کردیا۔

آدم۔ میں نے توبہ اس لئے کرلی تھی کہ جنت سے نکل کر براہ راست دوزخ میں نہ جانا پڑے۔ اُس وقت میرے لئے ناممکن تھا کہ دوزخ کی آب و ہوا کو برداشت کرسکوں۔

شیطان۔ تمھارا یہ اندیشہ کہ تم براہ راست دوزخ میں بھیجدیئے جاؤگے لایعنی تھا۔ تمھاری تخلیق جب محض دنیا کے لئے ہوئی تھی تم ہر صورت سے وہیں بھیجے جاتے۔ اگر تم توبہ نہ کرتے بالآخر وہی نتیجہ ہوتا جو توبہ کرنے

کے بعد ہوا۔ دنیا کے علاوہ تم اور کہیں بھیجے ہی نہیں جا سکتے تھے درا صل تمھاری پشیمانیوں نے تمھیں مجبور کر دیا تھا ورنہ تم توبہ ہرگز نہ کرتے۔

آدم ۔ میں نہ کبھی پشیمان ہوا اور نہ آج ہوں ۔ البتہ متفکر ضرور ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیاوی کش مکش کا آج کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

حوا ۔ کیا ہر گنہگار انسان کو سزا دی جائے گی ؟

شیطان ۔ ہر انسان کو کوئی نہ کوئی سزا دی جائے گی۔ بد مذاق گنہگاروں کو اُن کے غیر دلچسپ گناہوں کی اور مدعیانِ زہد و اتقا کو اُن کی غیر دلچسپ نیکیوں کی۔ زاہدانِ خشک جس بہشت کی حرص میں اپنی ساری عمر رائگاں کرنا عبادت سمجھتے رہے وہ میری دل فریب دنیا کی محض ایک نقل بے جا ہے۔ اُس میں داخل ہوتے ہی وہ متاسف ہونگے کہ اُنھوں نے ناحق اپنی دنیا برباد کی۔

آدم ۔ مجھے یہ اطمینان دلا دو کہ انسانوں کا حشر اُن کے لئے تکلیف دہ نہ ہوگا۔ اگر تم اطمینان دلا سکتے ہو۔ ورنہ ابھی اس کا موقع ہے کہ تمام گنہگار انسانوں سے توبہ کرا کے اُنھیں معدلت گاہِ خداوندی میں لے جاؤں اور اُس سے عفو و رحم کا طالب ہوں۔

شیطان ۔ اگر تم جنت اور دوزخ کے اُس باہمی امتیاز کے قابل بھی ہو جس کے متعلق تم نے بے خبر اور برخود غلط طبقہ سے بارہا سُنا ہوگا اُس صورت میں بھی تمھیں ایسا نہ کرنا چاہیئے وہ دوزخ جو انسان کی دلیرانہ بدکرداریوں کا نتیجہ ہو اُس جنت سے بہتر ہے جو عفو و رحم کے ذریعے سے حاصل کی جائے۔ البتہ اگر تم انسانوں سے توبہ کرا سکتے ہو تو اُنھیں مجبور کرو کہ اپنے اعمالِ بے روح سے تائب ہو کر مجھ سے طالبِ نصرت ہوں۔

(جبرئیل کو آتے ہوئے دیکھ کر آدم اور حوا گھبرا گئے۔ شیطان متبسم رہا)

جبرئیل ۔ آدم کیا تمھارے دنیاوی رشتے کبھی منقطع نہیں ہو سکتے۔ تم آج بھی شیطان سے بے تکلفانہ گفتگو کر رہے ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ شیطان ہی تمھاری اُن تمام گردشوں کا ذمہ دار ہے جنھوں نے تم کو دنیا میں مضطرب رکھا اور جن کے نتائج تمھیں آج بھی مضطرب کر رہے ہیں۔

شیطان ۔ پیمانِ الست باوجود اپنے ازلی استحکام کے ٹوٹ سکتا ہے اور وہ ٹوٹ گیا لیکن میرے رشتے کو نہ انسان توڑنا چاہتا ہے اور نہ توڑ سکتا ہے۔ وہ کوئی توبہ نہیں جو ٹوٹ جائے اُس کی رنگینیوں نے اُسے ہمیشہ کے لئے مستحکم کر دیا ہے۔ میرے ساتھ کے فرشتے انسان سے میرے ان بے تکلفانہ تعلقات پر رشک کرتے ہونگے تمہارا طنزیہ لہجہ اس کا ثبوت ہے لیکن میں طنز و تشنیع سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ میں ہر طعنہ زن پر ہنستا رہا۔ آج بھی ہنستا لیکن ابھی مجھے حشر کے بعض مراحل پر ہنسنا ہے اس لئے اپنی ہنسی کو اس وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

جبرائیل ۔ میں خود جانتا ہوں کہ جس پر ہزار لعنتوں کا اثر نہیں ہوا اُس پر فرشتوں کی طنز و تشنیع کا کیا اثر ہو سکتا ہے

شیطان ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ لعنت کا کیا مفہوم سمجھتے ہو۔ مجھے تمہاری لاعلمی پر افسوس ہے۔ بہرحال اس کا اعتراف تم کو بھی ہے کہ میری خودداری قابلِ رشک ہے۔

جبرائیل ۔ حوا۔ آج تمہارا چہرہ اُس قدر معصوم نہیں جس قدر بہشت میں تھا غالباً شیطانی تعلیم نے تمہاری فطرت بدل دی۔

شیطان ۔ فرشتوں کی مجبورانہ عصمت انسانی چہرے پر زیب نہیں دیتی تھی۔ اس لئے میں نے اُسے رنگِ معصیت سے بدل دیا۔ معاصی لطیف کی رنگینیاں انسان کو فرشتوں سے زیادہ دل کش اور دلآویز بنا دیتی ہیں۔

جبرائیل ۔ میں تمہارا زہر آگیں فلسفہ سننا نہیں چاہتا۔ میں مصالحِ خداوندی کا راز دار ہوں مجھے انسان سے حقیقی ہمدردی ہے۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ تم اُسے ابد تک گمراہ کرتے رہو۔

شیطان ۔ تم لوگوں میں سے کوئی بھی مصالحِ خداوندی کا راز دار نہیں معلوم نہیں کس بنا پر تم یہ دعویٰ کرتے ہو۔ تمام راہیں خدا کی ہیں پھر بھی تم سمجھتے ہو کہ میں انسان کو گمراہ کر سکتا ہوں۔ ناواقفیت میں تم نے اپنے ہی عقائد کی تردید کر دی۔

جبرائیل ۔ تم مجھ سے میرے ہی حربہ سے جنگ کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں ذرا بھی حق نہیں کہ اپنی گفتگو میں میرے عقائد سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم نے انسان کو ہمیشہ کے لئے رسوا کر دیا۔ آج گنہگار انسانوں کا دوزخ کے علاوہ کہیں ٹھکانا نہیں

شیطان ۔ بد مذاق انسانوں کے انجام سے مجھے کوئی تعلق نہیں چاہے وہ جنت میں رہیں یا دوزخ میں میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ البتہ میں اُن گنہگار انسانوں کا ذمہ دار ہوں جن میں ذوقِ معاصی کے ساتھ حسنِ عمل کی رنگینیاں بھی تھیں وہ نہ دوزخ سے خائف ہیں اور نہ جنت کے متمنی۔ اُن کی خود ایک مستقل

کائنات ہے وہ اس میں رہیں گے۔ گنہگار ہی نہیں زاہد خشک بھی میری دلآویز کائنات میں رہ سکتا ہے اگر وہ اپنے غیر دلچسپ اتقا سے تائب ہو کر میری طرف آنا چاہے۔

آدم۔ اب تک تم نے مجھے یہ نہیں بتلایا تھا کہ دوزخ وجنت کے علاوہ کوئی اور بھی مسکن ہے جس کو تم اپنی کائنات کہتے ہو۔

شیطان۔ تمھارے لئے اُس کا تصور ہی محال تھا تمھارا تخیل صرف جنت اور دوزخ سے مانوس تھا۔ جنت کے ساتھ انسانی حرص وابستہ تھی اور دوزخ کے ساتھ انسانی خوف۔ عام طور سے یہی دو جذبات انسان پر طاری رہتے تھے۔ اس لئے جنت اور دوزخ کے علاوہ کسی تیسری کائنات کا تخیل بھی قائم نہیں کر سکتا تھا جب تم کو اپنی نافرمانیوں کی سزا میں دوزخ کی دھمکی دی گئی تم یہ سمجھے کہ وہی شیطانی کائنات ہے کیونکہ میری رفاقت ہی کی سزا میں خدا تمھیں وہاں بھیج رہا تھا۔ تم رموزِ شیطنت سے بے خبر تھے اس لئے تمھاری غلط فہمیاں قابلِ اعتراض نہیں۔ آج تمھیں معلوم ہوگا کہ میری شیطنت کیا تھی اور اُس کی کائنات کیا ہے۔

آدم۔ اگر یہ حقیقت ہے تو تمھیں دنیا ہی میں اس کا اعلان کر دینا چاہئے تھا۔ تم نے اپنے سکوت سے ہزاروں بندگانِ خدا کو کش مکش میں مبتلا رکھا۔ عمر بھر انسان دوزخ وجنت کے خیال سے الجھتا رہا لیکن تم نے کبھی اُس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش نہ کی اور کسی خیال سے نہیں تو کم از کم اپنی ہی ذات کے تحفظ میں تم کو یہ راز افشا کر دینا چاہیئے تھا دنیا یہی سمجھتی رہی کہ دوزخ ہی تمھاری کائنات ہے۔

شیطان۔ دنیا تو محض ایک طلسم فریب تھی۔ اعلان حقیقت کا وہاں کوئی موقع نہ تھا۔ میرا فرض یہی تھا کہ اُس طلسم کو قائم رکھوں۔ مجھے خود اپنے تحفظ کی بھی ضرورت نہ تھی۔ غلط فہمیوں کا اثر صرف اُس پر ہو سکتا ہے جو غلط فہمیوں میں مبتلا رہے۔ اس میں میرا کوئی نقصان نہ تھا۔ انسان تو صرف اس لئے پیدا ہی کیا گیا تھا کہ کسی واقعہ کی حقیقت کو نہ سمجھے اُس کی کائنات ہی غلط فہمیوں کا نتیجہ تھی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ فرشتے انسانوں سے زیادہ حقائق سے بے خبر ہیں۔

جبرئیل۔ آدم تم کو معلوم ہے شیطان تمھیں کہاں لئے جا رہا ہے اب بھی تم ہوش میں نہیں آتے۔

آدم - جس طرف لئے جا رہا ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ اُس جنت میں نہیں جہاں شجرِ ممنوع تھا اور جہاں سے میں ذلّت و خواری کے ساتھ نکالا جا چکا ہوں۔ جبرئیل میں تم کو متحیر کرنا نہیں چاہتا لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں جنت سے ہمیشہ کے لئے بددل ہو گیا۔

جبرئیل - اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسری جگہ کو تم جنت سے بہتر سمجھتے ہو۔

شیطان - فرشتوں کو کیا معلوم کہ دوزخ و جنت سے بالاتر ایک کائنات ہے جس کی دلفریبیاں محض حسِ لطیف سے مانوس ہو سکتی ہیں۔ نہ زاہدِ خشک اُن کا محرم ہو سکتا ہے اور نہ عاصی خشک۔

حوا - کیا ہم دوبارہ دنیا میں نہیں بھیجے جا سکتے؟ میں اپنی اُسی دنیا میں واپس جانا چاہتی ہوں جس کی نیرنگیاں میرے دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہو سکتیں۔

شیطان - عورت ہمیشہ اپنے خوبصورت ماضی کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔ اُس کی غیر مطمئن فطرت حال سے ہمیشہ گھبراتی ہے۔ ناقابلِ حصول تمناؤں کا وہ ایک مجسمہ ہے لیکن مستقبل سے بھی وہ ڈرتی ہے اس خیال سے کہ کہیں وہ اُسے مایوس نہ کر دے۔ تمھیں آج مطمئن رہنا چاہئے۔ میری کائنات تمھیں مایوس نہ کرے گی۔ وہاں تمھیں اختیار ہوگا کہ جس طرح چاہو اپنی عقبیٰ بسر کرو۔ وہاں کی مسرتیں آئین و اصول کی پابند نہیں ہیں برخلاف اس کے جنت کی مسرتیں ناقابلِ برداشت ہیں۔ وہ انسان جو مذاق صحیح رکھتا ہے کبھی جنت کی فرسودہ مسرتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ مسرت حقیقی مسرت نہیں رہتی جو رسوم و قیود کی پابند کر دی گئی ہو اور جس کا نظام ہمیشہ کے لئے مستحکم کر دیا گیا ہو۔ اُس میں کوئی کرشمۂ راز باقی نہیں رہتا۔

جبرئیل - آدم میں تم سے صرف یہ کہنے آیا تھا کہ شیطان بہرصورت شیطان ہے اگر تم کو عقبیٰ عزیز ہے تو آج اُس کے دعوئے رفاقت پر اعتبار نہ کرنا۔

(جبرئیل یہ کہکر چلے گئے)

شیطان - آدم تذبذب ہی نے انسان کی دنیا برباد کی اگر وہ اسی کیفیت میں رہا تو آج اُسی طرح اُس کی عقبیٰ بھی برباد ہو جائے گی۔ میں دورنگیوں کا ہمیشہ دشمن رہا اگر تم کو میری تشفیاں مطمئن نہیں کر سکتیں تو مجھے تمھارے اضطراب سے کوئی ہمدردی نہیں میں نہیں چاہتا کہ تم غیر مطمئن دل لئے ہوئے میری کائنات میں قدم رکھو۔

میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ خوش مذاق انسان دوزخ و جنت کے معمّہ میں الجھکر اپنی عقبیٰ کو ہمیشہ کے لئے برباد کرے۔ صرف اسی لئے میں اس کی کوشش کرتا رہا کہ انسان میرے حقائق سے آگاہ ہو جائے ورنہ مجھ پر کوئی اخلاقی ذمہ داری نہ تھی۔ تمھارا جنت سے نکال دیا جانا اور انسان کی دنیاوی کش مکش ارباب قضا و قدر کی ایک مستقل مصلحت کا نتیجہ تھی۔ مجھ پر اُس کا الزام نہیں رکھا جا سکتا۔ مجھ پر کوئی فرض نہیں کہ تمھاری اعانت کروں۔ البتہ میری فطرت کی ابدی رنگینیاں ہمیشہ چاہتی رہیں کہ وہ بلند نظر انسان جنھوں نے اپنی رنگینیوں کی برکتوں سے معصیت لطیف کی حقیقتیں سمجھ لی تھیں ہمیشہ اُسی فضا میں رہیں جس میں اُن کی دنیا بسر ہوئی آج میں اُنھیں انسانوں کی جزا کا ذمہ دار ہوں۔

(شیطان غائب ہو گیا

آدم - جس راز کو ہم شیطان سے چھپانا چاہتے تھے وہ اُس کے ہر پہلو سے واقف ہے یہ اچھا نہیں۔

حوا - پھر بھی وہ ہر طرح کی اعانت کرنے پر تیار ہے۔ کیا یہ اُس کی شرافت کی دلیل نہیں۔

آدم - میں دیکھتا ہوں شیطان اور فرشتوں کی رقابتیں کہیں انسانوں کو تباہ نہ کر دیں وہ اس کی کوشش کریں گے کہ شیطان کے ہم آہنگ انسانوں کو رسوا کریں اس کے علاوہ وہ مجھ سے انتخاب نیابت کے دن سے متعصب ہیں۔

حوا - مجھے بھی اپنی نسل کی بہبودی مقصود ہے لیکن میں تمھاری طرح متفکر نہیں ہوں۔ تمھیں اس قدر مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ شیطان نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ آج کے فیصلہ کا کوئی نہ کوئی راز جانتا ہے ورنہ اس قدر مسرور اور مطمئن نہ ہوتا۔ اُس کی بعض باتیں تسکین بخش ضرور تھیں۔

(یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں
(چلے گئے

عرصۂ حشر

تیسرا منظر

ایک شخص سکوت کے عالم میں تنہا کھڑا ہوا کچھ غور کر رہا ہے گو اُس کی عمر
تیس سال سے زائد نہیں لیکن کہن سالگی کے تمام آثار اُس کی صورت سے نمایاں ہیں
چہرے کی ہر شکن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی متبسم بھی نہیں ہوا۔ غیر معمولی سنجیدگی
سے اُس کی صورت مسخ ہو گئی ہے ورنہ وہ بدصورت نہیں کہا جا سکتا۔ چہرے کی
پژمردگی کہتی ہے کہ اُس نے اپنی تمام عمر زہد خشک میں بسر کی۔

ایک دوسرا شخص آ گیا۔ وہ مضطرب بھی ہے اور مایوس بھی لیکن اس کی
کوشش کرتا ہے کہ اُس کے چہرے سے حزن و ملال ظاہر نہ ہو۔ وہ قطعی طور پر بدصورت
ہے۔ اُس کی عمر تقریباً ۴۵ سال کی ہوگی۔ آتے ہی وہ زاہد خشک سے مخاطب ہو گیا

دوسرا شخص ۔ جب سے میں نے اس حقیقت سرا میں قدم رکھا ہے حسن حقیقی کی جستجو کر رہا ہوں مگر وہ مجھے کسی طرح نہیں ملتا
آپ نے اُس کا مشاہدہ کیا ؟

زاہد خشک ۔ حسن حقیقی کیا ؟

دوسرا شخص ۔ وہ حقیقت جسے میں دنیا کے ہر مجاز میں تلاش کرتا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر وہاں نہ مل سکا تو عقبیٰ میں ضرور
مل جائے گا۔ لیکن یہاں بھی وہ مفقود ہے۔ مجھے آپ کی محرومیوں پر سخت تعجب ہے۔ اُس کی تمنا ایک طرف آپ
اُس کے نام و نشان سے بھی آشنا نہیں۔

زاہد خشک ۔ حسن مجازی ہو یا حقیقی کوئی ایسی دولت نہیں جس کی جستجو میں انسان اپنا وقت عزیز رائگاں کر دے۔
اگر آپ نے میری طرح عبادت و ریاضت میں وقت صرف کیا ہوتا یہ پریشانیاں ہرگز پیش نہ آتیں۔

دوسرا شخص ۔ آپ حسن کو ناقابل توجہ سمجھتے ہیں! بدتوفیقیوں کا یہ عالم! عبادت و ریاضت! کیا تلاشِ حسن
عبادات میں داخل نہیں۔

زاہد خشک ۔ ہرگز نہیں ۔ یہ عبادت نہیں ایک طرح کا شرک ہے ۔ میں ہر اُس کشش سے متنفر رہا جو میرے فرائض میں مخل ہو سکتی تھی ۔ میں گناہ کبیرہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا ۔ میں ہر حسن کو گناہوں کا محرک سمجھتا ہوں

دوسرا شخص ۔ آپ کے سنجیدہ لہجے سے مجھے یاد آگیا کہ میں دنیا میں آپ سے اکثر ملا ہوں ۔ مگر یہ خیال نہیں کہ کن مواقع آپ شاید محفل سماع میں تشریف لایا کرتے تھے ممکن ہے وہیں دیکھا ہو ۔ آپ اس قدر برہم کیوں ہو رہے ہیں

زاہد خشک ۔ میں اور محفل سماع ۔ استغفر اللہ ۔ سماع سے مجھے کیا تعلق ۔ خدا نہ کرتا میں کسی محفل سماع میں شریک ہوتا میں کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ایسی صحبت میں بیٹھوں جس میں شریعت کا کوئی دخل نہیں ۔ میں نے عمر بھر کوئی غیر شرعی حرکت نہیں کی ۔ آپ کو سخت دھوکہ ہوا ۔ آپ کسی صوفی سے ملے ہونگے ۔ میں بفضلہ صوفی نہیں ۔

دوسرا شخص ۔ موسیقی میں شرع یا غیر شرع کیا ۔ وہ خود ہی ایک مستقل شرع ہے اس کے علاوہ اصولِ طریقت نے اُسے مستحسن قرار دیا ہے ۔ آپ غالباً ذوقِ لطیف سے محروم ہیں ۔ ورنہ موسیقی سے اس قدر بیزار نہ ہوتے

زاہد خشک ۔ غالباً آپ بھی اُسی سماعی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے حسن پرستی کو بطور ایک پیشہ کے اختیار کر لیا ہے آپ نہ حسن کو سمجھے اور نہ مذہب کو ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی آپ اُسی طرح آوارہ گرد ہیں جس طرح دنیا میں تھے ۔

دوسرا شخص ۔ واقعتاً میں صوفی ہوں اور مجھے ناز ہے کہ دوسروں کی طرح میں نے اپنی عمر زہد خشک میں رائگاں نہیں کی ۔ مجھے رقص و سرود سے انتہائی محبت تھی ۔ مجھ پر محویت طاری ہو جایا کرتی تھی ۔ آواز کی ہر لرزش سے میں بیتاب ہو جاتا تھا ۔ میں جانتا تھا کہ ہر مجاز میں حقیقت مضمر ہے ۔ خوب صورت گانے والے میں بھی اور گانے والے کی آواز میں بھی ۔ تار و مضراب مجھے سرودِ حقیقت کا وہ نغمہ سناتے تھے جسے آپ آج جنت میں بھی نہیں سن سکتے ۔

زاہدِ خشک ۔ معاذ اللہ ! آپ مزامیر کا ذکر اس دیدہ دلیری سے کرتے ہیں ۔ مزامیر کے ساتھ گانا قطعاً حرام ہے خوفِ خدا نے مجھے ہمیشہ ممنوعات سے دور رکھا ۔ ہاں اگر خوش آوازی کے ساتھ کسی نے اشعار پڑھ دیئے اور اشعار بھی وہ جن میں فرائض کی تعلیم و تلقین ہو ۔ میں سن لیا کرتا تھا ۔ لیکن مجھ پر کبھی محویت

نہیں طاری ہوئی یہ بھی آپ کا محض ایک شرعی حیلہ ہے کہ سماع سے آپ پر انکشافِ معارف ہوتا تھا اور
آپ کی خود رفتگی عالمِ بالا تک سے باخبر ہو جاتی تھی۔ میرے خیال میں تو آپ لوگ محض رسماً اور اصولاً
موسیقی کے قائل تھے۔ آپ کے بر خود غلط گروہ کا انداز ہی یہی تھا کہ تمام ممنوعات کو کسی نہ کسی حیلہ سے
فرائض میں داخل کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ موسیقی میں وہ کون سی قوت ہے جس سے روح مسرور
ہو سکتی ہے۔

صوفی۔ موسیقی سے صحیح طور پر متاثر ہونے کے لئے قلب سلیم چاہیے اور آپ کی بدقسمتی سے قلب سلیم ہی آپ میں
نہ تھا۔ پھر آپ ان رموز سے کس طرح باخبر ہو سکتے تھے۔ آپ کے وظائف نے دل و دماغ کی کیفیتوں کو
مضمحل کر دیا تھا اُس کا اثر آپ کے چہرے پر بھی ہے۔

زاہدِ خشک۔ آپ کے دل میں ایمان کا شائبہ بھی نہیں۔ وظائف کے متعلق آپ اس قدر ملحدانہ خیالات رکھتے ہیں۔
اربابِ تصوف کی غلط کاریوں اور غلط بینیوں کی کوئی حد بھی ہے۔ آپ اپنی اوباشیوں کو خضرِ حقیقت
سمجھتے ہیں حسن صورت کی پرستش کا یہ عذر کہ اُس میں حقیقت نظر آتی ہے آپ کے کفر و شرک کا آخری ثبوت
ہے پھر بھی آپ خدا پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ کے تمام مشاغل قلب سلیم نہیں بلکہ قلبِ کثیف و حریص کا
نتیجہ ہیں۔

صوفی۔ کیا حسن انسانی میں خدا کی صناعیاں نہیں کیا اُس سے حقیقت نہیں جھلکتی۔

زاہدِ خشک۔ کیا خدا کی صناعیاں بدقطع چہرے میں نہیں کیا ایک کریہ المنظر پیر فرتوت کے چہرے سے حقیقت نہیں
جھلکتی۔ خدا کو آپ حسن ہی میں کیوں تلاش کرتے ہیں۔ بدصورتی میں بھی تلاش کیجئے۔ وہ بھی تو آخر
دستِ قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ کیا یہ مضحکہ انگیز نہیں کہ آپ کی صورت کا شخص حسن کا محرم ہونا چاہے آپ کو
حسن سے کیا واسطہ۔

صوفی۔ آپ میری صورت پر حملہ کرتے ہیں یہ آپ کی صریحی بزدلی ہے۔ میں اگر بدصورت ہوں تب بھی آپ سے
بہتر ہوں۔ عمر بھر میں حسن کی رنگینیوں میں محو رہا اس لئے میرے چہرے کی ہر شکن میں اُس کا رنگ
بھر گیا ہے برخلاف اس کے اعمال خشک نے آپ کے چہرے پر ایک قسم کی یبوست پیدا کر دی ہے

اس لئے آپ کی صورت میں اگر کوئی کشش تھی وہ بھی جاتی رہی۔ البتہ اگر آپ میری سیرت پر حملہ کرتے ہیں
(برا نہ ماننا) محض رشک و حسد کی بنا پر حملہ کر رہے ہیں۔

زاہدِ خشک ۔ میں اور آپ کی سیرت پر رشک کروں! بزدلی اور مکاری آپ کے ہر انداز سے نمایاں ہے۔ آپ حسن کی پرستش کرنا چاہتے تھے لیکن اتنی جرأت نہ تھی کہ بلا تکلف اور بلا خوف و ہراس اُس کی پرستش میں محو ہو جاتے، اس لئے آپ نے مذہب کے پردے میں پناہ لی اور اپنی حیلہ سازیوں کا نام طریقت رکھا آپ اپنی آوارگیوں اور اوباشیوں کی داد چاہتے ہیں۔ انتظار کیجئے آج آپ کے پورے گروہ کو اس کی کافی داد مل جائے گی۔

صوفی ۔ بزدلی ہر حیثیت سے بد مذاقی سے بہتر ہے میرا یہ عذر کیا کم ہے کہ میرا مقصدِ زندگی تلاش حسن تھا وہ چاہے جرأت کے ساتھ ہو یا بزدلی کے ساتھ۔ میری مکاریاں بھی اس اعتبار سے مستحسن ہیں لیکن آپ کی ہر صورت سے ناقابلِ برداشت ہیں۔ آپ کے مقاصد بھی خشک تھے اور آپ کے ذرائع بھی آپ حریص بھی ہیں اور مکار بھی۔ یہ ممکن ہے کہ اپنی مکاریوں کو آپ محسوس نہ کرتے ہوں مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ مکار نہیں۔ حور و کوثر کے حرص میں آپ نے عبادتیں کیں لیکن عورت اور شراب سے آپ دنیا میں اظہار نفرت کرتے رہے۔ آپ کو مجھ پر کسی طرح ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ جنت کی تمنا میرے دل میں بھی تھی لیکن میں نے اپنی دنیا آپ کی طرح دوزخ نہیں بنائی۔ میں گنہگار سہی تاہم مجھ میں اور آپ میں ایک نمایاں امتیاز ہے۔ آپ نہایت خشک اور غیر دلچسپ گنہگار ہیں۔ اس لئے میری سزا بھی آپ کی سزا سے زیادہ دلچسپ ہوگی....

(شیطان دفعتاً نمودار ہو گیا اُس کو دیکھتے ہی زاہدِ خشک سہم گیا اُس کے ہونٹھ جنبش کرنے لگے۔ لیکن صوفی مطمئن ہے اُس کے اطمینان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیطان سے نا آشنا نہیں)

شیطان ۔ آپ لوگوں کی گفتگو میں دیر سے سن رہا تھا مجھے مسرت ہوئی کہ آپ لوگ بعض اوقات واقعات کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ البتہ مجھے افسوس ہے کہ آپ دونوں جنت کے متلاشی ہیں آپ کو دوزخ و جنت کی

حقیقت نہیں معلوم ۔

زاہد خشک ۔ نعوذ باللہ ......

{ شیطان نے ایک خشمگین نگاہ ڈالی زاہد سہم کر خاموش ہو گیا }

صوفی ۔ یہ عادۃً پڑھ رہے تھے آپ سے ان کو واقعۃً کوئی نفرت نہیں ۔

زاہد خشک ۔ شیطان آپ کا رفیق ہوگا ۔ میرا ہرگز نہیں مجھے اُس سے بغض للٰہی ہے ۔

شیطان ۔ آپ کی للٰہیت سے مجھے انکار نہیں البتہ آپ کی بدمذاقی پر متاسف ہوں ۔ حقیقی انسانیت کا تقاضا تھا کہ غیر دلچسپ عقائد اور غیر دلچسپ اعمال سے تنفر رہے اور رنگینیوں سے انس و محبت لیکن ایسی بلند نظر ہستیاں دنیا میں بہت کم ہیں جو حقیقی نفرت اور حقیقی محبت کے راز سے باخبر ہوتیں پھر آپ ایسے جوان صالح سے کیا اُمید کی جا سکتی تھی ۔ جوان صالح کا مذہب ہی یہی تھا کہ تصورات لطیف اور اعمال رنگین سے بغض للٰہی رکھے وہ تو حسن کو ہمیشہ گناہ کبیرہ کا محرک سمجھتا رہا ۔ حالانکہ گناہ کبیرہ کا اگر کوئی مرادف ہے تو وہی اعمال خشک جن پر آپ کی تمامتر زندگی منحصر رہی ۔

زاہد خشک ۔ نعوذ باللہ ......

{ شیطان کی نگاہوں نے زاہد کو پھر خاموش کر دیا

شیطان ۔ یہ آپ لوگوں کا عجیب انداز ہے کہ جب آپ میرے دلائل کی تردید نہیں کر سکتے آپ فوراً توبہ و استغفار کرنے لگتے ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں آپ کی توبہ محض ایک اعترافِ شکست ہے لیکن مجھے آپ لوگوں کی اس شکست سے کبھی مسرت نہیں ہوئی ۔ میں نے جب کبھی چھوٹی شخصیتوں کو شکست دی مجھے ہمیشہ ندامت ہوئی کہ میں نے اپنی شانِ فتحمندی کو رسوا کیوں کیا ۔

زاہد خشک (صوفی سے مخاطب ہو کر) میں کسی مذہبی احکام سے منحرف نہیں ہو سکتا مجھے حق ہے کہ جب چاہوں اور جس طرح چاہوں توبہ و استغفار کروں کوئی شخص میرے عقائد و اعمال پر معترض نہیں ہو سکتا ۔

شیطان ۔ آپ کا لہجہ بہت کرخت ہے ۔ میں کبھی ایسی آواز کا متحمل نہیں ہو سکتا اگر آپ کی آواز میں ترنّم ہوتا میں آپ کی ہرزہ سرائیوں سے بھی مسرور رہ سکتا تھا ۔ آخر آپ اس قدر بدلہجہ کیوں ہیں ۔

صوفی ۔ یہ مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا کہ آپ موسیقی کا بھی مذاق رکھتے ہیں ۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ اُس سے بدگمان

ہونگے۔ صرف اس بنا پر کہ اُس سے روحانی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔

شیطان ۔ تمھاری کج فہمیاں افسوس ناک ہیں۔ تمھارا گروہ بھی باوجود اپنے ادعاے حقیقت پرستی کے ہمیشہ حقیقتوں سے بے خبر رہا۔ نہ وہ مجاز کو صحیح طور پر سمجھا اور نہ حقیقت کو، تمھارا مجاز بھی غلط اندیشیوں پر مبنی تھا اور تمھاری حقیقت بھی۔ اگر تم میں مذاق صحیح کی رنگینیاں ہوتیں تم میری حقیقتوں سے آج بے خبر نہ ہوتے۔ دنیا میں گو میری شیطنت مجازی تھی لیکن بعض اہل نظر حقیقی شیطنت کی بھی جھلک دیکھ لیتے تھے۔ جاہل اور بد مذاق انسان ہمیشہ غیر دلچسپ بداعمالیوں کو شیطنت سمجھتا رہا پھر وہ میری روحانیت کو کس طرح سمجھ سکتا تھا۔ آج حقائق الوہیت کے ساتھ حقائقِ شیطنت بھی نمایاں ہونگے تم کو معلوم ہوجائے گا کہ میری روحانیت کے مراتب کیا ہیں۔ بہرحال تمھاری بے خبری کچھ ایسی قابل اعتراض نہیں تم رنگینیوں کے قائل تو تھے یہ دوسری بات ہے کہ تمھاری گمراہیوں نے تمھیں حقیقی رنگینیوں سے ہمیشہ بے خبر رکھا حقیقت میں نہ وہ ذرائع رنگین تھے اور نہ مقاصد، جن میں تمھارا گروہ عمر بھر مبتلا رہا۔

صوفی ۔ مجھے یہ سُنکر تعجب ہوا کہ آپ بھی مجاز و حقیقت کے قائل ہیں۔

شیطان ۔ انسانوں کو آج ہزاروں باتیں سُنکر تعجب ہوگا۔ سب سے زیادہ متعجب وہ گروہ ہوگا جس کی نمایندگی آپ کے یہ جوان صالح کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تمھاری پیری ان کے شباب سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ان کا شباب حقیقۃً شباب نہ تھا بلکہ محض ایک فریب پیری تھا۔ جو زہد و اتقا کی ایک ٹھوکر سے برباد ہوگیا۔

زاہد خشک (صوفی سے مخاطب ہوکر) آپ تو ہر مجاز میں حقیقت دیکھتے تھے۔ شیطان میں بھی آپ کو حقیقت نظر آتی ہوگی مجھے نہ مجاز معلوم ہے اور نہ حقیقت میں صرف عبادت و ریاضت کو بزرگ ترین حقیقت سمجھتا ہوں۔ شیطان مجھ پر طعن و تشنیع کر رہا ہے اُسے کرنے دیجئے اگر خدا کو آج مجھے متحیر کرنا منظور ہوگا میں تحیر ہی کو اپنا اجر سمجھوں گا۔ شیطان کو نہ میری عبادت سے واسطہ تھا اور نہ اُسے حق ہے کہ میرے اجر کے مسئلہ پر مضحکہ کرے۔

شیطان ۔ مجھے انسان کے ہر عمل سے تعلق اور اُس کے ہر اجر سے واسطہ ہے۔ میں دنیا میں اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اُس کی زندگی میں حصہ لوں ورنہ خدا کو اگر مجھے کوئی سزا دینی منظور ہوتی جس طرح آدم کے لئے ایک نئی دنیا قائم کی گئی تھی میرے لئے بھی ایک ویرانہ مخصوص کردیا جاتا تاکہ میں اُس میں تنہا مقید رہوں۔ لیکن اس کے برعکس میں دنیا

کی آبادی میں نہایت وسیع اختیارات کے ساتھ بھیجا گیا۔ اصلاح انسانی میری زندگی سے وابستہ تھی
مجھے حق دیا گیا تھا کہ میں انسان کے ہر عقیدہ و عمل میں مداخلت کروں۔ آپ اپنی جہالت کو دور کیجئے اور اپنے
اس لایعنی اتقا سے توبہ کیجئے ورنہ آج آپ کی پشیمانیاں معلوم نہیں آپ کے ساتھ کیا کریں۔ دنیا میں آپ
بقدر رہے نتیجہ یہ ہوا کہ تمام حقیقتیں آپ کی متقی نگاہوں سے چھپ گئیں اگر آج بھی آپ کا جہل مرکب یوں ہی
رہا آپ کی جزا معلوم۔

زاہد خشک۔ تمہارا کیا مطلب ہے میں دوزخ میں چلا جاؤں؟ تم اسی وقت مطمئن ہو گے۔ جب میرا سرمایۂ اتقا اُس
شیطانی آگ میں جل جائے۔

شیطان۔ کیا دوزخ اور دوزخ کی آگ میں نے بنائی تھی؟ آپ اُسے شیطانی کہتے ہیں۔ کیا آپ کے نقطۂ نظر سے
یہ جملہ کفر و شرک میں شامل نہیں ہو جاتا۔ بیوقوف انسان اپنی حماقت کے جوش میں وہ سب کچھ کہہ گزرتا ہے
جس سے وہ روکا گیا تھا۔

زاہد خشک۔ یہ محض تمہاری شیطنت کے اثر سے اگر میں صحیح راستے سے بھٹک گیا تو اس کی ذمہ دار تمہاری اشتعال انگیز
گفتگو تھی۔ میں تم سے اس لئے گفتگو نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں کوئی قابل گرفت جملہ میری زبان سے نہ نکل جائے
مجھے توبہ کر لینے دو۔

شیطان۔ بالآخر آپ نے میرے اثر اور میری اہمیت کا اعتراف کیا۔ لیکن مجھے اپنی کامیابی پر کوئی فخر نہیں ہو سکتا
میری شیطنت اس قدر بلند نظر ہے کہ ایک ناقابل اصلاح گروہ سے کبھی مخاطب نہیں ہوئی۔ بد مذاق انسان کو
متاثر کرنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

صوفی۔ آپ کی گفتگو ایک عجیب معمہ ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے خیالات سے اتفاق کروں یا اختلاف۔
دنیا میں بہت سے واقعات ایسے تھے جن کا ظاہر کچھ اور تھا اور باطن کچھ اور ہر مجاز میں حقیقت ہوتی ہے
ممکن ہے آپ کی منطق صحیح ہو۔

زاہد خشک۔ اسی طرح تم دوزخ کے مجاز میں جنت کے حقائق دیکھو گے۔

شیطان۔ میں آپ کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ آپ ایک مختصر جملے میں ہزاروں واقعات کہہ گئے میں تو ہمیشہ

یہ سمجھتا رہا کہ وعظ و تلقین سے خیالات کی صحت ہو سکتی ہے۔ میں آپ سے قطعاً مایوس ہو گیا تھا لیکن اب خوش ہوں کہ تعصب کو علیحدہ رکھکر آپ نے حقائق کو سمجھنے کی نہایت دلیرانہ کوشش کی ہے ورنہ کمزور طبیعت والوں کی زبان سے یہ جامع الفاظ کبھی ادا نہیں ہو سکتے تھے۔

زاہد خشک - خدا مجھے گمراہیوں سے بچائے میرا مفہوم یہ ہرگز نہیں تھا کہ دوزخ حقیقۃً جنت کا کوئی پردہ ہے میرا جملہ محض طنزیہ تھا۔

شیطان - مشکل تو یہ ہے کہ متقی گروہ کا لہجہ ہمیشہ کے لئے خراب ہو چکا ہے۔ آپ لوگ ہر بات طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں اور کوئی امتیاز ہی نہیں کر سکتا کہ کہاں طنز ہے اور کہاں نہیں، البتہ اس میں آپ کے لئے ہمیشہ تحفظ کی ایک صورت پنہاں رہی۔ جب کبھی آپ کو اپنے کسی جملہ پر ندامت ہوئی آپ نے فوراً یہ حیلہ پیش کر دیا کہ وہ محض طنزیہ تھا۔

صوفی - زاہد کا جو مفہوم ہو میں اس جملہ سے قطعاً بری الذمہ ہوں۔ میں جنت کی حقیقتوں کو دوزخ کے مجاز میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ دوزخ جانے کے لئے میں ہرگز تیار نہیں چاہے اُس کے ہر پردے میں ہزاروں جنتیں پنہاں ہوں میں ایسی حقیقت کے تماشے کے لئے تیار نہیں جو مصائب کے مجاز میں مضمر ہو۔

زاہد خشک - تمھارے مجاز و حقیقت کا راز کھل گیا۔ تم لوگ مجاز بھی دلچسپ چاہتے ہو اور حقیقت بھی اگر حقیقت پرستی کا دعویٰ ہے تو دوزخ جانے سے بھی تم کو پرہیز نہ کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے اُس کے مصائب میں تم کو حقیقت نظر آجائے اور تمھاری عمر بھر کی جستجو کامیاب ہو۔

شیطان - یہ صحیح ہے کہ مدعیانِ تصوف کی نادانیوں نے اُنھیں حقائق سے بے خبر رکھا لیکن صوفی کی بزدلی اور نادانی کو میں زہد و اتقا کی بد توفیقیوں پر ترجیح دیتا ہوں ......

ایک مرد اور دو عورتیں قریب آتی ہوئی نظر آئیں۔ ایک عورت جس کا سن تقریباً بائیس برس کا ہوگا حسن کا ایک مجسمہ ہے جس کا ہر انداز بہار کی ایک مستقل فضا ہے اُس کے چہرے پر شباب کا تبسم اور حرکات شیریں کی رنگینیاں جھلک رہی ہیں دوسری عورت کی بھی عمر یہی ہے لیکن وہ شدت کے ساتھ بدصورت ہے۔ اُس کے خط و خال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں سے ہمیشہ خائف رہی۔ مرد نہایت وجیہ ہے اُس کے ہر انداز سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ اُس کا شباب اُس کی آنکھوں کی دلاویزی اور چہرے کی تمام کیفیتوں سے نمایاں ہے۔

شیطان (صوفی سے) دیکھو یہ خوب صورت عورت کائنات کی اہم ترین حقیقت ہے یہی وہ ہستی ہے جو خود اپنا مجاز ہے اور خود اپنی حقیقت۔ اُس کی گفتگو میں موسیقی کے تمام رموز پوشیدہ ہیں۔ اُس کی نسوانیت میں فطرت کی ہزاروں حقیقتیں مضمر ہیں۔

(سب قریب آگئے)

زاہد خشک (آہستہ صوفی سے) کیا یہ حور ہے؟ حور ہی ہوگی میں نے ایسی صورت کبھی دنیا میں نہیں دیکھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میری ریاضتیں کامیاب ہوئیں۔

صوفی۔ یہ حور نہیں عورت ہے دنیاوی عورت۔ اگر اس عورت کو دنیا میں تم ایک بار صحیح نظر سے دیکھ لیتے تمہارا قلب اس قدر لطیف ہوجاتا کہ پھر فرائض کا بار تم سے نہ اُٹھ سکتا۔ دوزخ کی دھمکی بھی تمھیں اُس سے علیٰحدہ نہ کرسکتی۔

شیطان۔ جوانانِ صالح نے تو محض اس حرص میں حسین عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کی تھی کہ جنت میں اُن کو حسین تر حوریں ملیں گی۔ مگر اس وقت وہ محسوس کرتے ہونگے کہ اُنھوں نے دنیا میں اپنی تمام جنتیں اپنے ہی ہاتھوں برباد کردیں۔ مجھے اُن کی پشیمانیوں سے ہمدردی ہے۔

خوبصورت عورت (شیطان سے) صوفی کو تو میں جانتی ہوں گو اُس سے بے تکلف نہیں لیکن یہ دوسرا شخص کون ہے میری صورت دیکھتے ہی اُس کے چہرہ پر کچھ حریصانہ پریشانی سی پیدا ہوگئی وہ تبسم نہیں جو ہر رنگین مذاق انسان کے لبوں پر مجھے دیکھکر رقص کرنے لگتا ہے۔ آج میں برابر پھرتی رہی۔ ہجوم حشر گرمی سے پریشان تھا سب کی آنکھیں آنسوؤں سے تقریباً بند تھیں لیکن پھر بھی میری طرف سے لوگوں کی نگاہیں نہیں ہٹیں۔ ایک غیر معمولی طور پر متقی گروہ (صورت سے وہ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا) مجھے دیکھکر حیرت زدہ ہوگیا۔ وہ سب ایک دوسرے سے کچھ باتیں کرنے لگے میں نے صرف ہاروت و ماروت کا نام سنا۔ میں نے جب اُنھیں بغور دیکھا وہ سب شرما گئے۔ شرم آتی تو مجھے آتی معلوم نہیں وہ کیوں شرمندہ ہوگئے۔

شیطان۔ وہ گروہ فرشتوں کا تھا۔ بیچارے سب کے سب نہایت معصوم ہیں۔ تمھیں دیکھتے ہی اُنھیں اپنی عصمت و بیچارگی کا خیال آگیا ہوگا۔ اصل میں وہ احساسِ مجبوری تھا یا اظہارِ ندامت۔ جسے تم شرم سمجھیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ تمھارے حسن سے متاثر ہو کر وہ محجوب ہو گئے ہوں اُن کا حجاب بالکل نسوانی حجاب ہوگا یعنی ایک طرح کا اعترافِ کشش۔ عورت جب جذبۂ محبت سے متاثر ہو جاتی ہے اُس کی بیباکیاں حیا سے بدل جاتی ہیں اُس کا حجاب اس امر کا اعتراف ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبت کرنے والے سے خود محبت کرنے لگی۔

خوبصورت عورت۔ مگر میں کسی ایسے شخص سے محبت نہیں کر سکتی جس کے زہد و اتقا نے اُسے سنگدل اور بے حس بنا دیا ہو۔ میں نے اُس گروہ کو نگاہ محبت سے نہیں بلکہ محض نگاہِ تاسف سے دیکھا تھا کہ اُن کی عصمت نے اُن کو اس قدر غیر دلچسپ بنا دیا ہے۔

خوبصورت مرد۔ اتقا کے جو اثرات چہرے پر پڑتے ہیں اُسے چاہے شرم کہا جائے یا ندامت مفہوم ایک ہی ہے۔ معصوم ہستیوں کے چہرے کی مستقل کیفیت ہی یہی ہوتی ہے یہ غلط ہے کہ کسی جذبہ سے متاثر ہو کر اُن کا رنگ بدل سکتا ہے۔ اُن میں یہ صلاحیت کہاں۔ وہ ہر لطیف جذبہ سے محروم ہیں۔ اُنھیں حسن متاثر کر ہی نہیں سکتا۔

شیطان (خوبصورت عورت سے) یہ بیچارے زاہد بھی فرشتوں کی طرح معصوم ہیں۔ ان کے اتقا کو تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ ان کے اصلاح کی کوشش کرو۔ مجھے فی الحال جزا و سزا کے بعض مراحل طے کرنے ہیں اس لئے میں جا رہا ہوں۔ ان کی پارسائی بظاہر ناقابل اصلاح ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ تمھارا حسن اُنھیں جو کچھ سمجھانا چاہے گا سمجھا دے گا۔ (صوفی) تم ہی میرے ساتھ آؤ تمھیں مجاز و حقیقت کا تماشا دکھلاؤں۔

[شیطان اور صوفی دونوں چلے جاتے ہیں]

زاہد خشک (خوبصورت عورت سے) آپ صورت سے بہت متقی معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔

خوبصورت عورت۔ آپ نے میری صورت میں کیا نقص دیکھا جسے آپ اتقا کہتے ہیں۔ آپ کو دھوکا ہوا۔ میں متقی نہیں بلکہ خوبصورت ہوں۔ آج میں نے پہلی بار یہ سُنا کہ میرے چہرے سے لایعنی اتقا نمایاں ہے۔

زاہد خشک۔ اتقا حسنِ سیرت کا نام ہے اُس کا اثر لازمی طور سے چہرے پر پڑتا ہے۔ آپ خوبصورت بھی ہیں اور معصوم بھی۔

خوبصورت مرد۔ حسن خود ہی اپنی عصمت ہے اُس کے لئے نہ عملی اتقا کی ضرورت ہے اور نہ حسنِ سیرت کی خوبصورت

کے ساتھ معصوم کا لفظ آپ نے بے کار کہا۔ حسن غیر معصوم ہو ہی نہیں سکتا۔ اُس سے وہ اعمال ہی سرزد نہیں ہو سکتے جو حسن و شباب کی رنگینیوں کے دشمن ہیں اور جنھیں فرائض کہا جاتا ہے۔ در اصل ایسے ہی فرائض صورت کو غیر معصوم بنا دیتے ہیں۔

زاہد خشک۔ معاذ اللہ آپ مذہب و اخلاق کی توہین کر رہے ہیں استہزا انتہائی معصیت میں داخل ہے۔ آپ کے نزدیک مذہب و اخلاق کوئی چیز نہیں۔

خوبصورت مرد۔ حسن خود ہی اپنا مذہب ہے اور خود ہی اپنا اخلاق۔ مذہبِ حسن میں معصوم اور غیر معصوم کا امتیاز عام مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ حرکات رنگین عام مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے کتنے ہی مذموم و ممنوع کیوں نہ ہوں شرعِ حسن میں مستحسن اور معصوم قرار دیئے جا چکے ہیں۔ جسے آپ اتقا کہتے ہیں وہ حقیقۃً ایک جرم ہے جس سے خیالات میں بھی ایک مجرمانہ بزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور اعمال میں بھی۔ اتقا سے چہرے پر ایک قسم کی کبیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جوان صالح کی وضع و قطع کو دیکھکر ہر خوش مذاق انسان کو حقیقی عزت حاصل کرنا چاہیئے۔ اس کے مقابلہ میں حرکات لطیف کے اثرات دیکھئے اُن کی جھلک چہرے کو اس قدر دلآویز بنا دیتی ہے جس نے آج آپ کے ایسے تنگ نظر انسان کو گرویدہ کر لیا۔

زاہد خشک۔ تم اس طرح کے عقائد لے کر یہاں آئے ہو کیا تمھیں یہ نہیں معلوم کہ آج عقائد و اعمال کی جزا و سزا ہو گی۔

خوبصورت مرد۔ میں نہ جزا و سزا کو اس قدر اہم سمجھتا ہوں اور نہ حشر و نشر کو کہ اپنی زندگی کے بہترین لمحوں کو اُن پر قربان کر دیتا۔ آپ شاید ہمیشہ قیامت ہی کو ڈرتے رہے ورنہ آپ اعمال سے زیادہ اُن کے اجر سے خائف نہ ہوتے۔ آج کا مرحلہ کوئی منزل نہیں یہ محض ایک وقتی حادثہ ہے جس سے زندگی کا سلسلہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

خوبصورت عورت۔ جس طرح زہد خشک حسن کے فتوحات میں حارج نہیں ہو سکتا۔

زاہد خشک (خوبصورت عورت) کم از کم مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی کہ ایسے ملحدانہ خیالات میں آپ ان کی ہم آہنگ ہونگی۔ مجھے آپ سے مایوسی ہو رہی ہے۔

خوبصورت مرد۔ زہد خشک کو کوئی حق نہیں کہ حسن سے کسی قسم کی امید رکھے۔ جوانِ صالح رموزِ حسن کا ہرگز محرم

نہیں ہوسکتا یہ صریحی گستاخی ہے کہ آپ حُسن سے ہمدردی کی توقع رکھتے ہیں۔ گستاخی کی بہترین سزا یہی ہے۔

زاہد خشک۔ آج حسن و شباب کی بھی پرسش ہوگی۔ اس وقت یہ معمہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ کس کو کس سے امید قائم رکھنی چاہیئے۔

خوبصورت مرد۔ آپ ہمیشہ اعمالِ خشک میں منہمک رہے۔ اس لئے آپ کے دل و دماغ میں سوا جزا و سزا کسی اور جذبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر محض آپ کے اعمال خشک ہوتے ہیں تھوڑی دیر کے لئے انھیں معاف کرسکتا تھا لیکن عقائد کی خشکی کو میں کبھی معاف نہ کروں گا۔

خوبصورت عورت (زاہد سے) تمھیں اپنے غیر دلچسپ اعمال و عقائد سے توبہ کرلینی چاہیئے۔ تمھاری سنگدلی اور تمھارا یہ ناقابل برداشت اتقا میرے حسن کی ایک مستقل توہین ہے۔

بدصورت عورت۔ میں نے بہت صبر کیا لیکن اب خاموش نہیں رہ سکتی ہیں یہ نہیں دیکھ سکتی کہ تم اپنے گمراہ حسن کی نمود و نمائش سے ایک متقی کا سارا سرمایۂ اتقا تباہ کردو۔

خوبصورت مرد۔ زاہد کا اتقا دراصل اتقا نہیں بلکہ سنگدلی ہے۔ صحیح اتقا تو وہ ہے جو لطیف مواقع پر خود بخود ٹوٹ جاتا ہے وہ حسن لطیف کی ایک شانِ بے نیازی ہے جو ناز بھی بن سکتی ہے اور نیاز بھی۔ زاہد حسن خیال سے اسی طرح بیگانہ ہے جس طرح تم حسن صورت سے وہ نسوانیت کا بھی صحیح تخیل نہیں قائم کرسکتا وہ غیر منکوحہ حسن کا قائل نہیں وہ صرف اسی عورت کو حقیقی معنوں میں عورت سمجھتا ہے جس سے اُسے دنیاوی رسوم و قیود نے وابستہ کردیا تھا۔

زاہد خشک۔ تم نکاح کی بھی تضحیک کرنا چاہتے ہو شرعی حکم اور اُس کے متعلق اس قدر استہزا۔ کیا نکاح کا احترام اس کا مقتضی نہیں کہ انسان اسی عورت کا قائل رہے جسے مذہب نے اُسے سپرد کیا ہے۔

خوبصورت مرد۔ میرے نزدیک دو مختلف الہیئت انسانوں کی وابستگی چاہے محبت کی بنا پر ہو یا نکاح کی بنا پر کسی طرح جائز نہیں۔ بدصورت اور بدمذاق مرد ہو یا بدصورت اور بدمذاق عورت دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ حسن پر حریصانہ نگاہیں ڈالے یا اُس پر کوئی مستقل اثر قائم کرنا چاہے۔

خوبصورت عورت۔ غالباً نکاح اور اسی طرح کی دوسری مستقل بندشیں بدصورت لوگوں نے ایجاد کی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ

جس عورت یا مرد نے اس رسم کو ایجاد کیا تھا وہ قطعاً بد مذاق اور بد ہیولہ تھا اُس کے پاس حسن کی کوئی ایسی کشش نہ تھی جو دونوں کو متحد رکھتی اس لئے ایک غیر فطری بندش کی تلاش ہوئی جو دو انسانوں کو جنھیں ایک دوسرے سے کوئی وابستگی نہیں۔ مجبوراً متحد رکھے۔ نکاح پر وہی عورت مصر ہوتی ہے جسے فطرت نے حسن سے قطعاً محروم رکھا ہے

خوبصورت مرد۔ نکاح ایسے ہی بدنصیب انسانوں کے لئے فرض کیا گیا تھا (بدصورت عورت سے) میں نے انھیں مصلحتوں کے خیال سے تمھیں صلاح دی تھی کہ تم کسی بے حس انسان کے ساتھ شادی کرلو۔

بدصورت عورت۔ تم نہایت بے رحمی کے ساتھ مجھے میری پچھلی زندگی یاد دلا رہے ہو۔ اگر میں بدصورت ہوں تمھیں مجھ پر افسوس کرنا چاہیئے۔ کیا میں تمھاری ہمدردی کی کسی طرح مستحق نہیں ہوسکتی۔

خوبصورت مرد۔ میں بدصورت اور خشک سیرت انسان سے کوئی ہمدردی نہیں کرسکتا۔ تم بدصورت ہونے کی وجہ سے فطرت کی ایک ناقابلِ عفو مجرم ہو۔ تم پر افسوس کرنا افسوس کو ضائع کرنا ہے۔ تم عورت تھیں تمھیں بدصورت ہونے کا ذرا بھی حق نہ تھا۔ تمھاری سزا یہی ہے کہ تم سے نفرت کی جائے نہ تم دنیا کے لئے کوئی پیامِ مسرت رکھتی تھیں اور نہ عقبیٰ کے لئے۔ دنیا میں تم نے مجھے بہت پریشان کیا لیکن میں نے کارِ خیر کے طور پر بھی تم سے ایک لمحہ کے لئے محبت نہیں کی۔

خوبصورت عورت۔ میں نے بھی نہ کسی بد قطع اور بد مذاق مرد سے محبت کی اور نہ اُسے اپنے حسن سے محبت کرنے دی۔

زاہد خشک۔ معاذ اللہ! حسن و شباب کا تذکرہ ایک عورت کرے اور اس دیدہ دلیری سے! اس کا انجام خدا ہی جانتا ہے کیا ہو۔

بدصورت عورت۔ حسن و عشق نے تم دونوں کو گمراہ کر دیا ہے نہ تم کو گناہ و ثواب کا ہوش ہے اور نہ تمھاری محبوبہ میں حیا و شرم کی گنجائش۔ جس حسن کا یہ انداز ہو اُس کی سزا جس قدر ہو کم ہے۔ حسن نے تم کو جس معصیت میں مبتلا کر دیا اُس کا احساس تم کو اُس وقت ہوگا جب خدا اور اُس کے فرشتے تمھاری تنبیہ کریں گے۔

خوبصورت مرد۔ خدا کبھی تنبیہ نہیں کرتا یہ ناخوشگوار حرکت اُس نے تنگ نظر اور کمینہ خیال انسان کے لئے مختص کردی ہے۔ وہ کبھی کسی کو سزا نہیں دیتا۔ تم کو معلوم نہیں کہ حسن کیا ہے اور اُس کا ارشاد کس احترام کا

مستحق ہے۔ جس کے اصرار سے ہر معصیت ایک خوش مذاق انسان پر فرض ہو جاتی ہے لیکن ایک کریہہ المنظر اگر فرائض کی تلقین کرے وہ بھی ممنوعات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ تم اگر مجھکو صوم و صلوٰۃ کی ترغیب دیتیں میں سمجھتا کہ مجھے گمراہی کی طرف لئے جا رہی ہو۔

بدصورت عورت۔ دنیا میں مجھے تمھاری محبت کی پروا تھی لیکن آج قطعاً نہیں۔ میری صورت کی جو سزا تمھارے ذریعہ سے ملنی تھی وہ دنیا ہی میں مل گئی لیکن آج میری کامیابی کا دن ہے۔ مجھے خدا حسن سیرت کی جزا دے گا۔ میری نیکیاں میری تشفی کے لئے کافی ہیں۔

خوبصورت مرد۔ جسے تم حسنِ سیرت کہتی ہو وہ حقیقۃً روح کی وہ پژمردگی ہے جو لطف و انبساط سے ہمیشہ تم کو محروم رکھے گی۔ حسن سیرت بلا حسن صورت کے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال تمھارا یہ اطمینان بھی کہ تمھاری نیکیوں کی جزا آج تمھاری دنیا کی تلافی کر دے گی میری بے التفاتیوں کا ممنون ہے۔ تمھیں میرا مشکور ہونا چاہیئے۔ عورت جب محبت میں ناکام رہتی ہے کار ہائے خیر میں منہمک ہو جاتی ہے وہ محض مجبوراً اور ایک حیثیت سے انتقاماً متقی ہو جاتی ہے۔ محبت کی شکست اُسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ محض عقائد و فرائض کی خشکیوں پر ہمیشہ کے لئے قناعت کر لے۔ بدصورت عورت مجبور ہے کہ رنگین مذاق انسانوں سے مایوس ہو کر عصمت و اتقا کی طرف جھکے لیکن ایک خوبصورت اور لطیف سیرت عورت کے لئے ہزاروں مشغلے ہیں وہ اُنھیں کی رنگینیوں میں محو رہتی ہے وہ زہد و اتقا کی محتاج نہیں اُس کا حسن عصمت و عفت کی لایعنی بندشوں سے فطرۃً آزاد ہے اُس کا ہر انداز حقیقی اتقا اور اُس کی ہر روش حقیقی عصمت ہے۔

خوبصورت عورت۔ اس کے علاوہ ہزار نیکیاں اور ہزار جنتیں بدصورتی کی تلافی نہیں کر سکتیں۔

بدصورت عورت۔ کیا محبت بھی بدصورتی کی تلافی نہیں کر سکتی۔ میں جانتی تھی کہ بدصورت ہوں۔ یہ بھی جانتی تھی کہ تم خوبصورت ہو۔ لیکن میں سمجھتی تھی کہ میرا جذبۂ محبت تم دونوں کے رشتۂ محبت کو توڑ دے گا۔ مجھے ان سے جس قدر محبت تھی تم اُس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ اس قدر محبت تم دونوں نے ایک دوسرے سے عمر بھر نہ کی ہوگی۔ تاہم میں ناکام رہی۔ باوجود میری انتہائی محبت کے انھوں نے کبھی میری صورت کو معاف نہیں کیا۔ خدا آج ان کے اس گناہ کو معاف نہ کرے۔

خوبصورت مرد ۔ محبت ایک لطیف مشغلہ ہے اُس کی لطافت کا یہ تقاضا ہے کہ حد سے زیادہ گزرنے نہ پائے ورنہ اُس کی تمام رنگینیاں ایک لمحہ میں فنا ہو جائیں گی ۔ انتہائے محبت میں ہلاکتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ محبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اپنی ہستی کی طرح اپنے محبوب کی ہستی کو بھی تباہ کردے ۔ اگر محبوب بھی اپنی بربادیوں میں معین ہو گیا حسن بھی برباد ہو جاتا ہے اور محبت بھی۔

خوبصورت عورت ۔ حسن کبھی مصائب کو برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں ہلاکت آمیز محبت کو ہمیشہ اپنی توہین سمجھتی رہی۔ تمہیں اپنی غلطی پر نادم ہونا چاہیئے ۔ لیکن تم آج جوشِ غضب میں اپنے محبوب کو بددعا دے رہی ہو ۔ کیا یہ بھی محبت کا تقاضا ہے ۔

خوبصورت مرد ۔ بدصورت انسان انتقاماً بدنفس ہو جاتا ہے ۔ وہ ہر انسان کا دشمن ہے اور ہر انسان کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اُس کی ازلی محرومیاں اُسے ہر اُس شخص سے بدگمان کر دیتی ہیں جسے فطرت نے حسنِ صورت بھی دیا ہے اور حسنِ مذاق بھی ۔ برخلاف اس کے حسن خود اپنی کشش اور اپنے اقتدار پر اعتماد رکھتا ہے ۔ اس لئے اُسے دوسروں سے نہ کوئی کاوش رہتی ہے اور نہ کوئی بغض ۔ مجھے اس بدنصیب عورت کی کاوشوں پر افسوس ہے ۔

بدصورت عورت ۔ اگر میں نے عمر بھر تم سے نفرت کی ہوتی تب مجھے وہی صلہ ملتا جو تم نے میری محبت کا دیا ۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں آج تم سے نفرت نہ کروں ۔

خوبصورت مرد ۔ میں تمہاری محبت کا کوئی صلہ نہیں دے سکتا تھا ۔ تم نے مجھ سے شدت کے ساتھ کیوں محبت کی ۔ یہ محض تمہاری تنگ نظری تھی ۔ میں اسے ابتذال سمجھتا ہوں کہ دوسروں کی بے اعتنائیوں میں انسان اپنے احساسات کو قربان کردے ۔ تمہاری سب سے بڑی بدمذاقی یہی تھی کہ باوجود میری بے التفاتیوں کے تم مجھ سے خود فروشانہ محبت کرتی رہیں ۔ اگر تم محبت کئے جانے کے قابل بھی ہوتیں میں محض تمہارے اس جرم پر تم سے متنفر ہو جاتا کہ تمہارے جذبات میں خودداری نہیں ۔ آج تم مجھ سے اظہارِ نفرت کر رہی ہو میرے نزدیک تم ایسی بدقسمت ہستیوں کی محبت اور نفرت دونوں ناقابلِ لحاظ ہیں ۔

بدصورت عورت ۔ میں تو حساب و کتاب کی منتظر ہوں، تمہاری ان برخود غلط محبوبہ کے حسن اور تم ایسے صحیح قسم کی محبت کرنے والوں کا حشر دیکھنا چاہتی ہوں ۔ دیکھوں اُس وقت تمہاری رنگینیاں تم کو کہاں لے جاتی ہیں ۔

زاہد خشک ۔ یہ آواز تو میری بیوی کی معلوم ہوتی ہے! میں یہ کیا سن رہا ہوں !!! شادی شدہ عورت اور پھر میری بیوی دوسروں سے محبت اور اس طرح کی غیر شرعی محبت۔

بدصورت عورت ۔ یہ کیا ہوا !! میری دنیا بھی گئی اور عقبیٰ بھی!

خوبصورت عورت ۔ کیا تمھاری عقبیٰ بھی اُسی پر منحصر ہے جس پر دنیاوی رسم و رواج نے تمھاری دنیا کا انحصار کیا تھا میری عقبیٰ تو میری ازلی اور ابدی رنگینیوں پر مبنی ہے۔ نہ دنیا میں میرے لئے کوئی رکیک بندش تھی اور نہ آج ہے۔

خوبصورت مرد ۔ ایک لایعنی عورت کی عقبیٰ سوا ایسے بدمذاق شخص کے اور کس پر منحصر ہو سکتی ہے جس کی دنیا محدود ہو اُس کی عقبیٰ کا محدود ہونا لازمی ہے۔

زاہد خشک ۔ میں محض تم لوگوں کی ضد میں اپنی بیوی کا قصور محبت معاف کئے دیتا ہوں۔ اس نے گناہ کبیرہ کیا لیکن کوئی مضائقہ نہیں اُس کا یہ عذر کیا کم ہے کہ اُس کی محبت ناکام رہی اور میرے حقوق شوہری کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا۔ اس کے علاوہ اُس کے اتقا اور اُس کی ریاضتوں کا تقاضا یہی ہے کہ میں اُس کی اس لغزش کو معاف کردوں۔

خوبصورت مرد ۔ اتقا کا یہ معیار خوب ہے! اس لایعنی منطق سے تم ایسے نادان اپنے نفس کو ہمیشہ دھوکے میں رکھتے ہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اُس نے غلط قسم کی محبت کی تھی اُس کی کامیابی اور ناکامی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ عفتِ نسوانی اُسی وقت فنا ہو گئی جب اُس کے دل و دماغ میں اس محبت کا نقش قائم ہوا۔ اگر اُس کی محبت صحیح تھی پھر نہ اتقا کا سوال آتا ہے اور نہ عفت کا تم لوگوں کے جہالت کی یہ انتہا ہے کہ حسن و محبت کے مشاغل کو ہر صورت میں عفت و عصمت کے منافی سمجھتے ہو۔

بدصورت عورت (زاہد سے) تم دیر سے باتیں کر رہے تھے مگر میں نے تمھیں نہیں پہچانا تھا لیکن ابھی جب تم نے میری محبت پر اظہار تعجب کیا مجھے دفعتًا تمھارا لہجہ یاد آگیا۔ پھر تمھاری صورت پر غور کیا تو وہ سنجیدگی نظر آگئی جسے میری نگاہیں عمر بھر دیکھتی رہی تھیں۔

خوبصورت مرد ۔ وہی سنجیدگی جسے تم نے پہلی بار نکاح کی شبِ اوّلیں میں اُس کے چہرے پر دیکھا تھا؟

زاہد خشک ۔ تمھیں ہم دونوں کے شرعی تعلقات پر مضحکہ کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ میں اپنی بیوی کے ہر جرم کو معاف کرتا ہوں ۔ تمھاری اشتعال انگیز گفتگو کا یہی جواب ہے ۔ مجھے جو کچھ شکایت ہے وہ یہ کہ اُس نے تم ایسے گمراہ انسان سے محبت کیوں کی، لیکن اب کوئی شکایت نہیں ۔ میں نے اُسے ہر حیثیت سے معاف کر دیا ۔

بدصورت عورت ۔ مجھے حیرت ہے کہ تم باوجود اپنی سنگدلی اور تنگ مزاجی کے اس قدر رحم دل اور بلند حوصلہ کس طرح ہو گئے ۔ مجھے تم نے فوراً معاف کر دیا ! دنیا میں جب کبھی تم مجھ سے برہم ہوتے تھے تمھارے دل سے شکایتیں کبھی نہیں جاتی تھیں ۔ تم اپنے وظائف کو محض اس لئے طویل کر دیا کرتے تھے کہ مجھ سے گفتگو کے مواقع نہ رہیں ۔ بہرحال آج تو تم نے مجھے معاف کر دیا اور اب اپنی معافی کو واپس نہیں لے سکتے ۔ مجھے یقین ہے کہ اس عورت کے حسن نے تمھیں مسخر کر لیا ہے اس لئے تم مجھ سے قطعاً بے نیاز ہو گئے ہو ۔ اسی بیگانگی نے تم کو میری لغزشوں پر غور کرنے نہیں دیا ۔ ورنہ اگر تمھیں آج بھی میرا خیال ہوتا تم اس طرح بیگانہ وار کبھی مجھے قابل معافی نہ سمجھتے ۔

خوبصورت مرد ۔ عورت کی یہ فطرت ہے کہ جب اُس کے کسی جرم کو مرد معاف کر دیتا ہے اُس کا شکریہ وہ الزامات کے ذریعہ سے ادا کرتی ہے ۔

زاہد خشک ۔ میرے اور تمھارے باہمی حقوق و فرائض دنیا ہی تک محدود تھے ۔ یہاں تمھیں میرے افعال کی گرفت کا کوئی حق نہیں ۔ اگر میں نے تمھاری طرح دنیا میں گناہِ محبت کا ارتکاب کیا ہوتا تمھیں دارو گیر کا حق ہو سکتا تھا ۔

خوبصورت عورت ۔ کیا تمھیں اس بدقطع عورت سے محبت تھی ۔

زاہد خشک ۔ محبت ضرور تھی مگر غیر شرعی نہیں ۔ میں نے کبھی اُس کی محبت میں اپنے فرائض ترک نہیں کئے ۔

خوبصورت عورت ۔ اگر میں تمھاری بیوی ہوتی تم کو اُن فرائض کے ترک پر مجبور کر دیتی جنھوں نے تمھاری انسانیت کو قطعاً فنا کر دیا ہے ۔ لیکن تم پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ایسی بدصورت عورت کی محبت میں فرائض کیا نوافل کو بھی ترک نہ کرنا چاہیئے ۔

خوبصورت مرد ۔ جب ایک لایعنی عورت کسی کی زندگی کی معصیت بن جاتی ہے وہ صرف خدا ہی کی درگاہ میں پناہ لے سکتا ہے

اور کہیں نہیں۔ تمھارے زہدِ خشک کا باعث شاید یہی ہے۔

خوبصورت عورت ۔ تمھاری بیوی کے عکس نے تمھارے چہرے کو بدرنگ بنا دیا ہے ورنہ تم اپنے نکاح کے پہلے ایسے بدقطع نہ تھے۔ تمھاری بدتوفیقیوں کے علاوہ اس عورت نے بھی تمھارے جسم اور تمھاری روح دونوں کو رنگینیوں سے محروم کر دیا ہے۔

بدصورت عورت ۔ تمھاری یہ لاابالی گفتگو تمھیں کہیں زاہد سے اُلجھا نہ دے۔ زاہد خشک کو چھیڑنا خطرات سے خالی نہیں مجھے اس کا کافی تجربہ ہے۔ غالباً شیطان تمھیں یہاں اس لئے چھوڑ گیا ہے کہ اُس کی زندگی کی ساری عبادت رائگاں کر دو۔

خوبصورت مرد ۔ یہ صحیح ہے کہ جوان صالح جب اپنے راستے سے ہٹتا ہے براہ راست شیطان کی گود میں گرتا ہے۔ اُس کے لئے کوئی درمیانی منزل نہیں، لیکن اُس کی بدمذاقیاں صرف بدصورت عورت سے متاثر ہو سکتی ہیں اگر وہ زہد خشک کو ترک کر سکتا ہے۔ صرف اُسی کی ترغیب سے مگر یہ لغزش زہد خشک سے بھی بدتر ہے اُس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ حسن کی کشش سے متاثر ہو کر لطیف گناہوں میں مبتلا ہو جائے۔ وہ سرتاپا حیوان مطلق ہے۔ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی حیوانیت کے اصرار سے اُس کی ریاضتیں بھی انسانی کیفیات سے محروم ہیں۔

بدصورت عورت ۔ تم دیکھتے ہو یہ لوگ اپنے حسن کے غرور میں تمھاری کس قدر اہانت کر رہے ہیں۔ خوبصورت عورت اس قابل نہیں ہوتی کہ تم ایسا معصوم انسان اُس سے ایک لمحہ کے لئے مخاطب ہو سکے۔ تم کو فوراً یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ تم جس طرف چلو میں تمھارے ہی ساتھ چلوں گی۔ یہ لوگ تمھاری اور میری دونوں کی عقبیٰ برباد کرنا چاہتے ہیں۔

خوبصورت مرد ۔ تم دونوں کی عقبیٰ دنیا ہی میں برباد ہو چکی۔ زاہد خشک کی سیرت اور تمھاری صورت دونوں نے ایک دوسرے ہی کی عقبیٰ نہیں بلکہ ہزاروں نادان انسانوں کی دنیا اور عقبیٰ برباد کر دی ہے۔ تم دونوں کے اثر سے دنیا کی رنگینیوں کو جو صدمہ پہونچا ہے اُس کی سزا جس قدر دی جائے کم ہے۔ زاہد نے دنیا والوں کو یہ دھوکہ دینا چاہا کہ وہ بھی انسان کی ایک قسم ہے۔ تم نے بدنظر اور کثیف سیرت انسانوں کو اس فریب میں

رکھا کہ تم بھی عورت ہو۔ ایسی ہی ابلہ فریبیوں سے تو قدرت شیطان کی کوششوں کو برباد کرتی رہی ہے ورنہ اگر اُس کی تعلیم دنیا پر حاوی ہوگئی ہوتی نہ زہد خشک کی بدتوفیقیاں قائم رہتیں اور نہ بدنما عورتوں کی بے معنی نسوانیت انسانوں کو گمراہیوں میں مبتلا کر سکتی۔ دنیا میں تو جس طرح زندگی گزرنی تھی گزر گئی۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ بدمذاق اور گمراہ انسانوں کے ساتھ یہاں کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اُن کی عقبیٰ اُن کی دنیا سے زیادہ خشک ہوگی یہ یقینی ہے (زاہد خشک سے) میں محض للّٰہیت کی بنا پر تم کو رنگینیوں سے مایوس کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ تمھاری حسرت سے مجھے کیا تعلق ہے۔ تم چاہے دوزخ میں رہو چاہے جنت میں میرا کوئی نقصان نہیں، البتہ تمھارے شباب پر مجھے افسوس آتا ہے کہ دنیا میں بھی محروم سعادت رہا اور یہاں بھی رہے گا۔

زاہد خشک (غور و فکر کے بعد۔ خوبصورت عورت سے) آپ یہاں کہاں رہیں گی۔ جنت میں یا ..... کہاں ؟

خوبصورت عورت۔ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہاں کی تمام جگہیں ابھی میں نے دیکھی نہیں۔ جس جگہ کی فضا لطیف ہو گی وہیں ٹھہر جاؤں گی۔

زاہد خشک۔ یہ کیسے! کیا جزا و سزا پر بھی آپ کو قدرت ہے۔ اس قدر تعلّی تو کسی صورت سے جائز نہیں۔ خدا اس قدر قریب اور آپ یہ باتیں کر رہی ہیں۔ آپ کو کوئی اندیشہ ہی نہیں۔ میں نے اس لئے دریافت کیا تھا کہ آپ اپنے اعمال سے واقف ہونگی۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آپ کو جنت ملے گی یا دوسری جگہ۔ لیکن آپ تو ایسی باتیں کر رہی ہیں گویا سب کچھ آپ ہی کے اختیار میں ہے۔

خوبصورت عورت۔ میں اپنی جنت اپنے ساتھ لائی ہوں۔ مجھے یہاں کی دوزخ و جنت سے کوئی تعلق نہیں۔

زاہد خشک۔ آخر آپ لوگ کس عالم میں ہیں۔ کیا دنیا میں عقبیٰ کو آپ نے اس قدر محو کر دیا تھا کہ آج بھی آپ کو عقبیٰ نظر نہیں آتی۔

خوبصورت مرد۔ صحیح انسان کی دنیا اور عقبیٰ ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں تھی۔ ہماری دنیا ہی ہماری عقبیٰ تھی ہم نے تمھاری طرح دونوں میں کوئی بے معنی امتیاز قائم نہیں رکھا۔ ہم اگر کبھی خائف ہوتے تھے تو دونوں سے اور اگر عیش و نشاط کے عالم میں مسرور ہوتے تھے تو صرف اس خیال سے کہ ہماری زندگی ابدی مسرتوں سے

لبریز ہی۔ ہماری دنیا ہی ہماری جزا تھی۔ تم حساب وکتاب سے پہلے ان حقیقتوں کو سمجھ نہیں سکتے منتظر رہو جزا و سزا کے موقع پر ارباب قضا وقدر کی روش تم کو سب کچھ سمجھا دے گی۔

زاہد خشک ۔ میرے حواس بجا نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ اگر (خوبصورت عورت سے) آپ جنت میں رہتیں میں ملتا اور آپ کی دلچسپ گفتگو سے مسرور ہوا کرتا۔ سنا ہی وہاں نہ کوئی گناہ گناہ رہتا ہی اور نہ کوئی ثواب ثواب۔ اس لئے وہاں کے اعمال کے متعلق جزا و سزا کا بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا۔ جنت میں آپ مجھے جس راہ پر لے جانا چاہتیں میں خوشی سے تیار ہو جاتا

خوبصورت مرد ۔ یعنی گناہ کو آپ صرف اس بنا پر گناہ سمجھتے ہیں کہ اس کی سزا ملتی ہی اور نیکیوں کو صرف اس لئے نیکیاں کہ اس کی جزا دی جاتی ہی۔ اتقا کی یہ خوش فہمیاں قابل داد ہیں! کیا آپ کو یہ یقین ہی کہ آپ کو لامحالہ جنت ہی ملے گی۔

زاہد خشک ۔ یقیناً۔ کیا میں نے اپنی ساری عمر بےکار ضائع کی۔ کیا آج بھی اس کا اجر نہ ملے گا۔

خوبصورت مرد ۔ جو عمر محض امید جزا میں اعمال حسنہ میں ضائع ہوئی اس کا اجر کبھی نہیں ملتا۔ جس عمل کی جزا دنیا ہی میں نہیں ملی عقبیٰ میں کس طرح ملے گی۔ آپ لوگوں کی جماعت بھی ایک مزدوری پیشہ جماعت ہی۔ دل و دماغ بیکار اور مضمحل تخیلات اور تصورات بالکل فرسودہ آپ صرف اسی اجرت کا تخیل قائم کئے ہوئے ہیں جس کا وعدہ بظاہر آپ سے کیا گیا تھا۔ کارکنانِ قدرت آپ کو اس قدر احمق نہیں سمجھتے تھے کہ آپ لفظ بلفظ ان کے وعدوں کا ایفا چاہیں گے ورنہ وعدوں میں احتیاط ملحوظ رکھتے۔ آپ صرف اسی جنت کے قائل ہیں جس کا نقشہ ان مولویوں نے کھینچ دیا تھا جو اپنی تنگ نظری سے جنت کو محض جنت سمجھتے تھے اور دوزخ کو محض دوزخ۔

زاہد خشک ۔ آپ نے اشتعال انگیز جملے کہے ہر لفظ سے کفر و الحاد کی بو آتی ہی لیکن خدا جانے کیوں مجھے اس قدر طیش نہیں آیا جس قدر مذہباً آنا چاہیے۔ ممکن ہی (خوبصورت عورت کی طرف اشارہ کرکے) ان کی موجودگی نے میرے غصہ کو فنا کر دیا ہو۔

خوبصورت عورت ۔ میری ہستی تم ایسے ناقابل خطاب وجود کو متاثر کرنا اپنی اہانت سمجھتی ہی اگر تم مجھ سے کسی طرح متاثر ہوئے

تم نے میری توہین کی۔ تم کو فوراً اس گستاخی کی تلافی کرنی چاہیئے۔

خوبصورت مرد۔ عشق و محبت کے مسئلہ میں زاہد خشک قابلِ عفو ہے۔ اُس کی عمر ہمیشہ محاسن محض میں صرف ہوتی ہے اس لئے وہ محبت کرنا نہیں جانتا۔ اگر کسی کو مضحکہ انگیز تماشا دیکھنا ہے جوان صالح کو کوئی اُس وقت دیکھے جب وہ اتفاقیہ جذبۂ محبت سے لبریز ہو کر کسی محبوبہ سے اظہارِ محبت کرتا ہے۔ اُس کے چہرے کی ہر کیفیت حیوانیت مطلق کے تمام اسرار افشار کر دیتی ہے۔ نہ اُس کی نفسیات کو لطافت بشری سے کوئی تعلق ہے اور نہ اُس کے اظہار میں اُس کی کوئی جھلک۔ اس وقت اگر وہ کسی طرح حسن نسوانی سے متاثر ہو گیا یہ اُس کی عین سعادت ہے گو محض وقتی اور اتفاقی تم اپنے الفاظ سے اُس کو بددل نہ کرو۔ اُس کا طرز ادا قابل معافی ہے۔

زاہد خشک۔ آپ جو چاہے کہیں مجھے اس وقت اشتعال نہیں ہوتا (خوبصورت عورت سے) کیا آپ نے کوئی جادو کر دیا۔ مگر آپ کا جادو شرعاً ناجائز ہے۔ سحر حلال ہرگز نہیں۔ آپ سے متاثر ہونا شاید گناہ کا مرتکب ہونا ہے۔ مگر یہ سب تو دنیا کے لئے تھا۔ بہرحال اگر میں کوئی غیر شرعی کیفیت سے لبریز ہو رہا ہوں خدا میری کیفیات کو معاف کر دے۔

بدصورت عورت۔ خدا رحم کرے آج عمر بھر کی ریاضتیں برباد ہو رہی ہیں۔ یہ محبت نہیں تو کیا ہے (زاہد) سے کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ تم دوزخ کی طرف کھچے جا رہے ہو۔

خوبصورت مرد۔ ریاضتیں تو اُسی وقت برباد ہو گئیں جب زاہد کی فطرت پر تمھاری سیرت و صورت کا پرتو پڑا۔ یہ اُن کی بدتوفیقی ہے کہ اُنھوں نے اسے کبھی محسوس نہیں کیا۔ آج بھی تم یہی کوشش کر رہی ہو کہ تمھارے ساتھ یہ اُسی طرح اپنی جنت کو دوزخ بنا دیں جس طرح دنیا کو بنا چکے ہیں۔ حسن کے برکات کو تم کیا سمجھو حسن کا فرشتہ اگر کسی کو دوزخ میں لے جائے وہ بھی جنت ہو جاتی ہے۔

زاہد خشک۔ مجھے نہیں معلوم۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ بہرحال میں اسی خوبصورت عورت کے ساتھ اپنی عقبیٰ بسر کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دوزخ میں نہ بھیجی جائے گی۔ قدرت ایسے حسن کو جنت ضرور عطا کرے گی خدا اُس کی دنیاوی زندگی کو اپنی رحمت سے معاف کر دے گا۔

خوبصورت مرد۔ تمھاری ازلی بدمذاقی کبھی تم سے علٰحدہ نہیں ہو سکتی۔ تم کو اپنے زہد و اتقا کی فکر کرنی چاہیئے۔ تم یہ دعا کرو

کہ خدا تمھاری بدتوفیقیوں کو اپنے رحم وکرم سے معاف کردے۔ حسن کسی عفو کا متمنی نہیں۔ اُس کی دنیا سرتاپا سعادت تھی اُس کے سلسلہ میں عفو و درگزر کا سوال ہی غیر متعلق ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ حسن فطرتاً گنہگار ہے۔ تمھاری کج فہمیوں کی کوئی انتہا بھی ہے۔ تمھارا طبقہ اگر کسی راز کو سمجھنا بھی چاہے اُس کی تنگ نظری اُسے سمجھنے نہیں دیتی۔ تم نے یہ جملہ قرینہ کا کہا تھا کہ حسن کو جنت ضرور ملے گی لیکن ساتھ ہی تمھارے ذہن میں اُس کی دنیا اور اُس کی گمراہیوں کا وسوسہ پیدا ہوگیا۔ تم کبھی راہ راست پر نہیں آسکتے۔ میں تم سے قطعاً مایوس ہوگیا۔

زاہد خشک (خوبصورت عورت سے) میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان سے متفق ہونگی۔ بہرحال مجھکو ان خیالات سے کوئی تعلق نہیں۔ میں آپ سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو مجھے اپنی فضا میں ساتھ رکھنے میں کوئی تامل تو نہ ہوگا۔

خوبصورت عورت۔ تمھاری دنیا نے مجھے تم سے ہمیشہ کے لئے بدگمان کردیا ہے۔ تمھاری فطرت ازل سے بیگانۂ لطافت ہے۔ تمھارا دل بیگانۂ کشش رہا اور تمھاری نگاہیں بیگانۂ حسن۔ تم صحیح انس ومحبت کے جذبات سے فطرتاً ناآشنا ہو۔ تمھاری محبت میرے حسن کی صحیح قدر نہیں کرسکتی۔ میں اپنے حسن کی تخریب نہیں گوارا کرسکتی نہ میرے حسن کی فضا تمھاری کیفیتوں سے مانوس ہوسکتی ہے اور نہ تمھارے احساسات میرے حسن سے لطف وانبساط حاصل کرسکتے ہیں جو ہستی عمر بھر حسن وکشش سے بیگانہ رہی وہ آج کسی حیثیت سے انس و محبت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ تمھاری دنیا ابد تک تمھاری عقبیٰ کو محصور رکھے گی۔ تم ایک قدم بھی اپنی دنیاوی زندگی سے باہر نہیں نکال سکتے۔ نہ میرا حسن تم ایسے بدنصیب انسانوں پر اپنی تجلی ڈالنا چاہتا ہے اور نہ تم لوگ اُس کی تاب لاسکتے ہو۔ بہتر ہے کہ جو دنیا تم اپنے ساتھ لائے ہو اُسی کو تکمیل تک پہنچاؤ۔ اس کے علاوہ تم اور کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ بھی ایک فطری مجبوری ہے۔ آج اگر تم حسن کے قائل ہوگئے ہو تمھارے لئے حوریں کافی ہونگی۔ تم نے انھیں کی حرص میں دنیاوی رنگینیوں سے پرہیز کیا تھا۔ آج وہ تمھارا پرجوش استقبال کریں گی۔ اُن کے لئے تم ایک دلچسپ تماشا ہوگے وہ انسان سے بے خبر ہیں اس لئے وہ تم ایسے لوگوں میں اور میرے خوش مذاق اور خوبصورت چاہنے والوں میں

کوئی امتیاز نہیں کر سکتیں وہ تمہاری محبت کی بھی قدر کرینگی۔ لیکن میں! ہرگز نہیں! یہ تمہاری گستاخی تھی کہ تم نے اس بے باکی سے مجھ سے لطف و محبت کا اظہار کیا۔ میرے حسن و شباب کی دل فریب دنیا میں تم ایسے قدم نہیں رکھ سکتے۔ دنیا میں تم نے حسن کی ہر ممکن توہین کی۔ مجھے کشش مہلک سمجھکر تم نے لوگوں کو ہمیشہ مجھ سے احتیاط و پرہیز کی تعلیم دی۔ میرے حسن کو تم نے گناہ کبیرہ کا محرک قرار دیا۔ آج تم مجھ سے قربت چاہتے ہو۔ کیا تم اپنی دنیا کو بھلا نہیں رہی ہو۔ جس سے تم عمر بھر شرعی محبت کرتے رہے آج بھی تم کو اسی سے محبت کرنی پڑے گی۔ تم اپنے ہر عمل کا اجر چاہتے تھے کیا انصاف کا یہ تقاضا نہیں کہ تمھیں شرعی محبت کا یہی اجر دیا جائے۔

خوبصورت مرد۔ تم نے شاید محسوس نہ کیا ہو۔ تمہارے حساب و کتاب کی یہ حقیقی منزل ہے۔ تمھیں اپنی سزا اور اپنی جزا پر قانع ہوجانا چاہئے۔ تمہارا حشر جو ہونا تھا اسی وقت ہو گیا۔

زاہد خشک (خوبصورت عورت سے) اگر میں اپنے ماضی سے تائب ہوجاؤں کیا حال اور مستقبل آپ کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا۔

خوبصورت عورت۔ میں قطعاً غیر ذمہ دار ہوں۔ میرے ہاتھوں کچھ محفوظ نہیں۔ نہ حال اور نہ مستقبل، میرا حسن کوئی معاہدہ نہیں کرتا۔ اگر مجھ سے کوئی معاہدہ چاہتا ہے میں اسے بھی توہین سمجھتی ہوں۔ ہر شخص کو میرے حسن اور میری رنگینیوں پر عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ اُس کا ہر انداز ایفاء عہد اور عہد شکنی کی سطح سے بلند تر ہے حسن اپنے ہر معاہدہ کو توڑ سکتا ہے اُس کے لئے لایعنی اخلاق و رسوم کی کوئی بندش نہیں۔

خوبصورت مرد۔ اس کے علاوہ تم کسی طرح اپنے ماضی سے تائب نہیں ہو سکتے۔ کوئی ہستی اپنے ماضی سے تائب نہیں ہو سکتی۔ یہ فطرتاً محال ہے۔

خوبصورت عورت۔ مگر بے کار تم پر یہ حقیقتیں ضائع کی جارہی ہیں۔ جس راز سے تم عمر بھر بے خبر رہے اُسے آج کسی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ تم یہ گمان نہ کرنا کہ میں نے غیظ و غضب میں تمہاری تنبیہ کی ہے۔ اس کی بھی اُمید نہ رکھو کہ رحم و کرم سے میں تمہاری بد توفیقیوں کو نظر انداز کردوں گی اور تم کو اس کی اجازت دیدونگی کہ میری جنت میں رہو۔ حسن غیظ و غضب اور رحم و کرم کے جذبات سے بالاتر ہے۔ اُس کا ہر انداز

رحم بھی ہے اور غضب بھی۔ تم ان تمام رموز سے بے خبر ہو۔ تمھارے لئے کوئی اطمینان نہیں۔ تم کو میرے حسن سے قطعاً ناامید ہو جانا چاہئے۔

بدصورت عورت (مسکراتے ہوئے) یہ غیر شرعی محبت کی ابتدائی منزل ہے۔ پہلی سزا آج اس نفرت کے ساتھ دی گئی۔

خوبصورت مرد۔ یہی سزا آخری بھی ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ زاہد کی بدتوفیقیوں کی کوئی شدید تر سزا دی جا سکتی تھی۔ میرے نزدیک تو یہی سزا شدید ترین ہے۔

زاہد خشک۔ کیا میں کسی صورت سے اپنی دنیاوی محرومیوں کی تلافی نہیں کر سکتا۔

خوبصورت مرد۔ تم نے ہمیشہ عقبیٰ کو دنیا پر ترجیح دی تم میں دنیاوی حقائق میں گم ہو جانے کی صلاحیت ہی نہیں تھی اس لئے تم ہر لحہ اعمال اور اجر اعمال کے معمہ میں اُلجھے رہے۔ تم منطقی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ نادانوں کا گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ انسان منطق کے ذریعہ سے نہیں بلکہ احساسات لطیف کی برکتوں سے اپنی زندگی میں ازلی اور ابدی سعادتیں پیدا کر سکتا ہے۔ منطقی اصول سرور و کیفیت نہیں پیدا کر سکتے۔ زندگی کی لطافتیں آئین و اصول کی پابند نہیں۔ تم دنیا کو بھی غلط سمجھے اور عقبیٰ کو بھی آج تم اُسی طرح غیر مطمئن ہو جس طرح کل تھے تم کو کبھی اپنی روش پر اعتماد نہ تھا اس لئے نہ آج پیدا ہو سکتا ہے اور نہ کل ہوگا۔ تم جو کچھ مذہب کے لئے کرتے تھے وہ دل سے نہیں بلکہ محض دماغ سے تم ہمیشہ اپنے اعمال سے جھجکتے رہے۔ تمھارا دل اگر تمھارے دماغ کے ساتھ ہوتا خود تمھاری ریاضتیں معنوی لطافت پیدا کر لیتیں تمھارے اعمال حسنہ بھی تمھاری فطری اور اخلاقی مجبوریوں کا نتیجہ تھے۔ تمھاری دنیا تذبذب و انتشار میں گزری۔ اجر اعمال کا وسوسہ تمھیں مضطرب کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی تم اپنے اجر سے خائف ہو ورنہ اس مضطربانہ انداز سے حسن کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش نہ کرتے۔ محرومیوں کی تلافی کیسی؟ دنیا کی تلافی عقبیٰ میں نہیں کی جا سکتی اس کی اب کوئی صورت نہیں رہی۔ تم نے توبہ کی تمام راہیں خود اپنے ہاتھوں دنیا ہی میں مسدود کر دی تھیں۔

(زاہد یاس مجسم بن گیا اُس کی خاموشی اُس کے ہیجان اضطراب کی عبرت انگیز تصویر پیش کرتی ہے)

خوبصورت عورت ۔ اگر یہ جذبۂ ندامت ہے خدا تمھارے زہد و اتقا کو اپنی رحمت سے معاف کر دے گا ۔

صوفی کے ساتھ ایک خوبصورت عورت آ رہی ہے اُس کی دلآویزیوں میں وہ کشش نہیں جو اُس کی عمر کے لحاظ سے ہونی چاہیئے ۔ وہ تقریباً بیس بائیس سال کی ہوگی، اُس کے چہرے سے نیکیوں کی متانت خاص طور پر نمایاں ہے جس نے حسن کی فطری شگفتگی پر پردہ ڈال دیا ہے ۔ زندہ دلی سے وہ ایک حد تک محروم ہو چکی ہے ۔ اُس کی آنکھوں سے یہ ظاہر ہے ۔ وہ آتے ہی زاہد سے نہایت اشتیاق کے ساتھ مخاطب ہو گئی ۔

متقی عورت ۔ آپ اس گروہ میں کہاں ! اس وقت تو آپ کو کہیں جنت کے قریب ہونا چاہیئے ۔ آج کی جزائیں آپ ہی کی سی بزرگ ہستیوں کے لئے ہیں ۔ آج آپ کو موعودہ جنت ملے گی جس کی تمنا میں آپ نے دنیا میں اس قدر ایثار و قربانی کی تھی ۔ ہزاروں انسانوں کی عقبیٰ آپ کی دستگیری سے بن گئی ۔ آپ کی نفس کشی ضرب المثل تھی ۔ آپ ہی کی شب بیداریاں تھیں جنھوں نے بہت سے گمراہ انسانوں کو باایمان بنا دیا ۔

زاہدِ خشک ۔ آپ کو میں نہیں پہچانتا ۔ آپ کی مذہبی گفتگو البتہ تسکین دہ ہے ۔ معلوم ہوتا ہے آپ کبھی راہِ راست سے منحرف نہیں ہوئیں ۔ مجھے آپ سے مل کر مسرت ہوئی ۔

متقی عورت ۔ آپ مجھے بھول گئے ! میرا مکان آپ کے حجرے سے ملا ہوا تھا ۔ اکثر راتوں کو آپ کی آواز میرے کانوں میں آیا کرتی تھی ۔ مجھے آپ کی ریاضتوں سے عبرت حاصل ہوئی ۔ روحانیت رفتہ رفتہ مجھ پر غالب آگئی ۔ یہاں تک کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دنیاوی مسرتوں کو ترک کر کے باخدا بن جاؤں ۔ لیکن وہ شخص جو شرعاً میری زندگی کا مالک بنا دیا گیا تھا نہ سزا کا قائل تھا اور نہ جزا کا ....

خوبصورت مرد ۔ دنیاوی مسرتوں کو ترک کرنے کے بعد جو کچھ ملتا ہے وہ خدا ہرگز نہیں ہوتا ۔ خدا کو اس قدر محدود اور محصور سمجھنا کہ مسرت میں نہیں محض رنج و الم کی فضا میں وہ تلاش کیا جا سکتا ہے تنگ نظری ہی نہیں صریحی گمراہی ہے ۔ خدا اگر لذات میں نہیں تو ترکِ لذات میں یقیناً نہیں ہو سکتا ۔ ترکِ دنیا حصولِ عقبیٰ کا ذریعہ ہرگز نہیں نادان اور تنگ نظر ہستیاں الوہیت کی وسعتوں سے ہمیشہ ناآشنا رہیں ۔ وہ خدا سے

فرانس مارک — ہرن

بیگانہ ہوکر جزوِ خدا کی فکر میں رہتی ہیں۔ اُن کی بدنصیبیوں کا یہی راز ہے۔

زاہد (متقی عورت سے) آپ یہ گمراہ کُن فلسفہ نہ سنئے۔ مجھے آپ کی زندگی سے انس پیدا ہو چلا ہے آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔

متقی عورت۔ مجھے ان کی گفتگو غیر مانوس نہیں معلوم ہوئی۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ ایسی ہی باتیں میں نے اپنے شرعی حاکم سے بارہا سنیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے روکنا چاہتا تھا۔ اُس کی تعلیم یہ تھی کہ خوبصورت عورت کے لئے زہد و اتقا کسی طرح موزوں نہیں۔ اُس سے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں برباد ہو جاتے ہیں چہرہ پژمردہ ہو جاتا ہے اور شباب مضمحل۔ مجھ پر چونکہ جذبۂ ایمانی مسلط ہو چکا تھا میں نے اُس کی پروا نہ کی اور عبادت و ریاضت میں منہمک ہو گئی۔ لیکن خدا جانے اُس کی کیا مصلحت تھی میری مذہبی زندگی کو دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ موت کے فرشتے نے مجھے اُٹھا لیا۔

خوبصورت مرد۔ اُس کو تمہارے حسن و شباب پر ترس آیا ہوگا وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری رنگینیاں برباد ہوں تمہیں اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا۔ البتہ مجھے اُس کی اس حرکت پر تعجب ضرور ہے۔ وہ انتہائی طور پر بد مذاق واقع ہوا ہے۔ اُسے کبھی حسن سے کوئی ہمدردی نہیں اکثر وہ حسین انسانوں کو عمرِ طبعی تک زندہ رکھتا ہے۔ صرف اس غرض سے کہ حسن مہیب اور خطرناک صورت میں بدل جائے۔ مجھے حیرت یہ ہے کہ تمہارے لئے وہ اس قدر خوش مذاق کس طرح بن گیا۔

متقی عورت۔ میرے شوہر کا اندازہ بالکل یہی تھا وہ حسن کو ہمیشہ مذہب پر ترجیح دیتا تھا آج اُس کو اپنے فلسفہ کی سزا ملے گی۔

صوفی۔ حسن کو مذہب پر ترجیح دینا کوئی گناہ نہیں۔ اس سے انسان مذہبی دائرہ سے باہر نہیں نکلتا۔ میری اصلاح میں اس روش کو طریقت کہتے ہیں (خوبصورت مرد سے) آپ بھی غالباً صوفی ہیں۔

خوبصورت مرد۔ قطعاً نہیں۔ میں صحیح معنوں میں حسن پرست ہوں یعنی میں کبھی حسن کو تلاش نہیں کرتا۔ اگر کرتا بھی ہوں اُن غیر دلچسپ لایعنی اور گمراہ کُن ذرائع سے نہیں جن میں آپ کا گروہ اپنی بد مذاقیوں اور بد توفیقیوں کی وجہ سے مبتلا ہے۔ میں ہر حسن کو حقیقت سمجھتا ہوں۔ آپ لوگ اُسے محض مجاز سمجھکر اُس کی حقیقتوں کو

بھول جاتے ہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ حسن کوئی پردہ نہیں وہ ایک کھلا ہوا راز ہے۔ وہ خود ہی حقیقت ہے اُس کی
تہ میں کوئی دوسری حقیقت نہیں۔ آپ اُسے پردہ سمجھکر گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر آپکے ذرائع!
مہمل ہی نہیں تنگ نظری اور غلط فہمی کی ایک مستقل کائنات ہیں جسن کی حقیقتیں اُن ذرائع سے نہیں مل سکتیں
جن کو آپ کے بدمذاق طبقہ نے اختیار کر رکھا ہے۔

زاہد ۔ حسن! محبت!! ان الفاظ سے نہ میرا دل آشنا ہے نہ دماغ۔ میرے خیالات اس قدر منتشر ہو رہے ہیں کہ
میری سمجھ میں نہ حال آتا ہے اور نہ مستقبل (متقی عورت سے) غالباً میرا اور تمہارا ایک حشر ہو۔ یہ میری
خوش نصیبی ہے کہ تم حسین بھی ہو اور متقی بھی۔ تمہارا حسن حقیقتہً شرعی حسن ہے۔ مجھ میں اور تم میں اتقا صفت
مشترک ہے، یہی ہم دونوں کو شاید یہاں متحد رکھے۔

خوبصورت مرد ۔ اتقا ممکن ہے مشترک ہو لیکن انسانیت مشترک نہیں۔ ان کے اتقا کی تلافی حسن ونسوانیت نے کر دی
لیکن تمہارے اتقا کی محرومیوں کی تلافی نہیں کی جاسکتی۔ تم دونوں کا حشر ایک نہیں ہو سکتا۔

خوبصورت عورت ۔ زاہد حرص وطمع کی ایک دنیا اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ رکھتا ہے مجھے دیکھتے ہی وہ بدحواس ہو گیا تھا۔
میں نے اُس کو اُس کی حقیقت سمجھا دی تو اب دوسرے حسن پر حریصانہ نگاہیں ڈالنا چاہتا ہے تصوف
کی طرح شاید زہد و اتقا بھی ریاکاریوں کا محض ایک پردہ ہے جسے حسن کا ایک اشارہ اُلٹ دیتا ہے۔

متقی عورت (خوبصورت عورت سے) تم نے دنیا میں عمر بھر عصمت وعفت کی تضحیک وتحقیر کی نہ تم کو مذہب واخلاق کا
ڈر تھا نہ خدا اور اُس کے فرشتوں کا۔ تمہاری لغزشوں نے تمہاری روح کو بھی فنا کر دیا تھا۔ تم نے
اپنے حسن سے ہزاروں نادان انسانوں کو گمراہ کیا۔ کیا آج بھی تمہارا وہی انداز قائم رہے گا زاہد کو
بھی تم آج اُسی طرح گمراہ کرنا چاہتی ہو جس طرح دنیا میں تم نے میرے شوہر کو گمراہ کر دیا تھا تمہارے
لایعنی حسن کی ابلہ فریبیوں نے اُس کو اس قدر آوارہ خیال بنا دیا تھا کہ وہ حسن ہی کو مذہب واخلاق
سمجھتا تھا۔ اُس کے نزدیک نہ کوئی گناہ گناہ تھا اور نہ کوئی جرم جرم۔ وہ اتقا کو مخرب اخلاق کہتا تھا۔
اسی لئے اُس نے مجھے میرے مذہبی رجحانات سے باز رکھنا چاہا مگر میں ایسی گمراہ نہ تھی۔ میں نے
اُس ناعاقبت اندیش کے فلسفہ کی ذرا بھی پروا نہ کی اور اُن بندشوں کو میں نے فوراً توڑ دیا جو میری

عبادت و ریاضت میں موانع پیدا کر رہی تھیں۔ آج بھی جب تک میں جنت میں داخل نہ ہو جاؤں گی اُس کے چہرے پر نظر نہ کروں گی اُس کے تبسم سے کفر و الحاد برستا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم کو اپنے حسن و شباب کی قدر اُس وقت معلوم ہوئی ہو گی جب اُس نے تم سے محبت کا اظہار کیا تھا یہ اُسی کے زہر آگیں تخیلات کا نتیجہ ہے کہ تمھارا دل و دماغ بھی اُن رنگینیوں سے لبریز ہو گیا جن کو میں انتہائی شیطنت سے تعبیر کرتی ہوں۔

خوبصورت مرد۔ غیظ و غضب سے چہرہ بد نما ہو جاتا ہے تم کو اتنا بھی احساس نہیں کہ خوبصورت انسان کا فرض اولین دل و دماغ کو ان محسوسات سے پاک رکھنا ہے جن سے صورت کی دلاویزیاں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر جب تم نے دنیا میں اس کا لحاظ نہ رکھا آج کس طرح رکھ سکتی ہو۔

متقی عورت (حیرت سے) میں نے تمھیں اب پہچانا۔ کیا یہاں بھی تم اس عجیب الفطرت عورت کا ساتھ نہ چھوڑو گے کیا اس کے ساتھ تم بھی اُن مصائب میں مبتلا ہونا چاہتے ہو جس میں یہ مبتلا ہونے والی ہے۔ اسی کے خطرناک حسن نے تمھاری دنیا برباد کی۔ کیا تم نے اسے اختیار دے دیا ہے کہ اُسی طرح تمھاری عقبیٰ کو بھی برباد کر دے۔

خوبصورت مرد۔ دنیاوی رسوم و قیود نے مجھے تم سے وابستہ کر دیا تھا۔ مذہب و اخلاق کی قیودِ بے جا نے مجھے مجبور کر دینا چاہا تھا کہ میں اپنے تخیل کی وسعتوں اور احساسات کی نیرنگیوں کو تم پر قربان کر دوں لیکن میں اس پر آمادہ نہ تھا میری فطرت اُن تمام قوانین سے بغاوت کرنا چاہتی تھی جو جماعت کے اغراض مجھ پر عائد کرنا چاہتے تھے۔ میں صحیح فطرت لے کر دنیا میں گیا تھا لطیف سے لطیف ہستی اگر مجھ پر مسلط کر دی جاتی میں محض اس بنا پر اُس سے متنفر ہو جاتا کہ مجھے مجبور کیا جا رہا ہے۔ جبر کو آتش جہنم سے تعبیر کرتا ہوں اگر آج میں جنت جانے پر بھی مجبور کر دیا جاؤں ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے مسرت نہیں ہو سکتی ایسی جنت میری فطرت کے لئے جہنم سے بدتر ثابت ہو گی جب میرے دل و دماغ کا یہ عالم ہے دنیاوی مراسم مجھے تم سے معناً متحد نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک غیر حقیقی بندش تھی جو دنیا ہی میں ختم ہو گئی۔ اُس کے برعکس اس پیکرِ لطیف سے مجھے حقیقی انس تھا۔ اس بندش کو نہ میں توڑنا چاہتا تھا نہ آسانی سے توڑ سکتا تھا اس نے میری دنیا کو دلچسپ بنا دیا ہے عقبیٰ بھی اس کی نیرنگ مزاجیوں سے دلچسپ ہو جائے گی۔ دیکھوں آج

ارباب قضا و قدر تمہارا کیا حشر کریں۔ میں کسی طرح تمہارا پابند نہیں اور نہ تم میرے پابند ہو۔

زاہد خشک۔ آپ کے دنیاوی تعلقات یوں ختم ہو گئے۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ میری جنت کو اپنے حسن سے معمور کر دیں۔ میں اور آپ دونوں حمد و تسبیح کے دلچسپ مشاغل میں وقت عزیز صرف کیا کریں گے۔

خوبصورت مرد۔ آپ کو کیا عمر بھر کی ریاضتوں کا صلہ صرف یہی ملے گا کہ آپ کوثر سے وضو کریں اور ہر وقت سر بسجود رہیں۔ یعنی آپ انسان سے فرشتہ ہونے والے ہیں یہ جزا ہے یا سزا؟ شاید آپ نے اس مسئلہ پر غور نہیں کیا۔

زاہد خشک۔ میں نے غور کیا یا نہیں کیا۔ تم کو کوئی تعلق نہیں اب جب تم اس کا اعلان کر چکے ہو کہ تم سے اس خوبصورت عورت سے کوئی واسطہ نہیں میں صاف طور پر کہتا ہوں کہ ہم دونوں عبادت بھی کریں گے اور محبت بھی۔ یہ حسن متقی میرے زہد پر مسلّط ہو گیا ہے۔ میں اس سے ضرور محبت کروں گا۔

خوبصورت عورت۔ واقعی آپ سے زیادہ صحیح محبت کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اب تک یہ جذبہ یتیم تھا اُسے دنیا میں کوئی انسان ایسا نہ ملا جو اس شفقت کے ساتھ اُس کی پرورش کرتا۔ آپ کا دل و دماغ اُس کے لئے بہترین گہوارہ ہے (متقی عورت سے) تو تمہارے حسن کو آج تمہارے اتقا کی جزا مل گئی۔ اس طرح کا خوش مذاق محبت کرنے والا دنیا میں کسی محبوب کو نہیں ملا۔ تمھیں تمہاری عقبیٰ کی کامیابی مبارک ہو۔

متقی عورت۔ خدا تم کو اس طنز کی سزا دے۔ تمہارے نزدیک تو خوش مذاق محبت والا اُس گمراہ انسان کو کہتے ہیں جو مذہب و ملت کو بھی تمہارے حسن پر قربان کر دے۔ تم کو نہیں معلوم کہ ایسی خدا ناشناس محبت قطعاً حرام ہے تم تو اُس شخص کو خوش مذاق سمجھتی ہو جو نہ صوم و صلوٰۃ کا قائل ہو اور نہ لوث و بے لوثی کا۔ تمہاری عشوہ طرازیاں ہی اُس کا مذہب ہے۔ اور تمہاری بے باکیاں ہی اُس کا اخلاق۔ ایسا ہی عشق حرام قرار دیا جا چکا ہے۔

زاہد خشک۔ حرام مطلق۔ جب فرائض کا وقت آجائے اُس کے قبل محبوب کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے اور اُس وقت تک اُس کے حسن و محبت کو ذہن میں نہ لانا چاہیئے۔ جب تک سلام کے بعد دعا و مناجات ختم نہ ہو جائے۔

خوبصورت مرد۔ آپ جس جذبہ کو شرعی محبت کہا کرتے ہیں اُس کے حدود یہی ہیں! دنیاوی کاروبار اور عشق و محبت میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہیںا اوقات طعام کی طرح اوقات محبت بھی معین ہیں؟ سوتے وقت دعا پڑھنے کے بعد

صرف نیند آنی چاہیئے۔ محبوب کے خیال کو مداخلت بے جا کا کوئی حق نہیں۔

متقی عورت۔ آپ میں آج یہ رنگینیاں کہاں سے آئیں۔ کاش دنیا میں مجھ سے آپ نے یہ جملے کہے ہوتے اُس وقت تو آپ نے مجھے اس طرح مایوس کر دیا گویا میں آپ کے ایمان کو غارت کرنا چاہتی تھی۔ آپ کے الفاظ کا مفہوم یہی تھا کہ میرا حسن آپ کے زہد و اتقا کا دشمن ہے جب میرے شوہر نے مجھے میرے مذہبی مشاغل سے روکنا چاہا میں آپ کے پاس گئی کہ میری رہبری کیجئے۔ لیکن آپ میں اتنی بھی خدا ترسی نہ تھی کہ آپ مجھے کوئی مشورہ دیتے۔ آپ مجھ سے صرف اس لئے خائف تھے کہ میں حسین ہوں۔ مجبوراً میں صوفی کی طرف بڑھی اُس نے میری تشفی کی وہ میرے حسن کو سمجھتا ہے لیکن آپ آج تک نہ سمجھے۔ میں مجبور ہوں کہ اُسی کے ساتھ رہوں جو رازدارِ حسن ہے۔

صوفی ۔ تمھارے ان مبہم الفاظ سے میرے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں تمھیں اس کی تصریح کر دینی چاہئے تھی کہ میری محبت کا باعث یہ نہیں تھا کہ تم عورت ہو بلکہ محض اس بنا پر میں تم سے محبت کرتا تھا کہ تمھارے حسن میں حسن حقیقی کی جھلک تھی۔

متقی عورت۔ آپ کی محبت کی بنا معرضِ بحث میں نہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ آپ مجھ سے کیوں محبت کرتے تھے میرے لئے صرف یہی کافی تھا کہ مجھ سے آپ کو محبت تھی۔

خوبصورت مرد۔ تم کو تو یہ دعوے تھا کہ تم نے دنیاوی مسرتوں کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔ تم حسن و محبت کو زہد و اتقا کا دشمن سمجھتی تھیں۔ بارہا تم نے مجھ سے یہی کہا۔ لیکن آج میں تمھاری ہی زبان سے یہ سن رہا ہوں کہ تم تلاشِ محبت میں نکلی تھیں اور صوفی کو بالآخر تم نے مسحور کر لیا۔ کیا نسوانی ریاکاریوں کی یہ ایک مثال نہیں حقیقت یہ ہے کہ عموماً عورتیں خود اپنی فطرت کے رموز سے ناآشنا رہتی ہیں ورنہ یوں گمراہیوں میں مبتلا نہ ہوجایا کریں۔ عورتوں کے دینی اور دنیوی فرائض محض اُن کی نسوانیت سے وابستہ ہیں۔ تمھارا فرض صرف یہ تھا کہ تم ہمیشہ عورت رہو۔ لیکن تمھاری کج فہمیاں تم کو عصمت و اتقا کی طرف لے گئیں متقی بن کر تم اپنے جذبۂ نسوانیت کو جھٹلانا چاہتی تھیں نتیجہ کیا ہوا۔ تمھاری نسوانیت نے تمھارے اتقا کو جھٹلا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری شب بیداریوں میں وظیفہ و نماز سے زیادہ صوفی کی محبت کا دخل تھا۔

متقی عورت ۔ ہرگز نہیں۔ تم حسن و شباب کے رازدار نہ بنے ہو۔ اس عورت کی محبت میں تم نے اپنی عمر ضائع کی لیکن تمھیں آج تک یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ عورت متقی ہو کر کچھ فرشتہ نہیں ہو جاتی وہ بہر حال عورت رہتی ہے محبت کے جذبات اُس کے دل میں بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ پاک محبت کرنا چاہتی ہے۔ گمراہ عورتوں کی طرح وہ عصمت فروشی کو محبت نہیں سمجھتی۔ وہ جذبۂ نسوانیت کو لغزشوں سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔

خوبصورت مرد ۔ کوئی عورت اپنے جذبۂ نسوانیت کو لغزشوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ میرے خیال میں اسے رکھنا بھی نہ چاہئے۔ حقیقی نسوانیت کا راز انھیں لطیف لغزشوں میں مضمر ہے۔ پاک محبت کی حقیقت بھی مجھے معلوم ہے الفاظ کی یہ محض ایک ریاکارانہ بندش ہے جو خود محبت کرنے والے کو اپنے متعلق دھوکے میں ڈال دیتی ہے وہ صرف دوسروں کو دھوکہ دینے کے لئے اپنی محبت کو بے لوث نہیں کہتا ہے بلکہ اکثر وہ خود بھی اپنی محبت کو مقدس اور معصوم سمجھتا ہے۔ یہ سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ مرد ممکن ہے کبھی بے لوث محبت کر سکے وہ بھی اُس صورت میں جب محال ممکن ہو جائے لیکن عورت کبھی پاک محبت نہیں کر سکتی خود اُس کی فطرت ایسی محبت کی قائل نہیں۔ اُسے بے لوث محبت کرنے کا فطرتاً کوئی حق ہی نہیں۔ عورت اگر پاک محبت کرنا چاہتی ہے وہ مصالح کائنات اور اپنی نسوانیت دونوں کو جھٹلاتی ہے۔

خوبصورت عورت ۔ اس عورت نے اپنی بدطینتی سے مجھ پر بھی حملہ کیا ہے۔ وہ مجھے عصمت فروش کہتی ہے (متقی عورت سے) مجھے تمھاری جہالت پر افسوس آتا ہے۔ میں تمھیں اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ تم سے نفرت کروں تم نہ حسن کو سمجھتی ہو اور نہ عصمت و عفت کو۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں اور نہایت بے باکی سے صحیح راستے پر چلتی رہی۔ حسن و شباب کی رنگینیوں میں محو ہو جانا عورت کا حقیقی فرض ہے یہی اُس کی عصمت ہے اور یہی اُس کی عفت۔ عصمت فروشی تو یہ ہے کہ ایک حسین عورت ایک بدصورت مرد سے محبت کرے اور اپنے رازِ حسن کو ایک ناآشنائے راز پر رائگاں کر دے۔ ایک کریہہ المنظر انسان کو خوبصورت انسان سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں اگر کوئی خوبصورت عورت بدصورت مرد سے محبت کرتی ہے یا اُسے محبت کرنے دیتی ہے وہ صریحی طور پر عصمت فروشی کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اعمال جو رنگینیوں سے محروم ہوں اور وہ نیکیاں جن سے خیالات اور حرکات کی لطافتیں فنا ہو جائیں ایک حسین عورت کے لئے قطعاً

ممنوع ہیں۔ عصمت شکن تو وہ اعمال ہیں جو حسن و شباب کے دشمن ہوں۔ صوفی سے تمھاری محبت اور تمھارا یہ غیر دلچسپ زہد و اتقا دونوں نے ہمیں ہمیشہ کے لئے بے عصمت کر دیا ہے۔

متقی عورت
بدصورت عورت } خدا تم کو ان گمراہیوں کی سزا دے۔

صوفی ۔ اس میں بھی شاید کوئی حقیقت ہے۔

زاہد خشک ۔ حقیقت نہیں صریحی کفر اور صریحی شرک ۔

خوبصورت مرد (زاہد سے) ان حقائق پر تمھارا جاہلانہ استعجاب قابل افسوس ہے۔ تم یہ نہیں سمجھتے کہ عورتوں کی عصمت و عفت کے معیار کو مذہب و اخلاق کے فرسودہ قوانین میں نہیں بلکہ نسوانیت کے فطری فرائض اور حسن و محبت کی رنگینیوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ عصمت و بے عصمتی کو نہ تم سمجھ سکتے ہو اور نہ یہ گمراہ عورتیں۔ یہ بدصورت عورت تو محض بدصورتی کو عورتوں کی بہترین صفت سمجھتی ہے۔ یہ معذور بھی ہے۔ فطرت نے اُس کے جسم اور اُس کی روح دونوں کو محرومِ حسن رکھا ہے لیکن یہ خوبصورت عورت۔ مجھے اس کی بدبختیوں پر ہمیشہ افسوس رہے گا۔ اس نے اپنے حسن اور اپنی نسوانیت دونوں کو گمراہ کر دیا

زاہد خشک ۔ نعوذ باللہ ۔

[دفعتاً شیطان نمودار ہو گیا۔ زاہد خاموش ہو گیا
شیطان زاہد سے مخاطب ہو گیا]

شیطان ۔ آپ نے مجھے یاد کیا۔ میں آپ کے اخلاقِ کریمانہ کا مشکور ہوں۔ آج آپ نے اس خوبصورت اور خوش مذاق عورت کی سحر طراز گفتگو سنی آپ کی روح میں لطیف کیفیتیں پیدا ہو گئی ہونگی۔ دنیا میں آپ کو ایسے دلچسپ مواقع کبھی نہیں ملے۔

زاہد خشک ۔ معاذ اللہ۔ اس عورت نے ابھی جو کچھ کہا وہ صریحی کفر و الحاد تھا۔ میں نے دنیا میں کبھی اسے برداشت نہیں کیا۔ لیکن اس عورت کی زبان میں معلوم نہیں کیا سحر ہے کہ اُس کی گفتگو نے میرے مزاج میں وہ اگلی سی برہمی پیدا نہیں کی۔ حسن واقعی کیا کوئی جادو ہے ؟

خوبصورت مرد۔ جادو ہے مگر اس قدر بلند کہ تم اس کی زد میں نہیں آسکتے۔ یہ تمھاری بدقسمتی ہے کہ وہ تم پر نہیں چل سکتا۔

خوبصورت عورت۔ حسن اس قدر ذلّت پسند نہیں کہ بدصورت اور بدمذاق انسانوں کو مسحور کرنا چاہے۔

صوفی۔ کیا یہ اشارہ میری طرف بھی ہے۔ میں تو کچھ ایسا بدصورت نہیں۔

متقی عورت۔ تم کو اس گمراہ عورت کی ہرزہ سرائیوں سے کیا واسطہ وہ تم سے متنفر ہو لیکن میں تو نہیں ہوں۔

صوفی۔ تمھارے حسن میں کوئی راز نہیں۔ تمھارے خیالات نہایت سطحی اور تمھاری گفتگو نہایت غیر دلچسپ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ عورت تم سے زیادہ حسین ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے حسن میں وہ حقیقتیں مضمر ہیں جن کی جستجو میں میں عمر بھر پھرتا رہا لیکن مجھے نہ ملیں۔ وہ سرتاپا موسیقی ہے اس کے ترنّم نے مجھ پر حسن کے تمام رموز افشا کر دیئے۔ تمھارا حسن میرے لئے محض ایک فریبِ نظر تھا۔ تمھارا مجاز خوبصورت ہے مگر تمھاری حقیقت ہرگز خوبصورت نہیں۔

خوبصورت مرد۔ تمھارے لئے اس عورت کا صحیح حسن بھی باعث تشفی نہیں ہو سکتا۔ تم نسوانیت کے رموز لطیف سے عمر بھر نا آشنا رہے۔ تم میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ حسن نسوانی کے رازدار بن سکو۔ یہ صحیح ہے کہ یہ متقی عورت ابھی تم جس سے مایوس ہو چکے ہو اپنے اتقا کی وجہ سے نسوانیت کی ایک مستقل تردید ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تمھاری یہ شکایت کہ وہ ایک فریب نظر تھی تمھاری نادانیوں کا مکمل ثبوت ہے عورت نہ کوئی سحر جسمانی ہے اور نہ کشش روحانی۔ وہ مرد کی شباب آلودہ نگاہوں کا محض ایک فریب نظر اور اس کے مخمور دماغ کا محض ایک فریب تصور ہے۔

صوفی۔ جو کچھ ہو۔ مجھے اس کے حسن میں حقیقت نظر آتی ہے۔ لیکن میں اس متقی عورت سے قطعاً مایوس ہو گیا۔

خوبصورت عورت۔ میں آپ کی حقیقت شناسی اور حسن پرستی کی داد دیتی ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرا حسن آپ سے مانوس نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھ سے ہمیشہ بے نیاز رہے آپ نے حقیقت کو محض سطحیات میں تلاش کرنا چاہا صرف محفل سماع خوبصورت گانے والوں اور لذیذ غذاؤں میں تلاش کیا۔ یہ میں نہیں کہتی کہ آپ کو حسنِ نسوانی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ آپ عورتوں سے محبت کرتے تھے لیکن ریاکاریوں کے ساتھ اخلاقی رسوم کی بنا پر آپ ان سے بظاہر متنفر رہتے تھے۔ آپ کو یہ نہیں معلوم کہ حسن ایک بزدل

اور ریاکار محبت کرنے والے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ نے کسی حسن کی بے تابانہ پرستش نہیں کی۔ آپ ایسے اخلاقی جرم سمجھتے تھے اس لئے آپ نے اپنی حسن پرستیوں پر مذہب کا پردہ ڈالنا چاہا۔ میں آپ کے ساتھ اپنی عقبیٰ کو رائگاں کرنا نہیں چاہتی۔

متقی عورت (صوفی سے) ایسی عورتیں متقی محبت کرنے والوں کے لئے ایک مستقل سزا ہوتی ہیں۔ میں خوش ہوئی کہ تم کو تمھاری ناعاقبت اندیشیوں کی سزا فوراً مل گئی۔

شیطان - یہ تو دارالانتقام ہے یہاں ہر عمل کی سزا فوراً مل جاتی ہے۔

زاہد خشک - مجھے اس وقت دلی مسرت حاصل ہوئی۔ صوفی مجاز اور حقیقت دونوں کی طرف دوڑتا تھا۔ الحمدللہ کہ نہ اسے مجاز ملا اور نہ حقیقت ملی۔ اب وہ کسی طرف کا نہیں رہا (صوفی سے) تمھارے لئے اب کوئی ذریعۂ تشفی باقی نہیں رہا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم نے کسی بدصورت چہرے میں حسن حقیقی کی جستجو نہیں کی ورنہ اگر تم چاہتے تو میری بیوی کے ساتھ اپنی عقبیٰ بسر کر سکتے تھے۔ میں معترض نہ ہوتا مجھے یہاں اس کے ساتھ نہیں رہنا ہے۔

شیطان - کیا آج آپ ان مقدس رشتوں کو توڑنا چاہتے ہیں جن کے شرعی استحکام پر آپ کو اس قدر ناز تھا۔ آپ مجبور کئے جائیں گے کہ اسی فضا میں اپنی عقبیٰ بسر کیجیے جس میں آپ کی دنیا بسر ہوئی تھی۔ یہاں بھی آپ کی بیوی آپ کے ساتھ رہیں گی۔ اپنے شرعی تعلقات کو آج آپ توڑ نہیں سکتے۔

خوبصورت عورت - آپ کو اگر یہ دنیا ہی میں معلوم ہوگیا ہوتا کہ آپ کی بیوی ہی آپ کے اتقا کی جزا ہوگی غالباً آپ ہمیشہ کے لئے زہد و اتقا سے توبہ کر لیتے۔

زاہدِ خشک - میری حالت قابل رحم ہے ہر شخص مجھ پر طنز و تشنیع کرتا ہے۔ خوبصورت عورتیں ظالم ہوتی ہیں حسن کی سفاکی ناقابلِ برداشت ہے۔

خوبصورت عورت - تمھارے لئے حسن ہی ناقابلِ برداشت ہے۔

خوبصورت مرد - بدصورت عورتیں بھی ظلم کرنا چاہتی ہیں لیکن کون ایسا بدمذاق ہے جو ان کے ظلم کو برداشت کر سکے یہی بے بسی بدصورت عورتوں کو بدطینت بنا دیتی ہے۔ لیکن ایک خوبصورت عورت ظلم بھی کر سکتی ہے اور رحم بھی

اُس کا حسن مختار کامل ہے اُس کے لئے نہ کوئی مذہبی قانون ہے اور نہ اخلاقی تلاش۔

بدصورت عورت۔ حسین عورتیں اپنے غرورِ حسن میں مذہب کی بھی توہین کرنے پر طیار رہتی ہیں جس کی سزا تو آج ملے گی

متقی عورت۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ محض خوبصورت ہونا کوئی جرم ہے تم غلطی پر ہو۔ البتہ گناہوں کی سزا ہر انسان کو دی جائے گی۔ چاہے وہ خوبصورت ہو یا بدصورت۔

خوبصورت مرد۔ حسن خود ہی ایک عذرِ گناہ ہے اور تمام عذرات سے برگزیدہ تر۔ ایک حسین گنہگار کی تمام خطائیں معاف کردی جائیں گی۔ بشرطیکہ وہ حسنِ خیال اور حسنِ عمل سے محروم نہ ہو۔ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ ایک خوش مذاق انسان سے خطائیں بھی سرزد ہو سکتی ہیں۔

(دفعتاً ایک ہنگامہ ہوا۔ انسانوں کے کئی گروہ سراسیمہ اور پریشان دوڑتے ہوئے دکھلائی دئے)

شیطان۔ حساب وکتاب کا وقت آگیا۔ ہم سب کو منتشر ہونا چاہیئے۔

(شیطان غائب ہو گیا۔ خوبصورت مرد اور خوبصورت عورت مسکراتے ہوئے ساتھ نکل گئے صوفی متفکر تھا وہ آہستہ آہستہ چلا گیا۔ زاہد خشک بے حد ملول اور رنجیدہ صورت لئے ہوئے اپنی بیوی کے ہمراہ گیا۔ وہ بھی پریشان تھی لیکن اُس کے چہرے سے نفرت و انتقام نمایاں تھا)

چوتھا منظر

معدلت گاہِ خداوندی

جلوہ گاہ نور کی بائیں جانب جبرئیل اسرافیل میکائیل اور عزرائیل ایک سلسلہ میں، اُن کے بعد فرشتوں کا گروہ دست بستہ کھڑا ہے۔ داہنی طرف برگزیدہ انسانوں کی ایک جماعت ہے جن کے چہروں کی تجلی فرشتوں کے نور سے لطیف تر ہے۔ سامنے شیطان آدم اور حوا ایک صف میں کھڑے ہوئے ہیں

اُن کے پیچھے انسانوں کا ایک مضطرب ہجوم جزا و سزا کا منتظر ہے۔

ندا - جبرئیل انسانوں کی اس پاک جماعت کو جو عرش کی داہنی جانب کھڑی ہوئی ہے جلوہ گاہ قدس میں لے جاؤ۔ یہ میرے محبوب ترین بندے ہیں انھیں حساب وکتاب کی زحمت نہ دی جائے گی۔ میرے فرشتے ان کی اطاعت کریں گے اور ان سے اُس تقدس و اطاعت کا سبق لیں گے جسے انسانی زندگی کی کش مکش بھی برباد نہ کر سکی۔

(انسانوں کا یہ مقدس گروہ دفعتاً غائب ہو گیا فرشتوں کی جماعت نے نعرۂ تکبیر بلند کیا)

ندا - جبرئیل! فرشتوں سے کہدو کہ گوش برآواز رہیں شیطان سے اُس کے اعمال کی باز پرس ہونے والی ہے۔

(جبرئیل نے فرشتوں کی طرف دیکھا اُن کی صورتوں پر تحیر و استعجاب کا عالم طاری تھا شیطان نے بھی فرشتوں کی طرف متبسم ہو کر دیکھا)

جبرئیل - تو قادر و توانا ہے تری قدرت کاملہ ہی اپنے مصالح کو سمجھ سکتی ہے تیرے فرشتے تیری بارگاہ میں سربسجود ہیں لیکن وہ متحیر ہیں کہ شیطان سے آج باز پرس کیوں کی جارہی ہے اُس کے نفرت انگیز اعمال کی سزا اُسے ایک بار دی جا چکی وہ ہمیشہ کے لئے ملعون قرار پا چکا۔ اُسے اپنے اعمال و افعال کی تشریح و تاویل کا موقع آج دوبارہ کیوں دیا جا رہا ہے۔

ندا - فرشتے میرے اُن مصالح سے بے خبر ہیں جو تخلیق شیطنت کے باعث ہوئے۔ وہ میری دنیا اور اُس کے طلسم کو نہیں سمجھتے۔ وہ نہیں جانتے کہ تخلیق انسانی سے میرا کیا مقصد تھا۔ شیطان کو بے شک سزا دی جا چکی ہے لیکن اُن اعمال کی جو اُس سے بطور معلم الملکوت کے سرزد ہوئے تھے۔ لیکن آج اُس سے اُن اعمال کی باز پرس ہوگی جن کا وہ بطور شیطان کے مرتکب ہوا۔ اُس دن اُس کی ملکوتیت معرض عتاب میں تھی آج اُس کی شیطنت کی جزا و سزا ہوگی۔ اُس کی دنیاوی زندگی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اُس کا حساب وکتاب آج کے لئے متعین تھا۔

(جبرئیل نے فرشتوں کی طرف دیکھا۔ شیطان نے پہلے فرشتوں کی طرف نظر کی اُس کے بعد انسانوں کے ہجوم کو دیکھ کر آنکھوں سے فرشتوں کی طرف کچھ اشارہ کیا۔)

جبرائیل۔ تو دانا و بینا ہے۔ تیرے فرشتے تیرے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ تیرے مصالح حقیقی اور تیرا فیصلہ حقیقی فیصلہ ہے۔

ندا ۔ (شیطان سے) اے مردود ازلی تو نے آدم اور حوّا کو گمراہ کیا اور اُن کو میری نافرمانیوں کی ترغیب دی۔

شیطان ۔ تیری مصلحت۔ تیری قدرت کا کرشمہ۔ تو ہی نے مجھے مردود قرار دیا۔ میری مجال نہ تھی کہ میں اپنی ذات کو مردود بنا سکتا۔ میری قوت نہ تھی کہ آدم اور حوّا کو گمراہ کر سکتا۔ تو نے اُسے دنیا کی خلافت کے لئے پیدا کیا تھا کسی وجہ سے تو نے اُنھیں بہشت میں رکھا لیکن اُس سے نکلنا ضروری تھا صرف اس غرض سے مجھے فرشتہ سے شیطان کیا اور میں نے تیری مصالح کی تکمیل کی تو قادر و توانا تھا تو قادر و توانا ہے۔

(فرشتے ایک دوسری طرف استعجاب سے
دیکھنے لگے)

ندا ۔ میری مصلحت جو کچھ ہو۔ مگر کیا تیرا قصور نہ تھا۔

شیطان ۔ تیری مصلحت ۔ میرا قصور ۔ تیری ہر مصلحت میرا قصور ۔

ندا ۔ خاموش تیرے ہر گناہ کو میری رحمت نے معاف کر دیا۔ ....

(تمام فرشتے متحیر رہ گئے۔ انسانوں کے ہجوم میں ایک
ہنگامہ مچ گیا۔ ہزاروں انسان جوشِ مسرت میں چیخ اُٹھے)

ندا ۔ مگر تیری مجرمانہ زندگی کا وہ حصہ انتہائی تعزیر کا مستحق ہے جسے تو نے اس جرأت و بے باکی سے انسانوں میں بسر کیا تیری گستاخیاں ناقابل عفو ہیں۔ تو میری کائنات کے ہر نظام میں رخنہ اندازی کرتا تھا۔ میں نے اصلاح انسانی کے لئے ہزاروں مصلح بھیجے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تیری ایک کوشش ہزاروں اصلاحات کو مٹا دینے کے لئے کافی ہوتی تھی۔

شیطان ۔ انسان ہر حیثیت سے ناقابل اصلاح تھا۔ اُسے گناہ کرنا بھی نہ آیا۔ اُس میں حسن ارتکاب کا ذرا بھی سلیقہ نہ تھا نیکیوں کی طرح گناہ بھی وہ نہایت غیر دل چسپ طریقے سے کرتا تھا۔ میں نے اُسے کئی بار سمجھایا کہ معاصی خشک محاسن خشک سے بھی بدتر ہیں اگر اُسے غیر دل چسپ اور کثیف گناہوں کا مرتکب ہونا ہے بہتر ہے کہ وہ نیکیاں ہی کرے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اُس کے کثیف گناہوں کو لطیف اور اُس کے غیر دل چسپ اور خشونت آگیں

محاسن کو معصیت رنگین کے ذریعہ سے دل چسپ اور دل فریب بنا دوں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میں نے اُس سے بارہا کہا کہ حسن کی حقیقی دل فریبیاں لطیف گناہوں اور لطیف گنہگاروں میں مضمر ہیں۔ لیکن مجھے ایسی صلاحیت پذیر ہستیاں بہت کم ملیں جو معصیت رنگین کے رموز لطیف کی محرم ہوسکتیں۔ ایسے انسان دنیا میں بہت کم تھے جنھوں نے میرے پیام رنگین کو سمجھکر اُس پر صحیح طور پر عمل کرنے کی کوشش کی ہو۔ مگر انسان ایک حیثیت سے قابل معافی بھی ہے۔ عقائد و اعمال میں حقیقی رنگینیاں پیدا کرنی کوئی آسان کام نہیں۔ ایک لطیف گناہ کا ارتکاب ہزار خشک نیکیوں سے زیادہ دشوار ہے۔

(فرشتے متعجب ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے)

ندا - تو نے میرے پرستاروں کے ہر طبقے کو کسی نہ کسی صورت سے گمراہ کیا۔ زاہد کے تقشف میں بھی تیرا دخل تھا اور صوفی کی رنگینیوں میں بھی۔ تو نے ہمیشہ انسانوں کو اعمال صالحہ سے روکا۔

شیطان - میں دنیا میں معصیت رنگین کے پیامبر کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ تو نے اپنے بعض مصالح کی بنا پر انسان میں ذوق معاصی ودیعت کیا تھا۔ لیکن اُس کی بدمذاقیوں سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ نیکیوں کی طرح گناہ بھی نہایت بدسلیقگی اور بدتمیزی سے کرے گا۔ اس لئے حسن معاصی اور حسن ارتکاب کا شعبہ میرے سپرد کیا گیا۔ میں محاسن قبیح اور معاصی کثیف کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ میرا فرض تھا کہ اعمالِ انسانی میں حقیقی رنگینیاں پیدا کروں۔ میں نے انسان کو سمجھایا کہ اعمال صالحہ وہ ہیں جو حسن خیال اور حسن ارتکاب سے مزین ہوں اور اعمال قبیحہ وہ ہیں جو خشک اور غیر دل چسپ کثیف اور رکیک ہوں عام اس سے کہ وہ محاسن ہوں یا معاصی۔ حقیقی حسن و قبح اُن سطحی امتیازات پر منحصر نہیں جو کج فہم انسان نے گناہ و ثواب کے درمیان قائم کئے ہیں۔ بلکہ صحیح معیار حسن عقائد اور رنگینیِ اعمال ہے۔ حسن ارتکاب سے ہر معصیت حقیقی محاسن میں شامل ہوجاتی ہے اور کثافتِ عمل سے محاسن بھی ناقابل عفو معاصی بن جاتے ہیں۔ اگر میں نے جوانِ صالح کو اُس کے اعمال صالحہ سے روکا تو صرف اس لئے کہ حقیقتاً وہ اعمال صالحہ نہ تھے۔ خشک اور غیر دلچسپ اعمال کبھی اعمال صالحہ نہیں ہوسکتے۔ زاہد خشک کی زندگی خلوت نشینی کی بیکاریوں اور عمل نیک کی خشکیوں میں رائگاں ہورہی تھی۔ میں نے چاہا کہ اُس کی اصلاح کروں مگر وہ اس قدر بر خود غلط تھا کہ اُس نے کسی مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی اس کی

تنگ نظری ناقابلِ اصلاح تھی وہ عقائد و اعمال کا اس قدر قائل نہ تھا جس قدر جزا و سزا کا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی ساری زندگی حرص و انتشار میں گزری نہ اُس کی منزل دل فریب تھی اور نہ جادۂ منزل۔ اُس کی ناکامیوں کا یہی راز ہے۔ صوفی حسن پرست ضرور تھا لیکن ایک بزدل اور گمراہ حسن پرست۔ مذہب سے مرعوب ہو کر اُس نے طریقت کا حیلہ اختیار کیا۔ اگر وہ بد مذاق نہ ہوتا اس سے زیادہ دل فریب حیلہ نکال سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اُن مظاہر میں اور اُن ذرائع سے حسن کی جستجو کرتا تھا جس میں قطعاً کوئی کشش نہ تھی۔ اُس کی پریشان خیالیوں نے اُسے ہمیشہ محروم رکھا وہ جب حسن کو دیکھتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ محض ایک مردہ ہے جس کے اندر کوئی دوسرا حسن پوشیدہ ہے جسے اُس کی اصطلاح میں حقیقی کہتے ہیں۔ اُس کی یہی نادانیاں اُس کی آوارہ گردیوں کا باعث ہوئیں۔ میں نے اُسے بتلایا کہ حسن خود ہی اپنا ظاہر ہے اور خود ہی اپنا باطن لیکن وہ ہمیشہ مجاز و حقیقت کے معمہ میں اُلجھا رہا۔ اُس کی محرومیوں کا باعث محض یہ ہے کہ اُس نے میری حقیقت نہ پہچانی۔

ندا ۔ تو ہمیشہ زاہد کے مجاہداتِ نفس کو قابلِ مضحکہ سمجھا۔ تو نے اُس کے ایثار اور نفس کُشی کی تذلیل و تحقیر کی۔

شیطان ۔ ایثار اور نفس کُشی روح کی نشوونما کے لئے کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہوں لیکن انبساطِ حسن کی قطعی دشمن ہیں۔ اس سے چہرے پر ایک غیر معمولی سنجیدگی اور خیالات میں ایک قسم کی پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے جو عہدِ شباب کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ مجاہداتِ نفس سے سیرت اور صورت دونوں میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے پیامِ رنگین کو صرف حسن و شباب سے تعلق تھا۔ اس لئے میں نے خوبصورت اور نوجوان انسانوں کو اُن تمام مجاہدات سے روکا جن سے فطرت کی رنگینیاں اور صورت کی دلآویزی فنا ہو جاتی ہے وہ تمام فرائض جو مذہب و اخلاق نے انسان پر اُس کی اصلاح کے لئے عائد کئے تھے ہمیشہ انسانی صورت کے لئے مہلک ثابت ہوئے۔ وضع و لباس کے لئے ایسے احکام نافذ کئے گئے تھے جن کی پابندی جسم اور چہرے کو بدنما بنا دیتی تھی اسی طرح اصلاحِ سیرت کے لئے جن اعمال و فرائض کی تلقین کی گئی تھی وہ بھی اکثر حسنِ صورت کے دشمن تھے۔ غرض کہ ہر تلاشِ حسن اور اُس کی رنگینیوں کے لئے خطرناک تھی۔ یہی نہیں بلکہ میں یہاں تک کہنے پر تیار ہوں کہ مجاہداتِ نفس اور لذت شکنی ارتقاءِ روح کے لئے بھی کسی طرح ضروری نہیں کہے جا سکتے وہ ریاضتیں کبھی روح کو لطیف نہیں بنا سکتیں جو جسم کی لطافتوں کو فنا کر دیں

صحیح اعمال وہ ہیں جو حسن سیرت اور حسن صورت کے درمیان ایک لطیف توازن قائم رکھ سکیں۔ بہرصورت حسن سیرت کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ لیکن ایسا نہیں کہ اُس پر حسن صورت قربان کر دیا جائے۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ حسن وشباب پر اُن غیر دلچسپ فرائض کا بار ڈالا جائے جس سے کائنات کے سب سے بڑے مصالح یعنی مصالح حسن وشباب برباد ہو جائیں "......

ندا - تو چاہتا تھا کہ حسن تمام بندشوں سے آزاد کر دیا جائے۔ اُس کی اصلاح کے لئے نہ فرائض ہوں اور نہ بندشیں۔

شیطان - وہ تمام فرائض ایک حسین انسان کے لئے ممنوعات میں داخل ہیں جن سے حسن کی حقیقی دلفریبیوں کو صدمہ پہونچتا ہو۔ ایک خوبصورت انسان کے لئے حسن ہی اُس کا فرض ہے اور حسن ہی اُس کی بندش۔ حسن خود ہی برگزیدہ ترین مصلح ہے۔ وہ ہزاروں خرابیوں کی اصلاح کر سکتا ہے۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ دنیا میں ہزاروں اصلاحات محض حسن کی سعی پیہم سے ہوئی ہیں۔ مذہب و اخلاق کی بھی اصلاح حسن ہی کر سکتا ہے میرے خیال میں حسن وشباب پر مذہبی اور اخلاقی فرائض عائد کرنے کے بجائے مذہب و اخلاق پر حسن وشباب کی طرف سے فرائض عائد کرنے چاہیئے تھے۔ بہرحال میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ حسن کی دنیا میں میں نے اُن فرائض کو آنے نہیں دیا جو مخرب شباب تھے لیکن کبر سنی کے فرائض میں میں نے کوئی دخل نہیں دیا۔ اُسے میں نے کامل اختیار دے دیا کہ جس قدر چاہے ریاضتیں کرے اور جس طرح چاہے نفس کشی کرے۔ ایک پیر کہن سال اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا ہے جب انسان میں حسن تخیل اور شیرینی حرکات فنا ہو جاتی ہے وہ لطیف معاصی سے تائب ہو کر نیک معاش بن جاتا ہے۔ اسی طرح میں نے بدصورت اور بدمذاق انسانوں کو بھی اُن کے فرائض سے نہیں روکا۔ زہد و اتقا اُن کا اعتراف شکست تھا وہ لطیف اور دلچسپ گناہوں کا ارتکاب ہی نہیں کر سکتے تھے اُن کی یہ بہترین سزا تھی کہ اخلاقی بندشیں اُن پر عائد کی جائیں اور اُن کی تمام عمر خشک اور غیر دلچسپ نیکیوں کے ارتکاب میں ختم ہو جائے۔ اسی خیال سے اکثر میں نے انھیں اس کی ترغیب بھی دی کہ اپنے مذہبی اور اخلاقی فرائض کی سختی کے ساتھ پابندی کریں۔ اس طریقے سے میں انھیں اُن کی فطری بدمذاقیوں کی سزا دینا چاہتا تھا۔ مذہب حسن کے

مراسم و آداب دوسرے مذاہب کے غیر دل چسپ آئین و اصول سے زیادہ محترم ہیں۔ یہ مذہب صرف آشنایانِ راز کے لئے مختص تھا جن کی فطری صلاحیتوں نے اُنھیں حسن کا حقیقی محرم بنا دیا تھا ہر بیوقوف انسان عام مذاہب کی تعلیم کو سمجھ سکتا ہے اور اگر استقلال کے ساتھ عمل کرنا چاہے عمل بھی کر سکتا ہے۔ لیکن مذہبِ حسن و شباب کے سمجھنے کے لئے فطرت میں حقیقی رنگینیاں خیالات میں حقیقی لطافتیں اور اعمال میں حقیقی دلفریبیاں چاہئیں۔ یہی وہ صفات عالیہ ہیں جن کو میں معاصی لطیف کے ذریعہ سے انسان میں پیدا کرنا چاہتا تھا اور جن کو میں جانتا ہوں کہ زہد خشک اور ایثار و نفس کشی کے ذریعہ سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتیں۔ البتہ حسن و شباب اور نسوانیت کی حقیقی رنگینیاں ۔۔۔۔۔۔

ندا ۔ تو حسنِ نسوانی کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو نہیں جانتا کہ اُس کا ذکر بھی میرے معصوم فرشتوں کے لئے باعث غیرت ہوگا۔

شیطان۔ میں سمجھتا ہوں کہ معصوم فرشتوں کے دلوں میں حسن نسوانی کے تذکرہ سے ایک تلاطم پیدا ہو جائے گا لیکن اگر وہ اُسے اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے ہیں مجھے اُن کی بدمذاقیوں پر سخت افسوس ہے۔ بہرحال یہ تذکرہ لطیف فرشتوں کے لئے کتنا ہی مہلک کیوں نہ ہو۔ میں مجبور ہوں کہ اُس کا اعادہ کروں میں نے انسان سے بارہا کہا کہ ایک خوبصورت عورت جس کا شباب نسوانیت کی دل فریبیوں سے معمور ہو کائنات کی ایک مستقل حقیقت ہے۔ انسان اگر اُس کے رموز لطیف سے آگاہ ہو جائے جس کے ہزاروں حقائق اُس پر خود بخود روشن ہو جائیں گے لیکن انسان اس قدر تنگ نظر اور کوتاہ بیں تھا کہ وہ کبھی ان رموز رنگیں کا محرم نہ ہو سکا۔ اُسے ہر عورت عورت نظر آتی تھی وہ یہ نہ سمجھا کہ ایک بدصورت عورت کا شباب دنیا کے مہلک ترین امراض میں سے ہے جو شخص اُس سے محفوظ رہ سکا وہ دنیا کی کسی دوسری مصیبت میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ صحیح معنوں میں عورت وہ ہے جس کی نسوانیت قیود بیجا کو توڑ کر حسن شباب کی رنگینیوں میں محو ہو جائے۔

(شیطان کی اس گفتگو سے فرشتوں کے چہروں پر حریصانہ پریشانی پیدا ہوگئی)

ندا- یہ تیری ہی گمراہ کُن تعلیم کا نتیجہ ہے کہ انسان حسنِ نسوانی کی محبت میں مبتلا ہو کر مجھکو اور میرے احکام کو بھول گیا۔

شیطان- میں محبت کی محویتوں کو بد مذاقی سے تعبیر کرتا ہوں محبت میں محو ہو جانا حسن و شباب کی رنگینیوں کا خون کرنا ہے تصورات کی لطافتیں اُسی وقت برباد ہو جاتی ہیں جب انسان دیوانہ وار محبت کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ میں ہر قسم کی پرستش کا دشمن ہوں۔ جذبۂ پرستش احساس خودداری کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیتا ہے۔ میں غلامانہ نیازمندی کا ہمیشہ سے مخالف ہوں چاہے وہ مذہب و اخلاق میں ہو یا انس و محبت میں۔ حسن و شباب کی دنیا میں بھی میرا یہی پیام تھا کہ انہماک مہلک سے انسان کو اپنی شخصیت فنا نہ کرنی چاہیئے۔ وفا محض جذبۂ مذلت پسندی ہے شرع حسن و شباب کا یہ تقاضا ہے کہ انسان اپنے تصورات لطیف کو برباد نہ کرے۔ محویت و انہماک ہر حیثیت سے انسانوں کے لئے خطرناک ہے۔ عام اس سے کہ وہ گناہوں میں ہو یا نیکیوں میں۔ لیکن انسان کی احمقانہ انتہا پسندیوں نے میرے تلقین و ارشاد کی قدر نہ کی۔ قیس و فرہاد کے ایسے مبتذل اور خود فروش محبت کرنے والوں نے حسن کی بھی توہین کی اور محبت کی بھی۔ اُن کی بد مذاقیوں نے محبت کی مضحکہ انگیز مثال قائم کر دی جس نے انسان کو تمام عمر گمراہیوں میں مبتلا رکھا۔ ایک طرف میں اس امر کی کوشش کرتا رہا کہ اس قسم کی محبت کا نقش انسانی قلوب سے مٹا دوں۔ دوسری طرف طبقۂ شعرا کے جہل مرکب نے ان بدمذاقیوں کی تشہیر و اشاعت کرنی چاہی۔ بیوقوف انسان یہ نہ سمجھا کہ عالم محبت میں انتہائی غلو اسی قدر مضحکہ انگیز ہے جس قدر مذہب و اخلاق کے خودساختہ اصول و مراسم ہیں۔

ندا- تو نے انسان کو ہر گناہ پر آمادہ کیا۔ تیری تعلیم سے انسانی قلوب میں خباثتیں اور رکاکتیں پیدا ہو گئیں۔

شیطان- میں اس الزام سے قطعاً انکار کرتا ہوں کہ میری تعلیم نے خباثت و رکاکت پیدا کر دی۔ میں خباثت آفریں گناہوں سے قطعاً بری الذمہ ہوں۔ حقیقت میں میں خباثت و رکاکت کا دشمن ہوں۔ میں انسان کو رکاکت آفریں گناہوں سے اُسی طرح روکتا رہا جس طرح اُن نیکیوں سے جن سے متانت اور سنجیدگی کے ایسے ناقابل اصلاح عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں صرف معاصی لطیف کا پیامبر تھا۔ اس لئے میں نے صرف اُن گناہوں کی ترغیب دی جن سے صرف لطافتیں پیدا ہو سکتی ہیں اور جن کی رنگینیاں خود اپنا آغاز تھیں اور خود اپنا انجام۔ میں کسی طرح اُن گناہوں کا ذمہ دار نہیں جنھوں نے ہزاروں انسانوں کو قطعی طور پر حیوان

بنا دیا ہے۔ ایسے گناہ میرے پیامِ رنگین کے دشمن تھے میں اُن سے ہمیشہ متنفر رہا۔ خود انسان کی بدمذاقی اور بُرے مصالح سے ان نفرت انگیز گناہوں کی ترغیب دیتے تھے یہ اُس کی مکّاری اور گستاخی تھی کہ وہ اپنے تمام گناہوں کا الزام مجھ پر رکھتا تھا۔ خواہ وہ کثیف ہوں یا لطیف دل پسپ ہوں یا غیر دلچسپ میں خباثت پرور اور کثافت آفریں گناہوں سے اُسی طرح متنفر تھا جس طرح رکیک اور خشک نیکیوں سے لیکن دنیا میں میرے متعلق سخت غلط فہمیاں رہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں اُس سے زیادہ ہیں۔ تیرے فرشتے میرے رازِ شیطنت سے اُسی طرح بے خبر ہیں جس طرح تیرے رازِ الوہیت سے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ غلط فہمیاں ہمیشہ کے لئے دور کردی جائیں۔ اس ہجومِ حشر میں میں نہایت فخر و امتیاز کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے انسان کو معاصیٔ لطیف کی ترغیب دی اور اُسے محاسنِ قبیح سے روکا۔ میں حقیقتاً اُن تمام گناہوں کا محرک ہوں جنھوں نے بعض برگزیدہ انسانوں کو ہمیشہ کے لئے حقیقی رنگینیوں میں محو کردیا ہے۔ آج میں اربابِ قضا و قدر سے اپنی کاوشوں کی داد کا طالب ہوں۔ میں نے اُن کے اہم مصالح کی تکمیل کی۔

جبرائیل ۔ تو سمیع و بصیر ہے۔ تیرے فرشتے تیرے حکم کے منتظر ہیں۔ شیطان کہاں بھیجا جائے۔

ندا ۔ ابھی اس کی بازپرس ختم نہیں ہوئی۔

(فرشتوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تمام انسان سراسیمہ ہوگئے۔ لیکن چند صدا ہائے آفریں بھی اُٹھیں)

جبرائیل ۔ تو منتقمِ حقیقی ہے۔

شیطان ۔ یہ فرشتے صرف تیری قہاری پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ تیرے مصالح اور تیری رحمت سے ناآشنا ہیں

ندا ۔ شیطان! تیرا یہ قصور ناقابلِ عفو ہے کہ تو نے میرے مصالح پر اس ہجومِ حشر میں گستاخانہ تقریر کی۔ کیا تو چاہتا ہے کہ میرے فرشتے ان مسائل میں اُلجھکر کشمکش میں مبتلا ہوجائیں۔

شیطان ۔ تیرے حساب و کتاب کا تقاضا یہی تھا کہ میں اپنے حقیقی عذرات کو پیش کروں۔ تیرے مصالح کے سامنے میں نے ہمیشہ سرِ تسلیم خم کیا اور آج بھی کرتا ہوں۔

ندا ۔ میری رحمتیں نیامن ہیں۔ میں نے تیرے تمام قصور معاف کئے

(فرشتے مبہوت ہوگئے۔ جبرئیل و اسرافیل وغیرہ ایک دوسرے کی طرف پریشان ہوکر دیکھنے لگے انسانوں میں ایک عالمِ بے چینی پیدا ہوگئی ایک طبقہ سے نعرہائے مسرت بلند ہوئے۔)

جبرائیل - تو رحیم و کریم ہے۔ تیرے فرشتے متعجب ہیں کہ کیا اُس کا وہ گناہ بھی معاف ہو جائے گا جس کی بنا پر وہ ملعون قرار دیا گیا تھا۔

ندا - جس دنیا کے لئے وہ ملعون قرار دیا گیا تھا وہ تماشا ہی ختم ہوگیا۔ فرشتوں کو میری رحمت سے بے خبر نہ رہنا چاہیے۔

[فرشتے مایوس ہوکر حمد و تسبیح میں مشغول ہوگئے]

شیطان - میری التجا ہے کہ خبیث اور کثیف گنہگاروں پر انتہائی عتاب نازل کیا جائے اور انھیں شدید ترین سزا دی جائے وہ تیرے بھی مجرم ہیں اور میرے بھی۔ نیک و متقی انسانوں کو تو چاہے جزا دے یا سزا مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ البتہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ واقعاً جزا و سزا دونوں رنگینیوں سے اُسی طرح محروم ہوں جس طرح اُس کی دنیا تھی۔ مجھے تیرے انصاف پر ہمیشہ احتمال رہا اور آج بھی ہے۔ البتہ اُن بلند نظر اور بلند حوصلہ انسانوں کے حشر سے مجھے خاص تعلق ہے جنھوں نے میرے پیام کو سمجھ لیا اور میری تلقین و ارشاد کو اپنے عقائد و اعمال کا رہبر بنایا۔ آج اُن کی راست روی کی داد دے اور انھیں ابدی رنگینیاں عطا فرما۔ آدم و حوّا میری وساطت سے بے نیاز ہیں۔ اُن کا حشر تیرے مصالح پر منحصر ہے۔

ندا - جبرئیل! آدم و حوا سے کہدو کہ اُن کے اعمال کی کوئی باز پرس آج نہ ہوگی۔ اُن کی تخلیق اور اُن کی سزائیں میری چند مصالح پر مبنی تھیں۔ اُن مصالح کی آج تکمیل ہوگئی۔ اُن کو اختیار ہے جہاں چاہیں رہیں

آدم - جبرئیل! کیا جنت وہی جنت ہے جہاں سے ہم نکالے گئے تھے۔ کیا اب وہ ثمر ممنوعہ وہاں نہیں۔

حوا - جبرئیل! کیا دوزخ وہی دوزخ ہے جہاں ہم لوگ بھیجے جارہے تھے۔ کیا ہم دوبارہ دنیا میں نہیں بھیجے جاسکتے

شیطان - جبرئیل سے کیا پوچھتی ہو مجھ سے پوچھو میں ملعون قرار دیئے جانے کے بعد ہوا جنت کی تمام سازشوں کا رازدار بنا لیا گیا تھا۔ ثمر ممنوعہ تمھاری جلا وطنی کا محض ایک حیلہ تھا۔ خدا تخلیق کائنات کا کوئی موقع چاہتا تھا ثمر ممنوعہ کے اختراع کا باعث یہی ہے۔ وہ اُسی وقت برباد ہوگیا جب تم جنت سے نکالے گئے۔ آج نہ جنت وہ جنت ہے اور نہ دوزخ وہ دوزخ۔ وہ نظام ہی ختم ہوگیا جو ابتدائے آفرینش سے نفخ صور کے لمحوں تک قائم تھا۔ آج انکشافِ حقائق کا دن ہے۔ جزا و سزا کے حقائق خود بخود روشن ہو رہے ہیں۔ آج اعمال اور اجرا عمال سے جنت اور دوزخ ایک نئے اُصول پر تعمیر کی جائے گی تمھیں اگر دنیا عزیز ہے تمھیں اختیار ہے کہ

اپنی دنیا یہیں تعمیر کرلو۔

ندا ۔ جبرئیل! زاہد خشک اور اُس کی بیوی کو سامنے لاؤ۔

زاہد خشک ۔ اے رب العالمین۔ میں تیرا فرماں بردار بندہ ہوں۔ میں نے اپنی ساری زندگی عبادت و ریاضت میں گزاری۔ ایثار اور نفس کشی سے میں نے لذت پرستیوں کے اُن تمام جذبات کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا جو مجھے تیرے احکام سے منحرف کر سکتے تھے۔ میں حسن اور بالخصوص حسن نسوانی سے ہمیشہ متنفر رہا۔ میں غیر شرعی حسن و محبت کو دشمن ایمان سمجھتا تھا۔ میں نے اپنے دامن کو دنیاوی رنگینیوں سے محفوظ رکھا۔ آج میرے زہد و ایثار کا اجر جمیل عطا فرما۔

شیطان ۔ تمہاری فطرت رنگینیوں سے متنفر تھی اور تمہارا تخیل تصورات لطیف سے غیر مانوس اس لئے آج تمہاری جزا بھی اُن دلفریبیوں سے بیگانہ ہوگی جس سے تم عمر بھر بیگانہ رہے۔ تم کو اُن رنگینیوں سے یہاں بھی پرہیز کرنا پڑے گا جن سے تم دنیا میں پرہیز کرتے رہے۔ وہ تم سے کبھی مانوس نہیں ہو سکتیں۔

ندا ۔ تم کو تمہارے اعمال کی جنت دی گئی۔ جن مکروہات و ممنوعات سے تم دنیا میں متنفر رہے اُس کا شائبہ بھی تمہاری جنت میں نہ ہوگا۔ تمہاری بیوی تمہاری عصمت و اتقا کی جزا ہے وہ یہاں تمہاری تنہا رفیق ہوگی۔ میری رحمت نے تمہیں اجر جمیل عطا کیا۔

(بدصورت عورت نے خوبصورت مرد اور عورت کی طرف دیکھا۔ خوبصورت عورت متبسم تھی اُس نے مایوس ہو کر نظر ہٹالی)

ندا ۔ جبرئیل! صوفی کو سامنے لاؤ۔

صوفی ۔ اے ہر مجاز کی حقیقت، مجھے اپنی ذات میں فنا کر دے۔ میں ہمیشہ گرم جستجو رہا لیکن حقیقت نہ ملی تھی نہ ملی ہر مجاز مجھے بالآخر ایک سراب نظر آیا۔ آج مجھے اپنی حقیقتوں کا تماشا دکھلا۔

شیطان ۔ حسن نسوانی سے تم بظاہر بیگانہ رہے۔ وہ بھی یہاں تم سے بیگانہ رہنا چاہتی ہے۔ تمہارے مجاز کی یہ بھی ایک حقیقت ہے۔

ندا ۔ یہ تیری نادانی تھی کہ تیرے سامنے جو حقیقت آئی تو اُسے مجاز سمجھا۔ مجاز و حقیقت کے بے جا امتیاز ہی میں

تیری جستجو کی ناکامیاں پنہاں تھیں۔ تو اپنی گمراہیوں کے باعث اب تک حقائق سے ناآشنا رہا۔ آج دفعتاً تو اُن سے مایوس نہیں ہو سکتا جس طرح دنیا میں تیری عمر صرف جستجو رہی اسی طرح اس وسیع دنیا کی نیرنگیوں میں بھی سعی و تلاش میں تجھے منہمک رہنا پڑے گا۔ تیری منزل ابھی تجھے نہیں مل سکتی۔ تیری حیلہ سازیوں کا یہی خمیازہ ہے۔ ابھی تو اپنے مجاز کا تماشا دیکھ۔ حقائق کا تماشا تجھے آج نہیں دکھلایا جا سکتا۔

(صوفی نے دونوں خوبصورت عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر دیکھا۔ متقی عورت کے چہرے پر انتقامانہ تبسم تھا)

ندا - جبرئیل خوبصورت اور متقی عورت کو سامنے لاؤ۔

متقی عورت - خداوندا مجھے میری عصمت و عفت کی جزا دے۔ دوسری حسین عورتوں کی طرح میں نے اپنے حسن کو رسوا اور ذلیل نہیں کیا۔ میں نے کسی سے ناعاقبت اندیش محبت نہیں کی۔ صرف تیری اطاعت و فرماں برداری کو میں حقیقی محبت سمجھی۔ دوسروں کی طرح حسن کے زعم باطل میں کبھی میں تجھے اور تیرے احکام کو نہیں بھولی۔ میں نے دنیا اور عقبیٰ میں ایک مذہبی امتیاز قائم رکھا۔

شیطان - عصمت و عفت کا صحیح مفہوم کج فہم انسان آج تک نہ سمجھا۔ تم اپنی بدمذاقی اور سنگدلی کو عصمت و عفت کہتی ہو جس طرح زاہد اپنی ناچارگیوں اور مجبوریوں کو زہد و اتقا سمجھتا ہے۔ تمھاری صورت حسن سے آشنا تھی لیکن تمھاری فطرت حسن کی رنگینیوں سے قطعاً محروم تھی۔ سیرت اور صورت کے اس تصادم میں تمھاری فطری بدمذاقی تمھارے حسن پر غالب آ گئی۔ فرائض نسوانیت سے تم ہمیشہ بیگانہ رہیں۔ تم یہ بھی سمجھیں کہ عصمت و عفت کسے کہتے ہیں۔ تمھارے اعمال بے روح کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تمھارے چہرے پر وہ شگفتگی نہیں جو اُس خوبصورت عورت کے چہرے پر نمایاں ہے۔ آج ممکن ہے تمھیں تمھاری ریاضتوں کی کوئی جزا ملے لیکن تمھارے حسن کی کوئی جزا نہیں مل سکتی۔ تمھاری زندگی میں اُس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ تم نے ہمیشہ اُس کی توہین کی۔ تمھاری جزا کبھی لطیف نہیں ہو سکتی۔

ندا - اے متقی عورت تجھے تیرے اتقا اور تیری عصمت کی جزا دی جائے گی۔ تجھے سکون و اطمینان عطا کیا جائیگا۔ تیرے سکون میں رنگینیوں کی جھلک نہ ہو گی کیونکہ تو اُس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ کسی خوبصورت انسان کو اُس کی

اجازت نہ دی جائے گی کہ تیری خلوت نشینیوں میں حارج ہو۔ کوئی شخص تیری عبادت گزار تنہائیوں میں مخل نہیں ہو سکتا۔ یہی تیرے لئے جزائے خیر ہے۔

(متقی عورت نے مایوس ہوکر خوبصورت مرد کی طرف دیکھا
خوبصورت عورت بھی سامنے تھی دونوں متبسم تھے
متقی عورت کی صورت پر حسد و رشک کی شکلیں پیدا ہو گئیں)

ندا ۔ اے رازدارِ معصیت اپنی جماعت کو سامنے لا۔

(سب سے آگے خوبصورت مرد اور خوبصورت عورت تھے
اُن کے بعد حسین انسانوں کا ایک مجمع تھا جن کی آنکھوں سے
ذہانت، چہرے سے سلیقگی اور لبوں سے ایک راز دار تبسم
نمایاں تھا۔)

خوبصورت مرد ۔ اے حسن حقیقی ہم نے عقائد لطیف اور اعمال رنگین کے ذریعہ سے تجھے پہچان لیا۔ زاہد کی طرح ہم جاہل اور بدمذاق نہ تھے، صوفی کی طرح ہم حیلہ ساز اور گمراہ نہ تھے، فلسفۂ کائنات پر غور کرنے والوں کی طرح ہم میں جہل مرکب نہ تھا۔ ہماری زندگی انتشار و تذبذب میں نہیں گزری۔ مذہب حسن و شباب ہمارا صراط مستقیم تھا تیرے شیطان نے ہم کو اُن رموز شیریں سے آگاہ کر دیا تھا جو ہمیشہ معصیت رنگیں میں پوشیدہ رہے۔ ہم نے وہ گناہ نہیں کئے جس سے فطرت انسانی میں خباثت و سفلگی، رکاکت و کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے وہ نیکیاں بھی نہیں کیں جن سے چہرے سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور طبائع مضمحل۔ غرض کہ ہم سے وہ اعمال حسنہ کبھی سرزد نہیں ہوئے جن سے حسن سیرت اور حسن صورت دونوں کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ہماری زندگی حقیقی رنگینیوں اور دل فریبیوں میں بسر ہوئی۔ ہم اعمال صالحہ کے رازدار تھے۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ نہ جنت کوئی مستقل جنت ہے اور نہ دوزخ کوئی مستقل دوزخ۔ ہر انسان خود اپنی جنت اور اپنی دوزخ کی تعمیر کر سکتا ہے اس لئے آج نہ ہم اُس دوزخ سے خائف ہیں جس کی دھمکی ہمیں بارہا دی گئی اور نہ اُس جنت کے متمنی جس کی تمنا میں حریص اور طامع انسان اپنی خوبصورت دنیا کو برباد کر دینے پر تُلا رہتا تھا ہم کو یہ معلوم تھا کہ دوزخ محض ایک فریب سزا ہے اور جنت محض ایک فریب جزا۔ ہم تجھے بھی سمجھے تھے اور تیرے شیطان کو بھی۔ گمراہ انسانوں کی طرح ہمارا یہ عقیدہ نہ تھا کہ تو بے حس ہے اور ہر ہستی جو تجھ سے

بغاوت کرنا چاہے تیرے مصالح کو ہمیشہ کے لئے برباد کر سکتی ہے۔ ہم جانتے تھے کہ بغاوت شیطانی تیری ایک مستقل مصلحت ہے۔ اس لئے جاہل مولویوں اور گمراہ زاہدوں کی طرح ہم کسی شیطان سے خائف نہیں رہے مولوی سمجھتا تھا کہ شیطان ایک بالاتر قوت ہے جسے تیری قدرت کاملہ مغلوب نہ کر سکی یہ صریحی کفر والحاد تھا اور صریحی شرک جس نے انسان کو تیرے علاوہ شیطان سے بھی خائف رکھا۔ ہم اس راز لطیف کے محرم تھے کہ تیری یہ کائنات رنگینیوں کا محض ایک طلسم ہے اور شیطان حقائق رنگین کا ایک رازدار اس لئے دنیاو عقبیٰ محاسن و معاصی اور جزا و سزا کے امتیازات اور اُن کی حقیقتیں ہم پر منکشف ہو گئیں۔ آج ہم اپنی اُس جنت کی تعمیر کریں گے جس کا تخیل تیرے معصوم فرشتے بھی قائم نہیں کر سکتے وہ جنت اپنی ایک تنہا مثال ہوگی یعنی حقائق محاسن اور حقائق معاصی کی ایک مستقل کائنات جس کی فضائیں ہمارے عقائد رنگین اور اعمال رنگین کی تجلیوں سے معمور رہیں گی۔

{ انسانوں کی اس فصاحت پر فرشتے متحیر ہو گئے
{ اسرافیل کی زبان سے بھی آفرین نکل گئی

ندا ۔ تم میرے عفو و کرم اور فیض عام کے حقائق سمجھتے ہو تمہیں اختیار کامل ہے کہ جس طرح چاہو اپنی عقبیٰ بسر کرو۔

{ جماعت نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ فرشتے مایوس ہو گئے
{ شیطان نے اُن کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا

ایک گروہ انسانی انتہائی متانت کے ساتھ آگے بڑھا۔ ہر شخص کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی اور ہر انداز سے انہماک و علو نمایاں تھا۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص نے تحقیق و اجتہاد میں عمر گزاری ہے۔ ان میں سے ایک محقق سامنے آیا۔

محقق ۔ اے وہ کہ دنیا میں تو ہمیشہ ایک مستقل موضوع بحث رہا۔ آخر تو کیا ہے۔ ہمارے اس گروہ میں ملحدین بھی ہیں اور متشککین بھی۔ تیرے وجود کے قائل بھی ہیں اور منکر بھی۔ ہم نے عمر بھر فلسفۂ کائنات پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا لیکن ہم پر کوئی حقیقت منکشف نہ ہوئی۔ ہمارا گروہ اس قدر ذمہ داریاں محسوس کرتا رہا کہ

اگر ہم میں سے کسی غیر محقق کو تیرے وجود کا یقین بھی ہو گیا اُس نے دنیا کے سامنے کبھی اس کا اقرار نہیں کیا صرف اس اندیشہ سے کہ .. ..

(نا تمام)

تجلّیات

(حضرت اقبال احمد سہیل)

نیازِ عشق نے کیا کہہ دیا نازآفریں ہو کر
جھکی پڑتی ہیں وہ مخمور آنکھیں شرمگیں ہو کر

بدل دی دل کی دنیا عشق نے حسن آفریں ہو کر
یہاں اب شامِ غم آتی ہے زلفِ عنبریں ہو کر

شرابِ شوق بن کر شعلۂ شمعِ یقیں ہو کر
رگ و پے میں کوئی رقصاں ہے موجِ آتشیں ہو کر

رہے گی اب یہ دنیا رشکِ خلدِ بریں ہو کر
نگاہیں اس رخِ رنگیں سے پلٹی ہیں حسیں ہو کر

الٰہی خیر شیخ و برہمن کے دین و ایماں کی
وہ چھائے جاتے ہیں سب پر جمالِ ہمنشیں ہو کر

ادھر دیکھیں کہاں ہیں دیر و کعبہ ڈھونڈھنے والے
چمکتا ہے وہ سنگِ آستاں داغِ جبیں ہو کر

قیامت میں یہ طرزِ داوری بھی کیا قیامت ہے
عمل کی پرسشیں ہیں کاتبِ لوحِ جبیں ہو کر

حریمِ ناز کے پردے ہیں اب ورزشِ وحشت ہے
جنوں رہتا ہے کب پابندِ جیب و آستیں ہو کر

سجودِ شوق کی رعنائیاں ہم سے کوئی پوچھے
کہ خود سنگِ حرم آتا ہے مشتاقِ جبیں ہو کر

ہماری خاک کا ہر ذرّہ اب دوشِ صبا پر ہے
شہیدانِ وفا رہتے نہیں بارِ زمیں ہو کر

معاذ اللہ ان آنکھوں میں کتنا سحر پنہاں ہے
بنے ہیں قبلۂ دل دشمنِ ایمان و دیں ہو کر

ترے تیور بدلتے ہی پھریں نظریں زمانہ کی
فلک نے بھی ستایا کوئے قاتل کی زمیں ہو کر

سہیلِ خستہ کو دورِ فلک نے گو مٹا ڈالا
مگر ہر حرف باقی رہ گیا ارژنگِ چیں ہو کر

جگر پارے

(حضرت جگر مرادآبادی)

دیدۂ یار بھی پُرنم ہے، خدا خیر کرے
آج کچھ اور ہی عالم ہے، خدا خیر کرے

حشر میں حشر کا عالم ہے، خدا خیر کرے
چشمکِ خلد و جہنّم ہے، خدا خیر کرے

اُس طرف غیرتِ خورشید جمال، اور اِدھر
زعمِ خودداریِ شبنم ہے، خدا خیر کرے

دل ہی پہلو میں کہ مچلا ہی چلا جاتا ہے
اور وہ خود سے بھی برہم ہے، خدا خیر کرے

رازِ بیتابیِ دل کچھ نہیں کھلتا، لیکن
کل سے درد آج بہت کم ہے، خدا خیر کرے

حُسن ہر گام پہ ہے سایہ فگن، دام فگن
عشق آزادِ دو عالم ہے خدا خیر کرے

بہار اور اُردو شاعری

محمد معین الدین دردائی متعلم بی اے آنرز (اُردو)
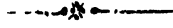
زمانہ کی ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ بہار جس کی خاک پاک سے مرزا بیدل، سید عماد، سجاد، تحقیق، راسخ، جذب، جوشش[1]، خلیل[2]، عبرتی[3]، شاد[4] اور اثر[5] جیسی ہستیاں اُٹھیں۔ آج اس کو اپنی علمی اور ادبی کارناموں کی ترجمانی کے لئے مجھ جیسے بے بضاعت کا انتخاب کرنا پڑا۔

نالندہ کا دار العلوم، اسوک اور چندر گپت کا دار السلطنت، مہاتما بدھ کا مولد اور سیاحانِ یونان وچین کا قبلۂ مقصود یاد آیا ہے کہ یہی خطہ بہار تھا۔ شاکی منی نے اپنا پیام نجات دنیا کو یہیں سے سنایا اور پٹھانوں کے لوہے کو یہیں کے ایک تلوار کے دھنی (شیر شاہ) نے منوایا۔ اردو شعر وادب کے پرستار ملا محمد علیم تحقیق کے خلوص، حسرت وانور کی قادر الکلامی اور راجہ شتاب رائے کے فرزند المتخلص بہ راجہ کی خدمتوں کو آج بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

جہاں تک اردو کی نشو ونما کا تعلق ہے بہار کے کارناموں سے تاریخ کے اوراق روشن ہیں ناصر الدین اور اس کے بیٹے معز الدین کیقباد کی جنگ کے حالات کو فارسی میں حضرت خسروؒ سے بہت پہلے ایک بہاری شاعر نے اس زمانہ کی اُردو زبان میں قلمبند کیا تھا خسرو کی قران السعدین ہر جگہ مشہور ہے لیکن غریب بہاری شاعر کا بھی ایک شعر یاد رہے:؎

منکی اوجڑی نگری کو تب کریں آبادان ؎ ناصردیں سے جب ملیں موجدین کبادان
معز الدین کیقباد

---

[1] محمد روشن جوشش میر حسن کے ہم عصر تھے، تذکرہ میر حسن سے پتہ چلتا ہے کہ جب میر حسن اپنا مشہور تذکرہ مرتب کر رہے تھے تو یہ بزرگ بھی عظیم آباد میں ایک تذکرہ لکھ رہے تھے۔ میر حسن کا تذکرہ آج شہرۂ آفاق ہے لیکن جوشش کا تذکرہ طاق نسیاں پر ہے۔ جوشش شاعر بھی تھے۔ تذکرہ آگے آئے گا ۱۲

[2] یہ وہی ابراہیم خاں خلیل ہیں جنھوں نے تذکرہ گلزار ابراہیمی لکھا ہے ۱۲ [3] وزیر علی عبرتی نے تذکرہ معراج الخیال تالیف کیا ہے ۱۲۹۸ھ میں انتقال کیا

[4] سید علی محمد شاد تذکرہ حیات فریاد کے مولف ہیں۔ یہ شاعر کی حیثیت سے بہت زیادہ مشہور ہیں ۱۲ [5] نواب امداد امام اثر مولف تذکرہ کاشف الحقائق ۱۲

اس سے کچھ اور نہیں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہار نے دہلی اور لکھنؤ سے بہت پہلے اُردو کی طرف توجہ کی۔

قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کا کوئی دعویدار نہیں ہوتا تو دوسرے لوگ اس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ یہی حال بہار کے اکثر مشاہیر کا ہے۔ اکثر وہ لوگ جن کی علمی اور ادبی زندگی بہار کے ماحول کی منت کش ہے اور جنھوں نے بہار ہی کی فضا میں آنکھیں کھولیں یہیں پلے اور پروان چڑھے۔ تذکرہ نویسوں کی غلطی سے غیر بہاری اور دہلوی مشہور ہیں مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل، میر تقی میر اور میر حسن وغیرہ ان کے کمال فن کا تو اعتراف کرتے ہیں لیکن خدا جانے کیوں ان کے بہاری ہونے کا تذکرہ نہیں کرتے، مرزا سرخوش نے تو آنکھیں بند کر کے انھیں شاہجہاں آبادی لکھ دیا ہے۔

اُردو زبان کا معمولی طالب علم بھی واقف ہے کہ آج سے بہت پہلے مختلف قوموں کے میل جول اور بہ وقت کئی مختلف زبانوں کی خلط ملط سے یہ نئی زبان تخلیق ہوئی ہے۔ ایرین جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں کے قدیم باشندوں سے انھیں ملنا جلنا پڑا اور اس میل جول سے مختلف مقامات پر مختلف پراکرتیں وجود میں آئیں۔ اس کے بعد ۱۰۰۰ء سے جب ہندوستان میں مسلمانوں کا داخلہ شروع ہوا تو ہندوستان کی پراکرتوں نے نیا رنگ بدلا۔ یہ نو وارد عربی فارسی، ترکی زبانیں بولتے ہوئے آئے تھے۔ ہندوستان میں انھیں دوسری پراکرتیں ملیں۔ اس میل جول اور زبان کی باہمی خلط ملط سے ایک نئی زبان کی بنیاد پڑنے لگی۔ مگر کچھ عرصہ قبل تک مختلف مقامات پر یہی زبان اس ملک کی پرانی پراکرت کی مناسبت سے مختلف صورت اختیار کئے ہوئے تھی۔ مسلمان جس جس ملک سے گزرے وہاں کے باشندوں سے ملنے جلنے کے باعث ایک نئی زبان کی بنیاد ڈال گئے۔ اس وقت تو وہ زبان اس ملک کی پرانی پراکرت اور مسلمانوں کی ساتھ لائی ہوئی زبانوں کا معجون مرکب معلوم ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ اور کافی عرصہ کے بعد یہی مخلوط زبان گھس پس کر ایک نئی شکل میں جلوہ گر ہوئی جس کو بالآخر اُردو کے نام سے موسوم کیا گیا۔

چنانچہ مختلف ملکوں کی اُردو زبان میں وہاں کی پرانی پراکرت کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ دکن کی اُردو میں وہاں کی ملکی پراکرتیں کچھ عرصہ قبل تک کثرت سے شامل تھیں۔ اسی طرح بہار کی اُردو میں بھی مگدھی اور پالی زبان کا کافی اثر تھا۔ شاہجہاں آباد کا کام نکھارنے اور سنوارنے کا تھا۔ دکن سے ولی آئے اور اپنی زبان نکھری اور ستھری شکل میں واپس لے گئے۔ بہار سے مرزا بیدل، راسخ وغیرہ بھی آئے اور کھرے کھوٹے پرکھا کر واپس گئے۔

بہار کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس نے کاروباری زبان کو علمی اور ادبی زبان سے

بالکل علیحدہ رکھا۔ اہل بہار روزمرہ کی زبان میں تو بے شک مگدھی زبان کا استعمال کر لیتے تھے لیکن انھوں نے اپنے علمی اور ادبی خزینہ کو مقامی آلودگیوں سے بالکل صاف رکھا۔ سید عماد الدین عماد[1]۔ غلام نقشبند سجاد[2] اور مرزا بیدل[3] وغیرہ گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے شعرا ہیں لیکن ان کی زبان یقیناً ستھری اور نتھری ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے دکن میں تامل اور تلنگی وغیرہ نے اردو ادب وانشا پر کافی اثر ڈالا ہے۔ فراقی، غوثی، لطفی، ولی وغیرہ کے کلام میں مقامی پراکرتوں کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔

جس طرح ۸۰۰ھ کے بعد جب دولت آباد ہندوستان کا دارالحکومت بنا دکن میں اردو زبان کی داغ بیل پڑنے لگی۔ اسی طرح ۱۷۱۳ء کے بعد جب فرخ سیر نے تاج شاہی سر پر رکھکر عظیم آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا بہار میں بھی اردو کی نمود ہونے لگی۔ اس سے پیشتر بھی دہلی سے گورنر بہار پر حکمرانی کرنے کے لئے آتے تھے اور اپنے ساتھ ادبی ماحول بھی لاتے تھے لیکن فرخ سیر کے پٹنہ میں تخت نشیں ہونے کے بعد بہار نے علمی اور ادبی حیثیت سے بہت کچھ ترقی کی۔

جس طرح بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں صوفیاے کرام کے اخلاق اور ان کی روحانی قوتوں کے باعث عالم میں پھیلا۔ اسی طرح اردو کی تعمیر اور ترویج میں بھی بادشاہوں سے زیادہ صوفیائے کرام کا دخل رہا۔ یہ جہاں کہیں جاتے اپنا ایک مشن لے کر جاتے اور وہاں کے لوگوں کو ان ہی کی پراکرتوں کی مدد سے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبانوں میں اسلام کی تبلیغ کرتے، امرا اور رؤسا کی طرح انھیں اس ملک کے عام باشندوں سے ملنے جلنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوتا۔ وہ باشندوں سے بے تکلفانہ اپنے بھائیوں کی طرح ملتے۔ ان سے ہر طرح کی باتیں پوچھتے اور اپنی اچھی اچھی باتیں انھیں بتاتے۔ اسی طرح ایک حد تک غیر شعوری طریقہ پر ایک مخلوط زبان کی بنیاد پڑ جاتی۔

دکن میں اردو کی ابتدا و ارتقا پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ آٹھویں صدی ہجری میں وہاں کے صوفیائے کرام

---

[1] سید عماد الدین عماد کا شعر ہے: ؎ جب بیچ چمن کے فصل بہاری آوے ہے ÷ تب جوش جنوں تلوا میرا کھجلاوے ہے

[2] غلام نقشبند سجاد کا شعر ہے: ؎ توڑا ہے وہ کب کا تقویٰ کو بھٹی میں تو اس کی گزرے ہے ÷ سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو سجاد ستی

[3] بیدل کا مشہور شعر ہے: ؎ جب دل کے آستاں پر عشق آنکر پکارا ÷ پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

کی زبان مبارک سے بے شمار اردو نما الفاظ نکلے ہیں۔ مثلاً حضرت زین العابدین خلد آبادی (متوفی ۷۷۱ھ) کا وفات کے وقت یہ فرمانا "منجھ مت بلاوہ"[1] (یعنی مجھے مت بلاؤ) اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ اس طرح کی زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (متوفی ۸۲۵ھ) کی طرف حسب ذیل اشعار کا منسوب کیا جانا بھی اس پر دال ہے ؎

پانی میں نمک ڈال مزہ دیکھنا اسے   جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

یوں کھوے خودی اپنی خدا ساتھ محمدؐ   جب گھل گئی خودی تو خدا بن کوئی دستے (دکن میں اردو صفحہ ا)

دکن کی مانند بہار میں بھی اُردو کی ترویج و تعمیر کا سہرا صوفیائے کرام ہی کے سر رہتا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری سے بہار میں اولیائے کرام کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ جھنداوان، منیر، اور بہار شریف کی خانقاہیں اس پر گواہ ہیں۔ یہاں وہ لوگ تبلیغ و نصیحت اسی مخلوط مگدھی زبان میں کرتے اور اس طرح ان کی خدمات رشد و ہدایت نے ہماری زبان پر گہرا اثر ڈالا۔[2]

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی طرح آپ کے زبان مبارک سے بھی اردو نما الفاظ مخلوط مگدھی اکثر نکلے ہیں۔ مثلاً آنکھ کے درد کے لئے آپ کا یہ نسخہ بہت مشہور ہے: ؎

لودہ پھٹکری مردار سنگ   ہلدی زیرا ایک ایک ٹنگ

افیوں چنا بھر مرچیں چار   اُرد برابر تھوتھا ڈال

پوست کے پانی میں پوٹری کریں   آنکھ کے پیر اترتے ہریں

میں اس کے علاوہ چند ایسی مثالیں بھی پیش کرنی چاہتا ہوں جو پرانی بیاضوں میں چھپی رہنے کے باعث شاید

---

[1] روضۃ الاقطاب مصنفہ رونق علی ۱۲

[2] حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ ۷۲۵ھ میں بہار تشریف لائے۔ آپ کی سنہ ولادت ۶۶۱ ہجری ہے۔ آپ بہت بڑے بزرگوں میں گزرے ہیں۔ بہار میں آپ کی خانقاہ ابھی تک موجود ہے۔ بہار سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ایک مقام راجگیر ہے وہاں بھی آپ نے ایک عرصہ تک ریاضت کی ہے۔ آج کل راجگیر آپ کی وجہ سے مسلمانوں کی بہت بڑی زیارت گاہ بنا ہوا ہے ۱۲

اب تک عام طور پر لوگوں کی نظر سے نہ گزری ہوں۔ جناب سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بہار ولیسنہ لائبریری کے ایک قلمی نسخہ کے حوالہ سے حضرت مخدوم جہاں کے چند فالنامے نقل کئے ہیں لیکن مندرجۂ ذیل فال نامہ ان سبھوں کے علاوہ ہے۔ اس کے لئے میں مشکور ہوں جناب سید شاہ نجم الدین صاحب نجم کا جنھوں نے نہ صرف اپنے ذاتی کتب خانہ اور خاندانی قلمی بیاضوں کو دکھلا کر مجھے مستفیض ہونے کا موقع دیا بلکہ اپنی یادداشت سے بھی بہت سی کارآمد باتیں بتا کر میری مدد فرمائی۔

فالنامہ :- دس چار کچھ اگم آوے آٹھ پانچ پہل مانگے پاوے

تین گیارہ پہنچے راج نو سو سترہ کرے اکاج

اس کے علاوہ آپ کا ایک شعر یہ بھی ہے

شرفا گورڈا دن نس اندھیاری رات ۔ واں نہ پوچھے کون تمہاری جات ذات

حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے جانشین مولانا مظفر بلخیؒ[1] قدس سرہ کی زبان مبارک سے بھی بعض جملے اور اشعار اسی طرح کے نکلے ہیں۔ مثلاً آپ کا یہ دوہا ہے

جی لگن میں ہے کہ آئیں ہیں سہانی رتیاں جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائیں گتیاں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں صوفیا کا کیا مذاق تھا اور اردو کی نشو و نما کا کیا اسلوب تھا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بہار میں اُردو شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی اور بہار میں اُردو کا سب سے پہلا شاعر کون ہے۔

یوں تو حضرت خسروؒ کے عہد سے قبل کے ایک بہاری شاعر کا ایک شعر میں نقل کر چکا ہوں جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت خسروؒ سے پہلے بہار میں اُردو کا ہیولیٰ تیار ہو چکا تھا اور اہل بہار اس سے کافی مانوس ہونے لگے تھے۔

---

[1] مولانا مظفر بلخی قدس سرہ ۷۸۲ھ میں اپنے پیر مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ ۷۸۸ھ میں راہی ملک عدم ہوئے۔ مولانا کے ملفوظات اور تصنیفات بے شمار ہیں۔ دو سو کے قریب ان کے مکاتیب بھی ہیں جس کو مولوی عبدالرحمٰن خاں بہاری نے ترجمہ کر کے مع متن کے طبع کرانا چاہا تھا مگر زمانہ نے مساعدت نہ کی اور تیس مکاتیب سے زیادہ طبع نہ ہو سکے۔ بقیہ قلمی مکتوب مع ترجمہ کے میرے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ آپ کا ایک فارسی مطبوعہ دیوان بھی ہے۔

بعض مورخین نے مرزا بیدل کے سر پر اولیت کا تاج رکھا ہے لیکن ملا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی بیدل سے پہلے گزرے ہیں۔ عظیم آباد کو ان کے مسکن اور مدفن دونوں ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہ عالمگیر کے عہد میں تھے اور شاہجہان کا آخری زمانہ بھی انہوں نے دیکھا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لکھنؤ کا تو کیا ذکر دہلی میں بھی کوئی اردو کا شاعر موجود نہ تھا۔ فارسی کے علاوہ ان کا اردو کلام بھی ملتا ہے۔ ان کی اردو شاعری سعدی دکنی وغیرہ سے ملتی جلتی ہے۔

مولف نوائے وطن نے ملا علیم تحقیق کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"عظیم آباد کے حکام اور صوبہ دار ملا صاحب کی بہت عزت کرتے تھے اور مسند پر اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔"

ملا صاحب کے دو اشعار نمونۃً درج ذیل ہیں :ـ

سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دہا ہے | دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں میرے چندھرا ہے
جمگھڑا باندھ دلموں سما جا | سلو سانورے ادھر کوں آجا

ملا محمد علیم تحقیق ہی کے ہم عصر سید عماد الدین عماد (۱۰۶۵ھ – ۱۱۲۴ھ) اور غلام نقشبند سجاد (۱۱۱۶ھ – ۱۱۷۳ھ) ہیں۔ یہاں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جب لکھنؤ اور دہلی میں کسی اردو شاعر کا وجود نہ تھا اس وقت بہار میں کئی اردو شعرا موجود تھے۔

ملا محمد علیم تحقیق کا جنھیں میں نے بہار میں اردو کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کیا ہے۔ ذکر اوپر ہو چکا اور میں نے ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کر دیا ہے۔ اب ذرا ان کے ہم عصر عماد صاحب کا بھی کلام ملاحظہ ہو :ـ

بیچ نظر کے ادھر ادھر ہر دم آوے جاوے ہے | بل بے ظالم تس پر ٹک دیکھے کو ترساوے ہے
جب ستی چھوڑس[1] کھانا پینا تیرا دوانہ الفت میں | خون جگر کا پیوے ہے اور غم غصہ کو کھاوے ہے
آوے اپنے ہاتھ وہ مورکھ نہیں عماد اب اس کی آس | اس کے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

اس سلسلہ میں سجاد کے بھی چند اشعار سن لیجئے :ـ

بھٹی[2] کو چلا ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجاد ستی | تھارات تک تو کام اس کو اشغال ستی اور اد ستی

---

[1] یہ لفظ ابھی تک بہار میں مستعمل ہے ۱۲ [2] از رسالہ نگار جنوری ۱۹۳۵ء

ٹک میری طرف سے بادِ صبا کہتی جا کر صیاد ستی
اب جان لبوں پر بلبل کے پہونچی تیری بیداد ستی

تنہائی فرقت میں اپنا گیا کیا نہ یہ دل گھبراوے ہے
بہلے ہے جو یہ ٹک ناشدنی تو صرف تمہاری یاد ستی

جب آگ دھندکتی ہو اس پر مت چھینٹو تیل خدارا تم
کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو یارو تم اک ناشاد ستی

اے بادِ سحر اے موجِ صبا لے جلد ہماری آ کے خبر
نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امداد ستی

سن پایا ہے اس نے دل میرا کعبہ ہے یہ گھر اللہ کا ہے
اب کھود کے اس کو پھینکوادے وہ بت نہ کہیں بنیاد ستی

جو دیکھ کے ہم کو ہاتھ ملے پچتاوے اور افسوس کرے
بتلاؤ کوئی شکوہ کریں کیا ایسے ستم ایجاد ستی

ٹھانا تو بہت اب جاویں گے ہرگز نہ کسی کے کوچہ میں
ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دلِ ناشاد ستی

توڑا ہے وہ کب کا تقوی کو بھٹی میں تو اس کی گزرے ہے
سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو اب سجاد ستی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہار کی شاعری کا کوئی خاص اسکول نہیں ہے بلکہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کی پیرو ہے لیکن اس کی تاویل کیوں کر کی جائیگی کہ اگر آشکی اور حالی نے خواجہ میر درد کو اپنا استاد بنایا، تو میر تقی میر نے بھی جعفر عظیم آبادی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ ان کے علاوہ غالب نے بھی مرزا بیدل عظیم آبادی کا کلام سامنے رکھکر مشق سخن کی ہے۔ ایک جگہ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں [۱]

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا ۔۔۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے

میرا ذاتی خیال ہے کہ اسکول کی ضرورت شاعری کو ہوتی ہے نہ کہ شاعر کو۔ باکمال شاعر بجائے خود ایک اسکول ہوتا ہے۔

جس وقت دہلی کی فضا اشرف، فطرت اور طالب آملی وغیرہ کے زمزمۂ شعر و سخن سے گونج رہی تھی اسی زمانہ میں بہار کا بیدل حیات شعری، رموز حکمت اور اسرار معرفت میں حکیم رومی کے دوش بدوش کھڑا تھا اور فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کی خدمت سے بھی بے خبر نہ تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ اب تک بیدل کے صرف تین شعر اُردو کے ملے ہیں۔

---

[۱] حیات فریاد مولفہ علامہ شاد صفحہ ۱۵۰

جیسا اوپر تذکرہ آچکا ہے بیدل سے پہلے بہار میں اُردو شاعری کی ابتدا ہوگئی تھی لیکن بیدل کے زمانہ سے بہار میں اُردو شاعری کا اسکول قائم ہوا۔ بہار اسکول کی اُردو شاعری میں بیدل کا اسکول یقیناً سب سے پہلا کہا جا سکتا ہے۔ غلام نقشبند سجاد اور فغاں وغیرہ کی شاعری بیدل اسکول سے اثر پذیر ہے۔

بیدل کی وفات کے تقریباً چوہتر سال بعد راسخ عظیم آبادی کی شاعری کا زمانہ آتا ہے۔ تیرہویں صدی ہجری میں راسخ کا شہرۂ شاعری عام ہو چکا تھا اور ان کا حلقۂ تلامذہ بھی کافی وسیع اور موقر ہو گیا تھا۔ انور علی یاس[1] (متوفی ۱۲۶۲ھ) وغیرہ کی شاعری راسخ اسکول سے اثر پذیر ہے' جیسا کہ یاس نے ایک جگہ اس کا اظہار بھی کیا ہے: ؎

یاں طرز سخن میں اے یاس　　راسخ کے یادگار ہیں ہم

راسخ کے متعلق بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ یہ میر کے شاگرد تھے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مزید خیالات کے اظہار صفحات آیندہ میں ہوں گے۔

بیدل اور راسخ کے علاوہ ایک اسکول بلگرامی سادات کا ہے خورشید' امامی اور صفیر وغیرہ اسی خانوادہ کے اہل کمال گزرے ہیں مولانا اسمعیل مہر' واجد حسین وحد اور امیر حسین بدر وغیرہ کی شاعری اسی اسکول کی منت پذیر ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی اسکول ہیں جن کو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

شعرائے بہار کے تذکرہ کے لحاظ سے میں اس مضمون کو چار دَور میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلے دور میں چند شعرائے متقدمین کا تذکرہ کروں گا۔ دوسرے میں متوسطین اور تیسرے میں متاخرین کا۔ ان تین ادوار کے علاوہ ایک دور موجودہ شعرا کا بھی ہوگا تاکہ ضمناً یہ بھی معلوم ہو جائے کہ بہار کی موجودہ شعر و شاعری کا کیا رنگ ہے۔

بر سبیل تذکرہ یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ میں شعرا اور ان کے کلام کے انتخاب میں مطبوعہ کتب کے علاوہ زیادہ تر ان بزرگوں کا رہین منت ہوں جن سے فرداً فرداً مل کر میں نے استفادہ کیا ہے اور ان کے علم سینہ سے خوشہ چینی کی ہے۔

---

[1] مفتی انور علی یاس فارسی اور عربی کے ایک جید عالم تھے۔ آرہ وطن تھا۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شاعری کرتے ان کا دیوان بھی طبع ہو　ہے۔ رسالہ کساتی ۱۹۳۲ء کے سالنامہ میں ان کی حالات زندگی اور شاعری پر بالتفصیل تبصرہ موجود ہے۔

چوبی چہرہ (افریقی)

اس مقالہ کی طیاری میں میں نے خصوصیت کے ساتھ بہار کے اکثر مقامات کا دورہ کیا اور وہاں کے ان بزرگوں سے جو اس وقت اپنے علم وفضل کے اعتبار سے بہار کے چشم و چراغ ہیں مل کر بہت سے مفید معلومات حاصل کی ہیں۔

پرانے قلمی نسخوں اور بیاضوں کی تلاش میں مشہور لائبریریوں کے علاوہ بعض ذاتی کتب خانوں کی بھی چھان بین کی ہے۔ میں اپنے بزرگوں کا بدل سپاس گزار ہوں۔

اس سلسلہ میں مجھے بہت سی کارآمد معلومات اپنے ذاتی کتب خانہ سے حاصل ہوئیں اور اس کے لئے میں اپنے ان بزرگوں کو جنھوں نے ان قلمی جواہر پاروں کو جمع کیا ہوگا دعاءِ خیر سے یاد کرتا ہوں خدا جزائے خیر سے مشرف فرمائے۔

مطبوعہ کتب میں زیادہ تر خمخانۂ جاوید، گلشنِ بیخار، نکات الشعرا، گلشن ہند، بزم سخن، مخزن نکات، چمنستان شعرا، تذکرہ جلوۂ خضر، تذکرہ نساخ، تذکرہ شعرائے اردو، نوائے وطن، گل رعنا، تذکرہ گلشن حیات، شعرالہند، تذکرہ گلزار ابراہیمی، تذکرہ شعرائے بہار اور مختلف و متعدد رسائل و جرائد سے مدد لی گئی ہے۔

دورِ متقدمین

(۱) مرزا عبدالقادر بیدلؔ جن کے بارہ میں حضرت غلام علی آزادؔ[۱] بلگرامی فرماتے ہیں:-

"عمدہ سخن طرازان وشہرہ تحریر پردازان ست، در اقسام نظم پایہ بلند و در اسالیب نثر رتبۂ ارجمند دارد۔ طبع دراکش چہ قدر معانی بہم رسانده وچہ ثمرہا نورس کہ از نہال قلم افشانده خلاصہ کلامش شراب میخانۂ ہوشیاراں وطلائے دستمانہ کامل عیاران ست از آغاز شعور تا دم آخر چشم بر سیمائے معنی دوختہ و چراغ عجیبے بر مزار خود افروختہ۔"

اس وقت جب کہ ولیؔ دکنی کا غلغلہ دکن سے دہلی تک بلند ہو رہا تھا۔ بیدلؔ کی شاعری مہ و انجم بن کر بہار پر پرتو فگن تھی۔ بیدلؔ ہی نے دکن کے مقابلہ میں شمالی ہند کی لاج رکھ لی۔

---

[۱] یہ وہی سید غلام علی آزاد بلگرامی ہیں جنھیں شاہ یمن نے "حسان الہند" کا خطاب دے کر شقہ مع خلعت فاخرہ کے عنایت فرمایا تھا۔ عرب میں ان ہی حضرت کا عربی دیوان داخل درس ہے۔ آپ سید محمد نوح بن سید فیروز بن سید اللہ داد کے فرزند ہیں۔ ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ میں بمقام بلگرام آپ کی پیدائش ہوئی۔ عربی وفارسی دونوں کے بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ تخلص آزاد کرتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں تیرہ چودہ کتابیں بہت زیادہ مشہور ہیں۔

مرزا بیدل آدمی فقیر دل اور صوفی منش تھے۔ دنیاوی عزت و ثروت و شہرت و ناموری کی انھیں کبھی خواہش نہ ہوئی۔ یہ ان کا سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے کبھی بادشاہوں اور امیروں کی بیجا تعریف سے اپنی زبان کو آلودہ نہ کیا۔ ایک دفعہ اعظم شاہ نے ان سے اپنی مدح سرائی کی فرمائش کی۔ تو انھوں نے فقر و قناعت کو اس کی مدح سرائی پر ترجیح دے کر ہمیشہ کے لئے اس کا دربار چھوڑ دیا۔

مرزا صاحب کی طبیعت میں سیر چشمی اور خودداری بہت تھی۔ نظام الملک باوجود اس کے کہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا لیکن انھوں نے اس کے دربار میں جانا پسند نہ کیا۔ نظام الملک کی طلب پر یہ مشہور شعر لکھ کر بھیج دیا: ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش ٭ من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

مولف جلوۂ خضر' حضرت آزاد بلگرامی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

"(بیدل) بلدہ عظیم آباد پٹنہ[۵۱] میں پیدا ہوئے اور ہندوستان میں نشو و نما پائی۔"

مرزا سرخوش سے بڑھ کر مولف خمخانہ جاوید' نے بیدل کے بیان میں غیر ذمہ داری اور بے پروائی سے کام لیا ہے۔ معلوم نہیں قابل مولف نے کس کتاب کے حوالہ سے بیدل کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"مولانا مرزا عبد القادر[۵۲] بیدل اصل وطن توران تھا۔ مگر یہ بخارا میں پیدا ہوئے۔"

تعجب ہے کہ صاحب خمخانۂ جاوید کی نظر سے نہ تذکرہ جلوہ خضر گزرا اور نہ آزاد بلگرامی کا تذکرہ "سرو آزاد" ورنہ وہ شاید ایسی صریح غلطی نہ کرتے۔

مرزا بیدل فارسی اور اردو دونوں کے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ یہ اردو کی بد قسمتی ہے کہ ان کا اردو کلام بہت کم پایا جاتا ہے لیکن اردو کے وہی چند اشعار جو ملتے ہیں ان کی قادر الکلامی پر دال ہیں۔ فارسی کی طرح ان کے اردو کلام میں بھی زور بیان اور پاکیزگی خیال نمایاں ہے۔

مولف "چمنستان شعرا" اور میر صاحب وغیرہ نے بیدل کے صرف دو اشعار اردو کے لکھے ہیں حضرت صفیر بلگرامی نے سید موسیٰ کاظم بلگرامی کی ایک بیاض کے حوالہ سے بیدل کے ایک اور اردو شعر کا اضافہ کیا ہے نجیب اشرف صاحب ندوی نے اپنے ایک مضمون میں بیدل کی طرف ایک مزید شعر منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ

---

۵۱ تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول صـ۹۵ ۵۲ خمخانہ جاوید جلد اول صـ۴۲۰

نہیں لکھا کہ آخر یہ شعر انھوں نے کہاں سے لیا۔ پروفیسر نجیب صاحب نے غالباً یہ شعر اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ اس عہد میں اُردو کی ابتدا ہونے کے باعث بیدؔل کے اُردو کلام میں بھی اکثر الفاظ بھاشا کے آ گئے ہیں چنانچہ ان کے الفاظ ہیں :-

"اس[1] عہد میں اُردو کی ابتدا تھی اور اس میں اکثر الفاظ بھاشا ہی کے ہوتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت بیدؔل گردش روزگار سے چلنے لگے تو اپنی مُنھ بولتی ماں کے ہاں جو ایک تیز اور حاضر جواب کٹن تھی رخصت ہونے گئے تو کہا ؎

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آپو کیس
پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدیس"

مجھے اس شعر کا بیدؔل کی طرف منسوب کئے جانے سے اختلاف ہے۔ قابل مضمون نگار کو اس شعر کے نقل کرنے سے قبل اس کے ماخذ کا حوالہ ضرور دینا چاہئے تھا۔

مرزا صاحب نے اُردو میں طبع آزمائی ضرور کی ہے اور اپنے معاصرین میں کسی سے کم بھی نہیں رہے ہیں لیکن ان کا اصل میدان فارسی ہے۔ فارسی کلام ان کا بڑے پایہ کا ہوتا ہے۔ ان کی قابلیت اور علمیت کا لوہا ہر شخص مانتا تھا۔ حد یہ ہے کہ میرؔ جس نے کبھی کسی شاعر کی تعریف جی کھول کر نہ کی ان کے متعلق فرماتے ہیں :-

"شاعر[2] پر زور فارسی، صاحب دیوان پنجاہ ہزار بیت و مثنویات وغیرہ .... از مذاق شعر او دریافتہ می شود کہ بہرہ کلی از عرفان داشت۔"

مرزا صاحب کی شاعرانہ قادر الکلامی اور عالمانہ صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف چمنستان شعرا لکھتے ہیں :-

"مانی[3] ارژنگ نگار معانی و اقلیدس سحر کار سخندانی ست۔ مستشرقان نازک خیالی از انوار آفتاب ضمیر انورش روشنی گیر جاوید گردیدہ ... ... حقا کہ در سرزمین ہندوستان مثل این سخن پناہ صاحب کمالے بقید از خواب عدم سر برنداشتہ۔"

---

[1] رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۳ء صفحہ ۵۸ [2] نکات الشعرا صفحہ ۲ [3] چمنستان شعرا صفحہ ۴۴

میر حسن نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :-

"مرزا عبد القادر بیدل[1] صاحب طرز فارسی تعریف او در تذکرہائے فارسی مسطور ست بندہ راچہ یارا شمہ از احوال آں عارف باللہ رقم نماید دو شعر ہندی ازاں بزرگوار مسموع شدہ نور اللہ مرقدہ"

میرزا صاحب ماہ صفر ۱۱۳۳ھ میں واصل بحق ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات یہ ہے :-

سر برآوردۂ ارباب سخن[2] | از غم آباد جہاں خورم رفت
گفت تاریخ وفاتش آزاد | میرزا بیدل ازیں عالم رفت

میرزا بیدل کے اردو کے چند اشعار درج ذیل ہیں :-

شہرۂ حسن[3] سے از بسکہ وہ محجوب ہوا | اپنے چہرہ سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا
مت پوچھ[4] دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں | اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب[5] دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا | پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

(۲) جوشش۔ یہ میاں شیخ محمد روشن جوشش عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کی تاریخ وفات کے متعلق تو کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن میر حسن کے اس جملہ سے "شخصے می گفت کہ او در تالیف تذکرہ مشغول ست" ان کا میر حسن کا ہم عصر ہونا ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن جس زمانہ میں اپنا مشہور تذکرہ مرتب کر رہے تھے۔ جوشش بھی ایک تذکرہ لکھنے میں مشغول تھے۔

مولف بزم سخن نے ان کے متعلق بہت مختصر نویسی سے کام لیا ہے لیکن ان کے اسی ایک سطر سے جوشش کے فضل و کمال کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"شیخ[6] محمد روشن جوشش باشندہ عظیم آباد فکر بلند و خاطر ارجمند داشت از عروض بہرۂ وافی نصیبش کردہ بودند"

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو مولفہ میر حسن صفحہ ۵۹ [2] چمنستان شعرا صفحہ ۴۴ [3] جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۹۸
[4] تذکرہ شعرائے اردو مولفہ میر حسن صفحہ ۵۹ [5] مولف جلوۂ خضر نے اس شعر کو اس طرح لکھا ہے :-
اس دل کے آستاں پر جب عشق آ پکارا ؎ پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں [6] بزم سخن صفحہ ۳۷

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ان کی علمیت اور شعر دانی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"جوشش تخلص، شیخ محمد روشن از تازہ خیالان عظیم آباد ست۔ شعرش صاف وسخنش فکرش دلپذیر و دلکش شیوۂ گزیدہ اش گزیدہ طرز پسندیدہ اش پسندیدہ و معہذا در فکر فن عروض بسیار مہارت دل خواہ داشت۔"

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

وہ زمانہ کیا ہوا جو مری گریہ میں اثر تھا ـــــ یہی چشم خونفشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

جیسا کہ دل پہ زخم ہے اس کے خدنگ کا ـــــ گلشن میں ایک گل نہیں اس آب و رنگ کا

اس کی آنکھوں کو دیکھیں اے جوشش ـــــ منھ تو دیکھوں شراب خواروں کا

جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش ـــــ ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ پایا

کل جو اسے دیکھکر ہو گئے ہم بے خبر ـــــ ہنس کے وہ کہنے لگا پھر بھی ادھر دیکھنا

حیران ہوں کس طرح وہ انساں میں جلوہ گر ـــــ جلوہ سے اس کے طور تو جل خاک ہو گیا

نہ پھولتے ہیں شگوفے نہ غنچے کھلتے ہیں ـــــ چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا

دیکھئے ہم میں اور ان آنکھوں میں کیا ہوتی ہے ـــــ لہو کے پیاسے ہیں وہ تشنۂ دیدار ہیں ہم

دود کی طرح میں دل سوختہ جاتا ہوں جدھر ـــــ اپنے احوال پہ عالم کو رلاتا ہوں

بیکسی سے یہی گلا ہے مجھے ـــــ تھام لیتی ہے دستِ قاتل کو

اس کی رنجش کا تجھے خوف عبث ہے جوشش ـــــ ہو چکا ہے وہ اسی طرح سے سو بار خفا

جوشش کے کلام میں جہاں عروض دانی کا کمال پایا جاتا ہے وہاں ان کے خیالات کی بلندی، بندش کی چستی زبان کی شستگی اور بیان کی روانی بھی قابل داد ہے۔ جوشش کے ہر شعر میں جدّت پائی جاتی ہے۔

(۳) شیخ محمد عابد دل - یہ حضرت شیخ محمد روشن جوشش کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مورخین نے ان کو جسونت رائے ناگر کی اولاد میں لکھا ہے۔ وطن عظیم آباد تھا۔ اپنے ہم عصروں میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی دونوں کے جیّد عالم تھے۔ فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو کا کلام بہت صاف اور پاکیزہ ہوتا ہے

لہ تذکرہ گلشنِ بیخار صہ ۵۱

مؤلف خمخانۂ جاوید ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" دل۔ شیخ محمد عابد متوطن عظیم آباد اپنے زمانہ کے بے مثل اور بے نظیر عالم تھے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ غرضکہ آپ سنجیدہ اطوار حمیدہ خصال اور طریقۂ یکرنگی میں بے مثل سمجھے جاتے تھے "

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :-

تیری زلفوں سے بہت دن ہی اسیر ہوئی ــ نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل

نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں ــ ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

چوں آئینہ یہ ستم رسیدہ ــ رہتا ہے مدام آب دیدہ

تمہارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی ــ برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

(۴) میر مظہر علی جذب عظیم آبادی۔ فارسی اور اردو دونوں میں کلام موزوں کرتے تھے۔ میر حسن کے زمانہ میں موجود تھے۔ سوائے تذکرہ شعرائے اردو کے اور کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا اور وہ بھی بہت مختصر۔ میر حسن صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں :-

" میر مظہر علی المتخلص بہ جذب در عظیم آباد استقامت دارد گاہ گاہے فکر ریختہ می نماید۔ سلامت باشد "[۱]

جذب کا یہ شعر مشہور ہے۔ ملاحظہ ہو :-

ہے جنوں کا زور طوفاں اندنوں ــ میں ہوں اور میرا گریباں اندنوں

(۵) علی نقی خاں انتظار کے حالات بھی جذب کی طرح بیشتر پردۂ فنا میں ہیں۔ تھوڑی بہت رہبری میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

" علی نقی خاں المتخلص بہ انتظار بعرف عظیم آباد استقامت دارد از احوالش معلوم نیست سلمہ اللہ تعالیٰ "[۲]

انتظار کا صرف ایک شعر راقم السطور کو یاد ہے۔ ملاحظہ ہو :-

صدف مشتاق ہیں دریا میں لے نیساں گوہر کے ــ یہ میری چشم پہ پھینکے ہیں بھر بھر کر خوان گوہر کے

---

[۱] تذکرہ شعرائے اردو مؤلفہ میر حسن ص ۶ [۲] تذکرہ شعرائے اردو ص ۹۵

(۶) راجہ بہادر المتخلص بہ راجہ یہ وہی راجہ بہادر ہیں جن کے والد راجہ شتاب رائے کے فیض و کرم کے دہلی اور لکھنؤ کے بہت سے شعرا منت کش ہیں۔ دہلی کے انحطاط کے بعد جو حالت لکھنؤ کی تھی وہی حالت راجہ شتاب رائے کے دربار کی تھی ہر طرف سے صاحبان فضل و کمال ہٹ سمٹ کر آتے اور مہاراجہ کے دامن علم پرور میں پناہ لیتے فغاں وغیرہ ان ہی کے دربار کے "رتن" ہیں۔

مولف خمخانۂ جاوید نے راجہ بہادر کے متعلق مختصر نویسی سے کام لیا ہے۔

نواب شیفتہ نے تذکرہ گلشن بیخار میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"راجہ تخلص، راجہ بہادر فرزند راجہ شتاب رائے ناظم بنگال و بہار بودہ"۔

اس وقت صرف ان کا ایک ہی شعر راقم السطور کو ملا ہے۔ جو پیش کرتا ہوں :-

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے ہم ان تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے

(۷) بیعت قلی خاں حسرت۔ فغاں اور آرزو وغیرہ کے ہم عصر بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے مولف گلشن ہند نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں :-

"(حسرت) بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے۔ بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے"۔

گلشن بیخار میں بجائے بیعت قلی خاں کے ہیبت قلی خاں لکھا ہے لیکن میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔

مولف گلشن بیخار ان کو مرزا مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"حسرت تخلص ہیبت قلی خاں نام از اہل عظیم آباد دست کسب سخن از مرزا مظہر کردہ"۔

کلام کا نمونہ یہ ہے :-

رات کا بیچ ہوا خواب مرا ٭ مل گیا صبح آفتاب مرا

زلف و رخ یار دیکھتا ہوں ٭ لیل و نہار دیکھتا ہوں

فرہاد سے ہمسری کرے کون ٭ سر کس کا پھرا ہے یوں مرے کون

———

سنا ہے آج میخانہ میں جام مے پہ مستوں نے | لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہے | اودھر بہار اِدھر ایک شیشۂ دل ہے

غزل کے ساتھ ساتھ دو رباعیاں بھی ملاحظہ ہوں :-

زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ | کہتا ہے کہ کافر ہے تو اے روئے سیاہ
ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یارو | آتا ہے وہ بُت دیکھو اللہ اللہ

میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی | زاہد و واعظ سے دور بھٹکی بھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز | یہ دخترِ رز ہی جس سے اٹکی اٹکی

(۸) **میر غلام حسین شورش** - عظیم آباد کے بلند پایہ شاعروں میں گزرے ہیں - میر محمد باقر حزیں سے اصلاح سخن لیتے تھے - مولف شعرالہند نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے لکھتے ہیں :-

"(شورش[1]) عظیم آباد کے رہنے والے ہیں - اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا ہے - میر باقر حزیں کے شاگرد ہیں - کلام کا رنگ استادانہ ہے"

ان کی سنہ پیدائش کا علم نہیں - سنہ وفات میں تذکرہ نویسوں نے اختلاف کیا ہے - نواب شیفتہ ۱۱۹۰ھ میں ان کی رحلت بتاتے ہیں :-

"شورش[2] تخلص میر غلام حسین از ارباب عظیم آباد ست .... وفاتش در ۱۱۹۰ھ نوشتہ اند"

تذکرہ کریم الدین میں سنہ وفات ۱۱۹۵ لکھا ملتا ہے لیکن میرے خیال میں نواب شیفتہ کی رائے زیادہ صحیح ہے - میں نے اور بھی کئی تذکروں میں سنہ وفات ۱۱۹۰ ہی دیکھا ہے - "پٹنہ خدابخش خاں کی لائبریری" میں گلشن بیخار کا جو ایک قلمی نسخہ ہے اس میں بھی ۱۱۹۰ھ ہی لکھا ہے - یہ نسخہ ۲۵ شوال ۱۲۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور اس لئے قدامت کی بنا پر زیادہ قابل قبول ہے -

---

[1] شعرالہند جلد اول ص۱۵۹ [2] گلشن بیخ - ص۱۱۴

مولوی کریم الدین صاحب نے اپنے تذکرہ میں شورش کو مغرور اور متکبر لکھا ہے لکھتے ہیں :-

" شورش خواہر زادہ ملا[1] میر وحید اور شاگرد میر باقر حزیں کا بہت مغرور اور متکبر تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے ۱۱۹۵ھ میں فوت ہوا"

مولف گلشن بنجار نے ایک شعر ان کا نقل کیا ہے :- ؎

رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش | ہوا کرے ہیں ہے یار اپنے کام سے کام

مولف شعر الہند نے ان کی ایک رباعی لکھی ہے وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے :- ؎

کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام | قسم مغاں کی ہے ساقی کے مجھکو نام سے کام
ہماری صبح رخ یار شام زلف نگار | نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح و شام سے کام

(۹) شاہ رکن الدین عشق۔ یہ حضرت شاہ گھسیٹا کے نام سے بہت زیادہ مشہور تھے۔ ان کے فضل و کمال کا کیا کہنا، میاں فدوی ان کے شاگرد عقیدت کیش، میر حسن ان کے ثنا خواں اور کون تذکرہ نویس ایسا ہے جس نے ان کا تذکرہ عقیدت و ارادت کے جذبہ سے متاثر ہوئے بغیر کیا ہو۔ میر حسن صاحب اپنے تذکرہ میں کچھ عجیب ارادتمندی کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

" خورشید سپہر[2] حال و سپہر خورشید کمال مالک کنوز دقائق و کاشف رموز حقائق کلامش بہ مذاق تصوف آشنا و نور صفائے باطنش چوں آئینۂ صبح دل کشا در عین صفا۔ عارف صاحب کمال و درویش بے مثال عرف مرزا گھسیٹا المتخلص بہ عشق۔ مرد صوفی ست کہ خیل مریداں و معتقدان حلقۂ غلامی دارند۔ الحال از مدتے ترک روزگار نمودہ بہ عظیم آباد مقیم ست۔ مرزا فدوی از شاگردان و معتقدان اوست۔ شعر عارفانہ در کلامش بسیار ست"

ممکن ہے ہمارے بعض دوستوں کو یہ اعتراض ہو کہ شاہ گھسیٹا کو عظیم آبادی شعرا میں کیوں شمار کیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ عشق صاحب شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے لیکن کیا جس بہار نے انھیں اپنے دامن عاطفت میں پال کر پروان چڑھایا اسے اتنا بھی حق نہیں کہ وہ انھیں اپنے فرزندوں میں شمار کرے؟ میں نے قصداً فغاں اور میر محمد باقر حزیں کا ذکر عظیم آبادی شعرا میں نہیں کیا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بہار میں بہت کم عرصہ تک رہے لیکن شاہ گھسیٹا کا

---

[1] تذکرہ کریم الدین ص ۳۴۷ [2] تذکرہ میر حسن ص ۱۲۸ - ۱۲۹

جن کی زندگی اور شاعری کا بیشتر حصہ بہار کے ماحول کا منت پذیر رہا تذکرہ بہاری شعرا میں نہ کرنا ایک ناقابل معافی غلطی تھی۔ اگر ملکہ نورجہاں ایرانی نژاد ہونے کے باوجود ایک ہندوستانی ملکہ کہلا سکتی ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ میں شاہ گھسیٹا یا میاں فدوی کو عظیم آبادی شاعر نہ کہوں۔

نواب شیفتہ نے بھی عشق کو عظیم آبادی شاعر لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"عشق تخلص شاہ رکن الدین معروف بہ شاہ گھسیٹا از سخن پروران معروف عظیم آباد ست بوقار زندگی کردہ"[۵]

شاہ گھسیٹا ایک صوفی منش آدمی تھے اور اس لئے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ بہت کافی پایا جاتا ہے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے :

تیر کے نام پر تڑپتا ہے —— اس طرح کا کہیں جگر دیکھا

خانماں کر چکا ہوں میں برباد —— تو بھی وہ میرے گھر نہیں آتا

نے درد دل ہے باقی نے آہ و نہ فغاں ہے —— اے سوز عشق سچ کہہ تو ان دنوں کہاں ہے

ڈر سے اس کے زباں پہ حرف نہیں —— تس پہ ہے بدگمان کیا کیجئے

حرم میں نام سنا دیر میں نشاں دیکھا —— سوائے تیرے نہ دیکھا غرض جہاں دیکھا

کہ بعد قتل مجھکو کس طرح چین آئے —— جو حسرتیں دل میں سوجوں کی توں رہی ہیں

اوروں کا جگر یار جو تیروں سے لئے ہے —— یہ عاشق جاں باختہ کس دن کے لئے ہے

زلف نے جس کے تئیں دکھائی شام —— دوسری پھر اسے نہ آئی شام

دل لیکے پوچھتے ہو کہ دلدار کون ہے —— ہم کس طرح کہیں کہ طرحدار کون ہے

(۱۰) **مرزا محمد علی فدوی** - یہ میاں فدوی شاہ گھسیٹا کے خاص شاگردوں میں تھے۔ نظم ریختہ میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان کے ہم عصر انہیں ہجو کے نام سے زیادہ جانتے تھے۔

اپنے استاد شاہ گھسیٹا کی طرح یہ پیدا شاہجہاں آباد میں ہوئے لیکن پروان عظیم آباد میں چڑھے اور آج بھی

۵۔ گلشن بیخار صہ ۱۳۴

ریختہ کا یہ مایہ ناز شاعر عظیم آباد ہی کے ایک گوشہ میں محو خواب ہے۔ ابتدا میں احمد شاہ کے حضور میں وقائع نگاری پر مامور تھے۔ ایام جوانی ہی میں عظیم آباد چلے آئے تھے اور آخری وقت تک یہیں رہے۔ مولف گلشن بیخار نے ان کا تذکرہ کیا ہے لکھتے ہیں :۔

"فدوی[1] تخلص مرزا محمد علی نام مشہور بہ مرزا بچہ از سکنائے جہان آباد بوقائع نگاری در حضور احمد شاہ مامور بود آخر الامر بہ عظیم آباد سکونت وہ اصلاح از شاہ گھسیٹا عشق نمود۔"

فدوی صوفی منش تھے اور موسیقی کے دلدادہ۔ ان کی شاعری میں کمال فن کے علاوہ درد بہت کافی پایا جاتا ہے۔ مولف گلشن ہندان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"(فدوی[2]) نظم ریختہ میں استاد ہے تلاش معنی میں فکر رسا رکھتے تھے۔ اور بیان حسن میں دل درد آشنا علم موسیقی میں مناسبت رکھتے تھے .. .. چند روز مرشد آباد میں بسر کی .. .. آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا۔"

کلام کا نمونہ درج ذیل ہے :۔

گالیاں کیونکر نہ دیوے تو نے فدوی چھیڑ چھیڑ — ایک تو وہ تھا ہی اس کو اور بھی بد خو کیا

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے — عاشق کا جنازہ بھی ذرا دھوم سے نکلے

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گزرنا — مت بھول کے ہرگز مع اغیار گزرنا

ضد دیکھیو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر — مر جائے جو عاشق تو نہ زنہار گزرنا

بن ملے تو یہ حال ہے فدوی — وہ ملے گا تو کیا غضب ہوگا

کل یار کے کوچہ کی طرف گزرے گا فدوی — مت آج سے اس طرف کو اغیار گزرنا

ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گزرنا — پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گزرنا

تجھکو ان ہی آنکھوں کی قسم تیر نگہ ہے — ٹک دل کو بچا سینہ کے تو پار گزرنا

جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا — اے اشک تو ہو قافلہ سالار گزرنا

---

[1] گلشن بیخار ص ۱۴۷ [2] تذکرہ گلشن ہند ص ۱۳۲

(۱۱) حضرت شاہ احسان اللہ چشتی نظامی قدس سرہٗ المتخلص فخری حضرت مخدوم فرید طویلہ بخش کے جانشین اور اولادوں میں تھے۔ آپ بہار شریف محلہ چاند پورہ کی بزرگ ترین ہستیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شعر و سخن کا ذوق تھا۔ مگر کلام فارسی میں موزوں فرماتے۔ آپ کا اردو کلام نایاب ہے۔ اس مضمون کی ترتیب کے سلسلہ میں راقم السطور کا بہار شریف بھی جانا ہوا۔ وہاں میں حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے خاندان کے اکثر لوگوں سے ملا۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ سے مجھے حضرت فخری کی ایک نظم دستیاب ہوئی ہے جو میں شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتا ہوں۔ جس قلمی بیاض سے میں نے یہ نظم نقل کی ہے اس میں اس نظم کی وجہ تنظیم بھی فارسی میں لکھی ہوئی ہے۔ جس کا لبِّ لباب یہ ہے :- حضرت شاہ احسان اللہ چشتیؒ سے اور حضرت شاہ علیم الدین فردوسیؒ سجادہ نشین حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ سے خلوص و محبت کے گہرے تعلقات تھے۔ حضرت شاہ علیم الدینؒ کے کوئی اولاد ذکور نہ تھی جس سے یہ اکثر ملول خاطر رہا کرتے۔ چنانچہ ایک دن شاہ احسان اللہ چشتیؒ سے اظہار مدعا کیا۔ شاہ صاحب موصوف نے اپنے عزیز دوست کو حضرت مخدوم جہاں کے آستانہ پر حاضر ہونے کی صلاح دی اور خود یہ مناجات (زیر نظر نظم) لکھی اور پھر دونوں بزرگوں نے مخدوم جہاں کے آستانہ پر حاضر ہو کر بہ سوز گداز یہ مناجات پڑھی۔ دعا کی برکت سے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ عالم وجود میں آئے۔"

اس نظم کے آخر میں (مناجات) کا سنہ تنظیم ۱۱۸۵ ہجری لکھا ہے جس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عہد میں (یعنی ۱۶۸ برس قبل) بہار کی زبان کیسی تھی۔ مناجات یہ ہے: ؎

یا شرف دیں تجھ شرف سے جملہ عالم پر شرف   جملہ عالم پر شرف ہے تجھ شرف سے ہر طرف

ظلم کرنا چاہتا ہے حاسدِ ناداں حرف
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

ایک تو میں ہوں اکیلا دوسرے تن ساں ہے   تس اوپر ان حاسدوں کے ڈاہ کا گھمسان ہے

تم کرو آباد اس جنگل کو جو ویران ہے
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

سگ میں ہوں در کا تمھارے اپنا جھوٹا دو مدام   مت کھلاؤ تم کسی ناپاک کے گھر کا طعام

گرچہ بختی ہو مجھے پر دو، رکھو از حرام
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

جو مرادیں تھیں مری سب تمنے بر لایا شتاب　　شاد ہیں سب دوست میرے اور ہیں دشمن کباب
آرزو اک اور ہیں رکھتا ہوں اے عالی جناب
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

وہ مراد اب دل کی میرے زود تم حاصل کرو　　حاسد بدخو کی باتوں کے تئیں باطل کرو
دین اور دنیا میں مجھ پر اک نظر کامل کرو
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

یا شرف دیں تجھ ستی رکھتا ہوں میں یہ التجا　　شاہ علیم الدیں کو دے تو اک پسر بہرِ خدا
ورنہ چنگل میرا اور دامن ترا روزِ جزا
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

گرچہ سب احساں کیا احساں پر احسان ہے　　آرزو یہ دوسری پوری کرو تو جان ہے
یا شرف دیں جان کیا ایمان تک قربان ہے
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

سال ہجری گیارہ سو اسی اور اس پر پانچ ہے　　یہ حکایت بولتا ہوں تم سنو سب سانچ ہے
لگ رہی اب دل میں میرے عشق کی سو آنچ ہے
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

رات دن ہے درد فخری یا مظفر شاہ دیں　　یا مظفر شرف دیں حاجت روائے سرزمیں
آرزو کو تم سے پوچھوں دل کو ہے میرے یقیں
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہِ نجف

دورِ متوسطین

یہ شعرائے متوسطین کا دور ہے۔ مرزا بیدلؔ اور تحقیق کے مسند فاخرہ پر میاں راسخؔ، فردؔ اور آئینؔ وغیرہ جلوہ افروز ہیں۔ ان کی زبان پہلے شعرا کی بہ نسبت کافی صاف ہو چکی ہے۔ نہ وہ پرانی تراکیب ہیں اور نہ فارسی یا بھاشا کی بھرمار۔ الفاظ کے اخذ و ترک کی کارفرمائی ہے۔ اس دور کے نمائندہ شعرا حسب ذیل ہیں :-

(۱) شیخ غلام علی راسخؔ[1]۔ ولادت ۱۱۶۲ھ وفات ۱۲۳۸ھ) کسے خبر تھی کہ یہ عظیم آباد (پٹنہ کے ایک گاؤں "سائیں" میں پیدا ہونے والا شاعر ایک دن میر جیسے استاذ مستغنی ہستی سے خراج تحسین وصول کرے گا۔ آسمانِ شعر و شاعری کا آفتاب "مشرق" سے ۱۱۶۲ھ میں طلوع ہوا اور تمام عالم کا چکر لگا کر آخر ۱۲۳۸ھ میں "مشرق"[2] ہی میں جا چھپا۔ نواب شیفتہ نے اپنی تالیف گلشن بیخار میں راسخؔ کا سنہ وفات ۱۲۴۰ھ لکھا ہے۔

"راسخ تخلص غلام علی نام در سنہ یک ہزار و دو صد و چہل فوت شد"

لیکن گلشن بیخار کے علاوہ جتنے اور معتبر تذکرے ہیں سب میں راسخؔ کا سال وفات ۱۲۳۸ھ بتایا گیا ہے۔

راسخؔ صاحب کی تلامذت مختلف فیہ ہے۔ علامہ آزاد انھیں میرزا سوداؔ کا شاگرد بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ بہت سنجیدہ کلام ..... مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر سنائیے انھوں نے پڑھا : ؎

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے"

مرزا نے اٹھ کر گلے سے لگا لیا۔

مگر جناب شاد عظیم آبادی انھیں میر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اپنی تالیف نوائے وطن میں لکھتے ہیں :-

"جب شیخ راسخ ان سے ملنے گئے تو میر صاحب نے کہلا بھیجا کہ میاں کیوں ستانے آئے ہو"

لیکن جب شیخ صاحب نے ٹھیکری پر یہ شعر : ؎

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم مہر و ماہ کا
آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

لکھا تو میر صاحب فوراً گھر سے نکل آئے اور گلے سے لگا کر کہا کہ بھئی مزاج مبارک؟ کہاں سے آئے ہو اور

---

[1] راسخ محلہ لودی کٹرہ عظیم آباد میں مدفون ہیں۔ [2] گلشن بیخار ص ۸۵

کیوں مجھ غریب کو سرفراز کیا۔"

مؤلف خمخانۂ جاوید نے راسخ کو کہیں میر و سودا کا ہمعصر بتایا ہے تو کہیں شاہ گھسیٹا عشق کا شاگرد لکھا ہے عجب ثم العجب۔

جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار میں "ہمارا اسکول کی شاعری" کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھتے ہوئے عبدالمالک صاحب آروی۔ نے شیخ راسخ کو حضرت شاہ نورالحق تپاں کا شاگرد بتایا ہے۔ لیکن کوئی دلیل یا حوالہ اس کے ثبوت میں نہیں پیش کیا ہے۔ مجھے اس بیان سے اختلاف ہے۔

میں شیخ راسخ کے تلمذ کے بارہ میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ علامہ آزاد کے مطابق راسخ مرزا کے شاگرد تو ہرگز نہیں ہو سکتے۔ البتہ جناب شاد کی رائے سے صرف اس حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ راسخ نے میر صاحب کو اپنا کلام دکھایا ہے۔

لیکن کلام دکھانے سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے اصلاح بھی لی ہو۔ راسخ کا پہلا شعر جو انھوں نے بوقت ملاقات میر کو سنایا تھا بتلاتا ہے کہ اس کا کہنے والا اصلاح سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اور پھر راسخ مرحوم کے دیوان پیش کرنے پر میر صاحب کا یہ فرمانا:-

"بھئی تم سمجھے بوجھے آدمی ہو تمہیں اصلاح کی کیا ضرورت"

ظاہر کرتا ہے کہ راسخ صاحبِ دیوان تھے اور میر کی نظر میں اصلاح سے بے نیاز تھے۔ میر صاحب اس وقت کے بلند پایہ اور پرانے استادوں میں سے تھے اور راسخ نوجوان۔ قیاس یہ ہے کہ راسخ نے اظہار عقیدت مندی کے لئے میر صاحب کو اپنا دیوان بھی دکھایا ہوگا اور دو چار شعر ان کی استادی کے اعتراف اور اپنی ارادتمندی کے اظہار میں بھی کہے ہوں گے۔ جیسا کہ راسخ کے ایک غیر مطبوعہ شعر سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ شعر ہے:[1]

ہوا ہوں عالمِ باطن میں پرسوں تربیت راسخ اویسیہ[1] ارادت ہے جناب میر سے مجھکو

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ راسخ محمد علی فدوی کے شاگرد تھے۔ ابتدا سے انھوں نے اسی صاحب فضل و کمال سے اصلاح سخن لی اور یقیناً راسخ صحیح طور پر فدوی ہی کے تلمیذ کہے جا سکتے ہیں۔ راسخ کا ایک غیر مطبوعہ شعر ہے ملاحظہ ہو[2]

---

[1] اس لفظ اویسیہ سے ظاہر ہے کہ راسخ کو میر سے محض ارادتمندی تھی

شاگرد ہیں گے حضرتِ فدوی کے بے شمار　　راسخ ہوں ایک میں بھی وے کس شمار ہیں[1]

راسخ کے کلام پر نظر ڈالنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب شاد کے وہ جملے بھی جو انھوں نے اس سخن سنج باکمال اور شاعر درد مند کی شان میں اظہار عقیدت کے لئے استعمال کئے ہیں لکھ دوں:۔

"شیخ مرحوم کے اوصاف میں سے ایک ہی جملہ کافی ہے کہ وہ فطری شاعر اور طبعی موزوں طبع تھے خطۂ بہار کو اس عزیز کے نام نامی سے افتخار اور اس کی استادی پر نبا ہات ہے"

۱۳۱۱ھ میں ان کا کلیات خیر المطابع عظیم آباد سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ راسخ کے کلام میں جہاں زبان اور مضمون کی متانت ہے۔ وہاں خیالات کی پاکیزگی اور سلاستِ بیان بھی کافی پائی جاتی ہے۔ مثنوی میں ان کا انداز میر سے مل جاتا ہے۔ مثلاً :۔

اے عشق امام ہے تو میرا　　دین ہے اسلام ہے تو میرا
تو جان جسمِ ناتواں میں　　ہووے جو نہ تو تو پھر کہاں میں
ہے اک کفنی سوز عفرانی　　اشکوں کا ہے رنگ ارغوانی

ان کے کلام میں رعایت لفظی اور جوشِ بیان کی مثالیں کافی ملتی ہیں۔ تصوفانہ رنگ بھی غالب ہے۔ علم موسیقی سے کافی دلچسپی تھی۔ چنانچہ جب تک نغموں سے دل پُر کیف نہ ہو جاتا۔ شعر گوئی کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

سارے خطِ شوق میں میں نے یہی رو رو لکھا　　ہائے صاحب کیا کیا تم نے جدا ہم کیوں ہوئے
خوں بہا میرا یہی ہے کہ کہو　　یہ میرا کشتۂ تمنا ہے
لذتیں غم کی تیرے ہو جیو راسخ یہ حرام　　دل میں کچھ اور اگر غم کے سوا رکھتا ہے
رخِ زیبا دیا گل کو دلِ بے صبر بلبل کو　　اسے خنداں کیا پیدا اسے گریاں کیا پیدا
میری متاعِ عجز بھی کی ناپسند ہائے　　بولے کہ اس متاع پہ تجھکو غرور تھا

---

[1] اس شعر کے لئے میں شکر گزار ہوں عزیز محترم شاہ عطا الرحمن صاحب عطا ایم اے کا جن کے علمی ذخیرہ سے میں نے اس سلسلۂ تحقیق میں کافی استفادہ کیا ہے۔ عطا صاحب ہمارے وطن کے ایک قابل نثر نگار اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ تذکرہ آگے آئے گا۔

دکھ لئے ترک جو نظارۂ دلدار کیا   ہائے پرہیز نے دونا ہمیں بیمار کیا

تم نے راسخ تنِ عریاں پہ جو توڑے ناخن   کیا نمک پاشی کا اس شوخ نے اقرار کیا

کہاں کی لیلی و مجنوں یہ سب اسمائے فرضی ہیں   مسمّٰی اور ہی شے تھا نہ لیلیٰ اور مجنوں تھا

چراغِ خانہ مت سمجھو چراغِ عشق کو راسخ   کہ اس میں چاہیئے روغن پر اس میں خونِ تمنا

فردوس سے وہ نکلا میں کوچۂ جاناں سے   رونے کو مرے پہونچا رونا کہاں آدم کا

پابندِ تعلق نہیں ہوتا عاشق   آزاد ہی ہر شے سے یہ آزاد محبت

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا   دید کو اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا   بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

مت پوچھئے مجھ سے حال میرا   حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا

کفر بھی اک شان جلوہ بھی اسی دلبر کی ہے   شیخ کیوں تو برہمن سے برسرِ پیکار تھا

طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں   کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہی منزل نہیں

ترجیح دو ان لمبے بالوں پہ نہ سنبل کو   خاموش رہو یارو کیوں بات بڑھاتے ہو

(۲) انور علی یاس آروی۔ یہ میاں راسخ کے شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے استاد سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں : ؎

یاں طرزِ سخن میں اے یاس   راسخ کے یادگار ہیں ہم

۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۲ھ میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ فارسی اور عربی دونوں کے جید عالم تھے کلام کا رنگ اپنے استاد کی طرح صوفیانہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو : ؎

آخر اس کے سب تماشائی ہوئے   ٭   جو ترا محوِ تماشا ہو گیا

عشق کی رہ میں جب تک نہ ہو جی کا نقصان   یاس تب تک نہیں ہوتا کوئی کامل ہرگز

---

(۳) شاہ ابوالحسن **فرد** پھلواری - یہ تیرھویں صدی کے ایک بزرگ تھے ۱۲۶۵ھ میں واصل بحق ہوئے
شاہ صاحب صوفی منش اور آزاد خیال تھے۔ کلام کا رنگ زیادہ تر صوفیانہ ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے:

دل جسے کہتے تھے وہ ایک آبلہ تھا بہ گیا — نام کو اب زخم سا داغِ نمایاں رہ گیا
فرد کی کیا خوب حالت عشق میں پہنچی ہے اب — جس کے جو کچھ جی میں آئی ہے منھ پر آکر گیا

(۴) منشی گنگا لال صاحب **دماغ** میران پور ندرہ ضلع گیا کے رہنے والے اُردو اور بھاشا کے علاوہ سنسکرت کے بھی زبردست عالم تھے۔ حضرت عرش سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں ستر سال کی عمر میں رحلت کی مرنے کے وقت ایک دیوان گلشن بنجار نامی چھوڑا۔ جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ مولف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں:۔

"دماغ منشی گنگا لال صاحب خلف منشی کنھیا لال ... ... ذی علم، خوش وضع اور نہایت متین و خلیق آدمی تھے۔ اُردو فارسی کے علاوہ آپ کو بھاشا و سنسکرت میں بھی دستگاہ تھی۔ فن شاعری میں حضرت عرش خلف میر تقی میر کے شاگرد تھے۔"

ان کا دیوان گلشن بنجار نایاب ہے۔ بڑی کوشش کے باوجود بھی صرف چند اشعار دستیاب ہو سکے مثلاً:۔ [۵۱]

تیری زلفوں سے اماں ہے کسے یار آج کی رات — انھیں دو کالوں نے رکھا ہیں مار آج کی رات
صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی — میری جان دور کرو دل سے غبار آج کی رات
درد دل سے جو کراہا تو وہ ہنس کر بولے — جاں بلب کون ہے آوارہ دیار آج کی رات
وہ شبِ ماہ میں آتے ہیں جو افشاں چن کر — چاندنی دوہری گھماتی ہے بہار آج کی رات

قتل کو بس ہے خنجر ابرو — حاجتِ تیغ آبدار نہیں
باغ عالم میں گل کھلاتے کچھ — اے جنوں موسم بہار نہیں

ایک ہی شکل کو دو کرکے دکھا دیتے ہیں — جوہر آئینہ قاتل تیری تلوار میں ہے

(۵) شاہ الفت حسین **فریاد** - یہ تیرھویں صدی کے ایک بلند پایہ شاعر گزرے ہیں ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۹ برس کی عمر میں ۱۲۹۸ھ میں واصل بحق ہوئے۔ حضرت شاہ داں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ فریاد کی حسب ذیل

---
۵۱ خمخانۂ جاوید جلد سوم ص۲۱۱

تصانیف مطبوعہ ہیں :-

(۱) مثنوی دبستانِ اخلاق (۲) مثنوی روضۃ المعانی (۳) مثنوی گنجینۂ عشق (۴) مثنوی طلسم جہاں
ان کے علاوہ ایک فارسی غزلوں کا دیوان، اردو فارسی کے کئی قصائد اور اُردو کا دیوان کلکتہ میں نذرِ آتش
ہوگئے کلام معرفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے :-

ہر ایک کو بانشاں تجھی کو بے نشاں پایا مگر اس بے نشانی پر جہاں ڈھونڈا وہاں پایا
تو ڈھونڈھتا ہے جس کو بیٹھا ہے تیرے دل میں کچھ سوچ اپنے دل میں فریاد تو کہاں ہے

(۶) میر انور علی انورؔ عظیم آباد کے مایۂ ناز بزرگوں میں تھے۔ ان کے سنہ وفات کا علم نہیں۔ لیکن
خمخانۂ جاوید سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ غدر کے بعد تک عظیم آباد میں زندہ و سلامت تھے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

اس فصل بہاری میں وہ گل ہم سے جدا ہو اے گردشِ ایام زبوں تیرا بُرا ہو
ہر سمت سے ہو سایۂ فگن یار کی صورت آئینۂ خاطر میں اگر کچھ بھی جلا ہو
لائی نہ کبھی پیرہنِ یار کی خوشبو اے بادِ صبا چل میرے آگے سے ہوا ہو

قطعہ

اُڑتی سی خبر ہم قفسو! پائی ہے میں نے معلوم نہیں کون رہے کون رہا ہو
پابندیِ الفت کا تقاضا ہے مگر یہ صیاد اگر چھوڑ دے خود رشتہ بپا ہو

(۷) منشی منگل سین الفتؔ۔ عظیم آباد کے شوخ طبع شاعر تھے اور میاں جرأت کے شاگردوں میں ممتاز
درجہ رکھتے تھے۔ رنگ استاد سے ملتا جلتا ہے۔ ان کا کلام بہت کوشش کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوا۔ صرف ایک
شعر خمخانۂ جاوید میں ملا ہے جو درج ذیل ہے۔ مگر بقول مولف خمخانۂ جاوید" اسی ایک شعر سے ان کی مضمون خیز طبیعت
کی قابلیت اور شوخی کا پتہ چلتا ہے :-

ہر قدم پر یاں تلک آنے میں سو سو نازہیں کیوں کہ گھر جانے لگے شام و سحر دو چار کے

(۸) منشی اندر رام۔ الفتؔ۔ یہ منشی منگل سین کے ہم عصر گزرے ہیں ان کے بارہ میں مولف خمخانۂ جاوید
لکھتے ہیں کہ :-

" یہ ۱۸۵۴ء میں بقید حیات تھے۔ اس سے زیادہ حال معلوم نہیں۔"

کلام صاف اور شوخ ہے ؎

دل پیش کش ہے نذر ہے یہ جانِ زار بھی — لکھدیں گر حضور مچلکہ نباہ کا
بیعت تجھے بھی مشربِ پیرِ مغاں میں ہے — ساقی ادھر بھی دورِ کرم کی نگاہ کا

آباد یہ میکش رہیں ساقی کا بھلا ہو — پھر قلقلِ مینا کی بلند آج صدا ہو
پھر زخم کہیں آج میرے دل کا ہرا ہو — قاتل دمِ شمشیر دمِ بادِ صبا ہو

(۹) **خواجہ امین الدین امین** - یہ وہی میاں امین ہیں جن کے بارہ میں مولف تذکرہ گلزار ابراہیم لکھتے ہیں :-

" (امین) در شعر فہمی و سخن رسی از نوادرِ روزگار است فکرش رار فتنے و ذہنش را استقامتے ست کہ کمتر در شعرائے معاصر یافتہ می شود۔"

یہ حضرت تیرہویں صدی کے شعرا میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے ان کے سنہ وفات کا صحیح پتہ نہیں چلتا لیکن تذکرہ خمخانۂ جاوید سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں بعالم ضعیفی بقید حیات تھے۔ ۱۱۹۶ھ میں نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر کی مصاحبت کے عہدہ پر مامور تھے۔ نواب صاحب کی مصاحبت سے علٰحدہ ہونے کے بعد قناعت اور پامردی کے ساتھ خانہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ علی ابراہیم خاں کے بڑے عزیز دوستوں میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں اس کا ذکر بھی کیا ہے لکھتے ہیں :-

" خواجہ امین الدین در عالم اتحاد با قربت دارد دوستانِ دیرینہ این خاکسار ست - از چند سال تا حال کہ ۱۱۹۶ھ باشد در زمرۂ منسلکاں نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر انسلاک دارد۔"

میر حسن[1] نے اپنے تذکرہ میں امین کو مرشد آبادی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :-

" خواجہ امین الدین امین تخلص ساکن مرشد آباد وست۔ ذکر احوالش معلوم نیست۔ سلامت باشد۔"

---

[1] تذکرہ میر حسن صفحہ ۵۰

آمین عظیم آباد کے رہنے والے تھے البتہ کچھ دنوں کے لئے نواب ناظم مرشد آباد کے یہاں ملازم رہے تھے اور غالباً اسی وجہ سے میر حسن کو ان کے مرشد آبادی ہونے کا دھوکا ہوا ہے۔ نواب شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں میر حسن کی تردید کی ہے لکھتے ہیں :-

"(امین)[1] از ارباب عظیم آباد ست وانکہ نسبتش بہ مرشد آباد کردہ اند از او خطائے عظیم آمدہ"۔

تذکرہ میر حسن کے علاوہ اور بھی جتنے تذکرے ہیں سب آمین کے عظیم آبادی ہونے پر متفق ہیں۔

خواجہ صاحب کے کلام میں شوخی اور بے ساختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات داغ کے کلام کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

بوسہ دیا تھا جی میں جو آوے تو پھر لو — اتنے خفا ہو کس لئے اس خاکسار پر

خواجہ صاحب کے کلام میں جہاں شوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے وہاں ان کے کلام میں تصوفانہ رنگ آمیزی اور زبان کی صفائی بھی کافی ہے کلام کا جستہ جستہ انتخاب درج ذیل ہے ؎

گالیاں جو دیں سو دیں بس کیجئے — سن چکے ہم جب تلک مقدور تھا

جس کا دل آپ نے لیا ہوگا — خاک میں لے ملا دیا ہوگا

گالیاں غیر سے سناتے ہو — ہاں میاں تم سے اور کیا ہوگا

دنیا میں کہنے کو سبھی کہلاتے ہیں بھلے — پر ہے وہی بھلا جو کسی کا بھلا کرے

کیا دین سے غافل ہیں امیں مردم دنیا — سکہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی

کیا کہیں دود آہ کی تاثیر — گھر کا گھر ہے سیاہ مت پوچھو

ڈر سے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے — ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر ہوا پر

یار کی مژگاں سے لڑ جاتا ہے یوں تیر نگاہ — جس طرح تلوار کوئی آ لگے تلوار پر

کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں — گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پئے جاتا ہوں

دل تو کیا ہے امیں جو آوے یار — جان آگے نکال رکھتے ہیں

امیں کی غذا آرہی ہے یہی — الٰہی یہ خون جگر کم نہ ہو

---

[1] گلشن بیخار صفحہ ۱۲۶

کس سے تشبیہ دیں بھلا تجھکو　　ایک یوسف سو تیرا ثانی ہے

جلوہ ترے حسن کا کہاں ہو　　یوں کہنے کو آفتاب ہاں ہو

حیاتِ جاوداں بخشے ہو تیغِ آبدار اس کی　　اگر باور نہ آوے جاکے کھاوے جس کا جی چاہے

رباعی

یہ جور و جفا و بے وفائی کب تک　　بس کیجئے پاسِ آشنائی کب تک

کرتا ہو کوئی حسن پر اتنا بھی غرور　　دیکھیں تو رہے ہو یہ خدائی کب تک

(۱۰) شیخ ثابت علی ثابت۔ شیخ محمد علی کے صاحبزادے تھے۔ تیرہویں صدی کے اچھے شاعروں میں شما کیئے جاتے ہیں۔ ۱۲۰۱ھ میں راجہ بھرت پور کی سرکار میں ملازم تھے۔ تذکرۂ خمخانۂ جاوید سے معلوم ہوتا ہے شیخ صاحب دہلی بھی تشریف لے گئے تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہو:-

آنے کی کسی کے کیا سنی ہے　　جاں لب پہ ٹھہر گئی ہے آکر

کہتے ہیں وہ بے وفا اب آیا　　کہنے ہی کی بات ہے سنا کر

ثابت کا ہو حال غیر کل سے　　تم بھی اسے دیکھ آؤ جا کر

(۱۱) میر شمس الدین تمنا۔ تیرہویں صدی کے ایک بلند پایہ شاعروں میں گزرے ہیں۔ حضرت مشتاق سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان کے آبا و اجداد کشمیر کے تھے لیکن انکا مولد و مدفن عظیم آباد ہے۔ مولف تذکرۂ کریم الدین[1] ان کے بارہ میں لکھتے ہیں:-

"ایک سیدزادہ میر شمس الدین اصل کشمیر اور مولد عظیم آباد ہو گاہ گاہ فکر ریختہ کرتا تھا۔۔۔ خوش فکر صاحب طبیعت اور نیک دل معلوم ہوتا ہے۔"

نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

شبِ فرقت میں تیری نالہ و زاری ہو اور میں ہوں　　جھپکتی پل نہیں آنکھیں ہیں بیداری ہو اور میں ہوں

چمن ہے خندۂ گل ہے مے و مینا ہے اور تو ہے　　فغاں ہے نالہ ہے، فریاد ہے، زاری ہو اور میں ہوں

---

[1] تذکرہ کریم الدین ص ۲۹۱

(۱۲) منشی بینی پرشاد دلؔ - یہ بھی شعرائے عظیم آباد میں اچھا درجہ رکھتے تھے ۔ کایستھ تھے ۔ یہ تیرہویں صدی میں گزرے ہیں۔ سنہ وفات معلوم نہیں ۔ ان کے بارہ میں مولوی کریم الدین صاحب صاحبِ تذکرہ لکھتے ہیں :-

"یہ شعرائے عظیم آباد سے ہے۔ مرد خوش زندگانی، کشادہ پیشانی، ہنس مکھ، نیک خو ہے۔"

کلام ملاحظہ ہو :ـ

پردہ اُٹھا کے تو نے ادھر کو گزر کیا ــــ عالم کے دل میں تیری محبت نے گھر کیا

نالہ و شور و فغاں، بے طاقتی ہمراہ ہیں ــــ ہم تو کوچے سے ترے نکلے بڑے ساماں لئے

دل چاہتا ہے بوسئے ہرگز نہ یار سے ــــ پر بس نہیں چلے ہے دلِ بے قرار سے

(۱۳) کنور سکھراج بہادر (حمقؔ) - آپ عظیم آباد پٹنہ کے صاحب اخلاق، ذی مروت اور علم پرور رئیس تھے۔ آپ کے دادا راجہ پیارے لال الفتیؔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں دہلی چھوڑ کر عظیم آباد چلے آئے تھے اور اس وقت سے برابر آپ کا خاندان عظیم آباد ہی میں مقیم رہا۔ آپ کے والد کنور ہیرالال صاحب ضمیرؔ رئیس اعظم پٹنہ بڑے صاحب علم شاعر اور شاعر نواز تھے۔

کنور سکھراج بہادر کو شاعری سے بڑا شغف تھا۔ آپ نے ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۸ء تک کے عرصہ میں پٹنہ میں متعدد مجلس مشاعرہ قائم کئے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے :ـ

جب آپ ہی کو پاس نہیں رسم و راہ کا ــــ کیا فائدہ جو ہو بھی ارادہ نباہ کا

جب سلسلہ جنباں یہ تری زلف رسا ہو ــــ عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بپا ہو

دکھا کر وہ گئے ہیں جب سے اپنی زلف شب گوں کو ــــ بلائیں آ رہی ہیں میرے سر پر دیکھتے جاؤ

کرنے کے لئے دعائے قاتل ــــ زخموں کا کھلا دہن ہمیشہ

(۱۴) شاہ غلام مرتضیٰ جنوںؔ - شاہ صاحب مرزا رفیع سوداؔ کے ہم عصر تھے۔ بڑھاپے میں نابینا ہوگئے تھے لیکن مشق سخن میں وہی انہماک تھا۔ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ جس کی جھلک کلام میں بھی ملتی ہے۔ نواب شیفتہؔ نے غلطی سے انھیں الہ آبادی لکھا ہے۔ میرے خیال میں نواب صاحب نے کسی اور جنوںؔ کے دھوکہ میں انھیں الہ آبادی

لکھدیا ہے۔ دراںحالیکہ ان کا عظیم آبادی ہونا ہر تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مولف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں :-

"شاہ[1] غلام مرتضیٰ متخلص بہ جنوں متوطن عظیم آباد پٹنہ ہم عصر مرزا رفیع السودا مہذب صورت پاکیزہ سیرت نہایت خوش مذاق، اکثر فنون میں قابل اور کامل"

شاہ صاحب نے ایک دیوان ریختہ بھی چھوڑا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

کب ماہ اس نمک میں ہم سنگ ہے تمھارا — حقا کہ حسنِ یوسف پاسنگ ہے تمھارا

مرشد کامل ہے درِ عشق ہر مذہب کے بیچ — میں تو کافر ہوں اگر قائل نہ ہوں اس پیر کا

وہ آنکھ دے کہ جس سے دیکھیں جمال تیرا — یارب جنوں کے منھ پر اس در کو باز کرنا

پہنچا کوئی کعبہ سے کوئی دیر سے پہنچا — تھی جس پہ تری مہر وہی خیر سے پہنچا

طوف باصدق وصفا کیجے دلِ آگاہ کا — میرے مذہب میں یہی ہے حج بیت اللہ کا

دشمنِ جاں ہوگئی آخر یہ بینائی مجھے — جو بلا کہئے سوان آنکھوں نے دکھلائی مجھے

اے جنوں مصرع ترا سودا کے ہو زنجیر پا — قید سے تیری نہیں ہونے کے اب آزاد ہم

(۱۵) خواجہ امام بخش امامی۔ تیرہویں صدی کے ایک شاعر باکمال گزرے ہیں۔ نواب سراج الدولہ کے یہاں کسی معمولی عہدہ پر فائز تھے۔ مولف گلزار ابراہیم ان کے بارہ میں لکھتے ہیں :-

"اسمش خواجہ امام بخش در زمان نواب سراج الدولہ روزگارے داشت والحال کہ سال بست وچہار جلوس شاہ عالم ست در عظیم آباد بہ غربت می گزراند" (گلزار ابراہیم)

کلام کا رنگ استادانہ ہے۔ ملاحظہ ہو :

اے چشم تو تھام ہے اشک تو جوشش او پر — مژگاں نہیں رکھ سکتے اس سیل کو دوش او پر

(۱۶) میر غلام علی اظہر۔ میر شمس الدین فقیر کے شاگردوں میں تھے۔ کچھ دن مرشدآباد رہ کر عظیم آباد چلے آئے تھے اور یہیں شاہ عالم کے عہد میں رحلت کی۔ علی ابراہیم خاں صاحب تذکرہ ان کے بڑے ثنا کی معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے تذکرہ میں انھیں مغرور اور خودستا لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :-

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد دوم ص۲۵۲

"میر غلام علی از شاگردانِ میر شمس الدین فقیر بغرور و خود ستائی مشہور بود"

کلام کا نمونہ درج ذیل ہے: ؎

کرنا تھا جو کچھ نہ کر گئے ہم — افسوس کہ یونہیں مر گئے ہم

تو ایسا جی کہ ترا نام نقش ہو دل پر — نہ یہ کہ دھو دیں ترے نام کو نگینے سے

(۱۷) **شیخ غلام بخش حضور** ۔ عظیم آباد کے ایک مشہور رئیس تھے۔ شاعری میں کسی سے اصلاح نہ لی بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ علی ابراہیم خاں، صاحبِ تذکرہ انھیں اپنے دوستوں میں لکھتے ہیں اور بڑے مدّاح معلوم ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"(حضور) از احباب مولف حقیرست۔ جوانے ست آرمیدہ اطوار" (گلزار ابراہیم)

میں نے ان کی کوئی مثنوی نہیں دیکھی ہے لیکن تذکرہ کریم الدین سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے ایک مثنوی درباب[1] درگاہ شاہ ارزاں جو عظیم آباد میں واقع ہے لکھی ہے۔"

چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں: ؎

گر ایسی ادا تو دکھاتا رہے گا — تو کب تک کوئی جی بچاتا رہے گا

جو اس تند خو سے کہا میں کہاں تک — فضول اپنے دل کو کڑھاتا رہے گا (ق)

گر ایسا ہی ہر دم ترا روٹھنا ہے — تو کب تک تجھے کوئی مناتا رہے گا

لگا ہنس کے کہنے کہ کیا بولتا ہے — بگاڑوں گا میں تو بناتا رہے گا

مرتا ہوں دردِ ہجر سے آرام ہو چکا — بس اے طبیبِ عشق مرا کام ہو چکا

اسی سلسلہ میں اسی دور کی ایک شاعرہ خاتون کا بھی تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

(۱۸) **امیر النسا بیگم غریب** ۔ میر برکت علی عظیم آبادی کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کے والد پٹنہ کے ایک محلہ مغل پورہ میں رہتے تھے۔ خود شاعر نہیں لیکن شاعر دوست ضرور تھے۔ پاس ہی جناب ذبیح (مرزا

---

[1] تذکرہ کریم الدین ص۱۷۵

امان علی ذبیح) کا مکان تھا۔ بیگم صاحبہ ابتدا میں انھیں سے اصلاح سخن لیتی تھیں۔ کلام میں بڑی سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ ان کا ایک شعر مجھے دستیاب ہوا ہے۔ اسی مضمون کا ایک مشہور شعر غالب کا بھی ہے۔ ناظرین کرام خود فیصلہ فرمائیں کہ کون "غریب" رہا اور کون "غالب" بعد زمانی اور مکانی بھی مدنظر رہے :۔

رسوائے شعر مجھکو دل زار نے کیا — کھلتا نہ تا بہ مرگ مرا یہ معاملہ (غریب)

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے — کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ (غالب)

(۱۹) حضرت شاہ امیرالدین قدس سرہٗ۔ سجادہ نشین حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ بہار کی بڑی مقدس ہستیوں میں گزرے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ ابن شاہ علیم الدین قدس سرہ کے فرزند تھے۔ سال ولادت کے متعلق خود ہی دو اشعار قلمبند کئے ہیں۔ شعر یہ ہیں :۔

کہوں کیا کب سے جائے استقامت یہ خرابا ہے — زروئے سال ہجری وقت پیدائش سے اس دم تک

دعائیہ سنہ تاریخ برخوردار آیا ہے — سنا ہے یہ کہ فکر والد غفراں پناہی سے

۱۲۱۷

شعر و سخن میں کافی دستگاہ تھی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کلام موزوں فرماتے۔ فارسی میں ظلوم اور اردو میں وجد تخلص کرتے تھے۔ آپ کا فارسی دیوان مطبوعہ ہے۔ اردو میں ایک ضخیم دیوان تین مثنویاں اور بہت سی رباعیاں غیر مطبوعہ ہیں، جو بہار میں ایک بزرگ کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ بہار کے سفر کے دوران میں میں نے اس قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا۔ میں اپنے مکرم بزرگ کا بدل سپاس گزار ہوں جن کی وساطت سے مجھے اس بیاض کے مطالعہ کا موقع ملا۔ امید ہے کہ انشاء اللہ عنقریب میں ان کے تمام اردو کلام کو مع مختصر سوانح حیات و نقد و تبصرہ کے اہل نظر کے سامنے پیش کرسکوں گا۔

چند اشعار نمونتہً درج ذیل ہیں :۔

روح کا آنا تھا قالب میں وہ آنا کیا تھا — جان کا تن سے نکل جانا تھا جانا کیا تھا

لاکھ دل ہوتا تو سر پر سے تصدق کرتا — ایک اس دل کے لئے تم سے بہانا کیا تھا

کرتا ہوں سراپا کو ترے نقش میں دل پر — تصویر یہ تری زیر بغل جائے تو اچھا

بے یار کے جینے سے تو مرنا ہی بھلا ہے　　　اب جان مری تن سے نکل جائے تو اچھا

حضرت وحید کا وصال ۱۲۸۷ھ میں ہوا۔

(۲۰) حضرت سید شاہ امین احمد فردوسی قدس سرہٗ المعروف بہ "جناب حضور" بہار کی مقدس ہستیوں میں گزرے ہیں۔ حضرت شاہ امیرالدین وحید قدس سرہٗ کے فرزند اور سجادہ نشین تھے۔

۲۳ رجب ۱۲۴۸ھ میں دنیائے آب وگل میں تشریف لائے اور ۴ جمادی الاخر ۱۳۲۱ھ میں راہی ملک عدم ہوئے۔ آپ کے علم وفضل کا ہر شخص معترف تھا۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح شعر وسخن سے بھی خاص شغف رکھتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ مثنوی گوئی میں تو آپ یکتائے زمانہ تھے۔ جو قادرالکلامی کہ آپ کو اس صنف میں حاصل تھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ مثنوی زیادہ تر مناقبانہ لکھی ہے۔ گلِ بہشتی، گلِ فردوس، روضۃ النعیم، شجرات طیبات سلسلۃ اللآلی، عبرت افزا اور شہد وشیر وغیرہ آپ کی مشہور مثنویاں ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں میں آپ کا کلام بہت بڑے پایہ کا ہوتا ہے۔ فارسی میں ثبات اور اردو میں شوق تخلص فرماتے تھے۔ آپ کی تمام تصانیف طبع ہو چکی ہیں۔ صرف اردو کا ایک دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ اس وقت اردو کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں[1]

اللہ ترا عام جو انعام ہو گیا　　　جاری مری زباں پہ ترا نام ہو گیا

کر اس کی جستجو وہ ملے گا تجھے ضرور　　　کوشش جو تو نے کی تو ترا کام ہو گیا

کوئی اور غم مجھکو ہوتا تو ہوتا　　　مگر رنجِ فرقت خدایا نہ ہوتا

فلک ہم سے اے شوق اگر میل رکھتا　　　تو اس مہ سے اب تک ملایا نہ ہوتا

خارزارِ عشق سے اے شوق نکلو تم کہیں　　　گلشنِ ہستی سے ہو جاؤ گے ورنہ گم کہیں

تن سے سر کٹ گیا حل ہو گئی مشکل اپنی　　　واہ کیا عقدہ کشا ناخنِ شمشیر بھی تھا

طرزِ غالب مجھے اب شوق بہت ہے مرغوب　　　ابتدا میں تو میں کچھ معتقدِ میر بھی تھا

---

[1] تاریخ شعرائے بہار مولفہ سید عزیزالدین احمد بلخی المتخلص بہ راز ص۲۳۳

گرفتارِ بلا گر کوئی ہوتا ہو تو ہونے دو　　مرا زلف سیہ پر دل جو شیدا ہو تو ہونے دو

مری روح قالب میں گویا نہیں　　کئی دن سے ان کو جو دیکھا نہیں ہے

رباعی

ارباب سخن جھک کے قدم لیتے ہیں　　جس دم ہاتھ میں قلم لیتے ہیں

جنس تعظیم ان سے ہم لیتے ہیں　　نقد تعلیم ان کو ہم دیتے ہیں

دور متاخرین

دور متاخرین کے شعرا میں جدت خیال اور پاکیزگی بیان مخصوص طور پر نمایاں ہیں۔

(۱) شمس العلما نواب امداد امام صاحب اثر صوبہ بہار کے ایک ممتاز اور مقتدر خاندان سے تھے۔ ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنی زندگی کا زیادہ حصہ موضع نیورہ ضلع پٹنہ میں گزارا۔ نیورہ کو اسی خاندان کی وجہ سے امتیاز خاص حاصل ہے۔

نواب صاحب کو ریاضی، معدنیات وحیوانات، مناظرہ، فلسفہ جدیدہ وقدیمہ میں بڑا شغف تھا۔ اردو اور فارسی میں فاضل متبحر اور زبان انگریزی پر خاصی قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی فنی اور عالمانہ تصانیف کتاب مراۃ الحکما، کتاب الاثمار[۱] اور کاشف الحقائق[۲] کافی مشہور اور مستند ہیں۔

آپ نہ صرف اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے بلکہ اکثر آپ نے انگریزی اشعار بھی نظم کئے ہیں۔ آپ کا اردو دیوان شائع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے :

تیرے ستم کی حسرت تیری جفا کی خواہش　　ظالم وہ کون دل ہے جس میں نہیں بھری ہے

کیا ہے بتوں کی خواہش کیا ہے خدا کی خواہش　　اے شیخ و برہمن تم کچھ تو ہمیں بتاؤ

دل میں خدا کو رکھ کر کیا ہو دعا کی خواہش　　دنیا طلب کا شیوہ ہاتھوں کا ہے اٹھانا

کچھ بیانِ حور اس کا بے طرح مستانہ تھا　　رات واعظ جو شریک صحبت رندانہ تھا

---

[۱] یہ کتاب سویڈن زبان میں ترجمہ ہو کر وہاں کی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔ [۲] کاشف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس میں مصری، یونانی، لاطینی، اطالوی، جرمن، انگریزی، عربی، فارسی، اردو، چینی، جاپانی، سنسکرت اور بھاشا کی شاعری پر عالمانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے ۱۲

مظلوم ہوں مگر نہیں ملتا کوئی گواہ ۔۔۔ ہیں اہل حشر اس ستم ایجاد کی طرف
ناصح اگر ستم نہ سہیں ہم تو کیا کریں ۔۔۔ دل دوڑتا ہے یار کی بیداد کی طرف

سبھی گل زر بکف گلشن میں ہیں انصاف کر یارب ۔۔۔ غضب ہے رند خالی ہاتھ ہوں فصل بہاراں میں
نکر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا ۔۔۔ محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
ہمیں بزم عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے ۔۔۔ کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے
ہم نے اثر سنا ہے اہل رضا کو کہتے ۔۔۔ اپنی وہی ہے خواہش جو ہے خدا کی خواہش
ہے پیام مرگ میں مضمر نوید زندگی ۔۔۔ تا بقا کی شکل پیدا ہو فنا ہو جائیے

(۲) سید الشعرا علی محمد شاد عظیم آبادی نے ۱۲۶۳ھ میں اس دنیائے آب و گل میں آنکھ کھولی اور مدت دراز تک شاعروں کا سرتاج اور "اردو سبھا"[۱] کے اندر بنے رہے۔ ایک محقق اور مایۂ ناز ادیب کی حیثیت سے وہ ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں۔

فردوسی نے شاہنامہ سے عجم کو زندہ کیا۔ شاد نے اپنی تصانیف[۲] سے بہار کو خلعت دوام بخشا۔ شاد کی سوانح حیات اور نوبنو کمالات پر ہندوستان کے بڑے بڑے اہل قلم حضرات روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس لئے یہاں ان کا تذکرہ بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

شاد تخیل اور زبان کا بادشاہ ہے۔ کلام میں شاعرانہ تخیل، عالمانہ رنگ اور عارفانہ اسرار و رموز کی فراوانی ہے، واقعہ نگاری ان کا خاص جوہر ہے۔ شاد کی شاعری عامیانہ مذاق اور سوقیانہ ترکیبوں سے بالکل مبرا ہے کہیں کہیں شوخی اور ظرافت البتہ پائی جاتی ہے لیکن شگفتہ شوخی سے آگے نہیں بڑھتی۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے:

جو نہیں نماز اس کی دعائیں اف ری جوانی ہائے زمانے ۔۔۔ پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے دعائیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے

---

[۱] شیخ عبدالقادر اڈیٹر مخزن نے اردو سبھا کی تحریک کی تھی اور اس کا صدر جناب شاد کو بنایا گیا تھا۔ [۲] آپ کی تصانیف میں سے مندرجہ ذیل کتابوں نے اس مقالہ کی ترتیب و تدوین میں میری رہبری کی ہے۔ فکر بلیغ، مرأۃ الخیال، نوائے وطن، تاریخ صوبۂ بہار، ظہور رحمت

قمار خانہ ہے بزمِ دنیا بڑے کھلاڑی کا سامنا ہے
گنوائی پونجی گرہ سے اپنی یہاں ذرا بھی جو چال چوکا

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوبؑ اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

تری یکتائی میں نقصان بتا کیا ہوتا
تجھ سا ہوتا جو کوئی وہ بھی تجھی سا ہوتا

یہ بزم ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

میں حسرت و غم کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہو اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

غیر مطبوعہ : ۵

کالی کالی آنکھیں ہیں اور گوری گوری رنگت ہے
لمبے لمبے گیسو ہیں اور بھولی بھولی صورت ہے

آڑی آڑی چتون ہے اور ٹیڑھے ٹیڑھے ابرو ہیں
نیچی نیچی نظریں ہیں اور کچھ کچھ دل میں الفت ہے

حسن کی خوبی جو کچھ کہئے عیب چھپاتا ہے ورنہ
جھوٹے جھوٹے وعدوں میں کچھ ایسی ایسی لذت ہے

پھر پھر آئیں دل نہ بہلا کس طرح سے شاد ان شعروں پر
سچی سچی باتیں ہیں اور پوری پوری حالت ہے

شب کو میری چشمِ حسرت کا سب درد دکھ اُن سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے اُن کا رہ جانا

میخانہ میں آنا زاہد کا پھر در پہ ٹھٹک کر رہ جانا
ساقی کے اشارہ کا رندو کچھ کان میں سب کے کہہ جانا

ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہئے
منقار کو رکھ کر کلیوں پہ کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

ہوئیں محتسب سے جو بدعتیں کریں یاد کس سے ضبط کیوں
نہ یزید کی ہے یہ بارگہ نہ اسیر ابن زیاد ہیں

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

صفِ اولیں تو ہے خاص صف وہاں پاؤں جائے کہاں شرف
صفِ آخریں سے بھی دور تر جو اشارہ ہو تو وہیں سہی

ہمہ شب زخیلِ کروبیاں رسد ایں صدا سے مہینے
کہ محاسبہ سے مری ڈرو میری بخششوں کا یقیں سہی

نہ مٹے گی دل سے یہ آرزو کہ لگا کے آنکھوں سے چوم لیں
ترے پاؤں تک نہیں دسترس ترے آستاں کی زمیں سہی

جسے پاک رکھنے کی تھی ہوس وہ تو تیرے در پہ پہنچ گئی — یہ جو مشتِ خاک زمیں پہ ہے اسے پھینک آؤ کہیں سہی

مری بادہ نوشی کی داستاں خبرِ احاد ہو سا قیا — مرے شیخ کو ہے مفید ظن ترے واسطے وہ یقیں سہی

لَمَعَاتُ وَجْهِكَ اَشْرَقَتْ وَشُعَاعُ طَلْعَتِكَ اعْتَلٰی

سب اسی میں جل کے فنا ہوئے خسِ کفر و خرمنِ دیں سہی

چند رباعیاں بھی ملاحظہ ہوں :۔

جب دیکھئے مضمون ادق ملتا ہے — ہر مرتبہ بے پڑھا ورق ملتا ہے

ہر دفعہ کتابِ روز و شب کھلتی ہے — ہر روز نیا نیا سبق ملتا ہے

گزری جس طرح زندگانی تیری — میں سن چکا قصہ خواں زبانی تیری

سوتا سنسار جاگتا پاک خدا — سچی تھی اسی قدر کہانی تیری

لے کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا — ہائے اے بادہ کشو اس پہ نہ پینا آیا

آج تک دامنِ گل چاک ہیں خیاطِ ازل — تجھکو خلعت بھی حسینوں کا نہ سینا آیا

بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں شاد کی بعض اُن نظموں کا بھی اشارۃً حوالہ دے دیا جائے جن میں انھوں نے مراثی و مناقب کے سلسلہ میں مناظر فطرت وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے، مقابلہ یا موازنہ مقصود نہیں ہے لیکن جس زمین کو انیس آسمان بنا چکے تھے اُسے کچھ اور نہیں جہاں کا تہاں سنبھال کر رکھنا بھی کچھ آسان کام نہ تھا۔ ادب اور احترام نے یہیں تک راقم السطور کو بڑھنے کی اجازت دی ورنہ ارباب نظر دیکھیں گے کہ شاد کے ساتھ میں نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے مثلاً :۔

صبح کا منظر :-

وہ جلوۂ نور سحری اور وہ دھندلکا
رنگِ رخِ گردوں کہیں گہرا کہیں ہلکا
شب کا تھا گماں صبح پہ اور آج پہ کل کا
اک برق چمکتی تھی جو قطرہ کہیں جھلکا
رخسار کو پتوں سے جو گل ڈھانکے ہوئے تھے
تارے بھی نکالے ہوئے منہ جھانک رہے تھے

در تعریف قلم :-

جو تازہ مضامیں ہوں انھیں ڈھونڈھ کے لانا
بوسیدہ خیالات سے دامن کو بچانا
اے مخزنِ معنی کبھی لالچ میں نہ آنا
پس خوردۂ اموات نہ ہونٹوں سے لگانا
جز میرے کہیں اور سہارا نہیں تیرا
غیروں کے نوالوں پہ گزارا نہیں تیرا

تلوار کی تعریف :-

کج بازیوں پہ اس کی تصدق تھے سو بناؤ
ہر وضع کے لئے ہے مناسب اگر لگاؤ
ڈھارس ہو دل کو ہاتھ میں اس کو اگر اٹھاؤ
تنہا کسی مہیب جگہ بھی جو لے کے جاؤ
ہر گام یوں تو بیم و رجا جی کے ساتھ ہے
دل خود بخود کہے کہ کوئی دستیاب ہے

وہ بے ریا کہ وقت پہ مشکل میں کام آئے
وہ دوست ہے زباں سے نکالے تو کر دکھائے
ظاہر میں یوں خموش ہے لیکن جو لب ہلائے
ڈھونڈھے سے بھی پتا نہ ملے اس طرح مٹائے
اس سے رکے کوئی تو ہمیشہ رکی رہے
پہلو میں دیں جگہ تو قدم پر جھکی رہے

گھوڑے کی تعریف :-

وہ آبلی انکھڑیاں کہ چکارا للک لجائے
ضیغم دبک کے سر جو ہو آنکھیں اگر دکھائے

پکاسو　　　گولے پر مشق　　　آئل پینٹنگ (۱۹۰۵)

وہ خوش خرامیاں کہ صبا کو ہوا بتائے　　گردش جو دیکھے عمر رواں راہ بھول جائے

ناپے ہوئے ہے کب سے زمانے کی حد تلک

پہونچے بیک نگاہ ازل سے ابد تلک

(۳) حاجی بشارت حسین صاحب احقرؔ ۱۲۷۶ھ میں ضلع عظیم آباد پٹنہ کے ایک گاؤں بڑا ڈیہہ میں پیدا ہوئے آپ اپنے زمانہ میں بہار کے سب سے پرانے اور پُرگو شاعر شمار ہوتے تھے۔ آپ کے لاتعداد شاگرد آج بھی آسمانِ شعر و شاعری پر جگمگا رہے ہیں۔ ابتدا میں آپ نے جناب ازلؔ لکھنوی کو اپنا کلام دکھلایا ہے لیکن غائبانہ آپ حضرت آتشؔ کی اتباع کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دو جگہ آپ نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

اور دیں لذت خاک نہیں آمد کا مزا ہے اے احقرؔ　　وہ چال نہ چل جو لوگ کہیں آتش کے چلن کو چھوڑ دیا

آپ کا کلام بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ صرف ایک دیوان، دو تین مثنویاں، ایک واسوخت، رباعیاں اور چند قصائد یادگار باقی ہیں جو بحمدہ میرے پاس محفوظ ہیں۔

جناب احقرؔ کی شاعری اور حالات زندگی پر نومبر ۱۹۳۴ء کے رسالۂ معارف میں مختصر طور پر میں تبصرہ کر چکا ہوں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے: ؎

کچھ بات ہی ایسی ہے جس سے دم بھر بھی اسے آرام نہیں　　اب حال تو یہ ہے احقرؔ کا گر صبح رہا تو شام نہیں

قربان کروں کیا چیز ہے یہ ہو دل جو پسند اے جان نہیں　　مفلس کا سمجھ لو مال اس کو کیا دام اس کا کچھ دام نہیں

یہ کافر و مومن دیر و حرم اسرار ہیں اس کی حکمت کے　　جو واقف ہے وہ واقف ہے یہ خاص یہ باتیں عام نہیں

گھبرائے جو بندے محشر میں رحمت نے صدائیں دیں بڑھکر　　لکھے سے ملا کر دیکھا ہے تم لوگوں پہ کچھ الزام نہیں

پوچھے جو کوئی احوال مرا کچھ بیچ کی حالت کہہ گزرو　　ایسا ہی فسانہ ہے جس کا آغاز نہیں انجام نہیں

رہتے ہو جو تم خفا خفا کچھ　　بندہ پرور میری خطا کچھ

ٹھہر اے موت جلدی کیا پڑی ہے　　مہیا کچھ تو سامانِ سفر ہو

بہت عاصی سہی رندِ سیہ کار　　مگر اے واعظو تم بھی بشر ہو

دل کی آشفتگی تو کیا جانے — ایسی باتیں تری بلا جانے
باوفا لوگ جانتے ہیں سب مجھے — ارے او بے وفا تو کیا جانے
بے خبر ہو جو خانۂ دل سے — کعبۂ و دیر کو وہ کیا جانے

پتھر ہیں دل بتوں کے اللہ موم کر دے — دکھلا دے شان اپنی اے میرے شان والے
تکرار کچھ نہیں ہے آجاؤ یا بلا لو — قصہ بڑھا رہے ہیں یہ درمیان والے

نظرسے خوش گزرے۔ لکھنؤ کا طرز بھی ملاحظہ ہو:ـــ

متاعِ عیش جنسِ کامرانی مول لیتے ہیں — کوئی پوچھے تو ہم عہدِ جوانی مول لیتے ہیں
نہ کھینچی جائے گی تصویر اس زلفِ پریشاں کی — یہ سودا مفت کا ہزاد و مانی مول لیتے ہیں
ہمہ دانی کا میرے اک جہاں قائل ہوا ہے اخترؔ — اسی دوکاں سے سب شیریں زبانی مول لیتے ہیں

اخترؔ سے جو پوچھا کیوں تم نے اب شغلِ سخن کو چھوڑ دیا — بولے کہ گیا جب موسمِ گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا
دل عنبس کے کسی کی زلفوں میں کس طرح الٰہی چھوٹ گیا — معلوم نہیں کیا پیچ پڑا کالے نے جو من کو چھوڑ دیا
آتے ہیں عجب انداز سے وہ ڈالے ہوئے رخ پر بالوں کو — زلفیں جو ہٹیں اک شور ہوا سورج نے گہن کو چھوڑ دیا

رباعیات :ـــ

کیا بزم میں بے حجاب آئی ہے — بدلی ہر تو ین کے آفتاب آئی ہے
انگور میں چھپ رہی تھی ظالم جاکر — آج کھنچکر میرے سامنے شراب آئی ہے

وحشت تو لے گئی تھی جنوں نے خاک بن میں — مٹی ہماری لائی پھر گھیر کر وطن میں
کھلنے نہ پائے پردہ مجھ زار ناتواں کا — یارو لپیٹ دینا اچھی طرح کفن میں

دنیائے دنی سے روح ناشاد گئی — پھر بھی نہ فلک کی خوئے بیداد گئی
لے کر نہ صبا گئی ترے کوچہ میں — فریاد کہ میری خاک برباد گئی

(۴) مولانا ظہیر احسن صاحب شوق نیموی (عظیم آبادی) صوبہ بہار کی بزرگترین ہستیوں میں گزرے ہیں۔ جہاں آپ کی اردو دانی کا لوہا لکھنؤ اور دہلی نے مانا تھا۔ وہاں آپ کی عربی دانی کو اہل عرب نے بھی تسلیم کیا تھا۔ آپ کی تالیف آثار السنن علم حدیث کی بڑی معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

آپ ضلع پٹنہ کے ایک قریہ نیمی میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۲۷۸ ہجری ہے۔ نیمی فتوحہ کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس مضمون میں اتنی وسعت نہیں کہ شوق کی شاعری اور ان کے حالات بالتفصیل بیان کئے جا سکیں۔ اس وقت شوق کے دو اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں:ـ

دامنِ یار سے جا لپٹے ہمارے آنسو ۔۔۔ گر کے اس طرح سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے

دامن کبھی جھٹکتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ ۔۔۔ اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

(۵) مولوی سید علی جان عرف لاڈلے صاحب بیتاب عظیم آباد کے ممتاز سخنوروں اور جناب شاد کے نہایت عزیز شاگردوں میں تھے اور حقیقت یہ ہے کہ جناب شاد کے بعد ان کی جانشینی کا حق آپ ہی کو حاصل تھا۔ شاد مرحوم اپنی زندگی ہی میں اپنے خاص شاگردوں کو اکثر بیتاب مرحوم کے پاس اصلاح سخن کے لئے بھیجا کرتے تھے اور یہ ان کی استادی کا ایک بین ثبوت ہے۔

کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:ـ

دمِ نزع آخر نکل آئے آنسو ۔۔۔ کہاں جا کے چوکے وفا کرنے والے

کتنے الزام آخر اپنے سر ۔۔۔ تم نے غیروں کو سر چڑھا کے لئے

لڑ گئی ان سے نظر کھنچ گئے ابروان کے ۔۔۔ معرکے عشق کے اب تیر و کماں تک پہونچے

مارے وہ نگہِ ناز تو رتبہ ہو بلند ۔۔۔ سر ہو اونچا مرا گر نوکِ سناں تک پہونچے

ساقیا لغزشیں مستوں کی فدا ہوں تجھ پر ۔۔۔ ہاتھ تھامے ترے اور پیر مغاں تک پہونچے

راہ میں اور بھی دیوانوں سے ملتے جلتے ۔۔۔ پوچھتے پوچھتے ہم ان کے مکاں تک پہونچے

لے گئے عشق کی بازی یہ صفائی بیتاب ۔۔۔ جان پر کھیل گئے جانِ جہاں تک پہونچے

(۶) شمس العلماء مولوی محمد یوسف صاحب رنجور - ممتاز شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے - بقول مولف خمخانۂ جاوید آپ کو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے ..... اخلاقی اور عشقیہ دونوں طرح کے کلام نظم کرتے ہیں فنِ سخن کی استعداد بھی عالمانہ ہے -

آپ کے کلام میں شوخی اور ظرافت کافی پائی جاتی ہے - لیکن شوخی متانت کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے اور یقیناً آپ کی خصوصیات کلام میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ آپ کی "متین شوخی" اور "عالمانہ ظرافت" ہے - نمونۂ کلام یہ ہے : ؎

دشمن نظر بچا کے دبے پاؤں ہٹ گیا — میں اپنے سر پہ کھیل کے مقتل میں ڈٹ گیا

کہتے ہیں دیکھ کے ملکِ دلِ ویراں میرا — آج تک کیوں کوئی شہر اس میں بسایا نہ گیا

زندگی میں تو رفاقت کا سبھی بھرتے تھے دم — قبر میں ساتھ کوئی اپنا پرایا نہ گیا

بولے وہ مجھکو مرنے پہ تیار دیکھکر — خوش ہوگئے اب تو حوروں کا دیدار دیکھکر

دل میں تو حضرتِ رنجور کے ہے عشق بتاں — گو یہ ظاہر میں مسلمان بنے بیٹھے ہیں

شیخ جی حوروں کے مسکن کی تو یہ راہ نہیں — کوچۂ یار ہے' یہ آپ کدھر جاتے ہیں

شیخ دوزخ سے ڈرانے کی ضرورت کیا ہے — ہم تو صورت ہی تری دیکھ کے ڈر جاتے ہیں

تمھاری خانقاہ اے شیخ جی تم کو مبارک ہو — رسائی ہم سے رندوں کی درِ پیرِ مغاں تک ہے

ان کے بھولے پن کے صدقے جایئے — کہتے ہیں مجھ سے تمھیں کیا کام ہے

نماز شیخ ریائی کے پیچھے ہے مکروہ — ہم اپنے پیرِ مغاں کو امام کرلیں گے

بتوں کے عشق میں واعظ مضائقہ کیا ہے — خدا خدا نہ سہی رام رام کرلیں گے

کبھی یہ حضرتِ دل چین سے نہ بیٹھیں گے — ہمارا کام نہ جب تک تمام کرلیں گے

سامنے تیرے اگر وہ پیاری صورت آئے گی — پھر نہ واعظ تجھکو یادِ حورِ جنت آئے گی

کچھ لامکاں میں گھر تو نہیں ہے رقیب کا — پوچھا کہاں گئے تو وہ بولے کہیں نہیں

کیا حور کی تلاش میں آتا ہے روز ادھر؟ — زاہد یہ کوئے یار ہے خلدِ بریں نہیں

(۷) جناب اقبال علی خاں صاحب وفاؔ۔ بہار شریف کے علم پرور اور فیاض رئیس اور داغؔ کے عزیز تلامذہ میں سے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں جناب داغؔ کا رنگ بہت غالب ہے۔ وضع بالکل پرانے زمانہ کے رئیسوں کی سی تھی۔

رسالہ الامین[1] کے پرانے پرچوں سے آپ کے چند اشعار بطور نمونہ کے درج ذیل کئے جاتے ہیں: ؎

تو جو بیزار ہے خفا بھی ہے — یہ تو کہہ کچھ مری خطا بھی ہے
اتنا دعویٰ نہ کر خدائی کا — آخر اے بت کوئی خدا بھی ہے
بے وفا تم سا باوفا ہم سا — تمھیں فرماؤ دوسرا بھی ہے
بوسہ مانگا تو ہنس کے فرمایا — کہئے کچھ اور حوصلا بھی ہے

جگر کو دل کو میرے چیر دیکھو — جہاں شک ہو تم اپنا تیر دیکھو
شکایت کی جو بیتابی دل کی — کہا ہنسکر مری تصویر دیکھو
نکالیں کس نے پہلے شر کی باتیں — مری اور اپنی تم تقریر دیکھو
وفاؔ اپنے بدن کو خاک کرنا — یہی ہے نسخۂ اکسیر دیکھو

(۸) حاجی شمس العلما مولانا محمد سعید صاحب حسرتؔ عظیم آبادی۔ بہار کے مشہور اہل فضل و کمال میں سے تھے۔ کتاب تحفۃ الاخوان، زاد الفقیر اور قسطاس البلاغۃ مشہور تصانیف ہیں۔ طبقۂ صوفیا علما اور فقرا میں نہایت درجہ مقبول و مقتدر تھے۔

ولادت ۱۲۳۱ھ میں ہوئی اور ۱۳۰۸ھ میں اپنے مکان ہی کے قریب محلہ مغل پورہ میں سپرد خاک کئے گئے مولوی احمد کبیر صاحب پھلواروی نے تاریخ الکملا میں آپ کی تاریخ وفات لکھی تھی اس کا آخری شعر یہ ہے: ؎

دل خراشیدہ ایں عطار گفت — رضی اللہ ربہٗ بودود

---

[1] رسالۂ الامین خاص بہار شریف سے زیر ادارت جناب شاہ شفیع صاحب شفیع اور رئیس بہاری شائع ہوتا تھا مگر اب اس کو بند ہوئے عرصہ ہو گیا۔

مولنا کے والد ماجد مولوی واعظ علی صاحب مرحوم عظیم آباد کے بڑے باوقعت رئیس تھے۔ مولنا نے ۱۲۶۲ھ میں حج و زیارت کے ارادہ سے حرمین شریفین کا سفر کیا اور وہاں کئی سال تک رہ کر حضرت مفتی سید احمد و جلان رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محمد علی ابن سنو الحسنی الخطائی جیسے برگزیدہ بزرگوں سے علم حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور وہاں سے آنے کے بعد درس تدریس اور کتب بینی کے مشغلہ میں اپنی تمام عمر گزار دی۔ آپ کے شاگردوں اور مریدوں کی اس وقت بھی کثیر تعداد موجود ہے۔

زیادہ تر فارسی اور عربی میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے عربی زبان پر ایک اہل زبان کی طرح قدرت حاصل تھی۔ فارسی کلام پر حضرت خسروؔ کا رنگ غالب ہے۔ بعض اشعار حسب ذیل ہیں:

آہ خونِ صد مسلماں ریختی	میزنی دم از مسلمانی ہنوز
دین و دل صبر و خرد از ما بغارت می برد	رخسارِ زیبا یک طرف زلف چلیپا یک طرف
معشوق و عاشق را بہم سوز محبت لاجرم	می سوخت لیلیٰ یک طرف مجنونِ شیدا یک طرف

فارسی کی طرح اردو میں بھی آپ کی زبان بڑی شستہ اور پاکیزہ معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ آپ کی زندگی ہی سر تا سر فقر و تصوف میں بسر ہوتی تھی۔ اس لئے آپ کے کلام میں بھی ہر جگہ صوفیانہ اور عارفانہ ہی رنگ پایا جاتا ہے:

دکھا کر اپنا جلوہ کر دیا ہر شے سے مستغنی	حسد ہے بادشاہوں کو گدائے یار پر کیا کیا
واجب و ممکن میں ہے اک ربط خاص	رازدارِ کن فکاں ہوں کیا کہوں
درد کا مجھ میں اثر ہو کچھ سعید	میں سراغِ رفتگاں ہوں کیا کہوں
زخم دل پر مرے ہنس ہنس کے چھڑکتے ہو نمک	یہ مزا عشق کا حاصل نہ ہوا تھا سو ہوا
کیا تڑپ کر دلِ مجروح نے کی بے لطفی	خوں سے تر دامنِ قاتل نہ ہوا تھا سو ہوا

(۹) حاجی حافظ سید شاہ نذر الرحمن صاحب حفیظ۔ مولانا محمد سعید صاحب حسرت کے نبیرہ اور سجادہ نشین تھے عظیم آباد کے سربرآوردہ شعرا میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حکیم آغا حسن ازل لکھنوی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ آپ کے بارہ میں مولف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں:۔

"۱۳۱۳ھ میں آپ کا ایک مبسوط دیوان بھی طبع ہو کر شائع ہوا ہے جو اپنے رنگ میں ہر طرح قابل تعریف ہے

ؔ خمخانۂ جاوید جلد ۲ صفحہ ۴۸۶

جدت پسندی، مضمون آفرینی، پرواز صوفیانہ، کہنہ مشقی، سلاست زبان۔ غرض اس کے دیکھنے سے ہر ایک بات کا پتہ چلتا ہے:-

نمونہ کلام یہ ہے ؎

دیکھکر لاش مری کہتے ہیں — یہ نہ سمجھے تھے کہ مرجائے گا

بے وفائی کی جب شکایت کی — ہنس کے بولے کہ آزماتے ہیں

نہ دل میں آکے رہتے ہو نہ آنکھوں میں ٹھہرتے ہو — وہ بے پروا ہو رکھتے ہو خبر گھر کی نہ باہر کی

اس لئے اب تو گنہ روز کیا کرتا ہوں — دیکھنا ہے تری قدرت کا تماشا ہم کو

رہا کرے بھی جو صیاد تو کہاں جائیں — اسیر وہ ہیں کہ ہم بال و پر نہیں رکھتے

جھوٹی تشفی تو مجھے باور نہیں بندہ نواز — آپ اور ہونگے مرے غمخوار رہنے دیجئے

منتوں سے جو ہو بیزار خوشامد سے خفا — ہائے اس روٹھنے والے کو منائیں کیونکر

بادہ پرست ہیں و لے، دل پہ بھی اختیار ہے — توبہ کریں گے ہم مگر اب کی بہار دیکھکر

متاخرین کا دور شاد کی حسب ذیل نظم پر ختم کیا جاتا ہے ؎

فلک کیونکر نہ روئے اب عظیم آباد کے اوپر[1] — نہ اب باقی بلاغت ہے نہ یاں شور فصاحت ہے

کہاں بیدل، کہاں ملا علی تحقیق سا کامل — پتہ یہ بھی نہیں ملتا کدھر دونوں کی تربت ہے

کہاں ہے راسخ مرحوم، سرخیل نوا سنجاں — کہ فخر میر استاد جہاں جس سے عبارت ہے

وہ موزوں نظم کی کیفیتوں کو جو سمجھتا تھا — وہ عشق ذو فنوں مشہور جو پیر طریقت ہے

کہاں ہے شیفتہ، کس جا ہے شیدا ہے کہاں کاہش — کہاں کیفی، کہاں مفتون پاکیزہ طبیعت ہے

ذبیح خوش کلام اب کون سے گلشن میں جا پہونچا — کہاں ہے یاس اور تسکین کی کس جا سکونت ہے

شرر کیا ہو گیا آتشکدہ سے دہر فانی کے — کدھر ہے احمد منشا کہاں اس کی ذکاوت ہے

---

[1] یہ ایک قطعہ ہے جسے شاد مرحوم نے ۱۸۸۰ء میں کسی موقع پر پڑھا تھا۔ غالباً ابھی تک یہ غیر مطبوعہ ہے۔ ان میں بعض اُن شعرا کا نام بھی ہے جن کا میں نے اپنے اس مضمون میں طوالت کے خیال سے تذکرہ نہیں کیا ہے ۱۲

کہاں ہے الفتؔی جوہرشناسِ اہلِ فن اے دل
یہ نقدِ فارسی دانی یہاں جس کی عنایت ہے
کہاں ہے وہ ضمیرِ باکمال وحشتؔی یارب
کدھر ہے عبرتؔی اے وائے کیا کیا جائے عبرت ہے
اندھیرا کیوں نہ ہو یہ بج لحد میں ہے قمرؔ پنہاں
ضیاؔ باقی نہیں اس شہر کی بے نور صحبت ہے
کہاں تسلیمؔ اور مائلؔ کدھر شاگرد ہے اس کا
کدھر ہے فیضؔ مشہورِ جہاں جس کی ریاست ہے
کہاں مہدیؔ کہاں ہے مہدوی دیکھوں کدھر جا کر
کدھر آشفتہ ہے مجنوںؔ کہاں ہے، دل کو کلفت ہے

...

رکا رہتا ہے دم نالے دباتے ہیں گلا اپنا
ہجومِ یاس ہے چاروں طرف اور خیلِ حسرت ہے
پڑھو اشعار چندے شادؔ گو طومار ہے غم کا
سمجھ رکھو کہ یہ صحبت پھر اس شب کی غنیمت ہے

دورِ حاضرہ

موجودہ قابلِ ذکر شعرا کی کثرتِ تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مضمون میں اُن کا نام ہی گِنا دینا مجھے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔ اس لئے اس وقت صرف چند شعرا کا تذکرہ کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان شعرا کو بغیر کسی قسم کی قید کے محض مثالاً پیش کرتا ہوں۔ اس سے قطعاً یہ مقصود نہیں ہے کہ موجودہ شعرا میں صرف یہی چند حضرات قابلِ ذکر تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندہ مصنف یا شعرا کی صلاحیتوں یا امکانات پر رائے زنی کرنا کسی حد تک قبل از وقت ہوتا ہے۔ اس لئے ان پر حکم لگانا ایک طرح کی زیادتی ہے۔ جن شعرا کا میں تذکرہ کر رہا ہوں ان پر کوئی آخر اور فیصلہ کن رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ مقصود صرف نمونہ کلام پیش کرنا ہے نہ کہ شاعر کی شخصیت یا حیثیت۔

(۱) حضرت شفقؔ رضوی عماد پوری۔ آپ آج کل کے بڑے کہنہ مشق شاعروں میں ہیں۔ قیام زیادہ تر الہ آباد میں رہتا ہے۔ آپ کا کلام ہندوستان کے علمی اور ادبی پرچوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ رنگ بیشتر صوفیانہ ہوتا ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

کیوں طور پہ جائیں اے موسیٰ وہ دل میں نظر آ جائے گا
نزدیک سے جو دیکھا نہ گیا کیا دور سے دیکھا جائے گا
جب آخری منزل آئے گی وہ سامنے خود آ جائے گا
اِک اِک پردہ دوری کا ہر سانس پہ اُٹھتا جائے گا

گھر سے ہیں کیا مطالب ہے شفق گھر والے کے مل جانے سے غرض
بت خانہ میں وہ نہ ملا نہ یہی کعبہ میں نظر آجائے گا

جو ہو پاسِ ادب مانع عیاں رازِ نہاں کیوں ہو
دہن میں پھر زباں کیوں ہو زباں پر پھر فغاں کیوں ہو

مکاں یا لامکاں جس گھر میں تم ہو پوچھنا یہ ہے
نشاں اپنا بتا کر سب کو ایسے بے نشاں کیوں ہو

کبھی گلچیں کبھی صیّاد جس کو دور سے تاکے
چمن میں ہمصفیرو! اتنا اونچا آشیاں کیوں ہو

کوئی در ہو جہاں رکھدوں گا سر بن جائے گا کعبہ
غرض سجدوں سے ہے پھر اک ترا ہی آستاں کیوں ہو

بہار آنے سے پہلے ہم اٹھا لیں آشیاں اپنا
خفا گلچیں۔ عدو صیّاد۔ دشمن باغباں کیوں ہو

خدا جانے یہ کیسی دوستی ہے دشمنی کیسی
بنو تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

شفق تو نے نہ کی جب قدر اپنی بے نیازی سے
کسی کو کیا غرض ایسے کا کوئی قدرداں کیوں ہو

(۲) جناب **فضل حق صاحب آزاد**۔ آپ آج کل کے مشہور شعرا میں ہیں آپ کا شمار استادوں کے زمرہ میں کیا جاتا ہے۔ آپ کی شاعری کے متعلق مولف خمخانہ جاوید کی رائے ہے:-

"معمولی فرسودہ[1] خیالات سے آپ کی جدت پسند طبیعت متنفر ہے۔ آپ کی نظم میں اچھوتے نیچرل خیالات اکثر پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ کہیں بوجہ علوئے معلومات و تبحر علمی شوکتِ الفاظ زیادہ ہوتی ہے۔ مگر نہ ایسی کہ قابلِ گرفت ہو آپ کی کوئی نظم لطف سے خالی نہیں پائی۔ بلکہ جدت خیال اور سلاستِ بیان اس پر مستزاد ہے"[2]

آزاد اخباری دنیا میں کافی مشہور ہیں۔ رسالہ مخزن لاہور اور اردوئے معلی علی گڑھ میں آپ کا کلام برابر شائع ہو کر اہل ذوق حضرات سے خراج تحسین وصول کرتا رہا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے:

حور پردہ میں ہے چوتھی کی دلھن چلمن میں
مئے گل رنگ ہے یا لال پری شیشے میں

نگہ ناز کوئی چشمِ فسوں ساز میں ہے
یا بھری ہے یہ مئے بے خبری شیشے میں

جا چکی گلشن سے جب فصل بہار
آہ کب رخصت ملی پرواز کی

جام مئے سرشار ساقی مہرباں
لب تک آجائیں نہ باتیں راز کی

---

[1] رسالہ ندیم ماہ مارچ ۱۹۳۳ء ص ۳۱ [2] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۴۲

رنگ میں آزاد یہ اردو غزل — ہے بھری بوتل مۓ شیراز کی

لالہ کو کہاں نصیب وہ داغ — جو دل کو دیئے ہیں آرزو نے

خنجر ہوا سرخرو لہو سے — لالی رکھ لی رگِ گلو نے

(۳) مولنا محی الدین صاحب تمنا عمادی مجیبی (پھلواری) :- آپ عظیم آباد کے بڑے پرگو شاعر ہیں بہار کے لئے آپ کی ذات بسا غنیمت ہے۔ کلام میں سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

جس گلی سے لوگ لائے تھے بعد مشکل مجھے — لو وہیں پھر لے چلا کم بخت میرا دل مجھے

رخ تو میرا پھیر دے لے موجِ دریا اس طرف — دور ہی سے کچھ کہے شاید لبِ ساحل مجھے

خاک تو میں ہوں مگر خاکسترِ پروانہ ہوں — جانئے اک یادگارِ گرمئ محفل مجھے

ناتواں ہوں کس قدر دوڑوں ذرا تھم ساربان — کچھ اشارے کر رہا ہے پردۂ محمل مجھے

جاگتے میں کون آتا ؟ دل ہی کتنا چور کا — حشر پھونچا دیکھکر سویا ہوا غافل مجھے

لوگ کرتے ہیں تمنا کیں لئے کسبِ ہنر — اتنی تحصیلِ ہنر سے کیا ہوا حاصل مجھے

(۴) حافظ سید شاہ محمد شفیع صاحب فردوسی - بہار کے مایۂ ناز شاعر ہیں۔ آپ کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قریب قریب صوبہ بہار کے ہر رسالہ میں آپ کا کلام برابر بڑے آب و تاب سے شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے ایک زمانہ تک قصبہ بہار سے رسالۂ "الامین" کو نکال کر علم و ادب کی خدمت بھی کی ہے۔ مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری کی اولاد میں سے ہیں۔ ابتدا میں جناب احقر مرحوم سے مشورۂ سخن لیتے تھے۔ کلام کا رنگ زیادہ تر متصوفانہ ہوتا ہے۔ لیکن آپ کی اکثر غزل میں شوخی بھی پائی جاتی ہے۔

نمونۂ کلام ؎

تھی عشق میں غم کی نہ کمی خونِ جگر کی — کھا پی کے بہت چین سے اوقات بسر کی

مشکل نظر آتا تھا گلا کاٹ کے مرنا — آخر یہ مہم بھی ترے جانباز نے سر کی

حیران ہیں دل ایک ہے چوٹیں ہیں ہزاروں — کھاتے ہیں کدھر کی تو بچاتے ہیں کدھر کی

کم بخت کو اس پر بھی شکایت ہے اثر کی — پھر سن کے مرا نالہ وہ گھبرا کے کہیں گے
پلچل ہے شفیع آج سرِ عرش اثر کی — یہ نالۂ مہجور ہے یا نغمۂ داؤد

(۵) شاہ محمد الیاس صاحب یاس : آپ صوبۂ بہار کے کہنہ مشق شاعر ہیں فارسی شاعری پر تجربہ۔ بذاتہ مجھے ان کے فارسی کلام میں اردو سے زیادہ لطف آتا ہے۔ گو اس میں شک نہیں اردو کلام بھی کافی بلند پایہ ہوتا ہے ایک مدت سے اردو شاعری کی گراں بہا خدمت کر رہے ہیں۔

نمونہ درج ذیل ہے ؎

تپش کی راحت اندوزی کہ روحِ زندگی میری — وہ کیسے لوگ ہیں جو درد سے فریاد کرتے ہیں
پسِ مردن ہمارے ضبطِ غم کی داد ملتی ہے — وفا کا نام جب آتا ہے تم کو یاد کرتے ہیں
ہمیشہ ہم نے دیکھا اُن کو محوِ خود فراموشی — خدا جانے جنابِ یاس کس کو یاد کرتے ہیں

رباعی

اندیشۂ انجامِ عمل کرنا تھا — یا خوف بہ ہنگامِ عمل کرنا تھا
توبہ بھی نہ کی یاس پسِ سوءِ عمل — کچھ تو ارے بدنام عمل کرنا تھا

ہائے ناکامیِ الفت ہائے مجبوریِ عشق — غیر سے کرنی پڑی ہے التجا تیرے لئے

(۶) جناب جمیل مظہری :- آپ آج کل کے نوجوانوں میں صوبۂ بہار کے مقبول شاعر ہیں اور ادبی دنیا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ قیام زیادہ تر کلکتہ میں رہتا ہے۔ جناب وحشت سے آپ کو تلامذہ حاصل ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

جنگل کی خاموشی میں چھوٹی سی اک دنیا ہو — تو ہو تیری عذرا ہو، میں ہوں میری رادھا ہو
محفل میں جب دو نظریں چپکے چپکے ملتی ہوں — کوئی سہمی جاتی ہو، کوئی جھینپا جاتا ہو
موجیں ماتم کرتی ہیں اس کشتی کی قسمت پر — جس کے تختے ٹوٹے ہوں جس کا مانجھی سویا ہو
دردِ جمیل اس دنیا میں شاعر کا سرمایہ ہے — شاعر اس کو کہتے ہیں جو اپنی بیتی گاتا ہو

تلاش کرنے سے دنیا میں کیا نہیں ملتا | مگر وہ درد جو ہو لا دوا نہیں ملتا
میں اس خدائے تمنا سے کیا سوال کروں | خود اپنے ذوق کا مجھ سے پتا نہیں ملتا
نہ مئے گراں ہے نہ ساقی کی چشم لطف بخیل | مگر کسی کا پیالہ بھرا نہیں ملتا
جمیل کے لئے بے چین ہے نظر ان کی | پھر آج بزم میں وہ بے وفا نہیں ملتا
اسے متبعِ وحشت کا حق نہیں ہے جمیل | جسے کہ دردِ جگر میں مزا نہیں ملتا

ایک رباعی بھی ملاحظہ ہو:

صد چاک ہوا گو جامۂ تن مجبوری تھی سینا ہی پڑا | مرنے کے لئے وقت مقرر تھا مرنے کے لئے جینا ہی پڑا
پیتے ہی کہا تھا ساقی نے "اس جام میں تلخی ہے جمیل" | پر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

(۷) جناب شاہ اکرام الدین صاحب عرفان۔ ان معروف و مغتنم ہستیوں میں سے ہیں جن پر بہار بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ صوبۂ بہار کے ایک باوقعت رئیس ہیں۔ آپ کی سیر چشمی اور علم پروری کا شہرہ دور دور تک ہے۔ قیام زیادہ تر اسلام پور ایک چھوٹے سے قصبے میں ہے۔ آپ فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اردو کلام آپ کا بڑا سنجیدہ اور عارفانہ ہوتا ہے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے

خطِ سبز اس آتشیں رخسار پر | ہے وکیلِ اعجازِ حسنِ یار پر
لاکھ جانیں ہوں تو کر دیجے نثار | یار تیری لذتِ دیدار پر
ہائے ساقی تیرے مے خواروں کا جوش | آنکھیں پڑتی ہیں ترے مے خوار پر
شوق سے لیجے متاعِ دل مگر | قرض ہے یہ حسن کی سرکار پر
ساغرِ الفت کے جو بیہوش ہیں | ہے انھیں ترجیح سو ہوشیار پر
صورتِ پروانہ عرفاں نے بھی آج | جان دیدی شعلۂ رخسار پر

(۸) جناب سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ولی ڈپٹی مجسٹریٹ بہار شریف۔ موجودہ شعرا میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ فارسی پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ مگر زیادہ تر اردو ہی میں کلام موزوں فرماتے ہیں۔ یہ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ آپ کے علمی مضامین بہار کے اکثر علمی رسالوں میں شائع

ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو میں غزل سے زیادہ نظم لکھنی پسند کرتے ہیں۔ آپ ضلع گیا کی ایک بستی کماکو کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے چند اشعار درج ذیل ہیں :ــ

حسن صبیح ہے غضب قہر ہے گیسوئے دراز　　خال سیاہ ہے ستم فتنہ ہے چشم سحر ساز
نعمتِ لازوال ہے عشق نے کردیا غنی　　جان ہے وقفِ بے خودی دل ہے رہینِ سوز و ساز
اشک فشاں ہے چشم زار در پہ ہوں تیرے سجدہ باز　　مذہبِ عشق میں یہی اپنا وضو ہے اور نماز
برق بھی بے قرار ہے ہائے رے تیری شوخیاں　　حشر بھی پائمال ہے اُف رے تیرا خرام ناز
دہر ہی وہ حرم ہیں وہ مسجد و میکدہ ہیں وہ　　عالمِ عشق میں نہیں فرقِ حقیقت و مجاز
میری جبینِ سجدہ ریز بن گئی جزوِ خاکِ در　　تو بھی ہوئی کہ ملتفت تیری ادائے بے نیاز
شاہ و گدا کی کیا تمیز مسلکِ حسن و عشق میں　　ہے دلِ غزنوی یہاں بستۂ گیسوئے ایاز

آخرِ شب ہے اے ولی اور وہ محوِ خواب ہیں
اپنا فسانۂ الم ختم کر اب زباں دراز

(۹) پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل۔ پٹنہ کے ایک نغز گو شاعر ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ــ

جھکی کس آستانے کی زمیں پر　　نشاں خنجر کا ہے اپنی جبیں پر
لبوں پر آگیا آخر تبسم　　نہ زور ان کا چلا چینِ جبیں پر
وہ دل جو تھا حریفِ شوخیٔ ناز　　ہوا قربان چشمِ شرمگیں پر
یہ الزامِ مصیبت تیرا ناصح　　غلط ہے عشقِ راحت آفریں پر
کہا کس نے میں مایوس لوٹا　　غبارِ آستاں تو ہے جبیں پر

کیا جس وقت ضبطِ نالہ بیدل
قیامت ہو گئی قلبِ حزیں پر

(۱۰) اختر احمد ختر آرمیوی: نوجوان شاعر ہیں لیکن کلام میں بڑی صفائی پائی جاتی ہے۔ رسالہ ندیم سے ان کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

پہلے تو بہت نادان تھے وہ اب ان کی شرارت کیا کہئے | اس شوخ ادا کی باتوں میں جملوں کی لطافت کیا کہئے
تھم تھم گئے وہ رونا آنکھوں کا اور زخم جگر کا ہنس دینا | آنا وہ تصور میں ان کا اور چپکے سے رخصت کیا کہئے
ہوتے وہ مرے کیا کہنا تھا حاصل نہ ہوا مجھکو یہ شرف | کیا راز ہوا افشا الفت کا اب حرف محبت کیا کہئے

اختر بھی تڑپتا ہے تیری چاہت کی کہانی کو سنکر
دکھ درد یہ سب کے سہتا ہے شاعر کی بھی حالت کیا کہئے

(۱۱) سید شاہ نصیرالدین صاحب جگر صوبہ بہار کا یہ دردمند شاعر ابنائے شعر و شاعری میں ہمیشہ باقی رہے گا اس کی زندگی سرتاپا شعریت ہے۔ اس کی زندگی درد و الم کی تصویر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہر شعر میں درد و تڑپ ہے۔ ابتدا میں جناب شاہ شفیع صاحب سے اصلاح لی ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

شیشہ کی طرح ساغر واعظ نے جو دے پٹکا | بس چیخ اٹھے میکش ہے ہے یہ میرا دل تھا
کیا یادِ الٰہی میں دنیا سے جگر اٹھا | گو رند تھا ظاہر میں باطن میں وہ کامل تھا

ہم نے سب نذرِ جنوں وحشت کا ساماں کر دیا | چاک داماں کر دیا تار گریباں کر دیا
کہدیا کیا کان میں چپکے سے تو نے اے صبا | گل کو خنداں کر دیا بلبل کو نالاں کر دیا
منحصر مجھ پر ہی کب ہے اے جنوں جامہ دری | صبح کے مطلع نے بھی تو چاک داماں کر دیا

رباعی

اک روز جہاں سے مجھے جانا بھی ہے | منہ حشر میں خالق کو دکھانا بھی ہے
ڈرتا ہوں جگر جاؤں تو کس برتے پر | عقبیٰ میں کہیں اپنا ٹھکانا بھی ہے

جگر کی زندگی کی اصلی تصویر ایک غزل میں نظر آتی ہے جو رسالہ "الامین" میں شائع ہوئی ہے ؎

اہلِ قفس رہیں سب کی نظروں میں جو بے توقیر ہوں | بانگِ بے ہنگام ہوں یا آہِ بے تاثیر ہوں

وہ ملا دل آہ جو کھلنے نہ پائے گا کبھی — گلشنِ ہستی میں گویا غنچۂ تصویر ہوں
زندگی بھر لاکھ تم دامن بچاتے ہی چلے — خاک ہو کر اب یہ ہمت ہے کہ دامنگیر ہوں
کیوں مٹاتا ہے فلک کیا دیکھتا سنتا نہیں؟ — صانعِ قدرت کی میں اک بولتی تصویر ہوں
کوئی کتنا ہی جگائے ہونگا اب بیدار خاک — بختِ خفتہ یعنی میں سوئی ہوئی تقدیر ہوں

"یادِ اجمل خاں" میں جگر نے اس طرح اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

اے فلک تجھ میں نہیں کچھ انتہائے ظلم و جور — دیکھتے ہیں ہم تو دنیا سے نرالے تیرے دور
اس ستم ڈھانے میں کرتا ہی نہیں تو فکر و غور — بڑھ کے اس سے قہر کیا ڈھائے گا ہم پر کوئی اور

وہ مسیح الملک گویا ہند کا روحِ رواں
کر دیا خاموش تو نے ہائے اس کو ناگہاں

عزت و ناموس کا اے قوم گر احساس ہے — جامعہ میں آ کے دو جو کچھ تمھارے پاس ہے
دو خدا کی راہ پر تم سے بہت کچھ آس ہے — راہ خدا جب کھل گئی تو دل میں کیوں وسواس ہے

آہ اجمل خاں کی یہ باقی کہانی رہ گئی
جامعہ یا طبیہ کالج نشانی رہ گئی

جامعہ چھوڑا تو بس محکوم ہو جاؤ گے تم — اور سن لو حق سے بھی محروم ہو جاؤ گے تم
رفتہ رفتہ ایک دن معدوم ہو جاؤ گے تم — خدمتِ قومی کرو مخدوم ہو جاؤ گے تم

قوم سے بہرِ خدا اتنی ہماری عرض ہے
جامعہ کو اب بچا لینا تمھارا فرض ہے

اے جگر اب یہ دعا کر دل میں سب کے صبر دے — رتبۂ اعلیٰ خدایا ان کو جنت میں ملے
حشر تک یارب جہاں میں جامعہ پھولے پھلے — تا قیامت نام اجمل خاں کا یوں زندہ رہے

جامعہ کی ہو ترقی قوم کی تعلیم ہو
طبیہ کالج سے ملکِ جسم کی تنظیم ہو

(۱۲) سید محمد عبدالعزیز صاحب عزیزؔ- اپنی اعلیٰ تخیلی اور سلاستِ زبان کے لحاظ سے اُستادوں کے زمرہ میں بجاطور پر شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں آپ کی قومی نظموں نے بہار کی بیداری میں جو کارہائے نمایاں کئے تھے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ آج کل بھی آپ زیادہ تر نظم ہی لکھتے ہیں اور جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے آپ عروض دانی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ قصبۂ بہار کے قریب ایک گاؤں جمالی چک ہے۔ آپ کا قیام زیادہ تر وہیں رہتا ہے۔ نمونۂ کلام کے لئے آپ کی ایک قومی نظم "خطاب بہ فصل بہار" درج ذیل ہے:ـ

آج ہوا میں باغ کی وہ اثر اے بہار دے
جو رخِ گل نکھار دے زلفِ چمن سنوار دے

جائے فسردگی کا راج کر غمِ دل کا تو علاج
شاہِ خزاں کے سر سے آج تاجِ غرور اُتار دے

بادِ سموم سے مرا جوشِ جنوں دبا رہا
فصلِ بہار جلد آ اور اُسے اُبھار دے

ضبط سے خون ہے جگر موسمِ گل کر اک نظر
خستۂ تیغ "جبر" کو مرہمِ "اختیار" دے

ابرِ نوطراز سے صفحۂ دل کی لے خبر
نقشِ اَلست مٹ چلا تو اب اسے اُبھار دے

باغ و چمن میں منحصر لطف و کرم ترا ہو
جس پہ گلوں کو رشک ہو دشت کو تو وہ خار دے

ولولۂ بہار نے دعوتِ عام دی ہے آج
صحنِ چمن میں عندلیب جاکے ذرا پکار دے

دامنِ بوستاں کو جب آتشِ گل سے بھر دیا
بلبلِ نالہ زن کو بھی سینۂ پُر شرار دے

ختم ہوئی مئے سبو جائے نہ میکشی کی خو
شوقِ طلب میں اور جوش اے اثرِ خمار دے

فصلِ خزاں کا وہ سکوں جسمِ حیات کا تھا خوں
بادِ بہار تو مجھے اک دلِ بے قرار دے

دامنِ بوستاں میں ہو ابرِ بہار گل فشاں
اور دلِ حریف کو تحفۂ نوکِ خار دے

آئے صدا جو کان میں ڈال دے جان جان میں
زاغ کی بھی زبان میں زمزمۂ ہزار دے

بادِ سموم جور نے حوصلے کردئے ضعیف
ابرِ کرم عزیزؔ کو ہمتِ استوار دے

(۱۳) سید شاہ عطاء الرحمٰن صاحب عطا ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) صوبہ بہار کی ان ہستیوں میں ہیں جو بغیر کسی خواہش نام و نمود کے اُردو شعر و ادب کی خدمت کرنی اپنا فرض اولین جانتے ہیں اُردو شعر و ادب کی آپ جس خاموشی سے اور مستقل طور پر خدمت کر رہے ہیں اس کی مثال مشکل مل سکتی ہے۔

آپ ضلع گیا میں ایک بستی کاکو ہے وہاں کے اس خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی نجابت اور شرافت کی وجہ سے ممتاز و سربلند ہے۔ آپ اپنی علمی اور ادبی خدمات کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد جناب سید شاہ غفور الرحمٰن صاحب فارسی کے پرگو شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے بھائی وؔلی اور اخترؔ بھی دورِ حاضر کے بلند پایہ شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔

جناب عطاؔ گرچہ ایک شاعر کی حیثیت سے زیادہ ایک ادیب کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن مجھے ان کی شاعری میں بھی ایک خاص جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں صداقت ہے اور تخیل میں بلندی اور زبان میں لطافت۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

مانع جور و جفا گر ہو تو ہے عین جفا   خوگر لذتِ آزار ہوں ایذا کیسی

خدا کرے کہ نہ دیکھیں کبھی وہ آئینہ   حسین ہونے کا ان کو یقیں نہ ہو جائے

سکون زندگی ہے موت بلکہ موت سے بدتر   نویدِ زیست ہے سرگرمِ شوقِ جستجو رہنا

بس یہی ہے کہ کھنچا جاتا ہے دل اس کی طرف   اور میں کیا کہوں تم سے کہ محبت کیا ہے

ادا وہ کیا کہ چرائے نہ دل کو دم بھر میں   وہ حسن کیا جو معاً دل نشیں نہ ہو جائے

اپنی ایک نظم میں مجموعہ "حسن و محبت" یعنی "عورت" پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ذیل میں پوری نظم پیش کی جاتی ہے۔ اس سے آپ ان کے کلام کا اندازہ بھی لگا لیں گے۔

نظم

اک عالم رنگ و بو ہے عورت   ایک محشرِ آرزو ہے عورت

سامانِ سرور و شادمانی   سرمایۂ عیش و کامرانی

وہ موجب صد نشاط بھی ہے   سرمایۂ انبساط بھی ہے

سب کچھ ہے مگر بلا ہی عورت — میں کیا کہوں جانے کیا ہی عورت

دل بھی اور دل کا مدعا بھی — ہے درد بھی درد کی دوا بھی
آفت بھی قہر بھی بلا بھی — شوخی بھی ناز بھی ادا بھی
ہے پیکر مہر بھی جفا بھی — سرمایۂ زیست بھی قضا بھی

یہ اس کا شباب ہے کہ یا رب — مینائے شراب ہے لبالب
ہے جانِ شراب اس کی مستی — ہے جانِ شباب اُس کی ہستی
مستی کے ساتھ ہوشیاری — اور شرم کے ساتھ عشوہ باری

اس کی رفتار اک آفت — قامت اس کی ہے ایک قیامت
آنکھیں ہیں شراب کے پیالے — لو میں چلا اب کوئی سنبھالے
وہ اس کی سحر کار آنکھیں — وہ اس کی گنہگار آنکھیں
وہ اس کی چشمِ فتنہ پرور — گردش جس کی ہے دورِ ساغر

عورت ہی حسن اور حسن عورت — اس کی ہے زندگی محبت
عورت ہی کائنات کی جان — عالم اس کے بغیر ویران

یار زندہ صحبت باقی!

احسان فراموشی ہوگی اگر میں اس سلسلہ میں اپنے برادر محترم جناب حکیم سید محمد اشرف جہانگیر صاحب کی ان کوششوں کا جو انھوں نے دور حاضر کے شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام کے بہم پہنچانے میں کی ہیں شکریہ کے ساتھ اعتراف نہ کروں۔

محمد معین الدین دردائی

لمعات

(حضرت اختر انصاری)

مدفنِ شباب

جہاں دیدنی ہے لہو کی روانی　　برستی ہے جس جا مئے ارغوانی
جسے کہتے ہیں سرزمینِ محبت　　وہیں دفن ہے میری کافر جوانی

رعنائیِ تخیّل

نہ دل ہے نہ ہنگامہ آرائیاں ہیں　　تحیر ہے، فرماں ہے، تنہائیاں ہیں
یہ عشق و محبّت، یہ بادہ، یہ نغمہ　　سب اپنے تخیل کی رعنائیاں ہیں

غزل

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں　　منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں
ایک تصویرِ محبّت ہے جوانی گویا　　جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں
عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں　　عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں
آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی اپنی خوشی　　اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں
شعر کہتے ہو بہت خوب تم اخترؔ لیکن
اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

"موت و حیات سب ہیں گم محو یہ کائنات ہے"

حضرت اصغر

موت و حیات سب ہیں گم، محو یہ کائنات ہے
مست قلندر آج کل مائلِ سیرِ ذات ہے

دن وہ کہیں تو دن سہی، رات کہیں تو رات ہی
عقل کی سو حکایتیں، عشق کی ایک بات ہے

کوئی بلائے تازہ پھر جانِ حزیں پہ آئے گی
پھر وہ نگاہِ سحر فن مائلِ التفات ہے

موت کو ڈھونڈھتا ہوں میں، موت کا کچھ پتہ نہیں
تو ہی سرِ حیات ہی تو ہی پسِ حیات ہے

سود و زیاں کے راز کی تجھکو ابھی خبر نہیں
ورنہ قصاصِ عاشقی حاصلِ صد حیات ہے

باغِ نعیم بھی بجا، نارِ جحیم بھی درست
تو مجھے بھیجدے جہاں میری وہیں نجات ہے

عشق کو حسن کے سوا اور نہ کچھ نظر پڑا
چشمِ خرد کے سامنے پردۂ کائنات ہے

مادرزاد

از سید سلطان حیدر صاحب جوشؔ

(۱)

"سیس پر گھڑا دھرے پنہاری۔ ی ی۔ پنگھٹ پہ ہو رہی بھیڑ"

مس پیاری، اسٹیج پر گا رہی تھی، نرت کے ساتھ بتا رہی تھی اور رہ رہ کر اپنے ناچ سے پوری اسٹیج پر ایک دائرہ بناتی جاتی تھی۔ تھیٹر تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سریلی اور اونچی آواز ہوا میں لہرا رہی تھی، اور تمام حاضرین پتھر ہو کر رہ گئے تھے۔

"سیس پر گھڑا دھرے پنہاری" کی تصویر بنتے ہوئے، مس پیاری نے شوخی آمیز تبسم اور دل آویز جنبش گردن کے ساتھ، فتنہ انگیز رقص شروع کر دیا۔ شروع کر دیا اور اسی انداز کے ساتھ اسٹیج کو پامال کر ڈالا پامال کر ڈالا اور چھلاوے کی طرح ایک پکھوائی کی آڑ میں چلی گئی۔ نظروں سے اوجھل ہوتا تھا کہ تماشائیوں نے تالیوں اور سیٹیوں سے ساری عمارت سر پر اٹھالی اور اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک کہ مس پیاری مسکراتی ہوئی پھر سامنے نہ آگئی ہو۔ گھونگر والے بال، موہنی آنکھیں، سبک ناک، تنگ دہانہ اور گورا رنگ مس پیاری کی مادر زاد خوبیاں تھیں مگر رقص و سرود کا کمال تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سترھویں سال میں پہنچتے پہنچتے، اور بچپن کو شباب بناتے بناتے، مس پیاری بلائے بے درماں ہو گئی تھی۔ لیکن یہ ملا کا شباب نہ باپ کے زیر سایہ حاصل ہوا تھا نہ ماں کی آغوش میں۔

خوش قسمتی سے وہ اس آزاد طبقے کی شگوفہ تھی جس کو دل گیری کی جد و جہد میں باپ کا علم اس قدر بھی نہیں ہوتا، جس قدر اسٹوارٹ مل اور ہکسلے کو خدا کا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ پیدائش کا دار و مدار ماں پر اور پیداوار کا انحصار زمین پر۔ دو پایہ مخلوق ہو یا ہزار پایہ، تخم ریزی کا فرض کوئی بھی ادا کرے، افزائش نسل کا سہرا مادہ ہی کے سر رہتا ہے۔ قانون فطرت کے پابند حیوان کو باپ کے معلوم کرنے کی ضرورت، پیدائش سے لے کر موت تک، ایک دفعہ بھی محسوس نہیں ہوتی۔

البتہ مس پیاری کا ماں کی آغوش سے محروم رہنا غیر معمولی واقعات کا نتیجہ تھا۔ اس نے زبان کھولی تو لاڈلی کو اماں جی' پکارا' اور ہوش سنبھالا تو اسی لحیم شحیم ہستی کو دیکھا۔ یوں تو نسوانی جسم کے لئے جن اعضاء کی ضرورت ہے وہ سب لاڈلی کے حصّے میں آئے تھے؛ اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک کوئی عضوِ نسائی مفقود نہیں تھا۔ مگر ان میں کوئی باہمی تناسب نہ عیاں تھا، نہ مخفی۔ مجبوراً لاڈلی کو اسی قدر راست باز اور خدا ترس ہونا پڑا جس قدر ایک بھونڈی اور بھدّی ہستی چار ناچار ہوتی ہے۔ لاڈلی اپنی جوانی میں شاید ایک آدھ مرتبہ بھولی ہو، مگر بھولے بھٹکے بھی پھلی نہیں؛ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ پیاری کا پالنا اس کا مشغلۂ حیات بن گیا۔

پیاری صرف تین برس کی جان تھی کہ لاڈلی کی آغوش میں آگئی۔ بچپن کی قوتِ تجسّس' پیاری نے اسی لحمی برِّ اعظم کے نشیب و فراز سمجھنے اور طول و عرض معلوم کرنے میں صرف کردی۔ پیاری کی تعلیم ــ آبائی بھی اور رائج الوقت بھی ــ زمانے کے اعتبار سے ہوئی اور خوب ہوئی۔ فنِّ موسیقی کے لئے اس کے گلے میں پری تھی' اور لکھنے پڑھنے کے لئے اس کے اندر طبعِ ذہین تھی۔ آبائی تعلیم اس کے گھر کے استاد جی نے لاڈلی کی نگرانی میں دی ہو، مگر لکھنے پڑھنے کی تعلیم مشن گرل اسکول میں ہوئی۔

جنسِ نو کی گرم بازاری اس کے اعلان و شہرت پر منحصر ہے؛ اور جنسِ حُسن بھی اس کلّیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ گزشتہ زمانے میں اعلانِ حُسن کے لئے، لبِ بام آنا، عُرس کے موقعہ پر مزاروں کا چکّر لگانا اور مشہور مقامی میلوں میں جلوہ افروز ہونا، طبقۂ آزاد کے مسلّمہ شعار تھے؛ مگر موجودہ زمانہ میں اسکول' اسٹیج اور اسکرین نے پرانے طریقوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ لاڈلی نے پیاری کو مدرسہ میں داخل کرنے سے زمانہ شناسی کا ثبوت دیا تھا؛ اور پیاری نے آبائی زندگی کے بجائے ایکٹرس کا موثر پیشہ اختیار کرنے میں انتہائی ذہانت کا اظہار کیا تھا۔ سولھویں سال کے ختم ہوتے ہوتے' اس کی نظر فریب تصویریں مختلف اخباروں اور رسالوں میں شایع ہو چکی تھیں آج بھی تھیٹر کا دیا سلائی کے بکس کی طرح بھرا ہونا محض مس پیاری کے بدولت تھا۔

انترے کو اونچی آواز اور لے کاری کے ساتھ ختم کرتے ہی مس پیاری جب آستائی پر پلٹی تو السیا معلوم ہوتا تھا کہ سامعہ فریبی کے سمندر میں مدّ و جزر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ایک لمحہ کے وقفہ کے بعد اُس نے آستائی کو دُگن میں دُھرایا اور کیفیتِ ہوش رُبا کے ساتھ رقصِ ناز شروع کر دیا۔ عین اس وقت جب کہ وہ سبک قدمی

گل کترتی ہوئی اسٹیج سے گزر رہی تھی کہ تماشائیوں میں سے ایک من چلے نوجوان نے۔ جو درجۂ خاص کی اگلی قطار میں رونق افروز تھا پھولوں کا گجرا ایسا تاک کر پھینکا کہ مِس پیاری کے ٹھیک سر پر گرتے ہی گلے کا ہار ہو گیا اس برمحل قادراندازی پر چاروں طرف سے تالیاں بج گئیں اور درجنوں نظریں اس من چلے نوجوان پر پڑ گئیں۔ لیکن ان نظروں میں سب سے زیادہ معنی خیز پیاری کی ترچھی نظریں تھیں جو خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ نوجوان کو عطا کی گئیں۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ یہ نوجوان سیاہ ڈیمی ڈریس پہنے، کوچ کے تکیے پر سہارا لئے، ٹانگ پر ٹانگ پھیلائے، بظاہر انجان بنے، سگرٹ کے دھوئیں سے ہوا میں چھلے بنا رہے تھے؛ اور پہچاننے والوں نے پہچانا کہ مسٹر ایچ۔ کیرار بیرسٹرایٹ لا تھے۔

یہ نوجوان بیرسٹر، ولایت جانے سے پیشتر محض حیدر کرار تھے۔ ایک مجلس میں اُن کے برادرِ خورد کا نام 'جعفرِ طیار' اور پدرِ بزرگوار کا نام 'احمدِ مختار' معلوم ہونے پر ایک حاضر جواب نے بیساختہ اُن کے جدِّ امجد کا نام 'پاک پروردگار' تجویز کیا تھا؛ اور یہ لطیفہ شہر بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ حیدر کرار ولایت کے زمانہ میں آئی۔ سی۔ ایس۔ ڈاکٹری اور انجنیری کے امتحانات کے لئے محمود غزنوی بنے رہے۔ فرق اس قدر تھا کہ محمود اپنے حملوں میں فتح یاب رہا؛ اور یہ ہمیشہ شکست اٹھاتے رہے۔ البتہ موروثی جائداد کا بڑا حصہ ولایت کے اخراجات میں فنا کر چکنے پر، بیرسٹری کا ڈپلوما، بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کی طرح، ان کے ہاتھ آگیا؛ اور یہ اپنے وطنِ مجہول میں مسٹر ایچ۔ کیرار بارایٹ لا بن کر واپس آئے۔ دو تین سال مغربی تعلیم و تہذیب کا نشہ دماغ پر چڑھا رہا؛ مگر جب کچہری کے روزانہ طواف اور حکامِ ضلع کی بددماغی جھیلنے پر بھی آمدنی کے موکل تابع نہیں ہوئے، تو مزاجِ بلند پرواز کا پارہ نارمل سے بھی چند درجے نیچے گر گیا۔ پھر بھی مسٹر کیرار کا روشن پہلو اُن کے چہرے اور مُہرے سے عیاں رہا۔ وہ شکیل ہونے کے علاوہ خلیق، چرب زبان اور خندہ پیشانی بھی تھے۔ اُن کی چمک دار آنکھوں میں صنفِ نازک کو متوجہ اور متاثر کرنے کی خاص قوت تھی۔ اور یہ قوت 'وہائٹ ہارس' کے ایک پگ چڑھا لینے پر دوبالا ہو جاتی تھی۔

مِس پیاری جب اپنے رقصِ عشوہ آمیز سے ہزاروں فتنے ٹھکراتی، دوبارہ مسٹر کیرار کے سامنے سے گذری تو پھر نظریں دوچار ہو گئیں۔ فریقین کی نظروں میں بلا کی یکسانیت بھی تھی اور قیامت کا تفاوت بھی

ایک دردِ لذت آمیز میں جوڑ، تو دوسری لذتِ دردانگیز سے معمور۔ نظریں ملی ہی نہیں، باہم دِگر وصل ہوگئیں۔ مسٹر کیرار کی سفید براق قمیص، لمبے سانس کے ساتھ، سینے پر اُبھری؛ اور مِس پیاری کی ساڑھی کا آنچل، ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ، چھنگلی سے چھوٹ گیا۔

(۲)

مسٹر کیرار سنگھار میز کے سامنے خود آرائی و خود بینی میں مصروف تھے۔ خود آرائی کے تحت میں سیفٹی ریزر سے چہرے کی جاروب کشی سب سے نمایاں کام تھا۔ وہ اپنے خوش نما چہرے کے کسی حصّہ کو محکمہ جنگلات کا نمونہ بنانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے؛ اس لئے خود رَو سبزۂ خط سے فارغ البال ہوجانا ان کے روزانہ حوائجِ ضروری کا اہم جزو تھا۔ سُوئر کے بالوں والے قیمتی بُرش سے، حجامت کا صابن ڈاڑھی اور مونچھوں کے حدودِ وبال پر ملتے جاتے تھے، اور آئینے میں اس دست درازی کا نتیجہ دیکھتے جاتے تھے۔

یہ خود آرائی کا شعار، پیش خیمہ تھا خود بینی کا۔ روزانہ صبح کو، آئینے میں، اپنے سے دوچار ہو جانا ایک شکیل نوجوان کے دل و دماغ پر وہی عمل کرتا ہے جو کشش سمندر پر یا موسلا دھار بارش دریا پر۔ مسٹر کیرار کا داہنا ہاتھ صابن کو جھاگ بنانے میں مصروف ہو، مگر ان کی آنکھیں اپنی چمک دمک دیکھنے میں لطف اٹھا رہی تھیں۔ بشاش چہرہ صحتُ شباب ہی نہیں بلکہ مسرت و کامیابی نمایاں کر رہا تھا۔

خود آرائی و خود بینی کا لطف، حصولِ مقصد کے ساتھ، اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کامیاب ہستی کے تمام حرکات و سکنات سے، ابلنے والے چشمے کی طرح، پھوٹ پڑتا ہے۔ مسٹر کیرار کے چشم و ابرو سے یہی کیفیت ٹپکی پڑتی تھی اور بجا تھی بس پیاری پر کامیابی - اور مستقل کامیابی - کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کوئی تعجب نہ تھا کہ اُس نے اپنی بے نظیر کامیابی کو محض اپنی شکل و صورت، اپنے اعضا، اور اپنے شباب کا کرشمہ سمجھا۔ ممکن ہے کہ وہ اسی پندار میں غرق، اپنے چہرے کی جزئیات پر آئینے میں نظر ثانی کر رہا ہو؛ اور کامیابی کی داستان، الف سے ی تک، اس کے حافظے میں چکّر لگا رہی ہو۔

مِس پیاری کو اپنی آغوش کے لئے مخصوص کر لینے میں کیرار کو موجودہ معاشرت کی متعدد دیواریں پھلانگنا پڑیں۔ اپنی خاندانی منگیتر سے انکار، ذات پات سے چشم پوشی، اور حسب و نسب سے روگردانی؛ غرض

مسٹر کیرار کو بڑا اجہاد کرنا پڑا۔ مسٹر کیرار کی بلند نظر میں نسل کا اثر کتے، گھوڑے، بیل اور اسی قسم کے جانوروں تک محدود تھا؛ اولادِ آدم میں اس لحاظ سے تفریق کرنا اس کی رائے میں حیوانی خصلت تھی حسب و نسب کے لحاظ سے اُس کو معلوم ہو گیا تھا کہ مس پیاری کی ماں دُلاری جان - لاڈلی کی چھوٹی بہن تھیں؛ اور باپ؟ اس کے متعلق البتہ سو مُنہ اور ہزار زبانیں تھیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مس پیاری اُس زمانے میں وجود میں آئی تھی جب دُلاری جان سری رام سنگھ جی - تعلقہ دار ملانواں - کے ۲۷ سالہ جسم کے لئے چھوٹی رانی کی صورت میں محفوظ کردی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ، باپ کا پردہ راز میں رہنا قانونِ فطرت کے لحاظ سے کوئی عیب نہ تھا۔ اور قانونِ معاشرت کے لحاظ سے؟ بہ ظاہر اس لحاظ سے بھی کوئی عیب نہ ہونا چاہئے۔ کیا تمام عیسوی دنیا یسوع ناصری کو بشر سے بالاتر محض اس وجہ سے نہیں سمجھتی کہ اُن کے باپ پردہ راز میں ہیں؟ مسٹر کیرار عیسوی گز سے مس پیاری کو ناپتے تھے اور اس بنا پر مس پیاری ان کو باپ رکھنے والی لڑکیوں سے بہت اونچی، انوکھی اور انسان نہیں۔ پری نظر آتی تھی۔

اپنے کارناموں کے ساتھ ہی ساتھ مسٹر کیرار کو مس پیاری کی دقتوں کا بھی پورا احساس تھا! اوّل تو لاڈلی ایسی سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے دینا کہاں گوارا کر سکتی تھی؛ دوسرے دُلاری جان بھی اس رشتہ مستقل کی سخت مخالف تھیں۔ مگر پیاری نے لاڈلی کو دم دلاسے سے شیشے میں اُتارا، اور دُلاری جان کا فرمان جوتی کی نوک پہ مارا۔

اس اجمال کی تفصیل سے پیشتر، مجھے اقبال ہے کہ میں نے لاڈلی اور پیاری کے ناموں سے "جان" کا موروثی لقب قلم انداز کردیا۔ مجھے علم ہے کہ "جان" کا لقب اس طبقۂ جاں نواز کو اسی قدر عزیز ہوتا ہے جس قدر خطاب کا طرّۂ امتیاز خطاب زدہ افراد کو۔ یہ دُم چھلے اگر مذکورہ طبقوں کے ناموں سے بھول کر بھی حذف ہو جائیں تو اُن کی ذہنیت کو ایسا کرارا دھکا لگتا ہے جیسا بہار یا کوئٹہ کو زلزلے سے۔ مگر میں نے "جان" کا لفظ جان بوجھ کر ترک کیا ہے اور وجوہات کی بنا پر کیا ہے۔ لاڈلی نے اپنی ذات کو مدّت العمر میں کسی کے لئے راحتِ جان تو درکنار آفتِ جان بھی ثابت نہیں کیا؛ پھر جان کا لفظ اس کے نام کے ساتھ کیوں نتھی کیا جائے؟ رہی پیاری - اس نے مِس کے وضع و جدید لقب کو "جان" کے سال خوردہ شاخسانے پہ ہمیشہ ترجیح دی۔

البتہ دلاری جان کے ساتھ 'جان' کا لفظ ایسا ہی پیوست ہے جیسے سوراج کے خیال کے ساتھ گاندھی جی' یا بروٹس اِمپائر کے خواب کے ساتھ مسولینی۔ دلاری جان کی تمام عمر جاں نوازی ہی میں گذری۔ نازک اندام ہونے پر بھی' دلاری جان سولہ برس کے سن ہی میں بڑی قادر انداز تھیں۔ ضرب شدید پہنچنے والوں کی فہرست میں سری رام سنگھ جی تعلقہ دار ملانواں کا نام چوٹی پر تھا۔ مہاراج 'ساٹھا سو پاٹھا' کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ جب انھوں نے بستر مرگ کی اِستھا میں حرکت قلب بند ہو جانے پر کسی دوسرے جنم میں چولا بدلا تو جہاں محکمہ باربرداری میں دو درجن بیل' ڈیڑھ درجن گھوڑے' ایک درجن ہاتھی اور آدھی درجن موٹریں چھوڑیں' وہاں محل کے اندر پانچ رانیاں بھی چھوڑیں اور ان سے بحث نہیں' دلاری جان مہاراج کی آنکھیں بند ہوتے ہی' زر و جواہر کا پشتارہ باندھے' لاڈلی کے پاس واپس آگئیں؛ تھوڑے عرصہ تک بڑے کر و فر کے ساتھ رہیں؛ اور آخر کار تین برس کی جان پیاری کو لاڈلی کے پاس چھوڑ کر ایسی گئیں کہ واپسی کا نام نہ لیا۔ پیاری پلی' بڑھی اور پروان چڑھی؛ مگر دلاری جان نے ادھر کا رُخ تک نہ کیا۔ اب پیاری کے مس پیاری بن جانے اور مشہورِ خلائق ہو جانے پر دلاری جان نے خط و کتابت شروع کی بھی تو اس کی وقعت کیا؟ ایسی صورت میں اگر دلاری جان کے فرمان مس پیاری کو مسٹر کیرار کی آغوش سے باز رکھنے کے لئے آئے اور مس پیاری نے ان کو ٹھکرا دیا تو کیا گناہ کیا؟

مسٹر کیرار کو پیاری کی دقتوں کا علم تھا اور اس کی محبت کا یقین تھا۔ اس یقین کے بعد اُن کا جنون اُس وقت تک کم نہیں ہوا جب تک کہ پیاری اپنے تمام تعلقات توڑ کر صرف ان سے ہی نہ جڑ گئی۔ پیاری سرگزشت مسٹر کیرار کے سامنے سے' یادِ ماضی کی صورت میں گزر رہی تھی اور وہ سیفٹی ریزر کی جاروب کشی ختم کر چکنے پر' ڈاڑھی کی رہ جانے والی کھونٹیاں' جبڑے اور ٹھوڑی پر انگلیاں دوڑا کر' معلوم کر رہے تھے۔ گویا تصویر حجامت کے آخری نقش مکمل کرنا چاہتے تھے۔ کہ۔ دفعتاً ان کی دونوں آنکھیں پُشت کی طرف سے ہاتھ بڑھا کر کسی نے بند کر لیں۔ کیرار کے دل و دماغ نے ان نازک انگلیوں کو فوراً پہچان لیا مگر لطفِ شرارت دوبالا کرنے کی وجہ سے اُس نے تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ کہا:۔

"کون"

کوئی جواب نہیں ملا۔ بلکہ آنکھیں ڈھکنے والی انگلیاں اور زیادہ پیوست ہوگئیں۔

"میں نے پہچان لیا - مجید ہیں" کیدار نے انتہائی تجاہل کے رنگ میں کہا۔

اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔

"اچھا - بشیر ہیں - بشیر؟" کیدار نے ہنستے ہوئے پھر کہا۔

"شریر - بشیتی شریر!" کہتے ہوئے پیاری نے آنکھیں کھول دیں۔

"اہا! میری جان! تم ہو" کیدار نے پیاری کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں کہاں ہوں؟ مجید ہیں - بشیر ہیں" پیاری نے عجیب ادائے دل رُبا کے ساتھ کہا "ابھی اور انجان بنیئے۔"

"انجان کیسا؟ میں تو نیم جان ہوں - بے جان ہوں"

"پھر یہ مردہ قالب باتیں کس طرح بنا رہا ہے؟"

"اس طرح کہ اپنی جان کو پا کر اس میں جان آگئی"

"بس باتیں بنا چکے" پیاری نے سنگھار میز کے آئینے میں اپنا قدِ رعنا دیکھتے ہوئے پوچھا "ابھی تک سنگھار سے فرصت نہیں ہوئی؟"

"میں اور سنگھار؟" کیدار نے حیرت کے ساتھ جواب دیا۔

"پھر کیا کر رہے تھے؟" پیاری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پوجا کی تیاری کر رہا تھا" کیدار نے بیساختہ جواب دیا "حسن کی دیوی کی پوجا بغیر صفائی اور اشنان کے نہیں ہو سکتی"

"وہ حسن کی دیوی کون بلا ہے؟" صبر سوز ادا کے ساتھ پیاری نے پوچھا۔

"وہ بلائے بے درماں یہ ہے" کہتے ہوئے کیدار نے پیاری کو آغوش میں لے لیا اور اس کے گھونگر والے بالوں کو چومنا شروع کر دیا۔

"میرا سر نہ ہوا حجرِ اسود ہو گیا" پیاری نے نہایت شوخی کے ساتھ کہا۔

کیدار نے جواب دینے کے بدلے، کرسی پر بیٹھتے ہوئے، پیاری کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور پیاری نے

کیرار کی گردن میں ایک ہاتھ حمائل کرتے ہوئے اُس کے بائیں کان کی لَو میں ایک ہمین چٹکی لے لی۔ کیرار کی گرفت تنگ ہوئی۔ مُنہ آگے جھکا؛ اور اُس کے ہونٹوں نے ایک گرم مُہر پیاری کے نازک دہانے پر لگا دی۔

"کیا اسی کا نام پوجا ہے؟" پیاری نے کیرار کو گدگداتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اسی کا نام پوجا ہے۔ اس کو پدما آسن کہتے ہیں۔"

سچ یہ ہے کہ ایک نوجوان کسی پری وش پر بد قسمتی سے مرنے لگے، تو بھی اس کے جینے کی تھوڑی بہت آس رہتی ہے؛ لیکن خدانخواستہ اگر اس کے دماغ میں سمائی کہ ایک پری وش اُس پر مرتی ہے تو پھر اس کا علاج ملک الموت کے سوائے کسی کے بس کا نہیں۔

(۳)

برسات کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں، آدھی رات کے قریب، مدھم آوازمیں، کوئی چھت پر گا رہا تھا؛ اور دلاری جان۔ جن کی آنکھ ابھی کھلی تھی۔ مسہری پر دراز، مچھر دانی کے اندر، اس آواز پر کان لگا رہی تھیں۔ انھوں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو پروفیسر ال نجے۔ ڈین کو برابر والی مسہری پر خرّاٹوں کی نفیری بجاتے پایا۔ البتہ پیاری والا پلنگ خالی تھا اور شکن آلودہ بستر کسی کے اٹھ جانے کا پتہ دے رہا تھا۔ کچھ عرصے تک کان لگائے رہنے کے بعد دلاری جان اُٹھیں، دبے پاؤں زینے تک پہنچیں اور چپکے چپکے سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں۔ سب سے اوپر والی سیڑھی کے قریب پہنچ کر، وہ ٹھٹک گئیں اور چپ چاپ سننے لگیں۔ نہایت درد بھری اور دھیمی آواز میں کوئی گا رہا تھا:۔ سه

"فردا و دی کا تفرقہ اک بار مِٹ گیا؛ تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی"

وہ زیادہ تاب نہ لا سکیں اور دفعتاً زینے کے دروازے سے گذر کر چھت پر پہنچ گئیں۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں، جو سائبان کے اندر روشن تھی، دلاری جان نے دیکھا کہ پیاری، کھری چارپائی پر اپنی دو سالہ بچی کو سینے سے لگائے داہنے بازو سے منہ چھپائے بائیں کروٹ پر پڑی تھی اور درد بھری آواز میں گا رہی تھی۔

"بیٹی! بیٹی!" دلاری نے پکارا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

"بیٹی! پیاری!" دلاری نے پھر پکارا۔ مگر اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔

پیاری کا چہرہ داہنے بازو سے چھپا تھا، مگر اس کے جسم کی غیر معمولی حرکت ہچکیاں لینے کا پتہ دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ درد بھری آوازیں گانے کے ساتھ، رہ رہ کر روتی بھی جاتی تھی۔ دلاری کے بار بار پکارنے سے درد بھرا دل قابو سے نکل گیا، گھٹا ہوا غم طوفان بن گیا، اور وہ جواب دینے کے بجائے بے اختیار ہچکیاں لینے لگی۔

پیاری پر فلکِ ناہنجار نے جو قیامت ڈھائی تھی اس کو چھ مہینے ہو گئے ہوں، مگر یہ زخم ایسا نہ تھا کہ آسانی سے بھر جاتا۔ مسٹر کیرار کا تین سال کے اندر، صرف ایک ڈیڑھ برس کی جان اپنی یادگار چھوڑ کر دنیا سے گزر جانا ایک قیامت تھی جو پیاری جیسے نوشگفتہ غنچے پر ٹوٹ پڑی۔ دلاری جان، عدت کا زمانہ گزر جانے پر پیاری کو پنجاب اپنے نئے گھر میں کھینچ لائی ہوں۔ اور پیاری بھی غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑنے سے چلی آئی ہو۔ مگر اس تبدیلِ مقام سے کیرار کی یاد بالکل مفقود نہیں ہو سکتی تھی۔ برسات کی اندھیری راتیں، مدھری ہوا کی سرسراہٹ سے اگر یادِ صحبت کے ابخرات سینے میں امنڈ آئے اور آنکھوں کے راستہ سے برس پڑے تو تعجب کیا؟

دلاری جان ابھی پلنگ کے قریب کھڑے کھڑے پیاری کو مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ پروفیسر صاحب بھی۔ غالباً آنکھ کھل جانے اور آواز سن لینے پر۔ آموجود ہوئے۔ آتے ہی نہیں بلکہ چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر اس کو تسلی تشفی دینے میں مصروف ہو گئے۔

(۴)

پروفیسر ایل جے۔ ڈین کی ذات پیاری کے لئے وہی مرتبہ رکھتی تھی جو یوسف نجار کی یسوع ناصری کے لئے۔ دلاری جان کی نظر نے جب ان کا انتخاب کیا تو وہ ولایت سے واپس آکر پنجاب یونیورسٹی میں تلاشِ معاش کے لئے سرگرداں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے جمال دین سے ایل، جے، ڈین بننے میں ارتقا کی متعدد کچلیاں بدلیں تھیں۔ مدرسہ کے زمانے میں وہ سیدھے سادھے جمال دین پنجابی تھے؛ کالج کے دوران ایف اے تک جمال دین لودھی رہے؛ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے تک جے، ڈی لودھی ہو گئے۔ اور ولایت پہنچ کر ان کے نامِ نامی نے ایسی قلابازی کھائی کہ مور چال چلنے لگا۔ یعنی۔ لودھی کا دُم چھلا بجائے دُم کے زیبِ سر ہو گیا اور یہ چھل چھلا کر ایل، جے، ڈین بن گئے۔

پروفیسر ڈین کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ جب ۴۵ سالہ دلاری جان کے مُنہ میں ان کو دیکھ کر پانی بھر آیا
جوان پروفیسر سر سے پیر تک فیشن کے روغن سے چکنے چپڑے ہوں مگر اونچی آواز والے ڈھول کی طرح پیٹ میں
خالی تھے۔ جس کششِ زر نے نوشگفتہ دلاری جان کو ایک بڈھے پھوس کی ارتھی پر چڑھایا تھا، اسی نے جوان
پروفیسر کو سال خوردہ عورت کے بھینٹ چڑھا دیا۔ دلاری جان نے اپنی اٹھتی جوانی زر و جواہر پر قربان کردی تھی،
کوئی وجہ نہ تھی کہ اسی زر و جواہر کے بدولت وہ پروفیسر ایل جے ڈین کی جوانی مول نہ لے لیتیں۔ یہ صحیح ہے کہ دلاری
جان کاروانِ عمر رفتہ کے نشان، اپنے چہرے اور جسم سے حتی المقدور نئے نئے پوڈر اور کریم سے چھپائے رکھتی
تھیں، پھر بھی یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا کہ پروفیسر صاحب دلاری جان کے کھُل ہو جانے والے آلاتِ حسن کا شکار ہوئے تھے۔
دلاری جان نے عرصۂ دراز تک لاپتہ رہنے کے بعد، جب مسٹر ڈین کی صورت میں لاڈلی سے خط و کتابت
شروع کی تو پیاری کو مسٹر کیرار کی آغوش سے باز رکھنے کے لئے۔ وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوئی ہوں، مگر
کیرار کی آنکھیں بند ہو جانے اور عدت کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد پیاری کو اپنے پاس لے آنے میں ضرور کامیاب
ہوگئیں۔ پیاری جب اُن کے ساتھ آئی تو سوگوار، دل شکستہ اور زندہ درگور تھی؛ مگر تبدیلِ مقام نے رفتہ رفتہ
اپنا اثر کیا اور ضرور کیا۔ قوتِ حافظہ کے ساتھ اگر قوتِ نسیاں نہ ہوتی تو انسان کی زندگی اکثر اجیرن ہو جاتی۔
بیماری کی تکالیف، ناکامیوں کی خجالت، اور صدمات کی صعوبت اگر ہمیشہ یکساں حالت میں یاد رہتی تو انسان
کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ یاد رکھنا جس قدر کارآمد خوبی ہے، بھول جانا بھی اُسی قدر ضروری لطفِ حیات ہے۔
زمین چکر کھائے جاتی ہے، راتیں دن بنتی ہیں، ہوائیں بدلا کرتی ہیں، موسم تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اور ان
انقلابات کے زیرِ اثر انسان کے دل و دماغ کی کیفیات محسوس نہ ہونے والی رفتار کے ساتھ پیدا اور زائل
ہوتی رہتی ہیں۔

غم زدہ پیاری بھی امتدادِ زمانہ کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اس کا زخم کاری ہو، مگر
زمانہ و مدت کے مرہم سے آخر کار بھرتے بھرتے مندمل ہو گیا۔ کیرار کی یاد کم ہوتی گئی اور اپنی عمر و حسن کا احساس
دوبارہ زندہ ہوتا گیا۔ بیرونی تعلقات سے پیدا ہونے والا نقش مٹتا گیا اور اندرونی جذبات سے اُبھرنے والا
مادر زاد میلانِ طبع پیدا ہوتا گیا۔ آنسو تھمے، آہیں رکیں، اور اضطراب زائل ہونے لگا؛ سکوت دور ہوا، خوش گفتارِ

محسوس ہوئی، اور گاہے گاہے چشم وابرو سے تبسم نمایاں ہو چلا۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی ساتھ پروفیسر صاحب کی موجودگی۔ موجودگی ہی نہیں توجہ۔ سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔

جوان مرگ کیرار اور جوان عمر پروفیسر ڈین میں۔ صورت و شکل کے اعتبار سے بھی، اور عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی۔ زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مرنے والے کا جسم چھریرا، قد درمیانہ اور نقشہ سبک تھا۔ ایسا سبک کہ مردانہ آنکھ ناک اور زنانہ چشم و ابرو کی درمیانی کڑی سمجھا جا سکتا تھا؛ مگر جیتے جاگتے پروفیسر کا جسم دوہرا، گردن کوتاہ اور قد پستہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صناعِ حقیقی نے دراصل ایک خوبصورت چُنیا بطخ بنانا شروع کی تھی مگر آگے چل کر ارادہ بدل دیا اور اُس نامکمل بطخ کو آخرکار انسان میں گڑھ دیا۔ عادات کے لحاظ سے، مسٹر کیرار اگر حریفِ نازک کا دل موہنا چاہتے تھے، تو مسٹر ڈین مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ گویا۔ مسٹر کیرار کبوتر صفات تھے اور مسٹر ڈین مُرغ عادات۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے کارناموں میں تسخیر و فتح کا فرق تھا۔

پیاری کا سکوت دور ہوتا تھا کہ پروفیسر ڈین نے پینگ بڑھانے شروع کر دئے۔ دلاری جان کے باضابطہ شوہر ہونے سے، دو جوان طبیعتوں کی بے ضابطہ کشش کہاں دور ہو سکتی تھی؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دُلاری کے شوہر ہونے سے، پروفیسر ڈین ہر قسم کے شبہ و شک سے محفوظ تھے۔ وہ پیاری کے لئے اکثر بازار سے میوہ لاتے، پھولوں کے گجرے لاتے، عمدہ سے عمدہ عطر لاتے اور دُلاری اُس سے مطلق مشکوک نہ ہوتی۔ مشکوک ہوتی کیا خوش ہوتی کہ پروفیسر صاحب دُلاری کی محبت میں چُور ہونے کی وجہ سے اس کی لڑکی کا غم غلط کرنا چاہتے تھے۔ پھر کیا تھا؟ — پروفیسر صاحب اثنائے گفتگو میں، اگر مہر اور پیٹھ کے بجائے پیاری کے شانے یا ران پر ہاتھ رکھ دیتے تو قباحت کیا تھی؟ پیاری ایسی خلافِ امید بے تکلفی سے چونکتی ہو مگر یہ پیش دستی رفتہ رفتہ اپنا اثر کرتی جاتی تھی۔ اور کچھ نہیں تو آگ اور پھونس ایک دوسرے سے متصل ہوتے جاتے تھے۔

دو چار مہینے اس یک طرفہ چھیڑ چھاڑ میں گزرے ہوں گے کہ ایک دن تنہائی کو غنیمت سمجھ کر پروفیسر صاحب اپنے جذبات کا امتحان کرنے میں معمولی حدود سے تجاوز کرنے لگے۔ پیاری نے حیرت کا اظہار کیا، گریز کرنا چاہی؛ اُن کے رشتہ کی بنا پر شرم دلائی، مگر پروفیسر صاحب کا جن کہاں اُتر سکتا تھا۔ جہاں تک خیالات کا تعلق تھا، اُنھوں نے ترکی کا جواب ترکی میں دیا؛ اور جہاں تک حرکات کا تعلق تھا، وہ مرغ صفات تھے ہی۔

پڑھے ہوئے جن کا اُتارنا، چڑھے ہوئے نشے کے اُتارنے سے زیادہ مشکل ہے۔ پروفیسر ڈین نے پیاری کو لاجواب کر دیا۔ قائل کر دیا، خاموش کر دیا۔ اس نے بہت کچھ گریز کی ہو، بدن چرایا ہو، ہاتھ پاؤں کھینچے ہوں۔ مگر آگ اور پھونس کے اتصال سے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہوئے بغیر نہ رہا۔ پیاری آخر کار مغلوب ہو گئی، لمبے لمبے سانس لینے لگی اور پروفیسر ڈین کی گرفت میں ڈھیلی پڑ گئی۔

(۵)

"کیا سو گئے؟" دلاری جان نے اپنی مسہری پر، پروفیسر صاحب کے پلنگ کی طرف کروٹ لیتے ہوئے پوچھا — کوئی جواب نہیں ملا — دلاری جان نے سمجھ لیا کہ وہ سو گئے۔

مگر فی الحقیقت پروفیسر ڈین سوتے نہیں تھے۔ اپنے دل یا ضمیر سے دست و گریباں تھے۔۔

"جب خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے تو ہر اچھی بات گھر ہی سے کیوں نہ شروع ہو؟" پروفیسر اپنے دل ہی دل میں باتیں کر رہے تھے۔ "خیرات، امداد اور عنایت کے لئے، اوّل خویش اور پیچھے درویش، پھر محبت کے لئے بھی اوّل خویش کیوں نہ ہو؟ محبت کا دروازہ خویش کے لئے بند کر دینا ظلم ہے اور بعض افراد کو اچھوت بنا دینا جہالت ہے۔ آخر خویش کے ممنوعہ افراد نے کیا قصور کیا ہے کہ محبت جیسے بہترین جذبے سے محروم کر دئے جائیں — آدم و حوا کا رشتہ پیدائش کے اعتبار سے، کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ حوا اگر آدم کے جسم سے برآمد ہوئیں تو اُن کی زائیدہ ہوئیں — پھر ان دونوں کے درمیان محبت کا تعلق ہوا یا نہیں؟"

لودھی جمال دین، جاڑوں کی رات میں اپنے بستر میں دراز، دلاری کی مسہری کی طرف پیٹھ کئے، اپنے دل ہی سے مخاطب تھے اور وہ کر غنودگی کے جھونکے بڑھتے جاتے تھے — "آخر میاں اور بیوی کے تعلق کو زنا کیوں نہیں کہتے۔ ایک ہی فعل کو خاص صورت میں اچھا اور خاص میں بُرا سمجھنا بالکل ایسا ہی جیسے کتے کو محض پھانسی دینے کے لئے بُرے نام سے موسوم کر دیا جائے — (نیند کا ایک جھونکا آیا اور وہ چند لحظے کے لئے اونگ گئے) ہاں مجھ سے اور پیاری سے براہ راست رشتہ ہی کیا ہے؟ میرے جسم کو اس کے جسم سے، میرے خون کو اس کے خون سے کوئی پیدائشی واسطہ نہیں۔ سوتیلی بیٹی ایک نام نہاد رشتہ ہے، دقیانوسی جہالت ہے، بے بنیاد حماقت ہے — (پھر نیند کا غوطہ لگا اور وہ اونگ گئے) وہ دل کھینچنے والی آنکھیں، وہ نیت ڈھانے والے بال، وہ نازک سراپا، پیاری! پیاری! اگر واقعی خدا جیسی کوئی ہستی ہے تو سچ کہا ہے کہ،

"ہم کو خدا جو صبر دے، تم سا حسیں بنائے کیوں ؟" پروفیسر صاحب منطق میں غوطے کھاتے، نیند کے سمندر میں ڈوب گئے اور خراٹے لینے لگے۔ دلاری جان اپنی مسہری پر، ان سے پیشتر، محوِ خواب ہو چکی تھیں۔ کمرے کے باہر والے دروازے بند تھے اور سکوت چھایا ہوا تھا؛ البتہ برابر والے کمرہ کا دروازہ کسی قدر کھلا ہوا تھا اور لالٹین کی روشنی اس کمرے سے اس کمرے میں کواڑوں کی جھری میں سے آرہی تھی۔ مگر خاموشی اس کمرے پر بھی طاری تھی، کیونکہ وہاں بھی پیاری نیند میں بے خبر تھی۔

رات کے دو بجے کے بعد، دلاری جان کی آنکھ کھل گئی اور نیند کچھ اُچاٹ سی ہو گئی۔ کمرے میں اندھیر اگھپ تھا اور پروفیسر صاحب کے خراٹوں کی نفیری بھی بند تھی۔ تنہائی سے گھبرا کر، یا کسی خواہش کے زیرِ اثر، دلاری جان نے اپنی مسہری سے اُٹھ کر پروفیسر صاحب کے پلنگ کا رُخ کیا۔ وہ دبے پاؤں پلنگ پر پہنچیں تو اس کو خالی پایا؛ پروفیسر صاحب ندارد تھے اور بستر بھی ٹھنڈا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سرہانے سے ٹارچ اٹھالی اور چاروں طرف روشنی ڈالی؛ کمرہ خالی تھا اور پروفیسر صاحب غائب تھے۔ کسی بدگمانی کے خیال سے نہیں، بلکہ یوں ہی، دلاری جان چپ چاپ اُٹھیں، پیاری کے کمرے کی طرف بڑھیں اور دروازے تک پہنچ کر دھڑ سے کواڑ کھول دیئے۔ ٹارچ کی روشنی میں اُنھوں نے جو کچھ دیکھا ناقابلِ بیان تھا۔ پیاری اور پروفیسر ڈین، دوئی کے دور کرنے اور وحدت الوجود کا مرتبہ حاصل کرنے میں ہمہ تن غرق تھے ـــ ایسے غرق تھے جیسے "گنگا میں جمنا لہر مارے"!

دُلاری جان کو فوراً سناٹا آگیا۔ دنیا اندھیر ہو گئی؛ پاؤں لڑکھڑائے اور اُنھوں نے اُلٹے قدم اپنے کمرے میں پلٹتے ہوئے دروازہ بند کر لیا ـــ پیاری اور پروفیسر پر کیا گذری ؟ ـــ وہی جو آدم و حوّا پر ثمرِ ممنوعہ کھالینے سے گزری ہو گی۔ کوئی نئی کیفیت نہیں تھی ـــ ازل سے یوں ہی مے یار ہوتی آئی ہے!

رات کا بقیہ حصّہ پیاری اور پروفیسر صاحب کی آنکھوں میں کٹ گیا۔ پروفیسر ندامت و ذلّت کے مارے جاڑوں کی رات میں پسینے پسینے ہو گئے اور پیاری کے بدن میں کاٹو تو خون نہ تھا؛ صبح ہونے تک ہوش و حواس کسی قدر بجا ہوئے تو پروفیسر صاحب نے دُلاری جان تک پہنچنے کی ہمّت کی۔ مگر اُس کمرے کے تمام دروازے بند تھے اور غالباً اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ پیاری تو اپنی جگہ سے ہلی نہیں؛ مُنہ لپیٹے بستر میں دفن رہی۔ البتہ پروفیسر صاحب نے کمرہ کا ہر دروازہ کھٹ کھٹایا، مگر کوئی جواب نہیں پایا۔ دن چڑھا، دوپہر ہوئی اور دن ڈھلنے پر آگیا، مگر دلاری

کا کمرہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ اب پیاری کو بھی وحشت ہونے لگی۔ اُس نے بھی "اماں جی" کو طرح طرح سے پکارا؛ مگر صدائے بر نہ خاست۔ تیسرے پہر کے قریب، پیاری کی انتہائی وحشت سے مجبور ہو کر، پروفیسر صاحب نے لاٹھیاں مار مار کر ایک کواڑ توڑ ڈالا۔ کمرے کے اندر گھستے ہی پروفیسر صاحب کو سکتہ ہو گیا اور پیاری نے بے ساختہ ایک چیخ ماری۔

دُلاری، مسہری پر نہیں، زمین پر مری پڑی تھی!

(۶)

ممکن ہے کہ پیاری پر وفیسر صاحب پر اپنی بھڑاس نکالتی، مگر [illegible] کو پھر نہ دیکھ رہنے کے بعد ایسے گئے کہ سیوم آیا، دسواں آیا اور بیسواں آیا، لیکن وہ نہ آنا تھا نہ آئے۔ البتہ بیسویں کے روز، ڈاک سے اُن کا خط ضرور آیا۔ لکھا تھا:-

"پیاری! غضب ہے کہ میں تم سے ملنے کی بجائے جدا ہونے پر مجبور ہوں۔ کاش میرے دماغ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوتی!

محبت کا صحیح احساس، عمر میں پہلی مرتبہ، دلاری کا مُردنی چھایا ہوا چہرہ دیکھ کر ہوا۔ واقعی اُس مرنے والی کو مجھ سے محبت تھی اور نہایت سچی تھی۔ اس کی صورت، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت میرے سامنے ہے اور اُس کے چشم و ابرو ہمیشہ مجھے ملامت کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے اندر کوئی چیز چبھتی ہے، کھٹکتی ہے، اور برابر کچوکے دئے جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے 'میں بے وفا ہوں' بدکار ہوں، قاتل ہوں'۔ میں نے اس چیز سے حجت کی، اس کو طرح طرح سے دفع کرنا چاہا مگر یہ ہر لمحہ میرے دل و دماغ پر غالب آتی گئی۔ کیا اسی کو ضمیر کہتے ہیں؟ جو کچھ بھی ہو، اس کو دور کرنے کے لئے میں نے تم سے کنارہ کیا، گھر سے کنارہ کیا، وطن سے کنارہ کیا، مگر اس ظالم نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں اس قلبی اذیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اس کی بدولت میری زندگی موت سے زیادہ بدتر ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل و دماغ کسی نظر نہ آنے والے چنگل میں ہے اور اس کی گرفت برابر سخت ہوتی جاتی ہے۔ مجھے سوائے موت کے اور کسی طرح چھٹکارا نہیں نظر آتا۔

غالباً مجھ سے تم کو بھی شکایت ہوگی اور اس تحریر کا مقصد صرف معافی مانگنا ہے۔ معافی دینا یا نہ دینا تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔ بہ ہر حال مجھے افعال کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ اس خط کے تمھارے پاس پہنچنے سے پیشتر میں وہاں پہنچ چکوں گا جہاں یہ ظالم احساس مجھے کھینچے لئے جاتا ہے۔ کیا موت کے بعد بھی مجھے اس زندگی کا بھگتوان کسی صورت میں بھگتنا ہوگا؟۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہوگا — بلکہ غالباً ہوگا۔ اچھا رخصت۔ ہمیشہ کے لئے رخصت!"

"جمال دین"

پیاری کو جمال دین کے لاپتہ ہو جانے سے حیرت و تشویش ہوئی تھی، مگر صدمہ نہیں ہوا تھا۔ اور ہوتا بھی کیوں؟ اس کو عمر بھر میں اگر محبت ہوئی تھی تو جواں مرگ کیرار سے؟ پروفیسر صاحب سے مغلوب ہو جانا دو جوان طبیعتوں کی بے روک ٹوک صحبت کا نتیجہ تھا یا محض کرشمۂ شباب۔ ایسے حباب آئے دن جوانی کے سمندر میں پیدا ہوتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں، ان کا کوئی قائم رہنے والا نقش باقی نہیں رہتا۔

البتہ پروفیسر ڈین کے خط نے اس واقعہ کی یاد پھر تازہ کر دی جو دلاری کی اچانک موت کا باعث ہوا تھا، اور اس یاد کے ساتھ ہی اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا۔ یہ الزام پروفیسر ڈین پر زیادہ ہو، مگر پیاری بھی اس میں شریک تھی۔ صرف ایک ہاتھ سے تالی بجنا ناممکن تھی۔ پروفیسر ڈین تو مرنے پر آمادہ ہو گئے یا مر چکے۔ مگر پیاری کیا کرے؟ اس کو بھی ماں کی ہلاکت کا باعث ہونے میں مر جانا چاہیے۔ وہ ان خیالات میں ڈوبی بے چینی میں مبتلا اور ندامت میں غرق تھی کہ اس کی تین سالہ لڑکی ایک تصویر لئے ہوئے آئی اور پیاری سے لپٹ گئی۔

اَمّی دَان (جان)!" اس معصوم بچی نے تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا "یہ توَن (کوَن) ہے؟"

پیاری نے اپنے خیالات سے چونکتے ہی پہلی نظر بچی پر ڈالی اور اس کے بعد تصویر پر۔ "ایک آدمی ہے" پیاری نے جواب دیا اور فوراً تصویر بچی کے ہاتھ سے لے لی۔ اس کو یاد آگیا کہ پروفیسر ڈین کا خط پڑھنے کی دھن میں اس نے لوہے کی الماری کھلی چھوڑ دی۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ اندر والے کمرہ میں گئی اور دیوار میں نصب ہونے والی لوہے کی الماری کھلی پائی۔ دو ایک زیور تتر بتر پڑے تھے، چند خطوط بکھرے ہوئے تھے اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی بچی نے الماری کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا اور تصویر نکال لی تھی۔ پیاری نے بکھری ہوئی چیزوں

کو اُٹھایا، الٹ پلٹ کر دیکھا اور احتیاط کے ساتھ "ٹھیک جگہ پر" لگا دیا۔ الماری کے دُرست اور مقفل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ان اشیاء سے وابستہ ہونے والے واقعات کی یاد تازہ ہوگئی۔

دُلاری نے پیاری کے لئے مکان چھوڑا، سامان چھوڑا، اور سب سے زیادہ لوہے کی الماری چھوڑی۔ اس الماری نے روپیہ اُگلا، زیور اُگلے، جواہر اُگلے، اور زہر بھی اُگلا۔ زہر کا تعلق اس راز سے تھا جو متعدد عشقیہ خطوط اور اس تصویر نے فاش کر دیا۔ رازِ سربستہ اسی علم پر ختم نہیں ہوتا تھا کہ راقمِ خطوط اور صاحبِ تصویر ایک ہی ذات تھی جس کا نام بکرم سنگھ تھا، بلکہ مضمونِ خطوط یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ دُلاری جان — عین اس زمانہ میں جب کہ وہ سری رام سنگھ جی تعلقہ دار ملانواں کی باضابطہ رانی تھیں۔ دراصل اُن کے چھوٹے صاحبزادے کنور بکرم سنگھ سے بے ضابطہ طور پر بیاہتی تھیں — یہ ہی نہیں — خود پیاری بھی اس خفیہ تعلق کا ثمر تھی۔

اس حقیقت کے یاد آتے ہی، پیاری کی ندامت زائل ہونے لگی، صدمہ کافور ہو چلا اور پروفیسر ڈین کے خط سے پیدا ہونے والا اثر ہوا ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کی اچانک موت کی وجہ سمجھ گئی — بلکہ — خود اپنے فعل کی اصلیت جان گئی — یعنی؟ — وہی قانونِ فطرت اور مادر زاد طبیعت۔

———— • —• •:• —• ————

افریقی مجسمہ

"سرودِ زندگی"

از خلیل الرب صدیقی متعلم بی اے آنرز (اردو)
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اصغرؔ صاحب کے کلام کا دوسرا حصہ یعنی "سرودِ زندگی" ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ کتابت وطباعت اور جلد بندی میں جس تکلف اور نفاست سے کام لیا گیا ہے وہ قطعاً مستحسن ہے اور یقیناً قابلِ ستائش مجموعۂ زیر نظر اس کا مستحق بھی تھا اور اس سے مستغنی بھی!

*رسکن کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی حیات میں اپنی کسی تصنیف کا سستا اور کم زر ایڈیشن نہیں نکلنے دیا صرف اس خیال سے کہ کہیں اس کی کتاب بے وقعتی کا شکار نہ ہو جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ستھرے مذاق اور پاکیزہ ادب کے نشو و نما اور اشاعت میں تصانیف کے خارجی آب و رنگ کو بہت بڑا دخل ہے۔ کتابوں کی ظاہری ہیئت ملک کے مذاق کا آئینہ ہوتی ہے۔ یورپ نے کتابت وطباعت کو مستقل فن کی حیثیت دے رکھی ہے! اور ان کا ادبی مذاق اور علمی معیار جتنا پاکیزہ اور بلند ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ "سرود زندگی" اس نقطہ نظر سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اور خوش آئند اضافہ ہے۔

سرسبزو کا بلند اور پاکیزہ ذوقِ شعر و ادب محتاج تعارف نہیں ہے۔ شعر و ادب نے سرسبزو کے انتخاب کرنے میں یا سرسبزو نے شعر و ادب کے انتخاب کرنے میں غلطی نہیں کی ہے! اور میں اسے دونوں کی خوش قسمتی تصور کرتا ہوں! ورنہ فطرت یا سوسائٹی اکثر ایسے مواقع پر انصاف کو نہیں بلکہ ستم ظریفی کو زیادہ دخل دیتی ہے۔

ہم شاعر کا کلام اکثر اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ شاعر ہمارا دوست ہے یا دشمن۔ اور شعر و شاعری کا حسن و قبح انھیں تعلقات جائز یا ناجائز سے پرکھتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یا تو قصیدہ خوانی شروع کر دیتے ہیں یا سب و شتم پر اتر آتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذاتی رنجشیں اکثر بہترین دل و دماغ کو بد ترین مشاغل کی دلدل میں پھنسا دیتی ہیں اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس صورت حال نے ہمارے شعر و ادب ہی کو نہیں بلکہ ہمارے تمدن اور اجتماعی زندگی کو بھی کس درجہ خستہ اور خوار بنا دیا ہے۔

---

* علامہ شبلی کو بھی اس کا بڑا لحاظ رہا۔

شعر و شاعری ہی نہیں دنیا کے ہر وجود یا واقعہ کو ہر شخص مختلف نیت یا نظریہ سے دیکھتا پرکھتا ہے۔ ایک نقاد بھی یہی کرتا ہے۔ کبھی تو وہ وہی کہتا ہے اور سب کچھ کہہ ڈالتا ہے جو وہ خود محسوس کرتا ہے۔ کبھی وہ اس امر کو بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ وہ کن لوگوں کو مخاطب کر رہا ہے۔ اور لوگ اس سے کس چیز کے متوقع ہیں اور کس حد تک اس کے ساتھ ساتھ چل سکیں گے۔ چنانچہ سر سپرو سے ہم نہ اس کی توقع کرتے تھے اور نہ خود وہ اسے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ کلام اصغر پر ایک کہنہ مشق ناقد کی حیثیت سے نظر ڈالتے۔ اور تنقید و تبصرہ کے فنی یا کتابی اصول و ضوابط کو بر سرِ کار لاتے۔ انہوں نے ماہر فن ہونے کا نہ تو دعویٰ کیا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ لیکن شعر و شاعری کو ایک عامی کی حیثیت سے پرکھنے کے وہ بہترین طور پر اہل ہیں۔ اور اس حیثیت سے ان کی تنقیدات اور ان کا فیصلہ نہایت درجہ گراں قدر ہیں۔ انہوں نے شعر سے زیادہ شاعر کو مدنظر رکھا ہے اور اصغر صاحب کے حق میں نہایت قیمتی اور حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جس پر اصغر صاحب کو جس قدر امتنان و مسرت ہو کم ہے۔ سر سپرو کا یہ خیال کہ

> ”مولوی اصغر صاحب کی شاعری اُن کی زندگی کا عکس ہے اور زردشتیوں کے قول کے مطابق ان کی ”رفتار گفتار اور کردار میں مطابقت“ پائی جاتی ہے۔ میں ان کی نسبت شاعرانہ مبالغہ سے کام لینا نہیں چاہتا۔ میں نے وقت کی عام عیب بینی و نکتہ چینی کے اندیشہ سے اپنی رائے کو معتدل رکھنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔“

ایک پیشہ ور شاعر کے لئے پیام مرگ اور شریف شاعر کے لئے بقائے حیات کا مژدہ ہے۔ آخری فقرہ میں وہ جو کچھ کہہ گزرے ہیں۔ اس سے ان کے خلوص اور جرأت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ شاعر بہر حال سوسائٹی کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور سوسائٹی کو ہمیشہ اس سے احتساب کا حق حاصل ہے۔ میں ایسے شعر یا شاعر کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں جو اپنے دواوین میں دفن ہو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندوں کی عناصر ترکیبی میں شامل ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں یہاں ایک ایسی بحث کو چھیڑ رہا ہوں جس کا فیصلہ کبھی نہیں ہوا۔ بالخصوص اس زمانہ میں جب کہ آرٹ اور اخلاق نہایت واضح طور پر علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھ دئے گئے ہوں یعنی شاعر کو شعر کا کہاں تک حامل یا پابند ہونا چاہیئے یا بالفاظ دیگر شاعر کی زندگی کو اپنے کلام و پیام کا آئینہ دار ہونا چاہیئے یا نہیں؟ فنی نقطۂ نظر سے ناقد اس چیز کو نہیں دیکھتا۔ وہ عموماً یہ دیکھتا ہے کہ کیا کہا گیا اور کیسا کہا گیا۔ نہ یہ کہ کس نے کہا۔ مجھے مسرت ہے کہ سر سپرو

نے خلوص وجرأت کے ساتھ اپنا محاذ قائم کیا۔ انہوں نے شعر کی ہجے نہیں کی شاعر کی تقطیع کی اور متوازن پایا!

سر سپرو کے تبصرہ کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریظ ہے۔ تقریظ قصیدہ خوانی ہوتی ہے تنقید نہیں۔ اس طور پر آزاد نے یا اصغر صاحب نے جہاں جا کر پناہ لی ہے وہ مقامِ دارالحرام ہے۔ جہاں اسلحات کا استعمال ہی گناہ نہیں بلکہ مسلح داخل ہونا بھی ممنوع ہے۔ مولانا آزاد کے لئے وہ رعایتیں ملحوظ نہیں رکھی جاسکتیں جو سر سپرو کے لئے مخصوص تھیں۔ یا پھر تنقید کی دنیا میں ان کو وہ پایہ دیا جائے جس سے متہم یا متصف ہونا شاید وہ خود گوارا نہ کریں یعنی الوہیت یا پیغمبری کا۔ آزاد نے صرف ایک طرح کی بشارت دی ہے۔ حالانکہ ضرورت ہدایت کی تھی، مثلاً

"میں نے یہ مجموعہ بے دلی کے ساتھ اٹھایا تھا لیکن جب رکھا تو اس اعتراف کے ساتھ رکھا کہ اردو میں اک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی سے میں اس وقت تک بے خبر تھا' میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا۔ اہل فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں بدگمانی کی شکایت ہے تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ جس شاعر کے کلام میں حسبِ ذیل اشعار موجود ہوں اس کی شاعری کی وقعت بحث واثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی"!

مانا یہ تنقید نہیں تقریظ ہے لیکن ہم یہ ماننے کے لئے مجبور نہیں کئے جا سکتے کہ انہیں تقریظ ہی پر اکتفا کرلینا چاہئے تھا۔ نقد ونظر کی دنیا میں صرف 'واہ واہ' سے کام نہیں چلتا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ 'واہ واہ' کرنے والا خود صاحبِ ذوق ونظر ہو۔ آزاد سے عقدہ کشائی اور رہبری کی توقع کی جاتی تھی نہ یہ کہ انہوں نے وجد وحال کی محفل قائم کردی، جہاں نذر دیجئے وجد کیجئے یا خاموش رہئے!

حاصل کلام یہ ہے کہ آزاد کو یا تو کچھ نہیں لکھنا چاہئے تھا یا تنقید کرنی چاہئے تھی۔ اصغر صاحب ممکن ہے مایوس رہے ہوں اب مسرور ہوں، ہم منتظر تھے اور مایوس ہوئے۔ اصغر صاحب سے نہیں آزاد سے۔

ایک مغربی انشاپرداز کا خیال ہے کہ نوجوانوں کو تنقید کا حق نہیں! اور یہ کسی حد تک درست بھی ہے۔ اس لئے کہ ان کی رائے میں سنجیدگی اور پختگی ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ جذبات کی شدت کے باعث ان کی تحریر میں جامعیت اور توازن کا پیدا ہونا ذرا دشوار ہے مجھے ذاتی طور پر اس سے کسی حد تک اتفاق ہے۔ مگر تنقید نہ سہی اپنے تاثرات کے ظاہر کردینے میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔

حسرت، جگر، فانی، اور اصغر اردو غزل گوئی کے عناصر اربعہ ہیں۔ انہیں کی شاعرانہ کاوشوں نے اُردو غزل گوئی میں کیف و رنگ بھرا ہے۔ حسرت کی سادگی و شگفتگی اور رنگینی، جگر کی سرشاری سرمستی واز خود رفتگی فانی کی حکیمانہ یاس انگیزی، اور اصغر کی رعنائی خیال اور لطافت بیان نے اُردو غزل گوئی میں خوش آہنگ توازن پیدا کر دیا ہے۔ اور ان غزلوں کو اس قابل بنا دیا کہ شائستہ جماعتیں بھی ان سے حظ اُٹھا سکیں۔ غزل گوئی کے موجودہ رنگ پیدا کرنے والوں میں اولیت کا سہرا حسرت کے سر ہے۔ اور غالباً اس وجہ سے کہ حسرت خود بھی اس نئی پود سے تعلق رکھتے ہیں جو غزلوں کی فرسودگی اور ابتذال سے تنگ آ چکا تھا۔ ان کی شاعرانہ طبیعت ان تحریکات سے بھی حد درجہ متاثر ہوئی جن نے اردو شاعری کو موجودہ قالب میں ڈھال دیا۔

مرحوم عظمت اللہ خاں جو اس نئی پود کے ایک زبردست شاعر اور مفسر تھے، اپنے شاعری[1] والے مضمون میں اردو غزل، سے انتہائی بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اردو شاعری اس وقت تک قالب بے روح رہے گی جب تک "قافیہ پیمائی" اور "پریشان گوئی" کا زہریلا مذاق اردو ادب کے جسم سے خارج نہ ہوگا۔ اور اس کے لئے بقول مرحوم یا تو "غزلوں کی گردن بے تکلف اور بے تکان ماردی جائے" یا "اردو شاعری سے اس کا منہ کالا کیا جائے"، لیکن آج اگر مرحوم زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ یہی غزلیں اردو شاعری کے لئے مایۂ ناز بن رہی ہیں اور انگریزی لیرک کے دوش بدوش نظر آ رہی ہیں۔ ان غزلوں کا ماخذ تو وہی "حسن و عشق" کی پرانی داستان ہے مگر اسی داستان کو فرسودگی اور بے مزگی سے بچا کر جس پُر کیف، لطیف اور نئے انداز میں دہرایا گیا ہے وہ ان شعراء کا لازوال ادبی کارنامہ ہے۔

ان عناصر اربعہ میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود اور رنگ رکھتا ہے۔ اور موجودہ طرز میں کہنے والے تمام بقیہ شعراء دانستہ یا نادانستہ طور پر انہیں کے رنگ کی تقلید کرتے ہیں۔ یوں تو ان میں سے ہر ایک اپنی روش خاص کا مالک ہے مگر تخلیقی عنصر اصغر کے یہاں نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں بے محل نہ ہوگا اگر تخلیق اور جدت آفرینی یعنی اریجنیلٹی کا صحیح خاکہ بھی ذہن نشین کر لیا جائے۔

ہر شاعر اپنے پیش رو شعراء کا ایک ابھرا ہوا نقش ثانی ہوتا ہے۔ اس طور پر کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ میرا اپنا

---

[1] اردو بابت ماہ جنوری۔ شاعری از عظمت اللہ خاں۔

خیال ہی حقیقتاً صحیح نہیں ہے۔ یہ البتہ ممکن ہے کہ اندازِ بیان اور زبان اپنی ہو۔ اور اگر شاعری جذبات اور فطرت کی مصوری ہے، بہترین الفاظ میں اور بہترین انداز میں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس خیال کی تردید کی جائے۔ فطرت کے اٹل اصول اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ قدرت کی رنگینیوں میں ذرا بھی کمی نہیں۔ پانی کی روانی اور ہوا کی اٹھکھیلیوں میں سرمو فرق نہیں پھولوں کی نزاہت و لطافت اور خوشبو اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کبھی تھی۔ نغموں میں روح کو بالیدہ کرنے کا عنصر اب بھی موجود ہے۔ حسن کی نازک خرامیوں کے آگے عشق اب بھی شکست آشنا ہے۔ طبیعت میں خوشی و رنج اور امید و بیم کے موقعوں سے متاثر ہونے کا احساس اب بھی باقی ہے۔ اور اگر یہی سب شاعری کا ماخذ ہیں تو پھر اریجنیلٹی یعنی نئے خیال کا دعویٰ کرنا ذرا آسان کام نہیں۔ جدت آفرینی کی سائنٹفک تعریف دنیائے شاعری کو بہت محدود کر دے گی ایک مغربی انشاپرداز کا خیال ہے کہ اگر دنیا کے سارے لٹریچر سے مشترک اجزاء اور خیالات نکال لئے جائیں تو جتنا مواد بچے گا وہ صرف دس یا بارہ جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ اب ذرا دنیا بھر کے مصنفین اور شعراء کی بہتات کا اندازہ لگائیے اور پھر خیال کیجئے کہ اریجنیلٹی کی کونسی مقدار ہر ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کسی خیال میں کوئی ندرت پیدا کرنا یا اس کو اچھوتے اور دلکش اسلوب میں ادا کرنا اریجنیلٹی یا اپج ہے۔

اصغرؔ کے یہاں یہی جدّت آفرینی ہے۔ جگرؔ و فانیؔ کے یہاں بھی یہ عنصر موجود ہے مگر اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ اصغرؔ کے یہاں ہے۔ میں اصغرؔ کی حقایق نگاری کا زیادہ معترف نہیں۔ میرے خیال میں "حقایق و معارف" کا بیان نہ تو کمال شاعری ہے۔ اور نہ شعر میں اس کی کوئی خاص ضرورت۔ اصغرؔ کے یہاں کیا کسی شاعر کے کلام کو لے لیجئے۔ تھوڑی بہت تلاش کے بعد چند شعر حکیمانہ اور چند شعر اعلیٰ اخلاق کے نظر پڑ ہی جائیں گے "بلند ہمتی" "شریفانہ سوز و گداز" اور "جذبات محبت" سے بھرے ہوئے اشعار بھی کافی مل جائیں گے۔ "درسِ بصیرت" دینے والے شعر بھی بہت سے نکل آئیں گے۔ مجھے اصغرؔ کے کلام میں حسن تخیل سے زیادہ حسنِ بیان کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی رقصاں ترکیبیں، شستہ و رُفتہ اندازِ بیان اور نکھرے ہوئے الفاظ سادہ اور معمولی مضامین میں بھی کیف و رنگ بھر دیتے ہیں۔ اور فرانس کے مشہور ادیب وکٹر ہیوگو کے خیال کے مطابق پیش پا افتادہ مضامین میں جان ڈال دینا ہی شاعر کا کمال ہے۔ اور یہی

ؔ روح تنقید صفحہ ۱۱۴

اصغر کا طرۂ امتیاز ہے، نموناً چند اشعار درج ذیل ہیں:

ایک ایک تنکے پر سوختگی طاری — برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

پتہ ملتا نہیں اب آتشِ وادیٔ ایمن کا — مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچۂ و گل کو — مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے — غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

بہارِ سبزہ و گل ہے کرم ہوتا ہے ساقی کا — جواں ہوتی ہے دنیا میکدہ آباد ہوتا ہے

یکایک توڑ ڈالا ساغرِ مے ہاتھ میں لیکر — مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں

مذاقِ زندگی سے آشنا چرخِ بریں ہوتا — مہ و انجم سے بہتر ایک جامِ آتشیں ہوتا

ہے خستگی کے دم سے رعنائیٔ تخیل — میری بہارِ رنگیں پروردۂ خزاں ہے

زمیں سے تا بہ فلک کچھ عجیب عالم ہے — یہ جذب مہر ہے یا آرزوئے شبنم ہے

یہ ذوقِ سیر یہ دیدار جلوۂ خورشید — بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے

اصغر کی معنوی دنیا جتنی وسیع ہے اتنی متنوع نہیں اور مجھے 'مصنف جدید اردو شاعری کی اس رائے سے قطعاً اتفاق نہیں کہ فانی کے پاس غالب کا سا تنوع نہیں لیکن اصغر نے یہ کمی پوری کر دی۔ اصغر صاحب کے یہاں 'حسن و عشق' 'جلوہ و پردہ' اور 'فنا و بقا' کے مخصوص نظریات ہیں وہی ان کی شاعری کا موضوع ہوتے ہیں۔

معنوی اعتبار سے اصغر و جگر میں بے حد یگانگت ہے خصوصاً جگر کی شاعری کے دوسرے دور کی کم و بیش ساری غزلیں اصغر کے تصوف اور فلسفۂ حسن و عشق سے متاثر نظر آتی ہیں۔ خود جگر کو اعتراف ہے ؎

یوں تو دنیا میں جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال — خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھکو

یا

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر — جو بیٹھو با ادب ہو کر جو اٹھو باخبر ہو کر

اسی حقیقت کی طرف مرزا احسان احمد نے یوں اشارہ کیا ہے "جن[1] کے (اصغر کے) فیض صحبت نے نہ صرف

---

[1] مقدمہ داغ جگر۔

ان کی (جگرؔ کی) شاعری کا رخ بدل دیا بلکہ خود ان کے قالبِ حیات میں ایک نئی روح پھونک دی جس نے دفعتہً ان کو زمین سے آسمان تک پہونچا دیا۔"

بعض بعض غزلوں میں تو اتنی یک رنگی اور میل ہے کہ امتیاز محال ہو جاتا ہے مثلاً

اصغرؔ

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

تمام دفترِ حکمت الٹ گیا ہوں میں — مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں
کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا — خود اپنا طرزِ نظر ہوں کہ دیکھتا ہوں میں

الٰہی خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے — ذرا بتوں کو بھی بندہ نواز رہنے دے
مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے — یہ راز ہے تو ذرا حسن راز رہنے دے
حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں — ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے

جگرؔ

تیری ہر ایک شان کے شایاں بنا دیا — انساں کو درد عشق نے انساں بنا دیا
اک اک ادائے عشق کو تاثیرِ حسن نے — آئینۂ لطافتِ پنہاں بنا دیا
دوڑا کے حسنِ یار کی ہلکی سی اک لہر — کانٹوں کو بھی رشکِ گلستاں بنا دیا

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں — اگر نہیں ہوں تو کیوں کر جو ہوں تو کیا ہوں میں
ہر ایک شے نظر آتی ہے میری ہی تصویر — جہاں سے منظرِ فطرت کو دیکھتا ہوں میں

یہ تیرِ ناز ہے تو شوق سے چلائے جا — خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے
میں رازِ عشق کو بیگانۂ جہاں رکھوں — مگر جو مصلحتِ حسن راز رہنے دے

ان اشعار میں بھی دیکھئے کتنی معنوی یگانگت ہے۔

اصغرؔ — دید کیا نظّارہ کیا اس کی تجلّی گاہ میں — وہ بھی موجِ حسن تھی جس کو نظر سمجھا تھا میں
جگرؔ — وہ بھی نکلی اک شعاعِ برقِ حسن — جس کو میں اپنی نظر سمجھا کیا

اصغرؔ — یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی — پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں
جگرؔ — ایک ذرہ کا اگر حسن نمایاں ہو جائے — آدمی شدتِ انوار سے حیراں ہو جائے

اصغرؔ — چمک دمک پہ مٹا ہوا ہے یہ باغباں تجھکو کیا ہوا ہے — فریبِ شبنم میں مبتلا ہے چمن کی اب تک خبر نہیں ہے
جگرؔ — یہ فریبِ جلوہ ہے سربسر مجھے ڈر یہ ہے دلِ بے خبر — کہیں رہ نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر

اصغرؔ — میں اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں — میری نظر تو غرق ہے موجِ شراب میں
جگرؔ — کسی کی مست خرامی کا واہ کیا کہنا — کہ جیسے حافظِ شیراز جھوم کر آئے

(ان دونوں شعروں میں معنوی یگانگت تو ضرور ہے مگر انداز بیان کے اعتبار سے جگر کا شعر اصغر کے شعر سے بہت بلند ہے)

یہاں پر اس اعتراض کی بھی گنجائش ہے کہ چند منتخب اشعار سے معنوی یگانگت پیدا کر دینا کوئی معنی خیز بات نہیں۔ ہر شاعر کے کلام سے چند ملتی جلتی ہوئی چیزیں نکالی جاسکتی ہیں۔ مگر یہاں ایک دو کیا جگر کی بعض بعض ساری غزلیں خصوصاً دوسرے دور کی داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے اصغر کے رنگ میں کھپ جاتی ہیں۔ مگر زمانہ کے ساتھ ساتھ رنگ شاعری بدلتا گیا۔ چنانچہ جگر کے موجودہ نکھرے ہوئے رنگ اور اصغر کے انداز شعری میں ایک نمایاں فرق ہے۔ جگر کا شعری رجحان حقیقت سے مجاز کی طرف جھک گیا۔ اور ان کے اشعار میں حسرت کی طرح نازک احساسات اور تاثرات کی دل آویز تصویر کشی کی شان پیدا ہوگئی۔ اور اصغر کی طبیعت "تفلسف و تصوف" کی طرف زیادہ مائل ہوگئی۔ اور اب تو بہت سی غزلوں کو دیکھ کر یہ گمان بھی مشکل سے ہوتا ہے کہ ان دونوں شاعروں کے رنگ میں کبھی یگانگت بھی رہی ہوگی۔

اصغر

متاعِ زیست کیا ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
جسے سب درد کہتے ہیں اُسے ہم دل سمجھتے ہیں

اسی سے دل اسی سے زندگیٔ دل سمجھتے ہیں
مگر حاصل سے بڑھ کر سعی لا حاصل سمجھتے ہیں

کوئی سرگشتۂ راہِ طریقت اس کو کیا جانے
یہاں افتادگی کو حاصلِ منزل سمجھتے ہیں

غمِ لاانتہا، سعیِ مسلسل، شوقِ بے پایاں
مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں

جگر

نظر ملا کے مرے پاس آ کے لوٹ لیا
نظر ہٹی تھی کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا

شکست حسن کا جلوہ دکھا کے لوٹ لیا
نگاہیں نیچی کئے سر جھکا کے لوٹ لیا

دہائی ہے مرے اللہ کی دہائی ہے
کسی نے مجھ سے بھی مجھ کو چھپا کے لوٹ لیا

کوئی یہ لوٹ تو دیکھے کہ اس نے جب پایا
تمام ہستیِ دل کو جگا کے لوٹ لیا

نگاہیں ڈال دیں جس پر حسین نظروں نے
اسے بھی حسن مجسم بنا کے لوٹ لیا

بڑے وہ آئے دل و جاں کے لوٹنے والے — نظر سے چھیڑ دیا گدگدا کے لوٹ لیا
نہ لٹتے ہم مگر ان مست انکھڑیوں نے جگر — نظر بچاتے ہوئے ڈبڈبا کے لوٹ لیا

ذوقِ طلب حصول سے جو آشنا نہ ہو — یعنی وہ درد چاہیئے جس کی دوا نہ ہو
دیکھا ہے برقِ طور کو بھی فرشِ خاک پر — افتادگیٔ عشق اگر نارسا نہ ہو
ہر ہر قدم پہ جلوۂ رنگیں ہے نو بہ نو — خود تنگیٔ نگاہ جو زنجیرِ پا نہ ہو
چھایا ہوا ہی ہر دو جہاں میں جمالِ دوست — اے شوقِ دید چشم بھی اپنی اُٹھا نہ ہو (اصغر)

زخم وہ دل پہ لگا ہے کہ دکھائے نہ بنے — اور جو چاہیں چھپا لیں تو چھپائے نہ بنے
ہائے بے چارگیٔ عشق کہ اس محفل میں — سر جھکائے نہ بنے آنکھ اُٹھائے نہ بنے
کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہی کہ آہ — منہ چھپائے نہ بنے سامنے آئے نہ بنے
ہائے وہ عالمِ پُرشوق کہ جس وقت جگر — اس کی تصویر بھی سینے سے لگائے نہ بنے (جگر)

غزلیں اگرچہ ہم قافیہ و ہم ردیف نہیں ہیں مگر فرق نمایاں ہے۔ جگر کے چند اور متفرق اشعار بھی درج ذیل ہیں ان میں تو اصغر کے رنگ سے بالکل تضاد سا ہی۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا — گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی
کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں — پھر ایسی چشم توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی
خیالِ یار سلامت تجھے خدا رکھے — ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

ترے بیان میں قاصد کچھ اشتباہ نہیں — جز اس قدر کہ یہ فرمودۂ نگاہ نہیں

جب سے تو مہربان ہے پیارے — دل بہت بدگمان ہے پیارے
صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے — تو یوں ہی دھان پان ہے پیارے

مرا جب بُرا حال سُن پائیے گا — خراماں خراماں چلے آئیے گا

ہر دم دعائیں کرنا ہر لحظہ آہیں بھرنا — ان کا بھی کام کرنا اپنا بھی کام کرنا

اصغر کا کلام حسن کارانہ رنگیں بیانی کا بہترین نمونہ ہے۔ مگر تغزل کے صحیح معیار پر اصغر کی تمام غزلیں ذرا مشکل سے پوری اتریں گی۔ گو ہمارا یہ مطلب نہیں کہ 'حسن و عشق' کے مبالغہ آمیز اور فرسودہ جذبات کو غزل کے چند مقررہ اصول کے تحت میں بیان کرنا تغزل ہے۔ 'تغزل' ایک ذوقی چیز ہے اور اس لئے اس کی منطقی تعریف دشوار ہے۔ ہاں معمولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ چیز جس سے ہمارے جمالیاتی ذوق' کی تکمیل ہو تغزل ہے۔ اور چونکہ حسن و عشق کے نغمے جاں نواز اور کیف انگیز ہوتے ہیں اس لئے تاثراتِ حسن و عشق کا سادہ اور رنگین پیرایہ میں بیان کرنا ہی جانِ تغزل ہو گیا ہے۔

میرے نزدیک غزل میں حقیقت سے زیادہ مجاز کو نمایاں ہونا چاہئے۔ 'حقیقت' خود ظاہر ہے۔ مجاز کی رنگینیوں کو سامنے لانا کمالِ شاعری ہے۔ اور یہ چیز حسرت کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حسرت کے بیان میں بھی کہیں کہیں رنگینی کے بجائے پھیکا پن آجاتا ہے۔ قطع نظر اس کے عشقیہ جذبات اور احساسات کی صحیح مصوری جس طرح حسرت نے کی ہے سب کے یہاں ناپید ہے۔ حسرت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں شاعر نے اپنے واردات کی نقاشی نہایت شگفتہ پیرایہ میں ایک فن کار کی طرح کی ہے:

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار
جن میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
ان کی تصویر بھی سینے سے لگائی نہ گئی

ہم رضا پیشہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں
کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

ہم نے تو نثار کر دیا دل
اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

ایسا تو ہوا کہ ہیں وہ نادم | اتنا تو کیا مری وفا نے
اب کاہے کو آئیں گے وہ حسرتؔ | آغازِ جنوں کے پھر زمانے

مرمٹا آپ پہ کون آپ نے یہ بھی نہ سنا | آپ کی جان سے دور آپ سے شکوا ہے مجھے

وہ بار بار سزا جرمِ شوق پر دیتے | مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے

اصغرؔ کی غزلوں میں برعکس اس کے "تصوف و تفلسف" کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اور "سرودِ زندگی" میں تو یہ رنگ بہت شوخ ہو گیا ہے۔ بعض غزلیں تو ساری کی ساری اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مثلاً:

اگرچہ ساغرِ گل ہے تمام تر بے بود | چھلک رہی ہے چمن میں مگر شرابِ وجود
جو لے اڑا ہے مجھے مستانہ وار ذوقِ سجود | بتوں کی صف سے اٹھا نعرۂ "انا المعبود"
شعاعِ مہر کی جولانیاں ہیں ذرّوں میں | حجابِ حسن ہے آئینہ دارِ حسنِ نمود
اٹھا کے عرش کو رکھا ہے فرش پر لا کر | شہود غیب ہوا غیب ہو گیا ہے شہود
مذاقِ سیر و نظر کو کچھ اور وسعت دے | کہ ذرّے ذرّے میں ہے اک جہانِ نامشہود
نیازِ سجدہ کو شائستۂ و مکمل کر | جہاں نے یوں تو بنائے ہزار ہا معبود

ان اشعار میں معنوی لطافتوں کے مقابلہ میں شگفتگی اور رنگینی زیادہ ہے۔ اصغرؔ کے اس مجموعۂ کلام کی بیشتر غزلوں کا یہی رنگ ہے۔ ان کے کلام کی حد درجہ رنگینی اور شعریت نے ان کی شاعری کے معنوی پہلو پر ایک قسم کا پردہ ڈال دیا ہے۔ ورنہ ان کے بیشتر اشعار احساسات و جذبات نہیں بلکہ فلسفہ اور تصوف کے روکھے پھیکے نظریات ہو کر رہ جاتے۔ تاہم اصغرؔ کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تغزل کا آب و رنگ جھلکتا ہے۔ اور اگرچہ ایسے اشعار کی بہتات تو نہیں ہے مگر جو ہیں وہ جانِ تغزل ہیں۔ اصغرؔ کو اپنے معاصرین پر ایک قسم کی فوقیت حاصل ہے۔ اور وہ فوقیت ان کی حسن کاری اور رنگیں بیانی ہے۔ اصغرؔ کے تغزل میں اسی لئے لطافت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار تغزل نگاری کا بہترین نمونہ ہیں:

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا | رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
کیا کہئے جاں نوازیِ پیکانِ یار کو | سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

تیری شوخی تری نیرنگ ادائی کے نثار — اک نئی جان ہے تجدیدِ تمنا ہونا

اک دلِ بیتاب ہیں پہلو میں پھر پیدا کروں — مسکرا کر پھر ذرا مجھ سے تقاضا کیجئے

تم سامنے کیا آئے اک طرفہ بہار آئی — آنکھوں نے مری گویا فردوس نظر دیکھا

رقصِ مستی دیکھتے جوشِ تمنا دیکھتے — سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت — میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی — نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے — لباسِ زہد کو جس نے کیا شراب آلود

قربان ترے اے کشش ہاں اے نگہِ ساقی — تو صورتِ معنی ہے تو صورتِ مے خانہ

درد وہ ہے کہ جہاں کو تہ و بالا کر دوں — اس پہ یہ لطف ہے نالہ نہ ہو فریاد نہ ہو

ایک مدت سے تری چشم سے محروم ہوں میں — کاش وہ چشمِ عنایت بھی تری یاد نہ ہو

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے — ہم کیا کریں گے مر کے کیا کر لیا ہی جی کے

کچھ ملتے ہیں اب پختگیٔ عشق کے آثار — نالوں میں رسائی ہے نہ آہوں میں اثر ہے

جن کو اپنی شوخیوں پر آج اتنا ناز ہے — وہ کسی دن میری جانِ ناشکیبا دیکھتے

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں — صاف ڈبو دیا مجھے موجِ مئے طہور میں

شعر و شاعری کا دیگر فنون لطیفہ کی طرح بہترین مقصد یہ ہے کہ وہ دل و دماغ کو سرور آشنا کر دے شِلر[۱] کہتا ہے "ہر آرٹ کا مقصد افزائش مسرت ہے اور دنیا میں اس سے زیادہ اہم اور سنجیدہ کوئی مسئلہ نہیں کہ انسان کو کس طرح خوش رکھا جائے۔ صحیح آرٹ صرف وہ ہے جو سب سے زیادہ آسائش و خوشی پیدا کر سکے"۔ تخلیقی ادب بھی آرٹ ہی اور اس لئے اس کو خارجی اور داخلی دونوں اعتبار سے اتنا رنگیں اور جاں نواز ہونا چاہئے کہ اس کی کیف آور اور نشاط انگیز رنگینیاں قلب کی گہرائیوں میں لطیف ارتعاش پیدا کر دیں اور مضمحل جذبات میں بھی بالیدگی اور انبساط کی لہر دوڑا دیں۔

---

[۱] انتخاب حسرت مقدمہ جلیل قدوائی صفحہ ۳۔

شعری پیداوار تخلیقی ادب کی ایک داخلی قسم ہے۔ اور اس لئے اگر کسی شعر سے انشراحِ طبع نہیں پیدا ہوتا تو اس کو شعر نہ کہنا چاہئے۔ ادب میں فنِ شاعری کا درجہ سب سے ممتاز ہے اور غالباً اس لئے کہ شعر کا حسنِ بیان اور اس کی موسیقیت و موزونیت ہمارے ''ذوقِ جمالیات'' کی تکمیل کرتی ہے۔ اصغر کی بہتیری غزلیں کیف و ترنم اور رنگین بیانی کا سحر لرزاں ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

اصغر نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن — جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

ان کے مترنم اور رنگین اشعار آنکھوں کے سامنے ایک پرکیف روحانی فضا پیدا کر دیتے ہیں جہاں ہر ذرہ حسین اور رقصاں نظر آتا ہے۔

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں — کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں
کبھی گل کہہ کے پردا ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر — کبھی مستی میں پھر گل کو رخِ زیبا سمجھتے ہیں
خوشا وہ دن کہ حسنِ یار سے جب عقل خیرہ تھی — یہ سب محرومیاں ہیں آج ہم جتنا سمجھتے ہیں
یہ جلوے کی فراوانی، یہ ارزانی یہ عریانی — پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں — محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو — مگر موجِ صبا کی پاکدامانی نہیں جاتی

ترے قربان ساقی اب وہ موجِ زندگی کیسی — نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے
حسینوں پر نہ رنگ آیا نہ پھولوں میں بہار آئی — نہیں آیا جو لب پر نعرۂ مستانہ برسوں سے

یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراقِ رنگیں ہیں — مگر اک مشت پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو
دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخیٔ پنہاں — چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

اصغر کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت ان کے کلام کی یک رنگی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے ملتی ہے۔ زندگی کے گوناگوں واقعات اور مختلف ذہنی کیفیات کا رنگ شاعری پر اثر ڈالنا ایک فطری اصول ہے۔ مگر اصغر کی حد درجہ متین اور قناعت پسند طبیعت اس قسم کے اثرات سے کوئی گہرا اثر قبول نہیں کرتی۔ اور

اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انفرادیت اور رنگ کی پختگی کا صحیح اطلاق اصغر کے کلام پر ہوتا ہے۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد اصغر کے کلام میں مشکل سے دو چار غزلیں ایسی ملیں گی جن کا رنگ اصغر کے رنگ سے مختلف ہے۔ مثلاً ایک ہی غزل ہے جس کا مطلع ہے:-

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

اصغر کے رنگ میں نہیں کہی۔ مگر ایسی غزلوں اور اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

فانی، جگر اور حسرت کی انفرادیت اگرچہ مسلّمہ ہے مگر ان کے مختلف دور کے اشعار میں معنوی اور خارجی دونوں اعتبار سے بہت فرق ہے۔ فانی اور جگر کے مختلف دور کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں دیکھئے کہ ان میں کتنا فرق ہے۔

فانی

شاید فسانۂ غم سچا سمجھ گئے تم
صدقے ان انکھڑیوں کے یہ کیوں بھر آئیاں ہیں

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی
کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں زار زار رویا
آیا ہے بعد مدت بچھڑی ہوئی ملے ہیں
دل سے لپٹ لپٹ کر دل زار زار رویا

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

جگر

جوانی پر ان کا شباب آگیا
مری جان کا اک عذاب آگیا

پسِ مرگ تربت پہ چھا جائے گی
مری بے کسی کام آجائے گی
مرے بعد ڈھونڈھو گے میری وفا
مرے ساتھ میری وفا جائے گی

جوشِ جنونِ عشق کا ارمان نکل گیا
دامن کو سی لیا ہے تو گریباں نکل گیا

تا عمر آہ کنجِ قفس دیکھنا پڑا
اڑ کر چلے تھے چار قدم آشیاں سے ہم
بیتابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا
آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

تصویر امیدوں کی آئینہ ملالوں کا
انساں جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا

لاکھوں میں انتخاب کے قابل بنا دیا
جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل بنا دیا
اللہ ایسے جذبِ محبت کو کیا کروں
رگ رگ کو جس نے درد بھرا دل بنا دیا

وحشت بقدرِ چاکِ گریباں رسا نہیں
دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

محروم یاں ذریعۂ الہام و ہوش تھیں
نالوں پہ انحصارِ پیامِ سروش تھا

فانیؔ تنک بضاعتیِ غم کا کیا علاج
ہر قطرہ خونِ دل کا تمنا فروش تھا

لیکے نکلا ہے مرا جوشِ لطافت مجھکو
خوب پہچان لے آج اے مری صورت مجھکو

فریب خوردۂ رنگینیٔ اداہوں میں
نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

مجھے تلاش کر اے بیخودیٔ شوق سجود
پہنچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

تصورات کی آئینہ بندیاں بے سود
تعینات کی دنیا سے ماورا ہوں میں

تمام اصل حقیقت کا آئینہ ہوں میں
خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں

فروغِ بادہ ترے حسن کا جواب ہوا
سنبھال لے مجھے ساقی میں بے نقاب ہوا

نگاہِ شوق کی جذب و کشش ارے توبہ
حسنِ آئینہ پہ نظر کی ترا جواب ہوا

یہاں تک جذب کر لوں کاش تیرے حسنِ کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر

پڑا رہ سبزۂ بیگانہ پر تو صورتِ شبنم
شعاعِ حسن اڑا لے جائیگی خود یاں پہ ہو کر

لطافت مانعِ نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہو کر

ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں
ورنہ یہ اضطرابِ پیہم کیا

صہبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

ٹھہر ٹھہر دلِ بیتاب پیار تو کر لیں
پھر اس کے بعد ملاقات ہوئی ہوئی نہ ہوئی

کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ایسی چشمِ توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی

جو تیرے ہجر میں سر کا راز فاش کرے
تری جناب میں وہ دل کبھی قبول نہ ہو

صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے
تو یونہی دہان یان ہی پیارے

حسرتؔ کے یہاں بھی کم و بیش یہی عالم ہے۔ بسا اوقات تو حسرتؔ کی ایک ہی غزل میں مختلف رنگ اور معیار کے شعر نظر آتے ہیں۔ مگر اصغرؔ کا رنگ شاعری تغیر آشنا نہ ہوا۔ بیان کی رنگینی و لطافت اور شعر کی ترنم ریزی کا جو عالم پہلے مجموعۂ کلام میں تھا وہی عالم سرودِ زندگی میں ہے۔ اصغرؔ نے حسن و عشق کا جو اعلیٰ اور بلند نظریہ ایک مرتبہ قائم کیا صداقت کے ساتھ اسی پر جمے رہے۔ اس نقطۂ نظر سے تو 'سرودِ زندگی' کو 'نشاطِ روح' کا نقشِ ثانی سمجھنا چاہیئے مگر یہ بات ضرور ہے کہ اس مجموعہ کی بیشتر غزلوں سے وہ کیف مفقود ہے جو نشاطِ روح میں تھا۔ اصغرؔ کے اس رنگ میں معنوی سنجیدگی

بہت زیادہ آگئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شعر انسانی فطرت کا آئینہ ہوتا ہے۔ مگر ایسے شعرا مشکل سے فی صدی دو ملیں گے جن کے حال پر شعر کی یہ تعریف صادق آتی ہو۔ مگر اصغر کی شاعری ان کی زندگی کی تفسیر ہے۔ ان کی پُرسکون قانع اور نفاست پسند طبیعت کا رنگ ہر ہر شعر میں جھلکتا ہے۔ رجائیت، شگفتگی اور رنگینی اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ وہ دنیا کو محرومیوں کا گہوارہ نہیں بلکہ مسرتوں کا گنجینہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ ان کے رجائی اور شگفتہ نغموں نے اپنے کیف ترنم سے اُردو شاعری کی محرومی، ناکامی اور اُداسی کو خوشگوار بنا دیا۔

اصغر کے یہاں جگر کی سرشاری و سرمستی نہیں، فانی کی یاس انگیزی نہیں بلکہ اس سے ان کو احتراز ہے۔ ان کا شعر ہے

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیے　　مجھکو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

نہ حسرت کے جذبات عشق و محبت کی دلکش تصویر کشی ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں وہ "کیف و رنگ" بھرنا چاہتے ہیں جس سے بقول عبدالقادر سروری پڑھنے والوں کے دل و دماغ نغمہ ہائے مسرت سے بھر جائیں چنانچہ خود کہتے ہیں:

اصغر غزل میں چاہیے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

حافظ کے کلام میں کلام

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (علیگ)
صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی

مندرجۂ ذیل بحث کو چند حضرات "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مصداق سمجھتے ہونگے۔ ممکن ہے ان کا خیال صحیح ہو۔ مگر فاضل مقالہ نگار نے اس پہلو پر ایک خاص وجہ سے زور دیا ہے۔ اُن کا مقصد حافظ کے کلام میں خردہ بینی نہیں بلکہ معیارِ سخن و سخن فہمی میں جو عظیم الشان انقلاب ہوگیا ہے اُسے آشکار کرنا ہے۔ معایبِ سخن کی یہ طول طویل اور مرعوب کُن فہرست جو یقیناً بڑی تحقیق و تدقیق سے تیار کی گئی ہے، اب سے ربع صدی قبل کسی شاعر کو ابدالآباد تک دفن کرنے کے لئے کافی ہوتی مگر اب بھی جبکہ شاعری کے متعلق نظریات بہت کچھ بدل گئے ہیں اور شاعر کی برتری محض مشغلِ بحور و قوافی سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے میں مضمر نہیں رہی بلکہ اس کے لئے تخیل کی بلندی اور جذبات کی پاکیزگی شرط ہے، اس فہرست کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ حافظ شیکسپیر کی طرح قدما کے بنائے ہوئے قوانین کا پابند نہیں۔ اُس نے اپنے فن کے لئے قوانین خود وضع کئے ہیں، جو بالفاظ دیگر قوانین فطرت ہیں۔ ایک عجیب نکتہ اس میں یہ بھی ہے کہ اُسی معیار کے مطابق جو اہل عجم نے وضع کیا تھا اُن کا سب سے بڑا شاعر لفظی و معنوی دونوں قسم کے معائب سخن سے اپنا دامن نہ بچا سکا۔ (ادارہ)

بلاغت کی کتابوں میں جہاں کلام کی خوبیاں بتائی گئی ہیں، کچھ عیب بھی گنائے گئے ہیں اور ان سے بچنے کی جا بہ جا تاکید ہے۔ ان معائب کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں:- (۱) لفظی، اور (۲) معنوی۔ آج کی صحبت میں جو کچھ عرض کیا جائے گا صرف لفظی عیبوں سے متعلق ہے، اور اُن میں سے بھی تین چار ہی سے بحث ہے:-

(۱) تنافر کا ذکر عربی اور فارسی کتابوں میں بھی آیا ہے اور ہندستانی مصنفوں نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ مولانا سید علی حیدر طباطبائی مرحوم نے، جن کے علمی تبحر اور صحیح مذاق کے سب معترف ہیں، اپنی "دیوانِ غالب" کی شرح میں کئی جگہ اس طرف اشارہ کیا ہے اور مخدومی سید فضل الحسن "حسرت" موہانی نے، جو اردو کے اساتذہ میں سر برآوردہ ہیں، اپنے مفید رسالے "معائبِ سخن" میں سب سے پہلے اسی عیب سے ڈرایا ہے۔

اس عیب کے سوا کچھ اور عیب بھی ہیں، جن کا ذکر ہمارے شاعروں کے حلقے میں بہت عام ہے؛ جیسے:-

(۲) الف، واو یا یے کا "دب کر نکلنا" یعنی کسی حرفِ علت کا بحر کی تنگی میں لفظوں کی چپقلش سے اتنا دب جانا کہ اُس حرف کی مقدار فقط ایک حرکت بھر کی رہ جائے۔

(۳) اپنے اُستاد "ذوق" دہلوی کے حوالے سے مولوی محمد حسین "آزاد" روایت کرتے ہیں کہ

"من جملہ اور اعتراضوں کے 'مصحفی' کی غزل میں ماہیِ تقنفوریں میں جو ی بہ تشدید پڑھی جاتی ہے، 'سید انشا' نے اس پر بھی تمسخر کیا۔"[۱]

اس روایت کو پڑھ کر خیال ہوتا تھا کہ جس طرح اکثر لوگ مشاعرے میں دھاندلی کر بیٹھتے ہیں، "انشا" نے بھی یہ زبردستی کا اعتراض جڑ دیا ہوگا، مگر جناب حسرت نے "معائبِ سخن" میں اس بحث کا ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور فرماتے ہیں:-

"اضافت کی حالت میں یائے معروف کی تشدید مسلّم طور پر معیوب سمجھی جاتی ہے۔"[۲]

اس سے یہ بھی لازم آیا کہ واو عطف کی حالت میں بھی تشدید معیوب ہے، کس واسطے کہ جیسے اضافت ایک حرکت ہے فارسی کے عطف کی مقدار بھی ایک حرکت ہی بھر کی ہے۔

(۴) ہائے مختفی کو شعر کے وزن کی خاطر اتنا کھینچنا کہ الف ہو جائے۔ اِس عیب کے بارے میں "حسرت" کے الفاظ یہ ہیں:-

"ترکیبِ فارسی کے ساتھ ہائے مختفی کی جگہ الف کا استعمال یقیناً ناجائز ہے مگر اردو شاعروں میں کم ایسے ہیں جو اس بات کا خیال رکھتے ہوں اور اُن سے اِس غلطی کا ارتکاب نہ ہوتا ہو۔"

خود حسرت سے بھی یہ "غلطی" سرزد ہو گئی تھی۔ دیوان چھپ چکا تھا اور اُس میں یہ مصرعہ:-

اے صاحبِ خانہ! کچھ لطف و عنایت بھی!

جب دوبارہ دیوان کے چھپنے کی نوبت آئی، اس خطائے منکر پر تنبیہ ہو چکا تھا۔ اس لئے "صاحبِ خانہ" کو کاٹ کر "ساقیِ جاں پرور" بنا دیا۔[۳]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختفی ہے کی یہ صورت فارسی شاعروں کے کلام میں نہیں دکھائی دیتی بلکہ یہ غلطی آن

---

[۱] 'آبِ حیات' (لاہور ۱۹۱۰ء)، ص ۳۲۴۔ [۲] 'معائبِ سخن' (کانپور ۱۹۲۹ء) ص ۲۵۔ [۳] 'معائبِ سخن'، ص ۹۰۔

اُردو خواں لوگوں کی ہے جو فارسی ترکیبوں سے پوری طرح واقف نہیں اور اُنھیں لوگوں کا اثر فارسی داں اردو شاعروں پر بھی پڑا جس سے بعضے اُستادوں کے کلام میں بھی اس عیب نے دخل پایا۔ خلاصہ یہ کہ فارسی شاعر کے لئے یہ سراسر عیب ہے۔

یہ سب چیزیں جن کا "عیوبِ سخن" ہونا "مسلّم" مان لیا گیا ہے خواجہ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کے کلام میں اس کثرت سے وارد ہوئی ہیں کہ کسی اور شاعر کے ہاں شاید ہی ان کی کچھ زائد مثالیں مل سکیں۔ جو عیب اوپر گنائے جا چکے ہیں اُن کی مثالیں دیوانِ حافظ کے (جہاں تک مل سکے) معتبر نسخوں سے اخذ کی گئی ہیں اور جن غزلوں یا شعروں پر الحاقی ہونے کا شبہ ہوا اُن کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ (ا) الف کا دب کر نکلنا:۔

"خارا" اور "آشکارا" کو "چارہ" سے ہم قافیہ کیا ہے:۔

(۱) زروئے دوست مرا چوں گلِ مراد شگفت — حوالہ سرِ دشمن بہ سنگِ خارہ کنم

(۲) زبادہ خوردنِ پنہاں ملول شد حافظ — بیانگِ بربط و نے رازش آشکارہ کنم

اور صرف قافیے ہی نہیں وزن کی ضرورت سے بھی "خارا" کو "خارہ" کر دیا ہے:۔

(۳) خفتہ بر سنجابِ شاہی نازنینے را چہ غم — گر ز خار و خارہ سازد بستر و بالیں غریب

(ب) واو کا دب کر نکلنا:۔

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرِ ما — چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما

(ج) یے کا دب کر نکلنا:۔

(۱) مے بدہ تا دہمت آگہی از سرِّ قضا — کہ بروئے کہ شدم عاشق و بربوئے کہ مست

(۲) اگر شبے بہ زیاتم حدیثِ تو برود — زبے طہارتی آنرا بہ مے غرارہ کنم

(۳) دانا چو دید بازیٔ ایں چرخِ حقّہ باز — ہنگامہ باز چید و درِ گفت و گو ببست

(۴) سبب مپرس کہ چرخ از چہ سفلہ پرور شد — کہ کام بخشیٔ او را بہانہ بے سببیست

(۵) جہاں بہ کامِ من اکنوں شود کہ دورِ زماں — مرا بہ بندگیٔ خواجۂ جہاں انداخت

اس شعر میں "بندگی" کی ے ٹوٹ کر ایک حرکت رہ گئی اور اس کے بعد کی اضافت بڑھ کر پوری ے ہوگئی۔ اسی طرح اگلے دو شعروں میں:-

(۶) آلودگیٔ خرقہ خرابیٔ جہان است | کو راہروے اہلِ دلِ پاک سرشتے

(۷) بہ غلامیٔ تو مشہورِ جہاں شد حافظ | حلقۂ بندگیٔ زلفِ تو در گوشش باد

تین شعر اور حاضر ہیں جن میں یائے وحدت تک کو گرا دیا ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ یائے وحدت ایک پورا لفظ ہے:-

(۸) اگرچہ دوست بہ چیزے نمی خرد ما را | بہ عالمے نہ فروشیم موے از سرِ دوست

(یعنی: از سرِ دوست موے نہ فروشیم)

(۹) گر خلوتِ ما را شبے از رخ بہ فروزی | چوں صبح در آفاقِ جہاں سر بہ فرازم

(یعنی: اگر یک شب خلوت ما را از رخ بہ فروزی.......)

(۱۰) تا شدم حلقہ بگوشِ درِ میخانۂ عشق | ہر دم آید غمے از نو بہ مبارکبادم

خیر فارسی کی ے کو گرا دیا تو ان کی چیز تھی، کسی کو کیا؟ ستم تو یہ کہ عربی کی ے کو بھی کھو دیا:-

جہانِ فانی و باقی فدائے شاہد و ساقی[1] | کہ سلطانیٔ عالم را طفیلِ عشق مے بینم

۲۔ جس عیب کی مثالیں اوپر دی گئیں اس کا عکس ہے کسی حرکت کا ابھر کر نکلنا یعنی وزن کے پورا کرنے کو اسے اتنا کھینچنا کہ ایک حرکت کی جگہ ایک پورا حرف ہو جائے۔ مخفی ہے حقیقت میں حرف صحیح نہیں بلکہ محض ایک حرکت ہے جیسے کردہ، بندہ دال کا فتحہ اور کہ، چہ میں کاف اور چے کا کسرہ۔

پہلے اس کے زبر سے الف ہو جانے کی مثالیں ملاحظہ ہوں:-

(۱) ہمہ کارم زخود کامی بہ بدنامی کشید آخر | نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

(۲) ع: گر ہمہ خلقِ جہاں بر من و تو حیف کنند۔

(۳) ع: برحسبِ آرزو ست ہمہ کاروبارِ دوست۔

---

[1] جہانے فا مفاعیلن نِ یو باقی مفاعیلن۔

(۴) خیز تا بر کلکِ آں نقاش جاں افشاں کنم　　کایں ہمہ نقشِ عجب در گردشِ پرکار داشت

(۵) با ایں ہمہ ہر آنکہ نہ خواری کشید ازو　　ہر جا کہ رفت ہیچکس محترم نداشت

(۶) ع تا ہمہ صومعہ داراں پئے کارے گیرند۔

(۷) ع ما ہمہ بندہ وایں قوم خداوندانند۔

(۸) چہ غم بود ہمہ حال کوہِ ثابت را　　کہ موجہائے چنیں قلزمے گراں گیرد

(۹) گفتم کہ زحافظ بچہ علت شدہ دور　　گفتا کہ ہمہ وقت مرا داعیہ ایں بود

(۱۰) ع: کہ بہ مژگاں شکند قلبِ ہمہ صف شکناں۔

(۱۱) ع: بندۂ من شو و برخور ز ہمہ سیمتناں۔

(۱۲) منال اے دل کہ در زنجیرِ زلفش　　ہمہ جمعیت است آشفتہ حالی

(۱۳) پندِ عاشقاں بشنو، و ز درِ طرب باز آئے　　کایں ہمہ نمی ارزد شغلِ عالمِ فانی

(۱۴) در ہمہ دیرِ مغاں نیست چو من شیدائے　　خرقہ جائے دگر و بادہ و دفتر جائے

ان مثالوں کو دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ تصرف صرف "ہمہ" تک محدود ہے۔ اور مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:۔

(۱۵) در چنیں موسمے عجب باشد　　کہ ببندند میکدہ بہ شتاب

(۱۶) چوں شمعِ وجودِ من شب تا بہ سحر خود را　　می سوخت چو پروانہ تا روز نہ بنشست

(۱۷) ہزار عقل و ادب داشتم من اے خواجہ　　کنوں کہ مست و خرابم صلائے بے ادبیست

(۱۸) چوں پیالہ، دلم از توبہ، کہ کردم، بشکست　　ہمچو بادہ جگرم بے مے و میخانہ بہ سوخت

(۱۹) حافظ زِ غم گریہ نہ پرداخت بخندہ　　ماتم زدہ را داعیۂ سور نماندست

(۲۰) از برائے شرف بنوکِ مژہ[۱]　　خاکِ راہِ تو رُفتنم ہوست

(۲۱) گر دیدہ و دلم کند آہنگِ دیگرے　　آتش زنم در آں دل و دیدہ بر آرمت

(۲۲) ع وگرنہ کے گزرے بودے سحرگاہاں ازیں سویت۔

---

[۱] "مژہ" میں ہے ملفوظ نہیں، مختفی ہے۔ اس باب میں بعضے لوگوں نے دھوکا کھایا ہے۔

(۲۳) ع ہمہ آنست وگرنہ دل و جان ایں ہمہ نیست۔

(۲۴) گفتم رخِ تو ماہست گفتا اگر دو ہفتہ — گفتم بُن نماید، گفتا اگر برآید

(۲۵) ز انقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ — ازیں فسانہ ہزاراں ہزار دارد یاد

(۲۶) طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید — ہمچناں در عملِ معدن و کان است کہ بود

(۲۷) اے پستۂ تو خندہ زدہ بر حدیثِ قند — مشتاقم، از برائے خدا یک شکر بخند

(۲۸) بہ یک دو قطرہ کہ ایثار کردی، اے دیدہ — بسا کہ بر رخِ دولت کنی کرشمہ و ناز

(۲۹) مرا بہ کشتیٔ بادہ در افگن اے ساقی — کہ گفتہ اند نکوئی کن و در آب انداز

(۳۰) دریں شہرے بہ ہجرِ یار و اندوہِ فراق — حافظ از خانہ چنیں دل تنگ می آید بروں

(۳۱) تنہا نہ منم کعبۂ دل بتکدہ کردہ — در ہر قدمے صومعۂ ہست و کنشتے

(۳۲) سحرگہ رہروے در سرزمینے — ہمی گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی، شراب آنگہ شود صاف — کہ در شیشہ برآرد اربعینے

(۳۳) اگر ایں شراب خام است، وگر ایں حریف پختہ — ہزار بار بہتر ز ہزار پختہ، خامے

(۳۴) تشبیہ دہانت نہ تواں کرد بہ غنچہ — ہرگز نبود غنچہ بدیں تنگ دہانی

(۳۵) دل کشادہ دار چوں جامِ شراب — سر گرفتہ چند چوں خمِ دنی؟

(۳۶) آئینِ تقویٰ، ما نیز دانیم — لیکن چہ چارہ با بختِ گمراہ

(۳۷) ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست — خیالِ آب و گل در رہ بہانہ

(۳۸) چو گل نقاب برافگند و مرغ زد ہو ہو — منہ ز دست پیالہ، چہ می کنی، ہی ہی؟

(۳۹) مے دہ کہ گرچہ گشتم نامہ سیاہِ عالم — نومید کے تواں بود از لطفِ لایزالی؟

(یہ مثال خاص توجہ چاہتی ہے، اس لئے کہ مرکب لفظ "نامہ سیاہ" میں تصرف ہوا ہے)

اب چند پوری پوری غزلیں ملاحظہ ہوں جن میں خود ردیف یا قافیہ ہی مختفی ہے پر ختم ہونے والا لفظ ہے:۔

(۴۰) در سرائے مغاں رفتہ اند و آب زدہ — نشستہ پیر و صلائے بہ شیخ و شاب زدہ

(اس غزل میں تیرہ شعر ہیں)

(۴۱) دوش رفتم بدرِ میکدہ خواب آلودہ — خرقہ تر دامن و سجّادہ شراب آلودہ

(اس غزل میں نو شعر ہیں)

(۴۲) اے از فروغِ رویت روشن چراغ دیدہ — مانندِ چشمِ مستت چشمِ جہاں ندیدہ

(اِس تیرہ شعر کی غزل میں اور قافیے یہ ہیں: نیا فریدہ، کشیدہ، تپیدہ، آرمیدہ، رمیدہ، خمیدہ، رسیدہ، چیدہ اور عربی لفظ "جریدہ") یہی حال ایک اور غزل کا بھی ہے کہ گیارہ شعر کی ہے اور قافیے کشیدہ، دریدہ، چکیدہ، پروریدہ، برگزیدہ، زبان بریدہ، شنیدہ وغیرہ۔

(۴۳) ایک اور غزل:۔

سحرگاہاں کہ مخمورِ شبانہ — گرفتم بادہ با چنگ و چغانہ

اور قافیے:۔ روانہ، زمانہ، نشانہ، درمیانہ، آشیانہ، بہانہ، کرانہ، جاودانہ، یگانہ، فسانہ۔

(۴۴) ایک غزل ہے: — چراغِ روئے ترا گشت شمع پروانہ

مرا زحالِ تو با حالِ خویش پروا نہ — (یعنی پروانیست)

یہ نو شعر کی غزل ہے اور قافیے: دیوانہ، جانانہ، بیدانہ، بیگانہ، افسانہ، پیمانہ، میخانہ۔

(۴۵) ایک غزل اور:۔

عیدست و موسمِ گل، ساقی بیار بادہ — ہنگامِ گل کہ دیدہ بے مے قدح نہادہ

سات شعر ہیں اور قافیے: کشادہ، دادہ، سادہ، فتادہ، شاہزادہ۔

عربی لفظوں میں بے تکلف تصرف کیا ہے:۔

(۴۶) چمن حکایتِ اُردی بہشت می گوید — نہ عارفست کہ نسیہ خرید و نقد بہشت

(۴۷) بفریادِ من اے پیرِ خرابات — بیک جرعہ جوانم کن کہ پیرم (حمیدہ کی مثال اوپر آچکی)

(۴۸) ع: با عاشقانِ بیدل تا چند ناز و عشوہ۔

(۴۹) ایک غزل آٹھ شعروں کی ہے جن میں صرف ایک شعر پورا فارسی ہے:۔

حالِ درونِ ریشم محتاجِ شرح نبود | خود می شود محقق از آبِ چشم خامہ

باقی سات آدھے فارسی آدھے عربی یعنی پہلا مصرعہ فارسی دوسرا عربی۔ مطلع ہے:۔

(۵۰) از خونِ دل نوشتم نزدیکِ یار نامہ
انی رأیتُ دهراً من هجرك القیامة

اسی غزل میں وہ مشہور مصرعہ بھی ہے:۔

(۵۱) من جرّبَ المجرَّب حلّت بهِ الندامه۔

اور قافیے۔ علامہ، سلامہ، غمامہ، ملامہ، کرامہ۔

یہ خواجہ حافظؔ ہی کی کرامت تھی کہ اتنے عربی الاصل لفظوں کو شدمی کرلیا اور جمعیت علما نے صدائے احتجاج بلند نہ کی۔

اب وہ مقامات حاضر ہیں جن میں مختفی ہے کو سے کر دیا ہے:۔

(۱)	غمے نباشد از آں کہ خدائے عز و جل	درے نہ بندد تا دیگرے نہ بکشاید
(۲)	یاد باد آنکہ بہ قصدِ خونِ ما	عہد را بشکست و پیمان نیز ہم
(۳)	فراواں گنجہا در سینہ دارم	اگرچہ مدعی بیند فقیرم

(۴) ع: اگرچہ مرغِ زیرک بود حافظؔ در وفاداری۔

(۵)	دانم کہ بہ گذرد ز سرِ جرمِ من کہ او	گرچہ پریوش است ولیکن فرشتہ خوست
(۶)	گرچہ بوئے وصلت در حشر زندہ گردم	سر بر نیارم از خاک از روئے شرمساری
(۷)	نمی بینم نشاط و عیش در کس	نہ درمانِ دلے نہ دردِ دینے
(۸)	اگرچہ رسمِ خوباں تندخوئیست	چہ باشد گر بسازی با غمینے

(۹) ایک غزل کی ردیف ہے "یعنی چہ":۔

ناگہاں پردہ بر انداختۂ یعنی چہ
مست از خانہ بروں تاختۂ یعنی چہ

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ کی جتنی قسمیں ہیں: اِسم، فعل، حرف، کوئی شاعر کے تصرف سے نہیں بچی بلکہ جو عربی لفظ عربی فقروں میں آئے ہیں اُن کی اخیرہ کو بھی مختتی فرض کر لیا اور تصرف در تصرف یہ کہ اُسے کھینچ کھانچ کے الف کے برابر کر دیا۔

۳۔ اب اُس اعتراض کو لیجئے کہ مصحفی کے اس شعر میں:۔

مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے   وہ ہاتھ میں ماہیِ سقنقور کی گردن

"ماہی" کے لفظ کی "ے" اضافت کے باعث مشدد ہو گئی ہے[1]

اس "عیب" کی مثالیں حافظ کے کلام میں بہ کثرت ہیں بلکہ سوا اضافت کے عطف کی حالت میں بھی "ے" کو تشدید دے دی ہے۔ جیسے

(۱) ع بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی؛ اور اسی غزل میں۔

(۲) ع غزل گفتی و دُر سفتی بیا و خوش بخواں حافظ۔

(۳) اسی طرح ع چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی۔

(۴) دوائے دردِ خود اکنوں ازاں مفرح جوئے   کہ در صراحیِ چینی و شیشۂ حلبیست

(۵) بیارے کہ چو حافظ مدام استظہار   بگریۂ سحری و نیازِ نیم شبیست

(۶) حافظ شراب و شاہد و رندی نہ وضعِ تست   فی الجملہ می کنی و فرو میگزارمت

(۷) ع عمر بگہ بے حضورِ صراحی و جام رفت۔

(۸) ع وقتِ شادی و طرب کردنِ رنداں برخاست۔

ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں مگر یہاں انھیں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اضافت کی مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) ہر کہ گوید سفر دور ندارد حافظ   گو درازیِ سفر سر نبرد از سرما

---

[1] مصحفی نے جو شعر سند میں پیش کیا تھا یہ ہے:۔

مائیم و فقیری و سیہ روئی کونین   رخسار سفید اُمرا را نہ شناسیم   (آبِ حیات ص ۳۲۴)

سننے والوں نے اسی پر شاید یہ بھی کہا کہ جانے کس کا شعر پڑھ دیا۔

(۲) جان درازیٔ تو بادا، کہ یقین مے دارم — در کمان ناوکِ مژگانِ تو بے چیزے نیست

(۳) نیست در بازارِ عالم خوشدلیٔ ورزانکہ ہست۔
شیوۂ رندیٔ و خوشباشیٔ عیاران خوشست۔

(۴) معنیٔ آبِ زندگی و روضۂ ارم — جز طرفِ جویبار و مۓ خوشگوار چیست

(۵) سہو و خطائے بندہ گرش نیست اعتبار — معنیٔ عفو و رحمتِ پروردگار چیست

(۶) شرابِ بیغش و ساقیٔ خوش دو دامِ رہ اند
کہ زیرکانِ جہاں از کمندِ شاں نرہند

(۷) پیش از ینت بیش ازیں اندیشۂ عشاق بود — مہرورزیٔ تو با ما شہرۂ آفاق بود

(۸) رشتۂ تسبیح اگر بگسست معذورم بدار — دستم اندر ساعدِ ساقیٔ سیمیں ساق بود

(۹) خوں می خورم ولیک نہ جائے شکایتست — روزیٔ ما ز خوانِ کرم ایں نوالہ بود

(۱۰) بغلامیٔ تو مشہورِ جہاں شد حافظ — حلقۂ بندگیٔ زلفِ تو در گوشش باد

(۱۱) ز آشفتگیٔ حالِ من آگاہ کے شود — آنرا کہ دل نگشت گرفتار ایں کمند

(۱۲) ز آنجا کہ رسم و عادتِ عاشق کشیٔ تست — با خصم بادہ نوش و دلِ ما کباب کن

(۱۳) کامم از تلخیٔ غم چوں زہر گشت — بانگِ نوشِ بادہ خواران یاد باد

(۱۴) مذاقِ جانش ز تلخیٔ غم شود ایمن — ہر آنکہ نکتۂ شکرِ تو در دہاں گیرد

(۱۵) بیا و حالِ اہلِ درد بشنو — بہ لفظِ اندک و معنیٔ بسیار

(۱۶) گردے از رہگزرِ دوست بکوریٔ رقیب — بہر آسایشِ ایں دیدۂ خونبار بیار

(۱۷) مے کند عقل سرکشیٔ تمام — گردنش را رسنے طناب بیار

(۱۸) چناں بحسن و جوانیٔ خویشتن مغرور — کہ داشت از دلِ بلبل ہزار گونہ فراغ

(۱۹) ع بسے نماند کہ کشتیٔ عمر غرقہ شود۔

(۲۰) اختیاری نیست بدنامیٔ من — ضَلّلنی فی العشقِ مَن یھدی السبیل

(۲۱) جہانِ فانی و باقی فدائے شاہد و ساقی — کہ سلطانیٔ عالم را طفیلِ عشق می بینم

(۲۲) جامے بدہ کہ باز بشادیٔ روئے شاہ — پیرانہ سر ہوائے جوانیست در سرم

(۲۳) تو آتش گشتی اے حافظ ولے بایار در نگرفت — ز بد عہدیٔ گل گوئی حکایت باصبا گفتیم

(۲۴) حافظا چوں غم و شادیٔ جہاں در گزر است — بہتر آنست کہ من خاطرِ خود خوش دارم

(۲۵) خسروا! امیدِ اوجِ جاہ دارم زیں قبیل — التماسِ آستاں بوسیٔ حضرت می کنم

(۲۶) خرقہ پوشیٔ من از غایتِ دینداری نیست — پردۂ بر سرِ صد عیب نہاں مے پوشم

(۲۷) شیراز معدنِ لبِ لعل است و کانِ حسن — من جوہریٔ مفلس ازاں رو مشوشم

(۲۸) ز دل گرمیٔ حافظ برحذر باش — کہ دارد سینۂ چوں دیگ جوشاں

(۲۹) بر سرِ منبر بہ وقتِ وجد و رزاقیٔ حال — از سرِ دستار واعظ بانگ می آید بروں

(۳۰) بس شکرہا کہ گویم از بندگیٔ خواجہ — گر اُفتد بہ دستم آں میوۂ رسیدہ

(۳۱) ز ساقیٔ کمان ابرو شنیدم — کہ اے تیرِ ملامت را نشانہ!

(۳۲) بدہ کشتیٔ مے تا خوش برآئیم — ازیں دریائے ناپیدا کرانہ

(۳۳) آلودگیٔ خرقہ خرابیٔ جہان است — کو راہروے اہلِ دلے پاک سرشتے!

(۳۴) شیشہ بازیٔ سرشکم نگری از چپ و راست — گر بریں منظرِ بینش نفسے بنشینی

(۳۵) وصالِ دوستاں روزیٔ ما نیست — بگو حافظ غزلہائے عراقی

(۳۶) بہ سرکشیٔ خود اے سروِ جویبار مناز — کہ گر بہ او رسی از شرم سر فرو داری

۴۔ تنافر کے معنے ہیں بعض حرفوں یا کلموں کا کلام میں ایک دوسرے سے میل نہ کھانا۔ غالب کے اس مصرع کے متعلق۔

"یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا"

مولانا طباطبائی مرحوم فرماتے ہیں کہ "جو جگر" کا واؤ وزن سے ساقط ہوا اور دو جیمیں جمع ہوگئیں اور عیب تنافر پیدا ہوگیا۔"

اسی طرح۔ "کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں"

کی شرح میں یوں فرمایا ہے: "آخر کے مصرع میں غضب کا تنافر ہے۔ تین کاف متحرک پے در پے جمع ہو گئے ہیں۔
پھر ایک جگہ

"جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی"

کے تحت میں فرمایا ہے: "(جو نہ نقد داغ) میں دو نونِ[1] متعاقب عیبِ تنافر رکھتے ہیں[2]"۔

مولانا حسرت نے اس سے بھی آگے بڑھ کر تنافر کی تعریف بیان کی ہے یعنی جو ایک قیدِ 'متحرک' کی تھی اُسے بھی نکال دیا جس سے تنافر کا میدان اور بھی وسیع اور شعر کا عرصہ تنگ سے تنگ تر ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔
"جب کسی شعر میں دو ایسے لفظ متصل آ جاتے ہیں جن میں سے پہلے لفظ کا حرفِ آخر وہی ہوتا ہے جو دوسرے لفظ کا حرفِ اول تو اِن دونوں حرفوں کے ایک ساتھ تلفظ میں ایک قسم کا ثقل اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام عیبِ تنافر ہے۔ اس سے ہر شاعر کو حتی الامکان احتراز لازم ہے۔"

اگر اس تعریف کے مطابق حافظ کے کلام سے مثالیں جمع کی جائیں تو اُن کی تعداد سیکڑوں سے گزر کر شاید ہزاروں تک پہنچے۔ اس لئے مولوی طبا طبائی مرحوم کے قول کے مطابق صرف متحرک حرفوں کے تنافر کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ دعویٰ میں نہیں کرتا کہ دیوان میں جتنی مثالیں ملتی ہیں اُن سب کے اِکٹھا کرنے میں مجھے کامیابی ہوئی ہے۔ سرسری نظر میں جو مثالیں مل گئیں اُن میں سے بھی کچھ کو چھوڑ دیا، پھر بھی اُن کی تعداد بہت ہو گئی۔ اس لئے ایسے لفظوں سے بحث نہیں کی جن پر بے یا نون داخل ہوا ہے؛ جیسے "بہ بوسے" یا "بہ بیں" یا "بہ بر" یا جیسے "نہ نمود"، "نہ نہاد" وغیرہ انھیں کے ساتھ ایسی مثالوں کو بھی حذف کر دیا جیسے:۔

"مگر بہ خواب بہ بینم خیالِ منظرِ دوست"

اس میں تین بیئیں جمع ہیں اور تینوں متحرک ہیں۔ "خواب" کی بے، اگرچہ اصل میں غیر متحرک ہے مگر اس شعر میں وزن کی بنا پر متحرک ہو گئی ہے اور یہ تینوں بیئیں یہاں اس طرح پڑھی جاتی ہیں: "بَ بَ بِی"۔

اب تنافر کی مثالیں حرف وار ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] مقصود ہے: "نونِ متحرک"۔ [2] اور دو متحرک والوں کا جمع ہونا مزید برآں۔ (ص)

ب (۱) غلام نرگسِ مستِ تو تاجدارانند — خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیارانند

(۲) کاروان رفت و تو در خواب و بیابان در پیش — کے روی رہ، زکہ پرسی چہ کنی چوں باشی؟

(۳) کلاہِ سروریت کج مباد بر سرِ حسن — کہ زیبِ بخت و سزاوارِ تخت و تاجِ زری

(۴) تا چند ہمچو چشمت در عینِ ناتوانی — تا چند ہمچو زلفت در تاب و بے قراری

ان چار شعروں میں یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ پہلے اور چوتھے شعر کے ہر مصرعے میں ایک اور باقی دونوں شعروں کے ایک ایک مصرعے میں دو دو تنافر ہیں:-

(۱) "تو تاج" اور "خرابِ بادہ" (۲) "رفت و تو" اور "خواب و بیابان"

(۳) "زیبِ بخت" اور "تخت و تاج" (۴) "ہمچو چشمت" اور "تاب و بے قراری"۔

ت (۵) با کہ این نکتہ توان گفت کہ آن سنگین دل — کشت مارا و دمِ عیسیِٔ مریم با اوست

(۶) تا مرا عشقِ تو تعلیمِ سخن گفتن داد — خلق را وردِ زبان مدحت و تحسینِ منست

(۷) دولتِ فقر، خدایا! بہ من ارزانی دار — کایں کرامت سببِ حشمت و تمکینِ منست

(۸) گل بر رخِ رنگینِ تو تا لطفِ عرق دید — در آتشِ رشک از غمِ دل غرقِ گلابست

(۹) راہِ تو چہ راہیست کہ از غایتِ تعظیم — دریائے محیطِ فلکش عینِ سرابست

(۱۰) کمینگہ است و تو خوش تیز می روی، ہشدار — مکن کہ گرد بر آید زشاہ رہِ عدمت

(۱۱) بیاضِ روئے تو روشن تر آمد از رخِ روز — سوادِ زلفِ تو تاریک تر زظلمتِ داج

(۱۲) خسروا حافظِ درگاہ نشیں فاتحہ خواند — وز زبانِ تو تمنائے دعائے دارد

(۱۳) کہ آگہست کہ کاؤس و کے کجا رفتند — کہ واقفست کہ چوں رفت تختِ جم بر باد

(۱۴) در ابروئے تو تیرِ نظر تا بہ گوشِ ہوش — آوارہ و کشیدہ و موقوفِ فرصتم

(۱۵) نقشِ خیالِ روئے تو تا وقتِ صبحدم — بر کارگاہ، دیدۂ بے خواب می زنم

(۱۶) دائم گلِ ایں بستاں سیراب نمی ماند — دریاب ضعیفاں را در وقتِ توانائی

(۱۷) آں کشیدم ز تو اے آتشِ ہجراں، کہ چو شمع — جز فنائے خودم از دستِ تو تدبیر نبود

(یہاں تین متحرک تیئیں جمع ہو گئی ہیں: " تِ تُ تَد ")

(۱۸-۲۰) جو چار شعر ب کے تحت میں درج ہو چکے اُن میں سے تین ت کے ذیل میں بھی آتے ہیں۔

ہ | (۲۱) در حلقۂ گل و مل خوش خواند دوش بلبل   ہاتِ الصبوح ہبّوا یا ایہا السکاریٰ

(۲۲) بہار شرحِ جمالِ تو دادہ در ہر فصل   بہشت ذکرِ جمیلِ تو کردہ در ہر باب

(۲۳) گر من آلودہ دامنم، چہ زیاں؟   ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

(۲۴) گفتم کہ حسنِ چہرۂ او را صفت کنم   او روئے خود نمود و درِ گفت و گو ببست

(۲۵) دانا چو دید بازیٔ ایں چرخِ حقہ باز   ہنگامہ باز چید و درِ گفت و گو ببست

(۲۶) مرا و مرغِ چمن را ز دل ببرد آرام   سحر گہاں کہ دلِ ہر دو در نوائے تو بست

(۲۷) اجر ہا باشدت، اے خسروِ شیریں دہناں!   گر نگاہے سوئے فرہادِ دل افتادہ کنی

(۲۸) طبیبِ راہ نشیں دردِ عشق نشناسد   برو، بہ دست کن، اے مردہ دل، مسیح دمے

(۲۹) بیار بادہ و بازم رہاں ز رنجوری   کہ ہم بہ بادہ تواں کرد دفعِ رنجوری

ایک شعر خاص توجہ چاہتا ہے۔ اُسے پڑھ کر تنافر کے ماننے والے ضرور کہیں گے بڑا ہی بُرا تنافر ہے کہ تنافر کی دو دالوں سے پہلے کئی اور دالیں بھی آگئی ہیں:-

(۳۰) حافظا! گر نہ دہد دادِ دلت آصفِ عہد   کام، دشوار بہ دست آوری از خود کامی

ج | (۳۱) اے صبا! بندگیٔ خواجہ جلال الدین کُن   تا جہاں پُر سمن و سوسنِ آزادہ کنی

(۳۲) تو بدیں نازکی و دلکشی، ای شمعِ چگل!   لائقِ بزمگہِ[1] خواجہ جلال الدینی

---

[1] "بزمگہ" پر اس زمانے کے محققوں کا یہ اعتراض ہوگا کہ "بزم" میں تو خود ہی "جگہ" کا مفہوم موجود ہے؛ اِس پر "گہ" کا اِضافہ غلط۔ خواجہ حافظ نے اور جگہ بھی یہ ترکیب استعمال کی ہے؛ جیسے:

کس ندانست کہ منزلگہِ مقصود کجاست

علامہ زمخشری نے ایک فرہنگ بھی لکھی تھی جس میں عربی لفظوں کے معنی فارسی میں لکھے ہیں۔ نام اس فرہنگ کا "مقدمۃ الادب" ہے (جو ۱۸۴۳ء میں لائپگ میں چھپی)۔ اس کے صفحہ ۱۲۱ اور ۱۲۲ میں مصطبہ کے معنے لکھے ہیں: "جائے غریباں، جایگاہ گدایاں، جایگاہ غریباں"۔ عرین کے مرادفات یوں لکھے ہیں "جایگاہ شیر، آرامگاہ شیر، خانۂ شیر"۔ اسی طرح "کرک جایگاہ، جایگاہ کرک، جایگاہ آہو، جایگاہ موچہ، جایگاہ گوسفنداں" وغیرہ۔ آگے چل کے "جائے سرائے، سرائے گاہ" اور اسی قسم کی اور ترکیبیں بھی ملتی ہیں۔

(٣٣) چو سرو، سرکشی، اے یارِ سنگدل! با ما — چہ چشمہاست کہ بر روئے ما ز اطراف است

(٣٤) در آستینِ مرقّع پیالہ پنہاں کن — کہ ہمچو چشمِ صراحی زمانہ خوں ریز است

(٣٥) بہ چہرۂ گلِ سوری نگاہ مے کردم — کہ بود در شبِ تاریک بہ روشنی چو چراغ

(٣٦) کجا روم، چہ کنم، چوں شوم، چہ چارہ کنم؟ — کہ گشتہ ام ز غم جورِ روزگار ملول

(٣٧) ع بہارِ توبہ شکن می رسد، چہ چارہ کنم؟

"چہ چارہ کنم" کی اور مثالیں چھوڑ دیں۔

(٣٨) برقِ غیرت چو چنیں می جہد از مکمنِ غیب — تو بفرما کہ منِ سوختہ خرمن چہ کنم

(٣٩) ع کز غنچہ چو گل خرم و خنداں بدر آئی۔

(٤٠) ع گرچہ چوں آفتاب مشہوری۔

ک | کاف کی مثالوں میں سے اُن کو خارج کر دیا ہے جن میں صرف کافِ بیانیہ کے باعث "تنافر" پیدا ہو گیا ہے۔ پھر بھی ملاحظہ ہو:۔

(٤١) میلِ من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق — ترکِ کامِ خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

(٤٢) ز خاکِ کوئے تو ہر گہ کہ دم زند حافظ — نسیمِ گلشنِ جاں در مشامِ ما افتد

(٤٣) نیازمندِ بلا گو رخ از غبار مشوئے — کہ کیمیائے مراد است خاکِ کوئے نیاز

گ | (٤٤) از تابِ آتشِ مے بر گردِ عارضش خوے — چوں قطرہ ہائے شبنم بر برگِ گل چکیدہ

(٤٥) کرا رسد کہ کند عیبِ دامنِ پاکت — کہ ہمچو قطرہ، کہ بر برگِ گل چکد، پاکی

(٤٦) سنگ و گل را کند از یمنِ نظر لعل و عقیق — ہر کہ قدرِ نفسِ بادِ یمانی دانست

م | "جامِ مے" اور "چشمِ میگوں" نہ ہو تو حافظ کے دیوان میں دھرا ہی کیا ہے؟ پھر بھلا میم کے "تنافر" کی مثالوں کی کیا کمی؟ اِس لئے اُن مثالوں کو چھوڑ دیا جن میں اس طرح کی ترکیبیں آ گئی ہیں یا جہاں صرف میمِ نہی کے باعث "تنافر" رونما ہوا ہے۔ مگر ایک غزل کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:۔

(٤٧-٥٠) ساقی بہ نورِ بادہ بیفروز جامِ ما ..... الخ

اِس گیارہ شعر کی غزل کا قافیہ "جام"، "نام" وغیرہ ہے اور ردیف "ما"۔ اِس طرح ساری غزل میں "م ما" کی بار ہی اور مقطع میں "قصدِ دامِ ما" نے دُہرا "تنافر" پیدا کر دیا ہے۔

(۵۹) ندانم از چہ سبب رنگِ آشنائی نیست — سہی قدانِ سیہ چشم ماہ سیما را

(۶۰) حکایتِ لبِ شیریں کلامِ فرہاد است — شکنجِ طرۂ لیلیٰ مقامِ مجنون است

(۶۱) ہمچو حافظ برغمِ مدعیاں — شعرِ رندانہ گفتنم ہوس است

(۶۲) ع دست از طلب نہ دارم تا کامِ من بر آید۔

(۶۳) دریں مقامِ مجازی بجز پیالہ مگیر — دریں سراچۂ بازیچہ غیرِ عشق مباز

(۶۴) مُہندسِ فلکی، راہِ دیرِ شش جہتی — چناں ببست کہ رہ نیست زیرِ دامِ مغاک

(۶۵) غلامِ مردمِ چشمم کہ با سیاہ دلی — ہزار قطرہ ببارد چو دردِ دل شمرم

(۶۶) عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش — تا تو دانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام

ن (۶۷) ع سنگ و گِل راکند از یمنِ نظر لعل و عقیق۔

نون کی مثالیں اور بھی ہیں مگر ایک ہی کفایت کرتی ہے۔

ر رے کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ یہاں صرف تھوڑی سی لکھی جاتی ہیں:۔

(۶۸) حافظا بے خور و رندی کن و خوش باش ولے — دامِ تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

(۶۹) ع ناامید از درِ رحمت مشو اے بادہ پرست!

(۷۰) ع شعرِ رندانہ گفتنم ہوس است۔

(۷۱) زمانہ افسرِ رندی نداد جز بکسے — کہ سرفرازیٔ عالم دریں کلہ دانست

(۷۲) در انتظارِ رویتِ ما و امیدواری — در عشوۂ وصالت ما و خیال و خوابے

ز زے کی بہت ساری مثالوں میں سے کچھ یہ ہیں:۔

(۷۳) ز زہدِ خشک ملولم بیار بادۂ ناب — کہ بوئے بادہ دماغم مدام تر دارد

(۷۴) چو جاں فدائے لبت شد خیال می بستم — کہ قطرۂ ز زلالش بہ کامِ ما افتد

(۷۵) بگفتمت کہ حذر کن ز زلفِ او، ای دل! — کہ می کشند دریں حلقہ باد در زنجیر

(۷۶) چو دل ز جوہرِ مہرِ تو صیقلے دارد — بود ز زنگِ حوادث ہر آئنہ مصقول

س (۷۷) دلم ز نرگسِ ساقی اماں نخواست بجاں — چرا کہ شیوۂ آں ترکِ دل سیہ دانست

(۷۸) حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاث دیں — خامش مشو کہ کارِ تو از نالہ می رود

ش (۷۹) غلامِ ہمتِ رندانِ بے سر و پایم — کہ ہر دو کوں نیرزد بہ پیشِ شاں یک کاہ

ف (۸۰) ع آوردہ و کشیدہ و موقوف فرستم۔

حروفِ حلقی اور ق کے "تنافر" کی مثالیں بھی موجود ہیں، حالانکہ اس قبیل کے حرف اوروں کے مقابلے میں ثقیل تر ہیں:۔

ح (۸۱) درچینِ زلف اے دلِ مسکیں! چگونہ؟ — کاشفتہ گفت بادِ صبا شرحِ حالِ تو

خ (۸۲) حافظ! آبِ رخِ خود بر درِ ہر سفلہ مریز — حاجت آں بہ کہ برِ قاضیٔ حاجات بریم

ع (۸۳) ز آفتابِ قدح ارتفاعِ عیش بگیر — چرا کہ طالعِ وقت آنچناں نہ می بینم

(۸۴) گفت: حافظ! الغز و نکتہ بہ یاراں مفروش — آہ ازیں لطف بہ انواعِ عتاب آلودہ

غ (۸۵) ماجرائے دلِ خوں گشتہ نہ گویم با کس — زانکہ جز تیغِ غمت نیست کسے دمسازم

ق (۸۶) حافظ! بزیرِ خرقہ قدح تا بہ کے کشی؟ — در بزمِ خواجہ پردہ ز کارت برافگنم

(۸۷) شد حلقہ قامتِ من، تا بعد ازیں رقیبت — زیں در دگر نراند ما را بہ ہیچ بابے

یہ بھی عام طور پر مانا جاتا ہے کہ جب دو قریب المخرج متحرک جمع ہو جائیں خاص کر وہ جن کا باہم تلفظ کرنا مشکل ہو تو بہت برا "تنافر" پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں بھی حافظ کے کلام میں ملتی ہیں؛ جیسے:۔

خ غ (۸۸) بہار و گل طرب انگیز گشت و توبہ شکن — بہ شادیٔ رخِ گل بیخِ غم ز دل برکن

خ گ (۸۹) اوپر والے شعر میں ایک دوسرا تنافر بھی ہے یعنی: "رخِ گل"۔

ق خ (۹۰) نگارِ خویش بہ دستِ خساں ہمی بینم — چنیں شناخت فلک حقِ خدمتِ چو منے

ک خ (۹۱) بہ نوکِ خامہ رقم کردہ سلامِ مرا — کہ کارخانۂ دوراں مباد بے رقمت

(۹۲) مدامِ خرقۂ حافظ بہ بادہ در گرو است ‌ ‌ ‌ مگر ز خاکِ خرابات بود فطرتِ او

ک ق | (۹۳) ع ہر کہ قدرِ نفسِ بادِ یمانی دانست۔

(۹۴) دلم بجو کہ قدت ہمچو سرو دلجو ہست ‌ ‌ ‌ سخن بگو کہ کلامت لطیف و موزون است

ق ک | (۹۵) دل کز ناوکِ مژگانِ تو در خون می‌گشت ‌ ‌ ‌ باز مشتاقِ کمانخانۂ ابروی تو بود

بعضے لوگ اسے بھی "تنافر" کہتے ہیں کہ ایک ہی مُرکب دو بار بغیر کسی حاجز کے آجائے یا ایک ہی حرف کئی بار آئے گو کہ بیچ میں کوئی خفیف حاجز بھی ہو اور اس میں حرکت کی بھی قید نہیں، جیسے :-

(۹۶) در آں غوغا کہ کس کس را نہ پرسد ‌ ‌ ‌ من از پیرِ مغاں منّت پذیرم

یہاں محض "کس کس" کو "تنافر" جانتے ۔ خواجہ حافظ نے اُس سے پہلے ایک "کہ" لاکر اُسے اور بھی "ثقیل" کر دیا

(۹۷) ہمچوں حباب دیدہ بروئے قدح کشا ‌ ‌ ‌ واین خانہ را قیاسِ اساس از حباب کن

"قیاسِ اساس" میں پہلے سینوں کی بھرمار ہی پھر زبر سے آکر آخر سین سے مل گئی ہے اور مخرج میں وہ سین سے بہت قریب ہے۔

اوپر جو مثالیں دی گئیں اُن میں بہت سی ایسی بھی ہیں کہ ایک شعر بلکہ ایک ہی مصرع میں ایک سے زیادہ صورتیں "تنافر" کی واقع ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

(۹۸) دو چشمِ مستِ تو آشوبِ جملہ ترکستان ‌ ‌ ‌ بچینِ زلفِ تو ماچین و ہند دادہ خراج

(۹۹) در ابروے تو تیرِ نظر تا بگوشِ ہوش ‌ ‌ ‌ آوردہ و کشیدہ و موقوفِ فرصتم

(۱۰۰) چو چشمِ من ہمہ شب جو بیار باغ بہشت ‌ ‌ ‌ خیالِ نرگسِ مستِ تو بیند اندر خواب

(۱۰۱) ع در عینِ گوشہ گیری بودم چو چشمِ مستت۔

(۱۰۲) تا چند ہمچو چشمت در عینِ ناتوانی ‌ ‌ ‌ تا چند ہمچو زلفت در تاب و بے قراری

(۱۰۳) خرم شد از ملاحتِ تو عہدِ دلبری ‌ ‌ ‌ فرخ شد از لطافتِ تو روزگارِ حسن

(۱۰۴) غمزۂ ساقی بہ یغمائے خرد آہیختہ تیغ ‌ ‌ ‌ زلفِ جاناں از برائے صیدِ دل گستردہ دام

(۱۰۵) بستہ ام در خمِ گیسوئے تو امیدِ دراز ‌ ‌ ‌ آں مبادا کہ کند دستِ طلب کوتاہم

(۱۰۶) بیاضِ روئے تو روشن تر آمد از رخِ روز — سوادِ زلفِ تو تاریک تر ز ظلمتِ داج

فارسی شاعری کو جس چیز نے تمام عالم کی شاعری سے ممتاز کیا، سب جانتے ہیں کہ غزل ہی؛ اور غزل کو جس نے غزل بنایا حافظ شیراز کی ذات ہی. کون نہیں مانتا کہ جو روانی، جو شیرینی، جیسی برجستگی، جیسی شگفتگی حافظ کے کلام میں ہی کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ فصاحت اور بلاغت، شوخی اور متانت حافظ ہی کے فقروں میں اپنے کمال کو پہنچی ہیں۔ اس کا اعتراف حافظ کے ہم وطنوں ہی نے نہیں کیا ہی بلکہ غیر قوموں اور دور دراز ملکوں کے جوہر شناس بھی اُس کی ثناخوانی میں پیش پیش ہیں۔

گوئٹے جرمانیا کا بڑا فلسفی اور سب سے بڑا شاعر تھا۔ انگریز اُسے اپنے شیکسپیر سے بڑا کا ہیکو جانیں گے، شیکسپیر کے بعد اُسے سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ گوئٹے فارسی زبان میں مہارت نہ رکھتا تھا، پھر بھی دیوان حافظ کے جرمانی ترجمے ہی کو پڑھ کر ایسا گرویدہ ہوا کہ کچھ نظمیں لکھیں جن میں حافظ کی پیروی اپنی زبان میں کی ہے۔ ان نظموں کے مجموعے کا نام "مغرب کا مشرقی دیوان"[1] رکھا ہی جس کے بارہ حصے ہیں اور ہر حصے کا نام بھی فارسی رکھا ہی، جیسے "مغنّی نامہ" "عشق نامہ"، "رنج نامہ"، "حکمت نامہ"، "زلیخا نامہ"، "ساقی نامہ" وغیرہ۔ انھیں میں ایک "حافظ نامہ" ہے جسے عقیدت نامہ کہنا چاہیے۔ لفظ لفظ سے ارادت اور عقیدت ٹپکتی ہے اور یہی معلوم ہوتا ہی کہ ایک دلدادہ مرید اپنے پیر کی مدح و ثنا کر رہا ہی۔ حافظ نامے کے عنوان پر جو قطعہ ہی اُس کا وزن اور قافیے سے آزاد ترجمہ یہ ہی:۔

"لفظ کو دُلھن فرض کیجئے،
معنی کو دولھا؛
اس بیاہ کو وہی جانتا ہے،
جو حافظ کا قدر شناس ہے"۔

ایک جگہ کہتا ہی کہ میں تیرا تتبع کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ کامیاب ہوں گا مگر آگے ہی نظم میں ہاری مان کے کہتا ہے:۔

---

[1] یہ گوئٹے کے آخری زمانے کی تصنیف ہی اور پہلے پہل ۱۸۱۹ عیسوی میں، شاعر کے مرنے سے تیرہ برس پہلے، شائع ہوئی۔

"تیری، حافظ، برابری کرنا ہی جنوں، اور جنوں بھی کیسا کچھ!"

کیا یہ وہی حافظ ہے جس کے کلام میں اتنے بہت سے عیب اوپر گنائے جا چکے ہیں؟ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ کوئی اور حافظ ہے یا جسے ہم عیب کہتے ہیں وہ عیب نہیں۔

پہلی بات کو تو کوئی نہ مانے گا، مگر ہاں کچھ لوگ ضرور کہہ اٹھیں گے کہ "حافظ نے یوں نہ کہا ہوگا کاتبوں نے کچھ کا کچھ کر دیا"۔ اللہ بخشے، مرزا غالب کی "قاطع برہان" کے جواب میں جب کسی مخالف نے برہان کے قول کی تائید میں خاقانی یا عرفی کا کوئی شعر پیش کیا اور حضرت نے کوئی مفر نہ دیکھا تو فرمایا کہ "اصل متن تو یوں تھا کاتبوں کی تصحیف سے لفظ کی صورت اور ہو گئی۔ اب خاقانی [یا عرفی] کو کہاں سے لاؤں کہ پوچھوں بھائی تو نے کیا لکھا تھا؟" انھیں حضرات کے ڈر سے اس مقالے میں یہ التزام کیا گیا کہ فارسی کے سب سے بڑے شاعر کے دیوان سے (جس کا حجم بھی زیادہ نہیں)، ہر عیب کی مثالیں کثرت سے دے دی جائیں تاکہ کاتب بیچارے کی گلو خلاصی ہو جائے۔ مثالوں کی کثرت سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ضرورت شعری کا شبہ نہ رہے گا جس کا بہانہ لوگ موقع بے موقع کر دیا کرتے ہیں۔

دوسری بات کے ماننے پر کچھ لوگ ضرور آمادہ ہوں گے مگر ان "کچھ" میں بھی کئی گروہ یا مذہب ہوں گے۔ بعضے کہیں گے کہ ہاں بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے مگر جن کتابوں میں فصاحت کے اصول بتائے گئے ہیں وہ بھی تو مستند کتابیں ہیں۔ بعضوں کے دل میں چور ہوگا کہ کہیں اس بحث میں کوئی سید احمد خانی مغالطہ تو مضمر نہیں۔ بعضے کہیں گے کہ ہمارے "استاد" نے، جن کا اس زمانے میں تو کوئی شاعر مدمقابل نہیں ہے، یوں ہی بتایا ہے کہ ان عیبوں سے اپنے کلام کو پاک رکھنا۔ "حضرات اساتذہ" فرمائیں گے کہ جن لوگوں نے معائبِ سخن کی تعریف کی ہے وہ وہ ہیں کہ عمریں صرف کر کے کلام کے حسن و قبح کو پرکھا اور فن کے اصول قائم کئے ہیں۔ یہ کہیں غلط ہو سکتے ہیں؟ اگر کسی شاعر نے غلطی کی ہے تو کیا ضرور کہ ہم بھی غلطی کریں؟

خلاصہ یہ کہ فصاحت بلاغت کا ہیکو ایک اچھا خاصا خلفشار ہے جس سے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل نہیں۔ اس معمے کا حل اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اُن عیبوں پر پھر ایک غائر نظر ڈالئے اور اُن کی ابتدا و حقیقت کا سراغ لگائیے۔

(۱) حرف کا دب کر نکلنا اردو شاعروں کے نزدیک بڑا عیب ہے مگر اس عیب کے حدود معین نہیں جہاں استاد اصلاح دے دیتا ہے مان لی جاتی ہے۔ جہاں شاگرد کے شعر میں اصلاح دی سمجھا گیا کہ یہاں حرف نہیں دبتا

اس کے حدود آسانی سے معین کئے جاسکتے ہیں یقین ہی کہ اساتذہ اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

(۲) اب مختفی ہے کے مسئلے کو لیجئے۔ یہ ایک حرف ہی جو فارسی کے ساتھ مخصوص ہی۔ سب کو معلوم ہی کہ فارسی لفظوں کا آخر حرف عموماً ساکن ہوتا ہی مگر بعضے لفظ ایک ہی ایک حرف کے تھے اور اُس حرف پر ایک حرکت جیسے چِ، کِ، دُ، تُ (یعنی چہ، کہ، دو، تو)۔ کتابت میں ان کی حرکت کے ظاہر کرنے کو اور ان کو لفظ کی سی صورت اور حیثیت دینے کی غرض سے زیر کے لئے ایک ے، پیش کے لئے ایک واو بڑھا کر ان لفظوں کو کم سے کم کتابت میں دو حرفی کر دیا تھا، چنانچہ پرانی قلمی کتابوں میں "چی" اور "کی" ہی ملتا ہی "دو" اور "تو" وغیرہ میں واو تو اب تک لکھا جاتا ہی؛ زیر کے لئے پرانا (یعنی ے والا) رسم خط بدل کر ایک ہے لکھنے لگے کہ پڑھنے اور بولنے میں ہے کی آواز مطلق نہیں نکلتی بلکہ محض حرکت کا فائدہ اُس سے حاصل ہوتا ہے۔ زیر کے لئے بھی یہی ہے ہمیشہ سے استعمال ہوتی ہی۔

اسم مفعول کا صیغہ اور کچھ اسم جامد ایسے تھے کہ اُن کے آخر میں کاف تھا مگر یہ اسلام سے بہت پہلے کی فارسی زبان میں تھا۔ یہ کاف رفتہ رفتہ گاف ہوگیا چنانچہ ساسانی زمانے کی فارسی میں؛ جو عام طور پر پہلوی کے نام سے مشہور ہی؛ یہ گ بولا جاتا تھا (کتابت میں کاف اور گاف کی شکل میں کوئی امتیاز نہ تھا) یہ گاف آگے چل کر لفظوں کے اواخر سے گر گیا مگر اُس کے ماقبل کی حرکت باقی رہی۔ کتابت میں حرکت کا اظہار مشکل تھا اِس مشکل کو ہائے مختفی نے حل کیا۔

اِس حقیقت پر نظر کرکے یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہی کہ اُسے کھینچ کر الف کے برابر نہ کر دینا چاہیے۔ مگر یہ بات یوں طے نہیں ہوسکتی۔ دیکھنا یہ ہی کہ ایران والے محض حرکت کو کھینچ کر بولتے ہیں یا نہیں۔

اِس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اضافت کے کسرے کو نظم میں کبھی بقدر ایک حرکت کے اور کبھی بقدر ایک پوری ے کے ادا کرتے ہیں اور نثر میں بھی جب کسی لفظ یا اُس کے کسی جُز پر زور دینا مقصود ہوتا ہی حرکت کھینچ کر ایک پورا حرف علت ہو جاتی ہی۔

یہی حال "تو" "دو" وغیرہ کا ہی ضمے کو کھینچ کر پورا حرف کر دینا نہ صرف جائز بلکہ زبان کی ضروریات میں سے ہی۔ پس جب ہائے مختفی محض ایک حرکت ہی تو اُس کو الف یا ے کی طرح ادا کرنا نہ عیب ہی نہ ناجائز۔

مولانا علی حیدر طباطبائی مرحوم نے اکتوبر ۱۹۳۱ء کے رسالۂ "زمانہ" میں ایک مدلل مضمون اس خاص بحث

میں شائع کیا تھا جس میں لکھتے ہیں کہ یہ محض توہم ہے حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔

(۳) اِضافت کی حالت میں یائے معروف کا مشدّد ہو کر پڑھا جانا اس میں بھی لوگوں نے سخت غلطی کی ہے کہ ایسے محل پر "ے" کو مشددمان کر "ے" ساکن "ے" کا متناقض ٹھہراتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ ارشاد ہے کہ "ے" دبنے نہ پائے دوسری طرف یہ کہ جب "ے" کو پورا کھینچ کر پڑھیے اور اُس کی اضافت کے کسرے کو ایک حرکت ہی کی حد تک رکھئے تو فوراً اعتراض ہوگا کہ "واہ! "ے" مشدّد ہوگئی"۔

کوئی ان حضرات سے یہ تو پوچھے کہ تشدید کے اجزا کیا ہیں؟ بتدی بھی جانتا ہے کہ مشدّد حرف کے دو ٹکڑے کئے جاتے ہیں اور ان میں سے پہلا ساکن، دوسرا متحرک ہوتا ہے؛ اور متحرّک کا طول ساکن (حرفِ علت) کے طول کا نصف ہوتا ہے۔ "ے" جو لفظ کے آخر میں ہوگی۔ ساکن ہی تو ہوگی؛ پس پوری پڑھی جائے گی۔ اُس کے بعد کسرۂ اضافت (یا ہمزۂ اضافت) کو کھینچنا ممکن بھی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ہمارے اہلِ فن کے اعتراضوں کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ کے آخر کی معروف "ے" کو زبان سے خارج ہی کردو، اِس لئے کہ

"دستم اندر ساعدِ ساقیِّ سیمیں ساق بود"

میں "ساقی" کی "ے" مشدّد ہوگئی اور

"مرا بہ بندگیِ خواجۂ جہاں انداخت"

میں "بندگی" کی "ے" دب گئی۔ اب شاعر بیچارہ اگر احتیاط کرتا ہے تو چاہیئے کہ اپنے کلام میں "ے" اور کسرۂ اضافت کو جمع نہ ہونے دے۔ بھلا اس پر کون شاعر راضی ہوگا؟

یہ حقیقت ہے سید انشا کے اعتراض کی۔ اُن کا منشا تو یوں پورا ہو گیا کہ مدِّ مقابل کو مشاعرے کے میدان میں پچھاڑ دیا۔ خوب جانتے تھے کہ یہ جادو چل جائے گا۔ چنانچہ چل گیا مگر لوگوں کو گمراہ کر گیا۔ اور یہ نہ کرتا تو پھر جادو کیسا؟

اس سلسلے میں ایک یہ بات بھی عرض کرنے کے قابل ہے کہ قدیم فارسی کتابوں میں اس تشدید کو کہیں منع نہیں لکھا ہے، نہ حرف کے دب کر نکلنے کو عیب قرار دیا ہے، بلکہ ان چیزوں کو زیادہ تر شاعر کی نادانی اور حسنِ مذاق پر چھوڑ دیا ہے۔ پھر جب حافظ کا حسنِ مذاق اُسے گوارا ہی نہیں پسند کرتا ہے تو اُس کے غلط یا مُخلّ فصاحت ہونے کا کیا ذکر؟

حالی کے حضور میں

مزاجِ ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوائے او بجاں ہا افگند شورے کہ من دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم

اقبال

۳۴۶ء

تاثرات

حیا پہ حسن کی نہ جا، نظر سے آشکار ہے
کہ عشق پاکباز کا اسے بھی اعتبار ہے

قدم قدم پہ محویت، قدم قدم پہ رفتگی
وہ کیسا ہوگا آستاں یہ جس کی رہگزار ہے

بتنگ اپنے زیست سے چلا تھا سن کے بوالہوس
کہ صیدگاہِ عشق میں اجل زبوں شکار ہے

بہ احترام عشق ہی بہ اعتبارِ عاشقی
ہزار جبر سہتے ہیں، ہزار اختیار ہے

دلیلِ نقصِ عشق کیا، بتاؤں میں تمہیں اثر
تمیز رہ گئی اگر، یہ خوش وہ ناگوار ہے

جعفر علی خاں اثر

غزل

برقِ ادا نہ رک سکی سینۂ موجِ نور میں
فطرتِ اضطرابِ دل آ ہی گئی ظہور میں

کس کی صلائے دید ہے، نغمۂ نفخ صور میں
اہلِ نظر کی عید ہے عرصہ گہِ نشور میں

جلوہ ترا وہی سہی شانِ شہود ہے جدا
فرق ہے عرش و فرش کا وادیِ قلب و طور میں

لاکھ گناہگار ہوں، حسن کا رازدار ہوں
عکسِ کمالِ یار ہوں، آئینۂ قصور میں

حسن کا نقش لم یزل برگِ گل و گیاہ پر
عشق کی صوتِ سرمدی زمزمۂ طیور میں

شیخ کی شانِ زہد ہے پردۂ رند مشربی
ورنہ یہ جوشِ طبع کیوں ذکرِ جمالِ حور میں

لاکھ کوئی ابا کرے، فیضِ ازل کو کیا کرے
ذوقِ سجود ہے نہاں ہر سرِ پُرغرور میں

تیرا کمال جلوہ زن، تیرا جمال ضوفگن
ہے ہر ایک نقص میں تیرے ہر اک قصور میں

اقبال احمد سہیل

حالی ایک محبِ وطن کی حیثیت سے

(از ڈاکٹر ذاکر حسین ایم۔ اے (علیگ)، پی ایچ ڈی (برلن)

مجھے حکم ہوا ہی کہ حالی صدی کے اس مبارک جشن کے موقع پر حالی کے محبِ وطن ہونے کے متعلق کچھ عرض کروں۔ دنیا کے جن ملکوں کا حال کچھ بھی ہم جیسا رہا ہی ان کے ممتاز محبانِ وطن کا خیال آتے ہی سولی کے تختے، پھانسی کی رسی محبس کی تیرہ و تار کوٹھریوں اور سلاسل کی جھنکار، تنہائیوں اور رسوائیوں، ناکامیوں اور بدنامیوں، دشت نوردی اور آبلہ پائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہی کہ حالی اس قسم کے محبِ وطن نہ تھے۔

پھر محبانِ وطن کی وہ صف سامنے آتی ہے جنھوں نے اپنے وطن کی خاطر دوسروں کے وطن فتح کئے، اپنی آزادی کو مستحکم کرنے کے لئے دوسروں کی آزادی سلب کی، اپنے دیس کی رونق کے لئے دوسرے دیسوں میں خون کی ندیاں بہائیں، اپنوں کے عیش و آرام کے لئے دوسروں کو بے گھر بے در کیا، اپنی تہذیب کو ترقی دینے کے واسطے دوسروں کے تمدن تباہ و برباد کئے؛ حالی ان محبانِ وطن میں بھی نہ تھے۔

ان عملی لوگوں کو چھوڑ کر اہلِ فکر میں محبانِ وطن کو تلاش کیجئے تو بڑے بڑے بلند پایہ ادیب اور شاعر اور فلسفی ملیں گے، اپنی خاکِ وطن کا جن کو ہر ذرہ دیوتا ہے، جن کے نظامِ اخلاق میں وطن قدرِ اعلیٰ ہی اور وطن کا مفاد حق و باطل، خیر و شر کا معیار ہے، جنھیں اپنی ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کا سب کچھ برا۔ حالی ان محبانِ وطن میں بھی نہ تھے

اور کیا تعجب ہی؟ حالی غریب جان دیتا تو کس وطن کے لئے، یا دوسروں کی جان لیتا تو کس کی خاطر، اور جب وطن کا وجود ہی نہ تھا اس کے مفاد کو معیارِ خیر و شر بنانا چاہتا بھی تو کیسے بناتا۔ حالی نے جس وطن میں زندگی شروع کی وہ زیادہ سے زیادہ ایک جغرافیائی تصور تھا۔ اس کے باشندوں میں نہ کوئی اتحادِ مقاصد تھا، نہ یکجہتی اغراض، نہ کوئی مشترک مطمحِ نظر تھا، نہ کوئی سیاسی تنظیم۔ حالی کے نسل کے لوگوں کا کام پہلے تو وطن کو وجود میں لانا تھا کہ یہ جب محفل میں آئے تو محفل ہی درہم برہم ہو چکی تھی۔ انحطاط و انتشار کے آثار مدتوں سے موجود تھے پر ۵۷ء کے انقلاب نے بساط ہی الٹ دی۔ مدت کے فتنہ و فساد کی مصیبت کے بعد امن و آشتی کا منہ دیکھا تو اس سے کیوں متاثر نہ ہوتے اور اس خلفشار کے بعد اس امن کو قومی شیرازہ بندی کی مہلت کیوں نہ سمجھتے؟

حالی نے بھی اپنے مرشد سید احمد خاں اور دوسرے ممتاز ساتھیوں کی طرح انگریزی تسلط کو اسی نظر سے دیکھا۔
اسی لئے اس پر اطمینان کا اظہار اور اسی وجہ سے اس کے ساتھ تعاون کی تلقین کی۔ میرا خیال ہے کہ اگر حالی آج زندہ ہوتے تو بھی برطانیہ اور ہندوستان کے اس تعلق کو جو اس ہنگامہ خیز عہد میں پہلی مرتبہ مستحکم ہوا تھا اچھا ہی جانتے اور ذمہ داری اور وفاق کی خوش آیند توقعات کی وجہ سے وہ حالات کے تغیر کے باوجود بھی شاید دونوں قوموں کے لئے اس تعلق کے برقرار رہنے کے متمنی ہوتے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ان توقعات کے پورا ہونے کے قرائن نہ ہوتے اور محکومیت مطلق کی جگہ شریک حکومت ہونے کی امید قوی نہ ہوتی جاتی تو حالی کا وطن دوست دل اس تعلق کی ذلت کے احساس سے خالی اور اس کی زبان اس احساس کے اظہار سے محترز نہ رہتی۔ اس لئے کہ اس وقت بھی جب اور سب کو اس تعلق کے برکات ہی نظر آتے تھے اور خود حالی کی عقل اس تعلق کے افادہ کی مقر تھی، اس کے دل میں ضرور ایک کانٹا سا کھٹکتا تھا، جس کے دکھ کا اظہار عقل کی پاسبانی کے باعث رک رک کر ہی سہی مگر ہوتا ضرور تھا۔

آپ ان کے کلام کو غور سے پڑھئے۔ جا بجا اور اکثر غیر متوقع طور پر ایسے شعر ملیں گے جن میں صاف اس تکلیف کا اظہار ہوتا ہے۔ کالے اور گورے کی صحت کے طبی امتحان والا قطعہ آپ سب نے پڑھا ہوگا۔ دو شخص ایک کالا، ایک گورا سول سرجن کے پاس بیماری کا صداقت نامہ لینے جا رہے ہیں۔ راستہ میں تکرار ہو گئی، گورے نے کالے کو مارا، کالا غریب بیہوش ہو گیا۔ ڈولی میں پڑ کر ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ گورا یوں ہی پہنچا۔ دونوں نے ڈاکٹر صاحب سے روئداد بیان کی تو انھوں نے

دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیق مرض	اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے	کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے "تم کو مل نہیں سکتی سند	کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو یہ ظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے	آئے یا یا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

دیوان میں غزلیں پڑھتے پڑھتے یہ شعر سامنے آجائے کہ

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا	دیکھا ہی ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

یا یہ:-

داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
تبلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

تو آپ کیا سمجھیں گے؟

زمزمۂ قیصری کے نام سے جو ایک انگریزی نظم کا ترجمہ کیا ہے اس کے ایک طویل حاشیہ میں کس دکھ کے ساتھ اس بربادی کا ذکر کیا ہے جو متمدن مغربی اقوام کے ہاتھوں اکثر غیر یورپی ممالک میں برپا ہوئی۔ لکھتے لکھتے یہ کہکر کہ کسی نے کیا خوب کہا ہے، خود اپنے دو شعر نقل کرتے ہیں:-

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گلچینی ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی!

تدبیر قیام سلطنت والا قطعہ پڑھئے کہ

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پانوں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو

اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو

پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اسے، اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو

کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی نظر ہماری سیاسی بے بسی کے ان گوشوں سے بے خبر نہ تھی اور اس کا دل تعبد کی ان تکلیفوں سے نا آشنا نہ تھا۔ مگر حالی کی زندگی اور حالی کی تصانیف پر غور سے نظر ڈالئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ عنصر ان کے حبِ وطن کے جذبہ میں کچھ بہت اہم اور موثر جزو نہ تھا۔

جذبہ حب وطن کا یہ پہلو اکثر نہایت شدید قسم کی منفی کیفیات نفسی پیدا کر دیتا ہے، حالات سے بیزاری یا تو رد عمل، غصہ کی شکل اختیار کر کے ہر نئی چیز سے انکار اور نفرت کو سب مشکلوں کا حل بتانے لگتی ہے، یا اگر قوائے عمل شل نہیں ہوئے ہیں تو نجات کے لئے تخریب کی راہ سجھاتی ہے۔ اچھے اچھے اس کا شکار ہو کر بے اثر و بے نتیجہ زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ یہ کڑھتے اور جلتے ہیں مگر وطن کے دل کو ان سے کوئی ٹھنڈک نہیں ملتی؛ یہ غصہ اور نفرت میں اپنا خون سکھاتے

ہیں، پر اس سے وطن کی رگوں میں خون نہیں دوڑنے لگتا؛ یہ اپنی سمجھ میں وطن کے لئے جان کھپاتے ہیں پر وطن کی روح کو اس سے بالیدگی حاصل نہیں ہوتی۔ اپنا تو کوئی عیب انھیں دکھائی دیتا نہیں، اور سب عیبوں کا ذمہ دار دوسرے کو ٹھہراکر اپنی اصلاح کی تدبیر کیسے نکل سکتی ہے؟ حقیقت کی ناگواری اور تلخی سے بھاگ کر یہ اپنی تنہائیوں میں دور دور کے منصوبے گانٹھتے ہیں۔ حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں، انقلاب کے خاکے بناتے ہیں اور یوں آج کے کام کو ان منصوبوں کی موہوم تکمیل تک کے لئے ٹالنے کا عذر نکال لیتے ہیں۔ وطن چٹنی روٹی کو ترستا ہے اور یہ اپنے خیالی پلاؤ سے اس کی ضیافت کرتے ہیں۔ حالی ان لوگوں میں نہ تھے۔

وہ ان میں تھے جن کی طبیعت میں مصائب و آلام سے غصہ کی آگ کی جگہ سوز دل کی دھیمی دھیمی گرمی اور درد کی میٹھی میٹھی کسک پیدا ہوتی ہے؛ دوسروں سے نفرت کی جگہ اپنوں سے محبت بڑھتی ہے؛ جو بے صبری سے جھلانے اور بپھرنے کی جگہ سعی پیہم کا عزم کرتے ہیں؛ جو تخریب کی سہل اور ڈھلواں سڑک کی جگہ تعمیر کی دشوار گزار راہ اختیار کرتے ہیں؛ اور دور دراز کار اگرچہ بظاہر شاندار منصوبوں کی خیالی تخلیق کی جگہ ان پیش پا افتادہ اور بظاہر حقیر کاموں کو پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں جو ان منصوبوں کے روبراہ آنے کی شرط اول ہیں۔ جو ہمہ گیر سیاسی اور معاشی اداروں کو قوم کی عام اخلاقی اور ذہنی حالت کا آئینہ دار سمجھتے ہیں، اس لئے ان اداروں میں تغیر سے پہلے اس اخلاقی اور ذہنی حالت کو بدلنا ضروری خیال کرتے ہیں؛ جو نئی دنیا کے بنانے کے لئے نئے آدم کی تخلیق اور نئی تعمیر کے لئے نئے معماروں کی تربیت لازمی جانتے ہیں؛ جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں کہ بظاہر عظیم الشان ادارے اخلاقی احساس کی کمزوری سے دیکھتے دیکھتے متزلزل ہو جاتے ہیں اور بظاہر کمزور اخلاقی قوتیں اپنی غیر منطقی توسیعی صلاحیتوں کے باعث عظیم الشان اور غیر متوقع تبدیلیاں پیدا کرسکتی ہیں۔ خوب کہا ہے:

نہ عیش کیخسروی رہے گا، نہ صولت بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دئے کی کچھ روشنی رہے گی

اگر مزاجوں اور طبیعتوں کی یہ تقسیم جو ہم نے بیان کی ذہن نشیں ہو جائے تو حالی کو بہ حیثیت محب وطن سمجھنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے کہ حب وطن کا جذبہ ان مختلف المزاج لوگوں میں الگ الگ شکلیں اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ حالی نے جب اپنے وطن کو انتہائی انحطاط اور انتشار کے عالم میں دیکھا، خصوصاً ۱۸۵۷ء کے ابتلاء عظیم میں جیسے

ایک جگہ "دریائے عتاب ذوالجلال کی موجزنی" اور ایک جگہ "نظم عالم میں خلل" سے تعبیر کیا ہے جب ان سب چیزوں کو جوان میں عزیز تھیں درہم و برہم ہوتے دیکھا، اور اس حالت کا خود مشاہدہ کیا کہ "نفسی نفسی کا تھا حب چاروں طرف غل پڑ رہا...... اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا- باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا-

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا سب کو خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلہ سے کہیں سب خشک و تر

اور اس ہنگامہ میں جسے بعض لوگ نادانی سے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کہتے ہیں اور بعض غدر، اس نے خود غرضی و نفس پرستی، بے ترتیبی اور بدنظمی کا مایوس کن منظر دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو بہائے اور دوسری طرف ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کی آمد آمد کا شور سُنا، اس نووارد کے بے حساب مادی وسائل دیکھے اور ان مادی قوتوں کی مستحکم علمی اور اخلاقی بنیادوں کو سمجھا تو اس کا دل کانپ اُٹھا کہ یہ اس کے وطن کے لئے جینے مرنے کی بات تھی، نہ جانے وطن اس حادثہ سے جانبر ہوگا کہ نہیں- ایک جگہ لکھا ہے:-

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو، شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آرہی ہے روشنی مغرب سے اک اُٹھتی نظر
رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

انھیں غافلوں میں حالی کا وطن بھی تھا! مگر حالی کا وطن تھا کیا ؟ پہلے تو حالی کا وطن ان کا گھر اور کنبہ پانی پت تھا جس کے ساتھ ان کی شیفتگی کا حال میں پانی پت میں کیا سناؤں، یہ محبت ایسی تھی کہ دلی کی محبت بھی ان سے پانی پت نہ چھڑا سکی- اس کے بعد حالی کا وطن بڑھ کر دہلی ہوا جس کا ذکر جہاں کرتے ہیں تو اس طرح کہ سخت سے سخت دل پسیج جائے:-

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینہ میں بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

مگر سلطنتوں کی فکر، حکومت کی تبدیلی، تمدنوں کے تصادم نے اس کے وطن کے تصور کو وسیع کیا اور اب ہندوستان اس کا وطن ہو گیا۔ اس کے کوہ و صحرا و آسمان و زمین اس کی دل لگی کی شکلیں بنیں، وہ اس کے عنادل کے نغمہ سحری اور اس کی تاروں بھری راتوں کو یاد کرتا، اس کی خاک کو پاک جانتا، یہاں تک کہتا ہے ۔

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

اور کیوں نہ ہوتا۔ جو شاعر داخلیت سے بچکر اپنے ماحول سے چاہے وہ طبیعی ماحول ہو چاہے تاریخی اپنے فن کا مسالہ حاصل کرتا ہے اس کے لئے وطن کی یہ دل پسند چیزیں اور بھی دلربا ہو جاتی ہیں۔ لیکن حالی پانی پتی، حالی دہلوی، بس خاک پاک ہند کے مظاہر مادی پر رک نہ گئے۔ کہ وطن کو بہ حیثیت قطعہ زمین محبوب بنانے سے ہی، اور خاک وطن کے ذرہ ذرہ کو دیوتا مان لینے سے ہی اس وطنیت کی بنیاد پڑتی ہے جو ایک غیر عقلی مذہب بنکر دوسروں کے وطن سے نفرت اور دوسرے دیس والوں سے جدال و قتال کی طرح ڈالتی ہے۔ حالی مسلم تھے اور اسلام کی عالمگیر برادری کی ہوا لگنے کے بعد اس تنگ وطنیت کا زہر اثر نہیں کرتا۔ حالی نے اس اگلی وطن پرستی کے حق نما مظہر میں بھی خود پرستی و خود غرضی کے پوشیدہ جھوٹ کو پہچان لیا۔ اور ان گھر کی چوکھٹ کے چومنے والوں کے لئے وہ صحیح تصور قایم کیا جس میں وطن کے معنی اہلِ وطن کی بے غرض خدمت اور بے لاگ سیوا کے ہیں کہ پہلی وطنیت تو انسان اور حیوان میں مشترک ہے اور دوسری وطن دوستی انسان کا امتیازی شرف۔ میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان کے ادب میں پہلی مرتبہ حالی ہی نے حبِ وطن کے اس صحیح تصور کی تلقین کی ہے۔ اور انفرادی اغراض کی بندگی کے ظلمت کدہ میں بے لوث جماعتی خدمت کا دیا انھیں نے روشن کیا ہے۔ اور جب تک ہمارے دیس کی مشترکہ قومی زبان اردو زندہ ہے اس کی نظر فروز روشنی میں صحیح حبِ وطن کی راہ ہندیوں کو ملتی رہے گی۔ وطن کے مظاہر مادی کی محبت کا اظہار نہایت دلکش انداز میں کرتے کرتے ٹھٹکتا ہے جیسے کسی نے غلطی پر ٹوک دیا ہو، اور کہتا ہے

اے شرابِ خودی کے متوالے گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے
نام کیا ہے اسی کا حبِ وطن جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
کیا وطن کی یہی محبت ہے یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے

....

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں سوکھ جاتے ہیں دکھ فرقت میں

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
گائے یا بھینس اونٹ یا بکری اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہیئے حب وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

پھر کس وضاحت سے خدمت قوم کا مرادف بتاکر اس حب وطن کو ممتاز کیا ہے جو انسان کا مخصوص شرف ہے۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

اور یہی نہیں کہ وطن کے مادی جغرافی تصور سے آگے بڑھکر حالی نے اس کا ایک انسانی تصور قائم کیا بلکہ اس انسانی تصور کی امکانی تنگیوں سے بھی اسے منزہ کر دیا ہے۔ حالی جب قوم کی خدمت کو وطن کی محبت بتاتا ہے تو اس کی قوم صرف نفع جو مالداروں اور سرمایہ داروں کا گروہ نہیں ہوتا جو جونک کی طرح دوسرے طبقوں کا خون چوسیں، نہ صرف ان غریبوں کا جو سب سے جلنا اور اپنے سوا سب کو گالیاں دینا ضروری سمجھتے ہیں، اس کی قوم خالی مسلمان نہیں نہ صرف ہندو، بلکہ دینی اور معاشی امتیازات و تفریقات سے بری وہ سب کی خدمت کی تلقین کرتا ہے اور یہ اس تصور کی وہ بلندی ہے جس تک ہمارے ملک میں عمل تو کیا خیال بھی خال خال ہی پہنچا ہے۔ کہتا ہے:

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب عمدہ کوئی تم پوشاک کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
نوکروں کی تمہارے ہے جو غذا ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے چلتے ہو — وہاں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی — جن پہ بیتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ — کہ ہی اُترن تمہاری جن کا بناؤ

. . . .

مقبلو مدبروں کو یاد کرو — خوش دلو غم زدوں کو یاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

ایک اور جگہ اسی چیز کو یوں لکھتے ہیں :۔

ان کی کیا عزت ہی یارو قوم ہے جن کی ذلیل — ان کو کیا راحت ہے جن کی قوم ہو سب خستہ حال
ہو وہ ایسا غول میں قلیوں کے جیسے ایک میٹ — ہی ہزاروں مفلسوں میں ایک اگر آسودہ حال
شال گدڑی سے وہاں سو مرتبہ بدتر جہاں — ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کاندھے پہ شال
کہتے ہیں غیر اس کو ہم جنسوں میں اُجلا دیکھکر — یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال

اور یہی نہیں کہ حالی نے قوم کے وسیع تصور میں صرف امیر وغریب ہی کو شامل کیا ہو اور دل میں چور رکھنے والے سمجھیں کہ اس سے مراد بس مسلمان امیر وغریب ہیں، حالی مسلمانوں کی قوم میں تو طبقات معاشی کو ضرور قریب ترلانا چاہتے تھے مگر ایک ہندوستانی قوم کا تصور ان کے ذہن میں نہ تھا۔ سچ پوچھو تو یہ خیال خود ہمارے دل کے میل کا پتہ دیتا ہی، حالی کا شیشۂ دل ان کدورتوں سے پاک تھا۔ ایک جگہ نہیں، بار بار اس نے اس خیال کی تکرار کی ہی کہ "عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہی چھپا" کہیں دیس والوں کی تنگ نظری اور تعصب کے مہلک مظاہر سے دل برداشتہ ہوتا ہی تو درد و محبت سے مجبور کس انداز سے اپنی تکلیف کا اظہار کرتا ہی۔

کبک و قمری میں ہی جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتادے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

بھائیوں کے آپس کے ٹنٹوں سے جب ثالثوں کو خوش ہوتے اور ان کی تفرقہ اندازیوں کو کامیاب ہوتے دیکھتا ہی تو رہا نہیں جاتا، بول اُٹھتا ہی کہ

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر — دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

اور جب ان جھگڑوں میں ایک تنگ نظر بھائی کے مقابلہ میں دوسرے کوتاہ اندیش بھائی کی مدد کوئی دوسرا کرتا ہی تو اس

کے عواقب بھی اس کی ژرف نگاہی سے چھپ نہیں سکتے اور یہ کہہ دیتا ہے:

ہیں اگر بے دردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار　　ناگوار ان سے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

پھر جب کبھی یہ بھائی گلے ملنے لگتے ہیں تو اس محب وطن کا غنچۂ دل کھل جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں جب ہندو مسلمانوں کو ملتے دیکھا تو لکھا ہے:

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا　　گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تفرقہ دل سے ہو سکا نہ تحریروں سے　　جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا

اور پھر:

تائید میں حق کی جو بلا آتی ہے　　ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے　　روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

اور اگر آپ کو اصرار ہو کہ یہ بات حدیث دیگراں، اور رمز و اشارہ میں صاف نہیں ہوتی تو حب وطن کے یہ شعر سن لیجئے:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی　　جین مت ہووے یا ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد

اور اس سے زیادہ وضاحت چاہتے ہیں تو سنئے:

ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی　　اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ　　لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی　　جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی،

اور مسلمان حالی کے حب وطن پر شبہ کرنے والے سنیں:

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے　　ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا　　کبھی درّانیوں نے زر لوٹا

کبھی نادر نے قتل عام کیا　　کبھی محمود نے غلام کیا

یہ متعصب مسلمان کی آواز ہی یا شیدائے وطن سچّے ہندی کی ؟

ہاں، اوروں سے پہلے، قوم کو حبّ وطن کا یہ وسیع تصور دیکر اور اپنے شعر کی دل نشینی اور گھلاوٹ سے اسے تاثیر کا دائمی سرچشمہ بنا کر، حالی نے، اس عملی آدمی کی طرح جو اپنی آواز کو بے نہایت وسعتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا، زیادہ تر مسلمانوں کو مخاطب رکھا۔ انھیں جگانے میں ساری زندگی کھپا دی، ان میں اجتماعی زندگی کا احساس پیدا کرنا چاہا، اخلاقی قدروں کی اہمیت انھیں سمجھائی، ان کی معاشرت پر نکتہ چینی کی، ان کے تمدن پر اعتراض کئے، ان کے امیروں کو شرمایا ہی اور ڈرایا ہے، ان کے غریبوں کو ہمت دلائی ہے۔ ان کے علما کو اپنے فرائض یاد دلائے ہیں ان کے شاعروں کی بے مغزی کو اس کا تمسخر کیا ہی، انھیں تحصیل علم کی رغبت دلائی ہی۔ تجارت کا شوق دلایا ہی، محنت اور مشقت پر آمادہ کیا ہی۔ ننگ بندگی کا احساس پیدا کیا ہے۔ غیرت دلائی ہی۔ ہمت بندھائی ہی۔ خود خون کے آنسو بہائے ہیں اور انھیں بھی رُلایا ہے، پھر محبت کے ہاتھوں سے ان کے آنسو پوچھے ہیں اور یہ سب کچھ اس تاثیر کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی تاریخ سیاسی میں، تاریخ تعلیمی میں، تاریخ معاشرت میں، تاریخ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب، شاعر، مصلح، محب وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوش ذہنی کے چشمہ صافی سے جا ملتا ہی جس کی ولادت کی صد سالہ برسی منانے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔

لیکن کیا مسلمانوں کی اس خدمت کی وجہ سے حالی کو محب وطن کہنے کا حق ہمیں باقی نہیں رہتا؟ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں، اور افسوس کہ بعض لوگ ایسا سمجھتے ہیں، انھیں خود اپنے دل اور اپنی نظر کا علاج کرنا چاہیے۔ وہ حالی جس نے ملک میں سب سے پہلے (یعنی خود انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے کئی سال پہلے) حبّ وطن کا ایسا وسیع تصور ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا جس میں اس دیس کے سب باسی شامل ہو سکیں، جس نے انفرادیت اور نمود پرستی کو اجتماعی خدمت کا سبق سکھایا، جس کی زبانِ قلم سے، جس نے کونسا ادارہ اور کونسا طبقہ ہی جس کے دل پر نشتر کا کام نہیں کیا ہی؟ پر جس سے ایک حرف ہاں ایک حرف ایسا نہ نکلا جس سے کسی ہم وطن کا دل اس سے دکھا ہو جو کسی دوسرے مذہب پر چلتا ہی جس نے اپنی شخصی زندگی میں مختلف المذاہب لوگوں سے محبت و مودت کی وہ وضع نباہی جس کے نمونے اس قوم پرستی کے دور میں مفقود ہوتے جاتے ہیں، وہ صرف اس جرم میں محب وطن نہیں باقی رہتا کہ وہ اپنی قوتوں کا بیشتر حصہ مسلمانانِ ہند کی خدمت اور انھیں بیدار کرنے میں صرف کرتا ہے! جو ایسا سمجھتا ہے وہ یا تو عمل

میں تاثیر اور کمال کے لئے حدود مقرر کرنے کے گُر سے ناآشنا ہی یا غریب مسلمانوں کو ہندوستانی ہونے کا شرف نہیں بخشنا چاہتا۔ اور یہ دونوں صورتیں قابل افسوس ہیں۔

پہلی صورت میں وہ لوگ ہیں جو کسی کام کو چاہے ذہنی ہو چاہے عملی اس کے پورے آداب کے ساتھ کرنے کی نہ خواہش رکھتے ہیں نہ صلاحیت مگر شیخت بگھارے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ یہ لوگ چند الٹی سیدھی تقریریں کر کرکے اور اخبارات میں موقع بے موقع بیانات شائع کرا کراکے سمجھتے ہیں کہ بس محبانِ وطن کی صفِ اوّل میں آگئے اور اب ہر کسی کو محبِّ وطن ہونے کی سند ان سے حاصل کرنی ہوگی۔ ان کا بیان چھپ گیا اور قوم کی اصلاح ہوگئی اور وطن کی نجات کا سامان۔ انھیں نہ کسی کو جگانا ہے، نہ کسی کو سدھارنا، یہ ساری دنیا کو مخاطب کر سکتے ہیں۔ دقت صرف ذرا سی ہے کہ دنیا ذرا اونچا سنتی ہے۔ اور جب سننے پر مجبور ہوتی ہے تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی ہے۔ ان محبانِ قوم کی تعداد کا اندازہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔ چند شعر حالی کے ان کی شان میں یاد آگئے! اجازت ہو تو پیش کروں:

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
ہیں مےِ ناب کے دلال، قدح خوار نہیں

شہر میں ان کے نہیں جنسِ وفا کی پکری
بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے یہ خریدار نہیں

بوالہوس، کام طلب، بندۂ نفس، اہلِ ہوا
ایک عالم ہے اسی رنگ میں دوچار نہیں

دعوے عشق و محبت یہ نہ جاناں ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

ان بیچاروں کو کیا خبر کہ جس کے دل کو کسی کام کی تکمیل کی لگی ہوتی ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی تاثیر کے حلقہ کو اپنی قوتوں کا اندازہ کرکے محدود کرے۔ حالی کے سامنے وطن کے بے شمار مہتم بالشان کاموں میں سب سے قریب مسلمانوں کی اصلاح کا کام تھا کہ یہ بھی تو اسی ہندی قوم کا نہایت اہم جزو ہیں اور اس قوم کی تاریخ میں ان کا بھی کچھ کم حصہ نہیں رہا۔ یہ خود اتنا بڑا کام تھا اور آج تک اس قدر کام باقی ہے کہ اگر حالی پھر پیدا ہوں تو صحیح طور پر پھر اپنی ساری عمر انھیں کے سدھارنے میں صرف کر دیں اور ضرورت ہے کہ مدتوں تک ہزاروں مخلص خادمانِ قوم و وطن انھیں کی خدمت میں اپنی زندگیاں کھپا دیں۔ حبِّ وطن کا وہ کون مالک مطلق ہے جو کسی مسلمان محب وطن کو جس کی محبت وطن کے لئے کسی طرح کسی دوسرے سے کم نہ ہو اس بات سے منع کر سکے کہ وہ اپنی قوتیں مسلمانوں کی ترقی اور اصلاح میں صرف کرے تاکہ ان کی درستی اور قوت سے ہندوستانیوں کی درستی اور قوت ہو اور ان کی ترقی سے دیس کو چار چاند لگیں۔

اور وہ دوسرے لوگ جو نہایت بلند آہنگی سے اپنی حبِ وطن کا اعلان فرماتے ہیں، لیکن ہندوستانی زندگی سے ان تمام چیزوں اور نشانوں کو رفتہ رفتہ مٹانے کے درپے ہیں جو اس زمانہ کی یادگار ہیں جب کہ اس دیس کے مسلمان باشندوں کے ہاتھ میں اس کی سیاسی باگ تھی انھیں اپنی تنگ دلی پر شرمانا چاہیئے۔ قومیں یوں نہیں بنتیں کہ کوتاہ بیں لوگ اپنے تعصبات کو اندھے پن میں اس کی تمدنی زندگی کے نہایت قیمتی عہد کو کالعدم کر دیں۔ جو لوگ ہندوستانی زندگی کا یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس میں سے اسلامی عناصر یک قلم خارج کئے جا سکیں گے۔ اور جو ایسا کرنے کی مہلک اور وطن دشمن مساعی میں مصروف ہیں انھیں اس سچے محبِ وطن کی یاد کے جشن کے موقع پر ناکامی و نامرادی کی بشارت ہو۔ انھیں چاہیئے کہ تربینی پر جہاں گنگا جمنا کا سنگم ہوتا ہے اور گنگا کے مقدس مگر ذرا گدلے گدلے اچھلتے دھارے میں جمنا کا گہرا صاف نیلگوں دھارا آکر ملتا ہے اور پھر دونوں مل کر آگے ہمارے عزیز ملک کے سب سے آباد اور زرخیز حصہ کو سیراب کرتے ہیں، اس سنگم پر جا کر ان دونوں دھاروں کو جنھیں قدرت نے اپنے مصالح سے ملایا ہے جدا کرنے کی کوشش کریں۔ جب تک یہ اس دشوار کام کو انجام دیں مسلم محبانِ وطن اور بہی خواہانِ قوم و ملک کو وطن کی خدمت کا یہ طریقہ اختیار کرنے کی بھی اجازت ہو کہ وہ مسلمانوں کو جگائیں کہ ان کے فروغ سے بھی وطن کا فروغ اور ان کی تباہی میں بھی وطن ہی کی تباہی ہے۔ اور جب حبِ وطن کا کوئی برخود غلط اجارہ دار انھیں اس راہ سے ہٹانے پر مصر یا ان کی حبِ وطن کے تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اسے حالی کا یہ شعر نرمی سے سنا دیا جائے:

قیس ہو، کوہکن ہو، یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں!

پنسل ڈرائنگ (عمل سلیم)

قومی ادب اور ہندی سمیلن کے منصوبے

(بھارتیہ سہتیہ پرشد اور رسالہ "ہنس" پر ایک نظر)

از ڈاکٹر کنور محمد اشرف ایم اے (علیگ) پی ایچ ڈی (لندن)

---

(۱)

انیسویں صدی میں جب یورپ میں نئی صنعتوں کا رواج ہوا اور جگہ جگہ کارخانے بننے لگے تو دنیا کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ مشینوں کے استعمال نے جہاں ایک طرف اپنے اپنے ملکوں کے رسم و رواج، طور طریقے، رہن سہن غرضکہ پوری زندگی بدل ڈالی وہاں تھوڑے ہی دن بعد اپنی ترقی کی خاطر اس نئی سرمایہ داری (پونجی واد) نے ایشیا اور بعد کو افریقہ پر دھاوا بول دیا۔ بیسویں صدی شروع ہونے سے پہلے ہی نئی سامراج کا وہ بول بالا ہوا کہ ساری دنیا کا روپ ہی بدل گیا۔ اس دور کی نرالی شان یہ تھی کہ اس نے ملکی خصوصیات کو مٹا کر پرانے متمدن ملکوں کو اپنی مصنوعات کی خرید فروخت کے لئے منڈی بنا ڈالا۔ سامراج اور پونجی واد کو اپنے نفع سے مطلب تھا، اُسے اس سے کیا سروکار کہ ایشیا کا گھر اجڑتا ہے یا افریقہ کا، ہندوؤں کی تہذیب فنا ہوتی ہے یا چینیوں کی۔ مسلمان ملیا میٹ ہوتے ہیں یا پرانے امریکن باشندے۔ اُس نے چین میں افیم بیچکر نفع کمایا تو امریکہ میں افریقہ کے حبشی غلاموں کی تجارت سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے تعصب اور امتیاز کا سوال سرے سے اٹھا دیا۔ جہاں کہیں نفع کی امید لے گئی سرمایہ دار پہنچا اور جس طرح نفع کمایا جا سکتا تھا کمایا۔ ملک گیری کی ضرورت پڑی تو ملک فتح کر لیا۔ جہاں محض بیرون مملکتی (اکسٹرا ٹیریٹوریل) مراعات حاصل کرنے سے کام بن گیا وہاں یہ حقوق بھی حاصل کئے۔ کہیں اس کی بھی ضرورت نہ پڑی تو صرف حکمبرداری پر اکتفا کر لی۔ نئے نئے آلات اور آلاتِ کار اس کے پاس تھے ان سے مقابلہ کون کرتا۔ جہاں پہنچا قبضہ کر کے سامراجی سرمایہ دار نے ریل تار، سڑکوں کا جال بچھا دیا نئے اور مرکزی ادارے بنا کر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

خلاف توقع ایک اثر اس نئے نظام کا یہ پڑا کہ پرانی زوال آمادہ تہذیبوں میں مرنے اور مٹنے کے باوجود ایک نیا تصور پیدا ہوا۔ ریل، تار، سڑکوں سے جہاں تجارت کی سہولتیں پیدا ہوئیں وہاں دور دور کے لوگوں میں ایک

نئی یگانگت اور مرکزیت کا ایک نیا خیال پیدا ہوگیا اور کیوں نہ ہوتا۔ نئے معاشی نظام کے خمیر میں مرکزیت اور قومی، نسلی اور صوبجاتی امتیازات کے مٹانے کے سب عناصر موجود تھے۔ اس کی بدولت قومی اور نسلی خصوصیات بالذات نہیں بلکہ اعتباری رہ گئیں تھیں۔ بڑھتے ہوئے سامراج کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نئے مرکزی خیال سے مدد لی گئی سماج نے اس کا نام "قوم پرستی" "دیش بھگتی" رکھا اور اس نئے دیوتا کے گیت گانا شروع کردئے کیونکہ اب اسی کی دستگیری کی آس رہ گئی تھی۔

قومی تحریک نے مصر، ایران، ترکی یا چین وجاپان میں جو کچھ کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان میں ہم خود اس دور سے گذر رہے ہیں اس لئے اس کے عروج کی تاریخ دہرانا فضول ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اس نئی جدوجہد میں اپنے تحفظ کے لئے اس تحریک نے وہ سب کچھ کر دکھایا۔ جو اس صورت حالات میں ضروری تھی مذہبی خیالات کو نیا جامہ پہنایا، اپنے بادشاہوں سے نئے قانون بنوائے اور منوائے اور جہاں وہ نہ مانتے تاج وتخت سے محروم کردئے گئے۔ فوجوں کو نئے ہتیار اور نئی فوجی تربیت دی۔ اسکول کھولے، کالج بنائے۔ غیر زبانیں پڑھائیں نئے خیالات سکھائے غرضکہ وہ سب کچھ کیا جو ایک کمزور ہدجو اس ایک قاہر وجابر کے مقابلہ میں یا اُس کا لوہا مان کر کرسکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں انیسویں اور بیسویں صدی کا زمانہ یادگار رہے گا تو صرف اُن لوگوں کے کارناموں کے اعتبار سے جنہوں نے ہموطنوں کو یہ سمجھانے میں عمر گنوادی کہ "اگلے وقتوں کی باتیں بھولو، زمانہ کی رفتار دیکھو اور اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرو" قومیت کے جب ذرا پاؤں جمنے لگے تو اُس نے اس پر یہ حاشیہ اور بڑھا دیا کہ صرف تبدیلیاں ہی پیدا نہ کرو بلکہ دیکھ بھال کر ایسی تبدیلیاں عمل میں لاؤ جس سے سامراجیوں سے زیادہ سے زیادہ رعائتیں حاصل ہوسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم سرسید، حالی، رام موہن رائے، دیانند سرسوتی، کے ناموں کے ساتھ زمانۂ حال کے سیاسی رہنماؤں کے نام ملا کر انہیں عزت بلکہ عقیدت سے یاد کرتے ہیں۔

اسی جزبۂ تحفظ کی ایک جھلک جدید ادبی تحریکوں میں بھی پائی جاتی ہے پہلے زمانہ میں جب منصب داری اور جاگیرداری کا دور دورہ تھا تو خواص اور شرفا اہلِ دولت کے ادب وتمدن سے اور عام شہری اپنے اپنے صوبجاتی ادب اور زبانوں سے جی بہلا کر خوش ہوتے تھے۔ اب جان کے بچاؤ کے لئے جس سماجی تحریک کی ضرورت ہوئی اُس کے سپرد دو کام ہوئے پہلا کام یہ کہ آپس میں یکجہتی بڑھائے دوسرا یہ کہ مقابل سے لڑنے میں مدد دے اور حق تو یہ

ہے کہ ادب کیا ساری ذہنی اور فکری زندگی اسی مقصد کے حصول میں مرکوز ہوگئی۔ اور کیوں نہ ہو اس لئے کہ جس طرح کسی فوج کے ہنر نرغہ میں پھنس کر مدافعت میں ہی کھلتے ہیں اسی طرح ان قوموں کے لئے تخلیقی کام، اخلاقی تربیت روحانی ترقی کی راہ ہی یہی ہے۔ ان پر اور دروازے اس وقت تک بند ہیں جب تک سماج ایک نیا پلٹا نہ کھائے۔

ہندوستان کی عملی ضروریات نے کام کرنے والوں کو سیاست پر زور دینے کے لئے مجبور کیا۔ یہاں ایران ترکی یا چین کی طرح اپنے ملکی بادشاہوں سے نئے حقوق اور دستور حاصل کرنے کا سوال نہ تھا کہ ادیب اور شاعر سماجی جدوجہد کی رہنمائی کرتے۔ یہاں آنکھ کھلتے ہی جدوجہد نے سیاسی صورت اختیار کرلی اور گو سماج کی سدھار کا کام کرنے والے بہت سے عالم اور غیر سیاسی لوگ تھے مگر سکہ اگر جما تو صرف سیاست دانوں کا بات اگر بنی تو پولیٹیکل لیڈروں کی۔ ہم نے اتحاد اور قومیت کا سبق کتابوں سے زیادہ موثر طریقہ پر سیاسی مظاہروں سے سیکھا جو شہر کیا گاؤں گاؤں میں برپا تھے۔ جب ہندو، مسلمان، پارسی عیسائی کالجوں اور اسکولوں کے بعد جیل میں جا کر یکجا ہوئے تو اخلاقی درس اور قومیت کا وعظ کئے بغیر ہی اُن کی سمجھ میں آگیا کہ وہ سب بھائی بھائی اور پڑوسی ہی نہیں بلکہ رفیق ہمدم اور ہم جنس بھی ہیں۔ یہ سب مشترک سیاسی ضرورتوں کا کرشمہ تھا جس نے دوش بدوش کھڑے ہو جانے کی صورت پیدا کردی تھی۔ ہلکے ہلکے ایک نئے اور جیتے جاگتے ادب کی بھی داغ بیل پڑنے لگی۔ جب پوری زندگی سدھار بلکہ انقلاب کی نیت سے دیکھی جانے لگی اور ادب کا تصور زندگی سے دوچار ہوا تو اس میں بالکل نئے خیالات اُبھرنے لگے۔ فسانہ، شعر، تاریخ، سوانح، تنقید میں ایک تازہ اور نئی جان سی آگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گجرات بلکہ مدراس اور آسام کے لوگ دہلی اور لاہور کے پبلک جلسوں میں سماج کے زندہ مسئلوں پر تقریر کیا کرتے تھے اور ان شہروں کے لوگ بمبئی اور ناگپور کی کانفرنسوں میں ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں جا کر شریک ہوتے اور اپنا دکھڑا سناتے اور دوسروں کی داستان سنتے تھے کوئی بھولے سے بھی نہ پوچھتا تھا کہ میاں تمہارا لب و لہجہ پنجابی ہے یا تم جو تجویز پیش کر رہے ہو اُسے اردو خط میں لکھ کر کیوں لائے ہو، مخالف اور موافق دونوں ایک ہی کینڈے میں سوچتے تھے اور اپنا ہی صوبہ کیا ہر صوبہ کے خیالات اور بعض اوقات زبان سے بھی واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ راقم الحروف نے خود لندن میں مولانا محمد علی مرحوم کے پاس مہاتما گاندھی کا وہ دستی خط دیکھا ہے جو مہاتما جی نے حکیم اجمل خاں کو دہلی میں اردو میں لکھا تھا اور جس میں زبان وہ درج تھی جو دلی کے کوچہ و بازار میں لوگ بولتے ہیں جیسے

سمجھنے میں بنارس اور ہردوار کے اُن پنڈتوں کو یا دیوبند اور ندوہ کے اُن عالموں کو ضرور دقت ہوگی جو خانقاہوں کی تنگ چہار دیواری میں عمر گزار دیتے ہیں لیکن عمرو بکر زید کے لئے روزمرہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس خط میں املا کی غلطیاں تھیں مثلاً ع کی جگہ الف ظا اور ض کی جگہ ز ص، ش کی جگہ س وغیرہ تھے جو خود زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ اگر اردو کو قومی زبان بنانا ہے تو رسم الخط میں ایسی اصلاحیں کرنی پڑیں گی جو اسے ہر صوبہ کے استعمال کے قابل بنادیں۔ خود پنڈت جواہر لعل تو آج بھی عام سیاسی جلسوں میں وہ زبان بولتے ہیں جو متوسط طبقہ کے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہی جاسکتی ہے یعنی نہ اُس میں "علمیت" کی بے جا نمائش ہے نہ جاہلوں کا گنوارپن البتہ پنڈت مالوی جی ہمیشہ دو زبانیں بولتے ہیں ایک بنارس کے پنڈت کی ہندی دوسرے ندوہ کے عالم کی اُردو۔

یوں تو دنیا بھر کے انسانوں میں شباب کے بعد بڑھاپا آتا ہے مگر ہندوستان میں پیرانہ سالی کے آثار ذرا جلد نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ "پیرانہ سالی" ہندوستان کی سیاسی فضا میں اس درجہ جلد آئی کہ دنیا حیران ہے آزادی کیا سماج کا کوئی بھی مسئلہ حل نہ ہوا تھا کہ کام کرنے والوں نے جدوجہد سے منہ چرانا شروع کردیا۔ دنیا میں جیسے جیسے غربت اور کساد بازاری بڑھی اور سیاسی فضا صاف ہونا شروع ہوئی ہمارے متوسط طبقہ کے لیڈر جھجکنے اور مڑنے لگے اور ایک خاص وقت میں (جس کی یہاں تشریح کی ضرورت نہیں ہے) انھوں نے پرانے طور طریقے چھوڑ کر اہلِ بزم کے مروج آداب سیکھنا شروع کئے۔ کچھ دنوں وضع نباہتے رہے بالآخر دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا، بساط ہی لوٹ دی اور اصلاح دیہات۔ چرخہ، کھدر اور سماجی سدھار کے وہ مہرے جو برائے بیت تبرکاً رکھ چھوڑے تھے اُن سے سوانگ رچایا گیا۔ ڈوبتے کو بھی کیا کیا چیزیں سہارا دیتی ہیں۔ نئے قومی ادب (بھارتیہ سہتیہ) کی تحریک بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ قصہ بکاؤلی ہی کا ہے اس لئے ہم بھی گلزارِ نسیم سے آگے نہیں بڑھے۔

زنجیرِ جنوں کڑی نہ پڑ یو، دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

یہ مقدمات اس امر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں کہ قومی ادب کی وہ تحریک جو مہاتما گاندھی جی کی نگرانی میں اندور کے ہندی سمیلن کے بعد اسی سال شروع ہوئی ہے اپنے ساتھ پیدائشی طور پر بعض ذہنی حدود لائی ہے

جن کا سمجھنا خود نفس تحریک اور اُس کے مظاہر کے پرکھنے کے لئے ضروری ہے پہلے سوال ایک بنتے اور بڑھتے ہوئے قومی ادبی نقطۂ نظر کو پروان چڑھانے کا تھا اب یہ سوال اپنی ادبی حیثیت سے گر کر ہندی اور اردو زبان کا ہو گیا ہے اور ادب کی نئی حیثیت زبان کے بھول بھلیوں میں آکر یکسر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ پہلے صوبجاتی ادب نئے ہندوستانی اور قومی ادبی میلان کی گنگا میں ملکر اپنی صوبجاتی حیثیت و اہمیت خود بخود کھوتے جا رہے تھے۔ اب صوبجات سرکاری فیڈریشن کے سیاسی اور رجعت آمیز تصور کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی اپنی حیثیت از سر نو قائم کرنا چاہتے ہیں چنانچہ کنہیا لعل منشی جی نے اس سہتیہ پرشد کی نئی تحریک کا مناسب اور صحیح نام کامن ویلتھ آف پراونشل لٹریچرس یعنی صوبوں کی ادبیات کا متحدہ ایتلاف رکھا ہے اور وہ اسی شان کا ایتلاف ہے جس شان کا برطانوی سیاسی ایتلاف۔ ایک زمانہ میں ہندوستان کا آئینی تصور نہرو رپورٹ کے مطابق (Unitary) 'وحدانی' تھا اب اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہوگا۔ پہلی تحریک کے قدم آگے پڑتے تھے اس کی نظر سائنس علم اور زندگی پر جمی ہوئی تھی موجودہ تحریک پیچھے مڑکر توہمات اور ویدک دھرم کا آسرا ڈھونڈتی ہے۔ پہلے ایک نوزائیدہ کی آمد کا انتظار تھا اب ایک پیر فرتوت کے متبنی کرنے کا ڈھونگ ہے۔ مختصراً یہ کہ پہلی تحریک میں تازگی وسعت اور امید تھی موجودہ تحریک میں تھکن، مایوسی بلکہ بند پانی کے فساد کی بو آتی ہے۔

اس کی مزید تشریح کے لئے خود ہندی سمیلن کی تحریک جواب بھارتیہ سہتیہ پرشد کے نام سے برا جمان ہے اور اُس کے ماہواری رسالہ "ہنس" کی شانِ نزول اور خط و خال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲)

گزشتہ اپریل ۱۹۳۵ء میں ہندی سمیلن کے اندور کے سالانہ جلسہ میں مہاتما گاندھی جی نے صدارت کی۔ اس اجلاس کے بعد اس سمیلن نے بھارتیہ سہتیہ پرشد (قومی ادب) کی تحریک شروع کی اور اس سلسلہ میں اکتوبر ۱۹۳۵ء سے "ہنس"، بمبئی سے ہندی میں نکلنا شروع ہوا۔ منشی پریم چند اور کنہیا لعل منشی اس کے سمپادک (ایڈیٹر) مقرر ہوئے۔ "ہنس" کے نصب العین خود منتظمین کی زبان سے سنئے۔ انگریزی گشتی رسالہ موسومہ "روپہ ایتلاف متحدہ ادبیات صوبجات ہند" میں کنہیا لعل جی فرماتے ہیں کہ:-

"آرین کلچر کی روح نے پرانے زمانہ میں بھی صوبجاتی حدود کو مٹا دیا تھا اور باوجود رسم خط اور زبانوں کے

اختلافات کے اُس نے برابر جمالیاتی اور ادبی یگانگت کی خاطر جدوجہد کی۔ جدید تہذیب کی سہولتوں
اور حب الوطنی کے سیاسی محرکات کو دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ اس کی (یعنی آرین کلچر کو۔ اشرف)
متحد کرنے کی کوششیں بہت جلد بار آور ہوں گی ......"

کنہیا لعل منشی جی نے اس کلچر کے قدموں پر اپنی حقیر دکشنا "لوپا مدرا" کے فسانہ کی صورت میں پیش کی ہے جس میں
ویدک زمانہ کی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے اور چونکہ بحث غیر تاریخی ہے اس لئے تخیل نے ایسے ایسے پیارے اور
دلفریب نقش کھینچے ہیں کہ شدر کا تخیل بھی خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ کر دم لے گا۔ گو ہمارا خیال ہے اس غریب
کی طفل تسلی کے لئے اتنے اہتمام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

من نہ بوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

کنہیا لعل جی فرماتے ہیں کہ مجھکو ۱۹۲۵ء ہی سے اس تحریک کا خیال ہو چلا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو اُس سیاسی
دور میں بھی ہندی۔ ہندی کی تحریک کا خیال رہا وہ ہی اس کا سچا سردھرا اور نگہبان ہو سکتا تھا۔ کنہیا لال جی ۱۹۳۵ء
میں اب اپنے ساتھ "جدید تہذیب کی سہولتیں" اور سیاسی "محرکات" ساتھ لائے ہیں ہمارے بعض دوستوں کو بیمہ کمپنیاں
اور کارخانے قایم کرنا بھی اسی جذبے نے سکھایا ہے۔

اندور کے اجلاس نے ایک کمیٹی اس غرض سے بنادی کہ "اُن ادیبوں میں جو صوبجاتی زبانوں میں کام کر رہے
ہیں ہمدردی پیدا کیجائے تاکہ اُن کی شرکت سے ہندی زبان کے ارتقا میں مدد ملے۔"

قومی ادب کے تصور نے کتنے قلیل عرصہ میں کتنی منزلیں طے کرلیں (۱) قومی ادب آرین تمدن ہم معنی ہیں
(۲) صوبجاتی ادیبوں کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ ہندی زبان (ہندوستانی نہیں جو ہندی اردو دونوں
پر حاوی ہے) کے ارتقا میں اُن سے مدد لیجائے یعنی قومی ادب کی روح آریائی اور جسم ہندی زبان ہوگی ہم نے
آرین نقطہ کا چرچا دو مرتبہ سُنا ہے۔ ایک جب آریہ سماج نے ہندو سماج کی اصلاح کے لئے اس کا پرچار کیا۔
دوسری بار جب جرمنی میں "فاشیت" کا "کلٹ" شروع ہوا اور ہٹلر نے اس آرین علم کو لیکر ایک روبہ انحطاط سرمایہ داری
کی حمایت میں مزدور تحریک کو از سرِ نو جرمن سرمایہ داروں کا "شدر" بنایا۔ ہم اس اصلاح کی تاریخی حیثیت کو بھولنا
چاہتے ہیں مگر برلا جیسے سرمایہ دار کی ہند و نوازی اور ہندوستان کے مزدوروں کی جدوجہد پھر چونکا دیتی ہے۔ ہندی

رسم الخط کی نمائش بتاتی ہے کہ سامراجی مدبّروں کی طرح یہ دیش بھگت بھی فرقہ وارانہ فرضی علمی گورکھ دھندوں کو ادب کی آزادی اور ترقی پر مقدم سمجھتے ہیں۔ جہاں ڈاکٹر امید کار اچھوتوں کو معاشی مسائل سے ہٹاکر دھرم کی طرف لیجاتے ہوں اور لطف یہ کہ آرین مہاشے اس تحریک سے سخت برہم بھی ہوں وہاں ہندی کے مسئلہ کو اہمیت نہ ہو تو تعجب ہے۔

ہمیں اُردو والوں سے ہمدردی ہے کہ جہاں تک اُن کا تعلق ہے اس کلچر میں آنے کے لئے ان پر پہلے ہی سے دروازہ بند کیا جاچکا ہے عجب نہیں جس طرح شدھی اور سنگٹھن کا ہنگامہ تبلیغ اور تنظیم کا محرک ہوا اس کا ردِّ عمل یہ ہو کہ اردو تحریک کا عَلم بلند ہونے لگے۔ یہ ہنگامہ ہوگا تو تھوڑے ہی دن کا مگر قومیت دشمن قوتیں سہنیہ پرشد کی بڑی ممنون ہوں گی۔ اردو رسم خط کے متعلق اس درجہ بے صبری سے کام لیا گیا ہے کہ "ہنس" کے پہلے ہی نمبر میں، صوبجاتی اردو رسائل کے اقتباسات کا واحد نمونہ جو "زمانہ" کا نپور سے لیکر پیش کیا گیا ہے اُس میں مسٹر فیاض الدین خاں نے زوردار الفاظ میں اس کی سفارش کی ہے کہ اگر اتر بھارت کے مسلمان ہندی لپ سویکار کرلیں تو بھاشا کا بھید رہ ہی کہاں جاتا ہے۔ (اصل عبارت ہنس اکتوبر صفحہ ۱۰۹)

دوسرے الفاظ میں اگر شمالی ہند کے مسلمان ہندی رسم خط قبول کرلیں تو زبان کا فرق رہ ہی کہاں جاتا ہے۔ جن لوگوں نے حکومتوں کے محکمہ جات اشاعت واطلاع کے کام کرنے کے طریقوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اُنہیں اس قسم کے اردو کے اقتباسات اور مسلمانوں کی تحریروں پر مطلق اچنبھا نہ ہوگا۔ یہ البتہ سمجھنا باقی ہے کہ مسلمان اور اردو رسم خط کب سے اور کیونکر ہم معنی ہوگئے ہیں!

اب خود ایڈیٹر صاحب کی زبان سے سنئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور اسے کیونکر حاصل کریں گے۔ ہندی رسم خط لیکن قومی زبان میں "پرانتیہ ساہتیہ کی ایکتا" (صوبجاتی ادبوں کی یگانگت) کے تحت میں فرماتے ہیں۔

"راشٹر وستو نہیں۔ وہ ایک بھاونا ہے۔ کروڑوں استری پرشوں کی سنکلپ۔ بکت اچھا پر اس بھاونا کی رچنا ہوئی ہے۔ آج انگرٹت بھارت واشی اپنے آچار اور وچار میں اسی بھاونا کو ویکت کرسے ہیں۔ سارا ہند ایک اور (ہندی عبارت میں ایک ماترا زیادہ چھپ گیا ہے۔ اشرف) ادبھاجیہ ہے۔

"یہ بھاونا کئی طرح سے، کئی روپوں میں پرگٹ ہے۔ انگریزی پڑھے لکھے لوگ انگریزی بھاشا کے دوارا

اس بھاونا کو ظاہر کرتے ہیں، دوسرے اینک اپنی اپنی ماتر بھاشا میں۔ یہ تینوں ایک ہی دشا میں اینکوں ہو رہے ہیں۔ وے راشٹر بھاشا اور ساہتیہ کے بنا ایک روپ نہیں ہو سکتے۔"

یعنی :-

"ملک ایک تصور ہے کوئی غیر نامی یا مادّی چیز نہیں ہے۔ کروڑوں مرد اور عورتوں کے ارمانوں و امیدوں پر اس تخیل کی پرورش ہوئی ہے۔ آج لاتعداد ہم وطن اپنے فکر و عمل سے اسی خیال کو ظاہر کر رہے ہیں سارا ہند ایک ہی سمت دھیان لگائے ہوئے ہے۔"

"یہ خیال کئی طرح سے کئی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ انگریزی پڑھے لکھے لوگ انگریزی زبان کے ذریعہ سے اس خیال کو ظاہر کرتے ہیں دوسرے اپنی اپنی مادری زبانوں میں۔ بہر حال کوشش ایک ہی سمت میں ہے۔ بغیر ایک زبان اور ایک ادب کے وہ ایک روپ نہیں ہو سکتے۔"

یہ اس تحریک کا مقصد ہے۔ اب تک یہ "بھاونا" تھی لیکن فوراً ہی "وستو" ہو گئی۔ آگے چلکر فرماتے ہیں۔

(ہنس کی عبارت)

" اب ہندی، راشٹر بھاشا کے روپ میں سروجن مانیہ ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے راشٹر ودھاتا اسے جیوت راشٹر بھاشا بنانے کا ورت لے چکے ہیں۔ پرنت یہ بھاشا صرف بیوہار کی، آپس کے بول چال کی ہی نہیں، ساہتیہ کی بھی ہونی چاہیئے ...." (ہنس اکتوبر ص۱۱)

یعنی :-

"اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں۔ لیکن یہ زبان صرف کاروبار کی روزمرہ ہی کی نہیں ادب کی بھی زبان ہونی چاہیئے ......"

اس کے بعد فرماتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے :

"قومی زبان کوئی بھی ہو اس میں ہمیں ملک کی ہر ایک زبان سے مدد لیکر جان ڈالنی پڑے گی حقیقی قومی ادب وہی ہے جس میں ہر صوبے کے ادبی ذخیروں کا نچوڑ بجنسہ موجود ہو۔ ملک کی اس ادبی روح کے

درشن سب کو نصیب ہونے چاہئیں۔ یہی خیال ہماری اس کوشش کا موجب ہے"۔ (ایضاً صفحات ۱۱۵-۱۱۶)

یہ عبارتیں کچھ انمل بے جوڑ ہیں جن سے ذہنی خلفشار کا پتہ چلتا ہے۔ ابتدا قومی ادب اور خود قوم کے نامی تصور سے ہوتی ہے۔ دفعتاً یہ خیال ہندی روپ دھارن کر لیتا ہے۔ یہاں بھی یہ کیفیت ہے کہ ایک جگہ معلوم ہوتا ہے کہ "ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے" پھر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی نہیں ہو چکی چونکہ "مہاتما گاندھی ...... اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد لے چکے ہیں"۔ عہد لینا خود اس کی دلیل ہے کہ ہندی زبان ابھی ملکی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد پھر بھی شبہ ہے کہ کام بخیر انجام پائے گا یا نہیں چونکہ فرماتے ہیں کہ "ملکی قومی زبان کوئی بھی ہو ......"۔ ہم اس سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ہندی ابھی ملک کی قومی زبان نہیں ہوئی مگر اسے قوم پر عائد کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں جو تصور سیاسی بیداری کے زمانہ میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ خاص و عام کی جو زبان عام ہو کر قومی بنتی جا رہی ہے ہندی (یا اردو) اسی زبان کو رواج دیا جائے اس دور میں اس قومی خیال کا روپ یہ بن گیا ہے کہ جو ہندی پہلے سے موجود تھی اور جس میں ایک مخصوص محدود اور جامد ادب کا تصور جاری و ساری تھا اسے مہاتما جی کے اثر، جدید تہذیب کی سہولتوں اور "حب الوطنی کے سیاسی محرکات" سے فائدہ اٹھا کر "آل انڈیا" بنا دیا جائے۔ تاکہ کوئی دوسری زبان یہ درجہ حاصل نہ کر لے!! اس سیاسی تجربہ اور سہولتوں کی شان یہ ہے کہ یہ تجویز غیر ہندی داں طبقہ کے سامنے گزارش کے طور پر پیش نہیں ہو رہی ہے بلکہ آگے چلکر ایڈیٹر صاحب یوں ہمکلام ہوتے ہیں کہ

> "ہندی کو چھوڑ کر دوسری بھاشا اس دیش کی ہو نہیں سکتی۔ ہمیں اس وستو (واقعہ) کا بھان (خیال) اس بات کا وسواس (یقین)، جتنی جلدی ہو جائے، اتنا ہی اس دیش کا بھاگیو جلدی نزدیک آپہنچے گا (یعنی نصیبہ جاگ اٹھے گا)" (صفحہ ۱۱۷ ایضاً)

فرض کیجئے کہ سہتیہ پریشد کی ہندی آپ نے رائج کر لی۔ اردو دانوں نے ہندی رسم خط اختیار کر لیا۔ اب اس نئی قومی زبان کی تحریک کے قومی ادب کا تصور کیا ہوگا؟ گزشتہ تحریک میں جو عناصر تھے ان کا ہم تذکرہ کر آئے ہیں مگر یہ بچہ ماں کے پیٹ ہی میں تھا اور ابھی مدت بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ فرقہ وارانہ ادب نے "مسلمان جائے" اور "ہندو لسکٹ" کی طرح اس کی جگہ لے لی۔ چنانچہ سمپادک جی اپنے خود ساختہ راشٹر سہتیہ کی مشکلات کا

تذکرہ کرتے ہیں وہ بھی غور طلب ہیں۔ عبارت کا سرسری ترجمہ یہ ہے:

"ادب کی وہ زبان کونسی ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں کی سمجھ میں آجائے؟ بازار میں لشکر میں، روزمرہ کے کاروبار میں سادہ ہندی عام فہم اردو کے قریب آجاتی ہے (پھر اس کے لئے ہندی رسم الخط کا سوال بیکار ہے!) لیکن جہاں ادبی چاشنی، شعر شاعری معانی و مطالب صنائع و بدائع کا سوال آئے گا یہ زبان تنگی ہو جاتی ہے۔ یہاں ادیب اپنے اپنے پیاری ادبیات عالیہ" میں مناسب طور پر بقدر ضرورت اس سرمایہ سے استفادہ حاصل کریں یہ مایوس ہونے کی بات نہیں ہے کوئی فریق اپنے امتیازی خصوصیت کھو کر یا خود چھوڑ کر آگے نہ بڑھے اس طرح دونوں فریق ایک دوسرے کی خوبیاں اپنا کر نئی زبان پیدا کر سکیں گے۔ اس کام میں جس قدر صبر کی ضرورت ہے اتنی ہی فراخدلی کی۔ دنیا کے بڑے بڑے کام متواتر کوشش سے اور مدتوں میں جا کر طے ہو پاتے ہیں"۔

(صفحہ ۱۱۷-۱۱۸ ایضاً)

ایک قومی تصور کے نام پر ان فرقہ وارانہ امتیازات کو قایم رکھنے کی کوشش جس درجہ مہمل اور بے معنی ہے اسی درجہ خطرناک بھی ہے اس لئے کہ اس کی بنا ماضی پرستی پر ہے جو دونوں کی بنیادی تفریق کا باعث ہے جس سے اس ملک کے عوام اور آیندہ آگے بڑھنے والے دونوں بیزار ہیں آگے چلکر ہم اس پر مزید غور کریں گے۔ اس وقت صرف اتنی گزارش ہے کہ سہتیہ پریشد نے ادب اور زبان کے دو بالکل مختلف مسئلوں کو ملا کر اپنے 'آرین' ذہنیت کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں ذاتی طور پر اس ذہنیت سے نہ کوئی شکایت ہے نہ اس رجعت پسندی کا شکوہ یا غم۔ ظاہر ہے آج ۱۹۳۵ء میں قومیت کی ذہنیت اور اس کی سماجی تحریکیں ایک مخصوص طبقہ کی حمایت اور اس کی اغراض و مفاد کے تحفظ کا نام ہے! اور وقت واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ طبقہ سیاسی لحاظ سے پوچ اور تاریخی اعتبار سے زوال آمادہ ہے۔ اس کے تمام اعمال و افکار پر رجعت پسندی اور انقلاب دشمنی کی مہر لگی ہوئی ہے۔ آج کل ہر قومی تحریک ایک بلند نظر پر جا دادی (جمہوری) خیال کو لے کر بڑھنے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن ایک محدود جماعت بنکر مٹ جاتی ہے۔ مثلاً تحریک نسواں کو لیجئے۔ کسان اور مزدور عورتوں کی بپتا اور ان کے معاملات آل انڈیا ویمنس کانفرنس کے پروگرام سے خارج ہیں۔ یہ بیگم اور راج دلاریاں کچھ کونسلوں کی نشستیں۔ کچھ شادی بیاہ اور میراث کے قانون

کی اصلاحیں اور کچھ لکھی پڑھی عورتوں کے لئے نوکریاں مانگ کر اٹواٹی کھٹواٹی لیکر پڑجاتی ہیں۔ قومی تعلیم کی تحریک پر نظر ڈالئے۔ اس کا مدت سے شور ہے آشرم، بلکہ ودیا پیٹھ اور جامعہ وجود میں بھی آگئی ہیں مگر کیا ابھی تک کسی نے عوام کی زندگی کی ضروریات کو نگاہ میں رکھکر کوئی تعلیمی پروگرام پیش کیا ہے؟ کسی نے جبریہ اور مفت تعلیم کا مطالبہ کیا ہے؟ کون دیش بھگت پرجا وادی نہیں ہے مگر کیا کسی نے ہر عاقل و بالغ کے حق رائے دہی پر کبھی زور دیا ہے؟ ریاست کے لوگوں کو تو معرض بحث میں لانا ہی بے سود ہے۔ جو کچھ آل انڈیا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس، کانگریس اور بالخصوص بھولا بھائی دسائی نے اس سلسلہ میں کیا ہے اور کرتے ہیں سب کو معلوم ہے۔ وما فی صدورھم اکبر۔ جس طرح اصلاح دیہات، ہریجن (زیادہ صحیح اچھوت ادھار) تحریک کی آواز عام سماجی تحریک اور اس کے صریحی معاشی مطالبات اور سیاسی تقاضوں سے بے تعلق ہو کر مہمل اور بے معنی ہو گئی ہے اسی طرح یہ ادبی ہنگامے بھی شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔

اب نئے ہندی ماہانہ رسالہ "ہنس" کا جائزہ لیجئے۔

اندور کے اجلاس مذکورہ نے کمیٹی کو یہ اختیار دیا تھا کہ اگر وہ نئے قومی ادب کی ترتیب کے لئے ضرورت سمجھے تو بجائے نیا رسالہ نکالنے کے کسی موجودہ رسالہ کو اپنالے چنانچہ اس کی نظر انتخاب منشی پریم چند پر پڑی اور بقول اُن کے رسالہ 'ہنس' جو ۶ سال سے ان کی ادارت میں نکل رہا تھا اس کام کے لئے وقف کر دیا گیا۔ چنانچہ اب رسالہ "ہنس" بھارتیہ سہتیہ پرشد جیسی بڑی سنتھا کا مکھ پتر ہے اور نئی آب و تاب، اور نئے ساز و سامان کے ساتھ بمبئی سے نکلا ہے۔ اس کے دو نمبر اب تک نکل چکے ہیں جن پر ہم آگے چلکر تبصرہ کریں گے۔

ہمیں رسالہ "ہنس" کی تو زیادہ فکر نہیں۔ رسالے نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ منشی پریم چند اور منشی کنہیا لعل کے گزشتہ کارناموں کا سرسری جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ جب کنہیا لعل ۱۹۲۵ء میں گجرات سہتیہ پرشد کے اجلاس میں بیٹھے ویدک اور آرین تمدن کے خواب دیکھ رہے تھے منشی پریم چند کا حال اُن مشرقی رہبانوں کا سا تھا جو ستارہ دیکھ کر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت و موقع پر موجود ہونے کے لئے چل کھڑے ہوئے تھے یعنی ابھی قومی ادب کی داغ بیل بھی نہ پڑی تھی کہ انھوں نے بنیادیں کھودنا شروع کر دیں۔ ابھی اس بچہ کی پیدائش کی گھڑی

بھی نہ آئی تھی کہ منشی جی نے شگون لیکر اس بچہ کے لئے ننھے گدے تیار کرنا شروع کر دئے گھٹی اور دودھ کا اہتمام
شروع کر دیا بلکہ شفیق دائی کی طرح لوریاں اور گیت بھی یاد کرنا شروع کر دئے۔ وہ یہاں تک تیار معلوم ہوتے تھے
کہ چاہے ماں باپ بھی اس بچہ کی تربیت سے ہاتھ اٹھالیں مگر یہ اُسے پروان چڑھاکر ہی دم لیں گے چنانچہ پریم پچیسی
اور چوگان ہستی سے گزر کر منشی جی نے مزدور اور کسانوں کی "نئی دنیا" بنائی اور آگے کی سوچنے لگے۔ عین ایسے
وقت میں یہ جانکاہ حادثہ ہوا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ منشی جی بھی ہر چلتی ہوئی چیز کو گاڑی سمجھتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ
منشی جی پر اس بات کا بڑا اثر ہے کہ "دکن (مدراس، ٹراونکور، کوچین، میسور) وغیرہ میں تو ہندی کی بالالتزام
تبلیغ ہوئی ہے اور لاکھوں ہندی خواں نکل آئے ہیں ...... اس لئے ایسے رسالہ کی قبولیت میں کوئی شبہ نہیں"۔
(ماخوذ از خط بنام رشید احمد صدیقی صاحب بنارس مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۳۵ء) جب جنگ عظیم میں امریکہ نے برطانیہ
کا ساتھ دیا تو ہم نے لارڈ ریڈنگ کی "بالالتزام تبلیغ" کی برکتیں سنی تھیں مگر آج اس کا جادو خود ہماری آنکھوں کے
سامنے ہے۔ بلاشبہ "قبولیت" ہی فی زمانہ کسی کام کے اخلاقی اور روحانی پایہ کی جانچ کے معیار رہ گئے ہیں:۔

بہر کیف جس طرح ہاتھی کے دو قسم کے دانت ہوتے ہیں اس بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے دو چہرے ہیں ایک روپ
اصلی ہے جس کا نام کنہیا لعل جی ہے دوسرا روپ ملک والوں کے درشن کے لئے ہے اس کا نام منشی پریم چند ہے اور
دونوں کی اس تحریک کو ضرورت ہے اس خیال سے کہ لوگ اس مسئلہ کے متعلق زیادہ سنجیدگی سے نہ سوچیں ایک
روحانی دیوتا کی بھی ضرورت تھی جسے مہاتما گاندھی جی نے پورا کر دیا جو سیاسی مار دھاڑ سے تھک کر سورہنا زیادہ
پسند کرنے لگے ہیں چنانچہ جس طرح ہندی سمیلن کو ان کی ضرورت ہے اُن سے زیادہ انہیں سمیلن والوں کی ضرورت
ہے تاکہ دیش کو ان کے نیم خوابی کا حال نہ معلوم ہو۔ ایک زمانہ تھا کہ مہاتما گاندھی اور کانگریس کو "مشاطہ" کی حاجت
نہ تھی۔ عمل اور جدوجہد میں اس دل آرام کو اپنے سنوار کا ہوش بھی نہ تھا مگر آج اس کی ضرورت ہے کہ راجندر بابو
سارے دیش کا دورہ کر کے ملک کو اطمینان دلائیں کہ "بیمار کا حال اچھا ہے"۔ جوبلی منائی جائے اور اس کے لئے
لبرل خیال کے لوگوں سے کھلم کھلا مدد لی جائے چنانچہ بھارتیہ ساہتیہ اور مہاتما جی کا قران ہو گیا علاوہ "اہنسا" کی
قوت تسخیر پر پورے ۳ کالم کا نوٹ دینے کے (صفحات ۱۱۴۔ ۱۱۵ "ہنس" نومبر) "ہنس" کے پہلے ہی اداریہ میں "مہاتما جی
کی جانتی" (سالگرہ) پر مہاتما جی کی سیاسی اور ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب ان الفاظ میں حق عقیدت

ادا کرتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے :

"..... ہم بھی اس سلسلہ میں اپنا ہدیۂ نیاز پیش کرتے ہیں۔ مہاتما جی کی شخصیت نے ملک کے خیالات میں جو بیداری پیدا کر دی ہے اُسے ہم انقلاب کہہ سکتے ہیں اور زندگی کی جیسی سچی مثال آپ نے ملک کے سامنے قائم کی ہے اس نے انسانیت کو الوہیت سے بھی بلند و بالاتر کر دیا ہے جو ہمارے ذہن میں شخصیت کا سب سے اعلیٰ پائیۂ تخیل ہے (الوہیت اور شخصیت کا یہ قران بھی دیدنی ہے۔ اشرف) آخر ادب ہماری تحریک بیداری کے ماسوا اور کیا ہے ؟ اگر ہم بغور دیکھیں تو ہمیں گاندھی جگ (جس طرح دو حضرت مسیح سے مورخین اپنا حساب لگاتے ہیں۔ اشرف) سے پہلے اور اس کے بعد آنے والے ادب میں ایک نمایاں فرق دکھائی دے گا۔ گاندھی جگ نے جس ادبی تحریک کی بنیاد ڈالی اُس میں قوتِ عمل۔ حریتِ فکر اور زندگی کے لئے سہولت اور اطمینان (بے خوفی) ہے ...... ہندی زبان کو قومی زبان کے منصب پر پہنچا کر آپ نے جس سیاسی دوربینی کا ثبوت دیا ہے وہ صرف آپ ہی کے شایانِ شان تھا۔ آج جو ہم قومی ادب کی یکتائیت کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ بھی آپ ہی کی پاک ہدایتوں کی برکت ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی بھاشا کو آپ کی مساعی جمیلہ کی بدولت جو زندگی جو ترقی جو عروج نصیب ہوا ہے وہ پہلے نہ تھا۔ آپ نے ملک کو بھاشا عطا فرما کر گونگے کو زبان بخشی ہے ......"

("ہنس" اکتوبر صفحہ ۱۱۵)

لکھنے والے کو جلدی یا فرطِ عقیدت میں سوچنے کا موقع نہیں ملا کہ سیاسی "دوربینی" جس پر اُنہوں نے مہاتما جی کو داد دی ہے اس نے مہاتما جی سے اُن کی قومی ادب پر سوچنے کی اہلیت اور نظری اور بے لاگ حیثیت (اگر موجود تھی تو) بالکل چھین لی۔ اسی "راجنیتک دور درشنا" کی وجہ سے ہریجن اندولن بھی شروع ہوا جس کی بدولت غیر ہندو کانگریس کے سیاسی کاموں میں حصہ لینے سے محروم ہو گئے۔ بہر حال لکھنے والے کا مدعا یہ تھا کہ جب اُس شخص نے جس نے خود اپنی مثال سے الوہیت کا ثبوت دیا ہے، جس کی بدولت ایک نیا جگ (اس کل جگ میں !) شروع ہوا ہے اور جس نے اس گونگے ملک کو زبان بخشی ہے جب وہ ہمارا حامی اور ہادی ہے تو اے ملک والو تم اس کے متعلق سوچنے والے کون ؟

(۳)

اب ایک سرسری نظر "ہنس" کے دو نمبروں کے مضامین پر ڈالتے چلیں۔ لکھائی، چھپائی۔ کاغذ غرض ہر لحاظ سے یہ رسالہ دیدہ زیب ہے۔ چندہ بھی زیادہ نہیں سستے رسالہ نہ ہے اور ۔ ارفی پرچہ۔ قومی اور دھارمک حدود میں رہ کر اس سے بہتر ہندی ماہانہ نکالنا مشکل شاید ناممکن بھی ہے۔ محض اطلاع اور واقفیت کے لحاظ سے بھی ہندی زبان میں بالکل اچھوتا ہے۔ صوبجاتی ادب کے نمونے گو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ کے مطابق دئے ہیں مگر پھر بھی بہت کافی ہیں۔ بعض بعض مثلاً مسز لیلاوتی منشی کا المیہ جو گجراتی سے لیا ہے اور "آنند" کا فسانہ "جیون" تو ہمارے لئے بالکل نئی چیزیں ہیں اور فن کے لحاظ سے بڑی مکمل ہیں۔ شعرا شعار اور ادیبوں کے سوانح بڑی تعداد میں ہیں اور اچھے ہیں۔ البتہ مزاحیہ مضمون کوئی نہیں ہے جو حقیقتاً ہندو "ادبیات اعلیٰ" کا پرتو اور ہماری ماتمی قومی ذہنیت کی صحیح ترجمانی ہے۔ شعرا شعار میں زیادہ تر "روحانیت" ہے حتیٰ کہ سندھی اور تامل زبان کی کرتاؤں میں بھی صرف یہی چیز نظر آئی ہے۔ دوسرے نمبر میں صوبجاتی جریدوں کے اقتباسات نہیں دئے مگر یہ کمی بالکل اتفاقی معلوم ہوتی ہے۔ بیرونی ادیبوں سے صرف ایسی چیزیں لی ہیں جو صرف ہندوستانی قوم پرستی کی عینک سے نظر آسکتی ہیں اور یہ معذوری جبلی ہے۔ یوروپین ادیبوں کے متعلق جو مضمون درج کیا ہے اُس میں بیسویں صدی کا ادیب یا انقلاب پرست یا پرولتاری ادیب کوئی نہیں ہے۔ لے دیکر ایک مضمون "وشوا بھارتی" سے ونٹرنٹس جیسے مستشرق کا نقل کیا ہے اور وہ بھی "اتحاد انسانیت" پر جس کے لئے فارسی کا ایک مصرعہ ہی کافی تھا کہ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ البتہ مرہٹی جریدہ "کرات" سے ایک نوٹ آنری۔ باربوس آنجہانی فرانسیسی انقلاب پرست ادیب کے متعلق درج ہے۔ فی الجملہ معصوم اور پرامن قسم کے مضامین دیکھ بھال کر رکھے گئے ہیں جس کی داد مہاتما گاندھی دیں گے۔

اب بعض مضامین پر نظر ڈالئے بالخصوص ان مضامین پر جو سماج کے متعلق اپنے خیالات اور نظریے کے سرآ میں پیش کرتے ہیں مگر ہم پہلے ہی اس امر کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم ان مضامین کو اُن نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے جن سے جنارد ن رائے جی نے "گھر کی راہ" پر تبصرہ کیا ہے یعنی یہ کہ "دوش ہیں پر ہے درگزر کر دینے چاہئیں"۔ (ہنس اکتوبر صفحہ ۸۹) رواداری کا صرف وہی مبصر قائل ہو سکتا ہے جس کے سامنے زندگی کا اچھا برا کوئی نظریہ

نہیں ہے۔ چونکہ منشی پریم چند اور کنہیا لعل جی کی زبان سے اس مضمون میں بحث کی گئی ہے اس لئے اُن کے افسانوں پر تنقید کرنے سے عمداً طوالت کے خیال سے احتراز کیا گیا ہے۔

اکتوبر نمبر میں اردو کے ۳ مضمون نقل کئے ہیں۔ ایک ڈاکٹر اقبال کی نظم ’ماں کا خواب‘ دوسرے ڈاکٹر محی الدین قادری کا مضمون ”دکن کی اردو شاعری“ جس میں کچھ تو اس نئے قومی ادب کی ٹکسالی برج بھاشا پائی جاتی ہے اور کچھ پنڈت مالوی جی کی اردو تقریر کا ہندی تحریر میں جواب ہے۔

تیسرے ڈاکٹر شری جاکر (ذاکر) حسین صاحب کی کہانی ابو خاں کی بکری۔ ہندی فسانوں میں ایک منشی پریم چند کا فسانہ ”لاٹری“ ہے۔ دوسرا رتن کماری کا ”پرتھم یاچنا“ (پہلی مانگ) کے نام سے۔ گجراتی سے ’دھوم کیتو‘ کا ایک فسانہ ”راجپوتانی“ لیا ہے کناڑی سے ’آنند‘ کا فسانہ جس کا ہم تذکرہ کر آئے ہیں۔ علاوہ اس کے بنگالی سے ٹیگور کا ایک قابل ذکر مضمون ”بدلتا ہوا زمانہ“ ہے۔

’آنند‘ کا ’جیون‘ تمام فسانوں میں بلاشبہ بہترین ہے۔ قصہ معمولی ہے۔ ایک بیشہ ور عورت اپنے بچے کے ہاتھ اپنے بنائے ہوئے خوبصورت رومال بکوا کر لوگوں کو بلاتی ہے اور اپنی نوعمر بیٹی انہیں پیش کرتی ہے۔ ایک نوعمر کانگریسی اور ایک سمجھدار با مذاق نوجوان، اس میں پھنس جاتے ہیں۔ نوجوان کانگریسی اس عورت کی اخلاقی پستی پر کچھ خفگی کا اظہار کرتے ہیں جس سے مجبور ہو کر یہ عورت حقیقت بیانی اور واقفیت پرستی سے ان بزرگ کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ موجودہ سماج میں عورت کی پوری داستان حقیقتاً ایک جامع فقرہ میں اس طرح بیان کر دیتی ہے کہ ”مردوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے کئی طریقے ہوں گے لیکن عورت کے لئے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ خودکشی کرے یا اپنے شریر کو بیچ دے“ (صفحہ ۱۹) کاش یہ قول تحریک نسواں کا نقش نگیں ہوتا۔

”پرتھم یاچنا“ میں انسانی ہمدردی کا وہ ارزاں تصور ہے جو آج کل کانگریسی لیڈر ”گاندھی سوشلزم“ کے نام سے پیش کرتے ہیں یعنی ایک بے بس اور مظلومہ پر ایک زمیندار کے مظالم دیکھ کر ایک دیش بھگت نوعمر اور پڑھے لکھے ماسٹر صاحب بلک اٹھتے ہیں۔ اُس بدنصیب کے ایک بیٹی بھی ہے۔ انتہائی پریشانی میں جب وہ فرار ہونے کی فکر کرتی ہے اور ماسٹر صاحب سے کہتی ہے کہ ”میری شکلا کو بچائیے۔ میری سی دشا (حالت) اُس کی بھی ہوتی جا رہی ہے“ تو ہمارے ہری بابو فرماتے ہیں کہ ”میں نے بڑی جلدی سے کہا۔ میں اُس سے وواہ (بیاہ) کروں گا“۔ اس طرح میرے پاپ

کا پرشچت (تزکیہ) کچھ نہ کچھ ہوگا ہی" (صفحہ ۹۹) غالباً اسی قسم کے خیالات سے جدید میلانات مراد ہیں جن کا کنھیا لعل
جی نے مذکورہ انگریزی رسالہ میں مقاصد کے سلسلہ میں تذکرہ کیا ہے یعنی سماج کی خرابیوں کا انفرادی تصور اور روحانی
نجات سے علاج۔ اگر ہری بابو اسی انداز سے اس سماج کا سدھار کرتے رہے تو سماج کا جو کچھ انجام ہوگا وہ تو ظاہر
ہے خود ہری بابو کا انجام کیا ہوگا؟

'دھوم کیتو' صاحب کا فسانہ ہندوانداز میں ٹاڈ کی تاریخ راجستان کی ایک رومانی تفسیر ہے۔ "راجپوتانی"
میں ایک راجپوت ویر اپنی دلہن کو رخصت کرانے جاتا ہے اور بیچ میں دریائے روپیٹر میں ڈوب کر جنگ میں شہید
نہ ہونے کی وجہ سے آسیب بنجاتا ہے۔ چنانچہ ایک "دیوی پتر" چارن نام اس کی بیاہتا بیوی کو لانے اور اس سے
ملانے کا عہد کرتا ہے آخر "راجپوتانی" بھی آرین تھی اس نے جب سنا کہ اس کا خاوند آسیب بنکر راہگیروں کو ستاتا
ہے اور وہ چونکہ اسی لئے ستی نہیں ہوئی تھی کہ اسے امرجیو اور حیات جاوید بخشے اس لئے وہ تیغ بکف خاوند کی مقابل
ہوئی اور دونوں لڑتے ہوئے دریا میں غائب ہوگئے اور دونوں شہادت اور ستی کے درجہ پر پہنچ گئے جو لوگ
خود راجپوت نہیں ہیں اور انحطاط پذیر قوم کو رومانیت اور آرین آنکھوں سے دیکھنے کے لئے مجبور ہیں وہ سوائے اس
کے اور کیا لکھ سکتے تھے۔ 'دھوم کیتو' اگر آنند کمارا سوامی جیسے آرٹسٹ کی ہمجنسی اختیار کریں تو پھر خوب گزرے گی۔

ہمیں بعض اعتبارات سے سب سے دلچسپ اور واقعیت نگاری کا نمونہ "ابوخاں کی بکری" میں نظر آیا اور
ہم ڈاکٹر ذاکر کو اس کامیاب کہانی اور اس کی زبان پر مبارکباد دیتے ہیں۔ کہانی خوبصورت اور مختصر سی ہے
اور بچوں کے لئے اُن کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ ابوخاں نے چاندنی نام رکھکر ایک بکری پالی وہ ایک دن آزادی
کے جوش میں جنگل میں نکل گئی۔ رات ہوگئی اور بھیڑیا آیا۔ چاندنی کا ناتواں جان نے مقابلہ تو جم کر کیا یہاں تک
کہ صبح ہوگئی مگر بالآخر آنکھیں تو کھلی رہ گئیں پر مرگئی بکری۔ لیکن مرنے سے پہلے ایک سچّے مسلمان اور قوم پرست
کی حیثیت سے چاندنی نے کہا کہ "اللہ تیرا شکر ہے۔ میں نے اپنی بس بھر مقابلہ کیا۔ اب تیری مرضی!" اب تماشائیوں
میں جو درخت پر بیٹھے یہ سب دیکھ رہے تھے یہ بحث شروع ہوئی کہ فتح کس کی ہوئی زیادہ تعداد اس پر مُصر تھیں کہ
بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا کہتی ہے۔ چاندنی جیتی" (صفحہ ۴۴) کہانی گزشتہ ۱۵ سال کی سیاسی اور سماجی تحریکات
کا مرثیہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو جوان پیر سال" تحریک سے باہر بیٹھے واقعات اور حادثات کو علمی عینکوں سے دیکھ رہے ہیں وہ

صرف اخلاقی ہی پہلو پر زور دے سکتے ہیں جس سے نہ کسی سماجی تحریک کے اسباب نمو کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے نہ موجبات تنزل کے تجزیہ میں۔ البتہ اخلاق محسنی اور اخلاق جلالی پڑھنے والوں کو روحانی تسکین ضرور حاصل ہوتی ہے۔ بکری کی ناتوانی سے مایوس ہو کر ڈاکٹر ذاکر نے پیام تعلیم میں ایک دوسرے قصہ میں عقاب پالا ہے مگر وہ کمبخت بھی مجروح ہو گیا۔ دیکھئے تصوف کی منزلوں تک کب تک آتے ہیں۔

مضامین میں ٹیگور کا مضمون "بدلتا ہوا زمانہ" قابل ذکر ہے۔ اس میں اپنے روحانی خیال کے مطابق ہندوستانی تاریخ کی تمام قومی خصوصیات گنانے کے بعد گرو دیو نے یورپ اور جاپان کی تباہ کاریاں گنائی ہیں اور آئندہ کی ہولناک جنگ کے خطرہ سے آگاہ کیا ہے لیکن ہمارے رشی ٹیگور جو کچھ دیش کے سامنے آج ۱۹۳۵ء میں پیش کر سکے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ "ہم کبھی اس بات کو تسلیم نہ کریں کہ جس کے ہاتھ میں طاقت ہے وہ بھول چوک سے پرے ہو جاتا ہے۔ ہمیں کھلے الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ جس کے پاس طاقت سب سے زیادہ ہے اُس کی ذمہ داریاں بھی سب سے زیادہ ہیں...... ہمیں ماننا پڑے گا کہ نیا دور اپنی ساری پونجی خرچ کر کے ایک دم دیوالیہ ہو گیا ہے اور بس اس کے بعد تباہی ہے" (صفحہ ۱۰) لب ولہجہ ایسا ہے جیسے مسٹر لینسبری آج ملک حبش کی سیاسیات پر فریاد کر رہے ہوں یا کوئی کونسل آف اسٹیٹ کا نامزد شدہ ممبر حکومت کی فوجی پالسی پر تقریر کر رہا ہو۔

نومبر کے ہنس میں ترجموں اور مضامین کی زبان کسی قدر آرین روپ اختیار کرتی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم زبان کے لحاظ سے برج اور خیالات کے اعتبار سے بنارس کے قریب آتے جا رہے ہوں۔ اُردو کے صرف پانچ اشعار نواب علی صاحب کے درج ہیں اور مقطع میں عرض کیا ہے کہ:۔

زباں نواب دل کی ایک ہے اُردو ہو یا ہندی
رہیں مل جل کے آپس میں نہ کیوں اے ہموطن دونوں

ادب اور زندگی پر دو اچھے مضمون ہیں ایک ہندی میں "پرساد" کا کاویہ اور کلا (شاعری اور آرٹ) پر اور ایک نارانا تھ کا کناڑی زبان سے "سہتیہ محانسا" (ادب پر ایک نظر) ہماری طبیعت بے ساختہ چاہتی ہے کہ ان انشاپردازوں سے گزارش کریں کہ اگر اس مبحث پر اور نہیں تو اختر رائے پوری کا مضمون "ادب اور زندگی" "اردو" رسالہ کے گزشتہ نمبر میں پڑھ لیں۔ اس کے پڑھنے سے ان کا بھلا ضرور ہوگا۔ پروفیسر پوتدار کا مضمون "صوبجاتی زبانوں کا

مستقبل" نہایت دلچسپ بلکہ عبرت انگیز ہے اور ہم آگے چلکر اس کا حوالہ دیں گے۔ پربھاکر ماچوے اور موتی راؤ کے مضامین مرہٹی زبان کے فسانہ نگاروں اور جدید کناڑی ادب پر خوب ہیں اسی طرح بھارتیہ صاحب کا مضمون گرو بھگت سنگھ جی کی شاعری پر مگر ہمیں فسانے بالطبع زیادہ بھاتے ہیں اس لئے ہم کچھ اشارہ ان کے تخیلات پر ضرور کریں گے۔

مرہٹی سے ایک فسانہ "ندی کی باڑ" نقل کیا ہے جس میں سوائے اس کے کہ قدرتی مصائب نے دو ہندو اور عیسائی خاندانوں کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو مٹا دیا کوئی خاص بات نہیں۔ ضرورت سے زیادہ طویل ہے اور ناکامیاب انداز سے لکھا گیا ہے۔ کناڑی زبان کا ایک فسانہ 'سرنیواس' کا لکھا ہوا" وہ اندرا ہی تھی" اچھا ہے۔ مختصر ہے۔ مرحومہ بیوی کے خواب میں آنے کا قصہ ہے جس میں خاوند کی یہ حس ابھی باقی ہے کہ شاید یہ شعور کا دھوکا ہو۔

جیسا ہم نے اوپر تذکرہ کیا مسز لیلا وتی منشی کا المیہ "پتن کی ایک کرڑ کتھا" (ایک پنچ کا سانحہ) اس لحاظ سے بہت اچھا ہے کہ اس میں عورت کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچ دی ہے جو کسی مرد کے لئے بہت مشکل ہے۔ قصہ ڈائری کے انداز میں لکھا ہے وسنت سینا ایک شریف گھرانے کی لڑکی سوتیلی ماں سے گھبرا کر خاوند کے مرنے پر جیٹھ کے پھندے میں پھنس جاتی ہے جس سے ایک لڑکا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بچہ کو یتیم خانہ میں چھوڑ کر تلاش روزگار کے لئے بمبئی آتی ہے اور سینما میں نوکر ہو جاتی ہے حسین اور بالطبع تیز ہونے کی وجہ سے اُسے کامیابی ہوتی ہے۔ بچّے کے مر جانے کے بعد آہستہ آہستہ اس میں ایک نوعمر اور نارمل عورت کے لطیف جذبات پیدا ہوتے ہیں جس میں ایک دوسری سینما ایکٹریس ترو بالا کے رشک سے بڑی مدد ملتی ہے۔ تھوڑے دن میں اُسے سب سے مشہور ایکٹر شنکر سے محبت ہو جاتی ہے مگر ہندو ازدواجی عقائد کہیں نیم شعوری ذہنیت کی تہ میں دبے ہوئے ہیں ایک اجنبی کے خاوند کی یاد دلانے پر ابھر آتے ہیں ۔اسی نیم شعوری حس نے شراب پینے پر مائل کیا تھا اور یہی میلان گناہ کی جڑ۔ آزادی اور صحت کے تباہ کرنے کا باعث ہوا۔ جب صحت اچھی تھی اور اُس کا جیٹھ آیا تو لکھتی ہے کہ ..... اُنھیں دیکھکر غصہ کرنے اور ذلیل کرنے کے بدلے مجھے تو رحم ہی آیا۔ میں چاہے جیسی ہوں لیکن اس ادھرمی کے پنجے میں تو پھنسی ہوئی نہیں ہوں۔ میری موجودہ زندگی کو چاہے اخلاقی اعتبار سے کچھ کہئے مجھے تو اتنی اچھی لگنے لگی ہے کہ اگر سُو سکھ

بھی ملیں تو بھی میں پہلی زندگی پسند نہیں کروں گی" (صفحہ ۲۹) جہاں آزادی کی یہ مسرت ہے وہاں خاوند کے دوست کو دیکھ کر ضمیر (ہندو دھرم) کی ملامت سے گھبرا کر مارا مار شراب پیتی ہے اور اس نفسیاتی ردِّ عمل میں یہ کہتی ہے کہ اس بیکار زندگی سے حاصل کیا۔ اتنا زمانہ اگر شراب پینے میں گزرتا تو کتنا اچھا ہوتا"۔ اسی عالم میں ہم اُسے چھوڑ دیتے ہیں۔

سب سے آخر میں ہمارے لئے قابلِ تبصرہ ایک ڈراما "سروسمپرن" (ایثار کامل) ہے جس کا پلاٹ ٹیگور سے لیکر گنیش پرشادجی نے ہندی جامہ پہنایا ہے۔ قصہ ہندو عورت کی ازدواجی زندگی کا ہے مگر نام لسے آرین آدمی نے دیا ہے۔ غالباً اگر کوئی عورت لکھنے بیٹھتی تو کوئی دوسرا نام رکھتی بہرکیف تصویر بڑی سچی ہے۔ پلاٹ یہ ہے کہ ایک نوجوان ونود نامی اوما سے شادی کرتا ہے جس سے بچّہ ہوتا ہے اور نسائی امراض اور پریشانیوں کی بدولت عورت لبِ مرگ ہوجاتی ہے۔ ونود بابو دفعتاً محسوس کرتے ہیں کہ اُنھیں محبت ایک دوسری نوعمر لڑکی نرملا سے ہے اور بیوی کو اس حالت میں چھوڑ کر نرملا کے ساتھ گھر چھوڑنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ہندو بیوی اور ایک معاشی غلام کے لئے اب سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ وہ اپنے ان داتا ونود کو جس طرح ہوسکے منائے۔ کچھ روحانی فکر بھی تھی کہ اگر ونود گھر چھوڑ کر نرملا کے ساتھ چلے گئے تو میری نعش کو کون لیجائے گا"۔ میاں بیوی اور نرملا کے ایک متر بھی تھے پریم نامی جو بزعم خود ناستک (لامذہب) بھی تھے۔ چنانچہ وہ اوما کو وہ قیمتی مشورہ دیتے ہیں جو پراچین ہندو حکومت کے زمانہ میں پنڈت ایک متاہل بیوہ کو ستی کرانے کی خاطر دیتے تھے یعنی فرماتے ہیں کہ "ایکبار دونوں ہاتھ سے کلیجہ تھام کر کہدو۔ دیا ہم نے جو سب سے قیمتی ہے۔ وہی دیا اُس کو جس کو پیار کیا سب سے زیادہ۔ بس اُس گھڑی دل ہلکا ہوگا پر سکون ہوجائے گا۔ کچھ کام نہیں ہے دیوی دیوتا کا۔ کہو کہو۔ دیا...... سب ۔ کچھ..... اپنا سروسوا نہیں دیا، کچھ بھی نہیں رکھا ہاتھ میں۔ اب خالی ہاتھ ہوکر چلی سنسار سے"۔ یعنی مشورہ یہ ہے کہ دل سے سوکن کو اجازت دو۔ اوما نرملا کو اپنا قیمتی پچلڑا دیکر اُس کا منہ چومتی ہے مگر پھر بھی پریم کو اطمینان نہیں ہوتا کہ اُس نے یہ ایثار دل سے کیا ہے یا نہیں۔ بالآخر بدنصیب عین جانکنی کے عالم میں سوکن کے پاؤں چومنے کو اُٹھتی ہے اور مرجاتی ہے۔ اب آرین، مرد کے ٹھاٹ دیکھئے۔ اُس کا اس بیاہ سے جو تعلق رہ گیا ہے وہ نرملا کے عشق سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ بات بات پر اس بدنصیب کو ڈانٹتے ہیں۔ کسی بات کے جواب میں کہتے ہیں "ٹھرو! ابھی بتاتا ہوں"! کبھی صرف "ہوں" کہتے ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں "اے! تم کیا کرتی ہو"۔

عورت کی پستی اور غلامی کا یہ انسانیت سوز نمونہ ہے جو قربانی کے دلکش عنوان سے پیش ہوتا ہے۔ کاش قلم عورت کے ہاتھ میں ہوتا۔

یہاں مضامین اور اُن کے سماجی خیالوں پر سرسری تنقید تھی۔ اب کچھ قومی زبان کے متعلق جو رسالۂ "ہنس" کے ایڈیٹر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دو ایک نمونے ہم پہلے بھی دے آئے ہیں۔ یہاں کنہیا لعل منشی اور منشی پریم چند جی کی نئی اور پرانی زبان کے متعلق کچھ "سخنہائے گفتنی" کہنا ہیں۔

ہنس کو یہ تسلیم ہے کہ سادہ اردو اور سادہ ہندی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس سے زیادہ یہ کہ اُس نے پنڈت جواہر لعل جی کے جو خیالات اس تحریک کے متعلق پیش کئے ہیں اُن میں بھی زور اس پر دیا گیا ہے کہ "ہندی اور اردو تو بہنیں نہیں ہیں۔ ایک ہی شے پر دو چہرے ہیں"، ("ہنس" نومبر صفحہ ۱۱۶) خود جو زبان کنہیا لعل جی اپنے فسانوں میں لکھتے ہیں اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ گویا مدراس کے ایک منظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ (اردو خط میں)

"گھبراتے گھبراتے دونوں سب لڑکوں کے بیچ سے ہو کر جاتے ہیں پر او نچے سے نیچے نہیں دیکھ سکتے۔
باپ رے! کتنے لڑکے ہیں یہاں۔ کوئی کوئی تو اُن کی طرف انگلی دکھاتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ کیسے رہا جائے گا۔ یہ وچار اُنہیں گھبراہٹ میں ڈال دیتا ہے"۔ ("ہنس" نومبر صفحہ ۹۱)

اب منشی پریم چند جی کی زبان ملاحظہ ہو۔ رشید صاحب کو خط اردو میں اس انداز سے لکھتے ہیں:۔

"جناب مکرم۔ تسلیم۔ نادم ہوں کہ اب تک ارشاد کی تعمیل نہ کرسکا۔ چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی سی چیز خدمت میں بھیجوں اور وہ چیز نہیں ہو پاتی۔ اس کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت ہے وہ نہیں میسر ہوتی۔ میرا نیا افسانوں کا ہندی مجموعہ جس میں تقریباً ایک ہزار صفحات ہوں گے زیر ترتیب ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنا نیا ناول بھی صاف کر رہا ہوں جسے نومبر سے پریس میں دینا ہے اور جو ۶۰۰ صفحات سے زائد ہوگا دل اور دماغ اُدھر لگا ہے" وغیرہ وغیرہ

اردو "پیام تعلیم" دہلی کے تاسیس نمبر (نومبر و دسمبر ۱۹۳۵ء) میں بچوں کے لئے "نئی دنیا" کا تخیل ان دلکش الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

"وہ دنیا امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ، حاکم و محکوم کی دنیا نہ ہوگی۔ اس دنیا میں سبھی بھائی بھائی ہوں گے جسمانی طاقت کی بنا پر اونچی تعلیم کی بنا پر یا سیم و زر کے انباروں کی بنا پر کسی کی عزت نہ ہوگی۔ عزت کا معیار ہوگی انسانیت، حق پسندی اور خدمت کا ذوق۔ لوگ ثروت اور رتبہ کے لئے کسب کمال نہ کریں گے بلکہ اپنے بھائیوں کی خدمت کے لئے۔ تب حکومت کے معنی ہوں گے زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی صلاحیت ..... علم کے معنی اونچے عہدے نہوں گے بلکہ حق پر قربان ہونے کی طاقت اور دولت کو تو اس دنیا میں لعنت سمجھا جائے گا جس نے تمہاری اس پرانی دنیا کو دوزخ بنا رکھا ہے .... اس دنیا میں جائداد نام کی کوئی چیز نہ ہوگی ...... وہی دنیا تمہاری منزل مقصود ہے وہی تمہاری زندگی کی معراج ہے۔"

یہ اندازِ کلام مسلمانوں یا بچوں تک محدود نہیں ہے مثلاً اُن کے فسانہ "لاٹری" کی زبان ملاحظہ ہو:۔

"جلدی سے مالدار ہو جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی۔ اُن دنوں جب لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے دوست وکرم کے پتا اور چچا اور ماتا اور بھائی سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے۔ کس کے نام آئے، روپیہ رہے گا تو گھر ہی میں" ("ہنس" اکتوبر صفحہ ۷۶)

لیکن یہی کنہیا لعل منشی جی اور پریم چند جی جب قومی زبان بنانے چلتے ہیں تو زبان دفعتاً عام روزمرہ سے بدلکر ایک اعلیٰ طبقہ کی اور وہ بھی ایک ہندو پنڈت کی زبان ہو جاتی ہے۔ مثلاً مہاتما گاندھی جی کا ایک وہ اردو خط تھا جس کا ہم تذکرہ کر آئے ہیں۔ ایک وہ سندیش (پیام) ہے جو "ہنس" قومی زبان میں اس طرح پیش کرتا ہے:۔ (ہندی عبارت)

"ہنس" ہندوستان بھر میں انوکھا پرتین ہے۔ یدی ہندی اتھوا ہندوستانی کو راشٹر بھاشا بنانا ہے تو ایسے ماسک کی اوشیکتا ہے۔ پرتیک پرانت کی بھاشاؤں میں جو لیکھ لکھے جاتے ہیں اُس کا پریچے راشٹر بھاشا دوارا سب کو ملنا چاہئے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب ایسا پریچے دل چاہئے اُن کو ہنس دوارا پرت ماس آدھے روپیے میں مل سکے گا۔"
("ہنس" اکتوبر صفحہ ۱)

یعنی۔ (صوبجاتی اردو)

"ہنس" ہندوستان بھر میں ایک انوکھی کوشش ہے۔ اگر ہندی یعنی ہندوستانی کو ملکی زبان بنانا ہو تو ایسے ماہانہ کی ضرورت ہے۔ مختلف صوبوں کی زبانوں میں جو مضامین لکھے جاتے ہیں اُنھیں دیکھنے کا موقع

ملکی زبان کے ذریعہ سب کو ملنا چاہئے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب ایسا موقع مان ملنے ہنس کے ذریعہ ہر مہینے آدھے روپئے میں مل سکے گا۔"

کنہیا لعل جی کا روپ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں۔ اب منشی پریم چند کے تیور دیکھئے۔ بھارتیہ سہتیہ پرشد اور قومی زبان کی ذمہ داری کا احساس ہوتے ہی منشی جی برج باشی ہی نہیں بلکہ کاشی نواسی ہو جاتے ہیں۔ مولانا حالی کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔ (قومی زبان کی ہندی عبارت)

"سورگیہ مولانا حالی (خواجہ الطاف حسین) اردو سہتیہ کے یگ پرورتکوں میں ہیں اور گت سپتاہ اُن کے جنم ستھان پانی پت میں اُن کی جانیتی جس سمروہ سے منائی گئی، وہ اُن کی شان کے سرو تھا یو گیہ تھی۔ سبھاپتی کے آسن کو ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال نے سشوبھت کیا تھا اور بھارت کے پرتیک پرانت سے بھکتوں نے آکر اپنی شرندانجلی اُن کی سمرتی کی بھینٹ کی۔ اُن میں نواب بھی تھے، رئیس بھی تھے، سہتیہ کے اُپاسک بھی تھے۔ علی گڈھ اور عثمانیہ وشو و دالیوں نے بھی اپنے پرانت ندہی بھیجے تھے۔... وغیرہ وغیرہ

مولانا حالی اردو سہتیہ میں نویگ کے پرورتک ہیں۔ اردو شاعری کو النکاروں اور کرتم بھاوؤں اور درہ کے پچڑوں سے مکت کرکے اُس میں جاگرتی پیدا کرنے والی بھاؤنائیں بھریں۔ آپ کا مسدس اردو سہتیہ کا سب سے پرسدھ کاویہ گرنتھ ہے جس میں مولانا حالی نے مسلم راشٹر کے اُتھان اور پتن کا ورتانت اوج اور پرساد سے بھری ہوئی شولی میں بیان کیا ہے..... خوشی کی بات ہے کہ اس سمروہ میں ہندو سہتیہ کار بھی شریک ہوئے تھے۔ سہتیہ ایک ایسا چھیتر ہے جہاں پانتھک بھید بھاؤ کے لئے استھان نہیں۔ ("ہنس نومبر صفحات ۱۲۱-۱۲۲)

لیکن واقعہ صرف اتنا ہے:

"مولانا حالی مرحوم (خواجہ الطاف حسین) اردو ادب میں نئے دور کی بنا ڈالنے والے ہیں اور پچھلے ہفتہ ان کے وطن پانی پت میں اُن کی برسی جس دھوم دھام سے منائی گئی وہ اُن کے شایانِ شان تھا۔ صدارت کی کرسی کو ہز ہائنس نواب صاحب بھوپالی نے زینت بخشی تھی اور ملک کے ہر صوبہ سے

عقیدت مندوں نے آکر اُن کی یاد میں اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔ اُن میں نواب بھی تھے رئیس بھی تھے ادیب بھی تھے۔ علی گڈھ اور عثمانیہ یونیورسٹیوں نے بھی اپنے نمایندے بھیجے تھے۔ . . . .

مولانا حالی اردو ادب میں نئے دور کے بانی مبانی ہیں۔ اردو شاعری کو تصنع اور بناوٹ اور ہجر و وصال کی خرافات سے نجات دلاکر آپ نے نئی جان ڈالنے والے اسلوب بھرئے۔ آپ کا "مسدس" اردو ادب میں شاعری کا سب سے خوبصورت مجموعہ ہی جس میں مولانا حالی نے مسلم حکومت کے اتار چڑھاؤ کی جیتی جاگتی تصویر پرزور اور پر اثر انداز میں کھینچی ہی۔ . . خوشی کی بات ہے کہ اس جشن میں ہندو ادیب بھی شریک ہوئے ادب کی ایسی منزل ہی جہاں فرقہ وارانہ تفریق کی گنجایش نہیں"۔

اس عبارت کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی جی سوچتے اب بھی اردو ہی میں ہیں چنانچہ باوجود کوشش کچھ الفاظ اب بھی نادانستہ طور پر اردو کے آگئے ہیں جن کے بدل بآسانی ہندی میں مل سکتے تھے مثلاً شان، رئیس، نواب، بیان، شریک وغیرہ۔ حیرت ہے کہ جس طرح اردو داں بعض اوقات فارسی اور عربی سے الفاظ لیکر اپنا مطلب ادا کرتے ہیں اس نئی ہندی میں نادانستہ طور پر اس کی ضرورت رہتی ہے کہ اردو سے الفاظ لئے جائیں چنانچہ ایک سے زیادہ مضمون "ہنس" کے اس کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں مگر عالم یہ ہے کہ یونیورسٹی کے لئے بھی "وشو ودالیہ" جیسے غیر مانوس اور بے جوڑ الفاظ رائج کرنا چاہتے ہیں۔

ان نمونوں کو پیش کرنے کے بعد تنقید و تبصرہ لاحاصل ہی۔ ہم یہ نتیجہ نکالنے پر بالکل مجبور ہیں کہ جو زبان قدرتی طور پر قومی زبان کم از کم صوبجات متحدہ اور پنجاب وغیرہ میں خود بخود بنتی جارہی تھی اور جو "اسلامیت" اور فارسی اور عربی سے خود بخود دور ہوکر بڑھنے اور عام ہونے کی کوشش کر رہی تھی یہاں تک کہ خود پریم چند جی کنہیا لعل جی، لیلاوتی جی اور دوسرے مشہور ادیبوں کے خمیر اور گھٹی میں مل گئی تھی اُسے مصنوعی "آریہ" قالب میں ڈھالکر "راشٹر بھاشا" بنایا جارہا ہی۔ کاش یہ لوگ ہندی کی کہاوت یاد رکھتے کہ جو عورت ماں سے زیادہ چاہنے کا دعویٰ کرتی ہے وہ اکثر ڈاین ہوتی ہی۔

منشی پریم چند کے بارہ میں اقبال کا یہ مصرعہ بار بار میرے ذہن میں آتا ہے ؎

قلبِ او مومن و ماغش کافرست

(۴)

قومی تحریک کے تاریخی اسباب، موجودہ قومی ادب کی تحریک اور "ہنس" پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اب ہم

آخری اور اصلی نظری بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی یہ کہ ہندوستان کے قومی ادب کا صحیح تصور ہمارے نزدیک کیا ہے اور زبان سے اس کا کیا تعلق ہے؟

سوال یہ ہے کہ قومی ادب یا بھارتیہ سہتیہ سے کیا مراد ہے؟ بہ یک نظر ہم یہ کہدیں گے کہ وہ ادب جو کسی قوم کا ذہنی اور علمی سرمایہ ہو مگر چونکہ ادب کو تمدن سے بھی لگاؤ ہے لہذا زیادہ صحیح جواب یہ ہوگا کہ اُس طبقہ کا علمی اور ذہنی سرمایہ جو اُس قوم کے پورے تمدن اور کلچر کا ضامن ہے۔ اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے جو حالیہ تاریخ ہے کہ کسی قوم کے ادب اور تمدن کا ضامن اور نگراں کونسا طبقہ ہوتا ہے۔ اس کا جواب سیدھا اور صاف ہے کہ جو طبقہ برسر اقتدار ہو، جس کے ہاتھ میں اس سماج کی باگ ڈور ہو جس کی پرکھ یہ ہے کہ جو طبقہ معاشی نظام پر حاوی ہوتا ہے وہی اُس سماج کا سیاسی حکمراں بھی ہوتا ہے۔ غرضکہ ہمارے نئے اور قومی ادب کے سوال کو معاشی نظام سے براہ راست لگاؤ ہے۔ تاریخ میں برہمن اور دوسرے طبقے حامل ادب ہوئے ہیں بلکہ سطحی طور پر دیکھنے سے یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ "کشتری" اور "براہمن" دو علحدہ علحدہ اور آزاد طبقے ہیں اور دونوں کے سماجی کام جدا جدا ہیں تاریخی اعتبار سے یہ تقسیم اس حد تک غلط ہے کہ دونوں کو مستقل معاشی حیثیت دیجائے۔ دیکھنے میں چھتری، برہمن کے پابند معلوم ہوتے ہیں لیکن برہمن، پنڈتوں کے دبدبہ اور اثر کا سبب یہ رہا ہے کہ اُنھوں نے حکمراں طبقہ سے ملکر اُس کے باقی رکھنے اور مضبوط کرنے میں مدد دی ہے۔ غرضکہ برہمن علما سید پیروں اور ولیوں نے ادب و تمدن میں مدد دی ہے اور اس کی تشکیل بھی کی ہے مگر صرف ان حدود کے اندر رہکر جن میں حکمراں طبقہ (جو بھی ہو) گوارا کرے بلکہ یوں کہئے کہ جن حدود میں اُس دور کا معاشی نظام (جس پر حکمراں طبقہ قابض ہوتا ہے) اجازت دے مثل ہے کہ الناس علی دین ملوکھم۔ اور تاریخی اعتبار سے یہ صحیح بھی ہے۔ یہ نظری بحث زیادہ توضیح اور تشریح کی محتاج ہے مگر اس جگہ اس سے زائد گنجایش نہیں ہے۔

اسے ہندوستان کی تاریخ میں ادبی لحاظ سے یوں سمجھئے کہ جب مسلمانوں کا دور دورہ ہوا تو تھوڑے ہی دنوں میں عام مسلمان عوام کے نہیں بلکہ حکمراں مسلمان طبقہ کے افکار و خیالات آچار اور وچار ملک پر چھاگئے اُن کی زبان چونکہ فارسی تھی اس لئے وہ بھی دوسری زبانوں پر حاوی ہوگئی اور جس طرح مسلمان حکومت بڑھی یہ خیالات اور یہ زبان بھی بڑھتے گئے۔ عربی زبان گو دیکھنے میں اسلامی مذہب کی زبان تھی لیکن اُس کا اور اس کے خیالات کا تمدن اور ادب پر کوئی اثر نہ پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ سنسکرت اُس زمانہ میں بھی عربی کی طرح ہندو مذہبی

عالموں کی زبان تھی، یہ بھی صحیح ہے کہ برج کی زبان اور خیالات کے کبیر اور سورداس یا ملک محمد جائسی اور چندی داس صحیح ترجمان تھے مگر نہ سنسکرت پاٹ شالاؤں سے آگے بڑھی نہ کبیر کی زبان نے بول چال اور روزمرہ سے بڑھ کر ادب کا کام دیا۔ جو چیز ملک پر حاوی اور اُس کی شیرازہ بندی کا باعث تھی، جو طبقہ ملک پر حاوی تھا وہ اہل دولت کا تھا اس لئے اُس زمانہ کے وقیع ادب اور علم کا سرمایہ فارسی میں جمع ہوا اور جس کسی کو اس زمانہ کے ادب اور اُس دور کے زندہ علم سے کوئی لگاؤ ہوتا تھا وہ اسی فارسی سے پیاس بجھاتا تھا۔ چنانچہ امیر خسرو اور ابوالفضل ہی نہیں بہت سے راجپوت راجہ اور کایستھ بھی فارسی کے عالم اور ادیب ہوئے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادیب دوسرے درجہ پر آتے تھے اور صرف اسی وقت سامنے آئے جب حکمراں طبقہ کا زوال شروع ہوا۔ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ اگر ان ثانوی ادیبوں کے پالن کرنے والوں کی جماعت حکمراں جماعت کی گدی پر بیٹھ جاتی تو یہ سب اعزاز اور اپنی زبان کو قومی بنانے کے مواقع ان کے ورثہ میں خود بخود آجاتے مگر واضح رہے کہ جب تک معاشی نظام اصولاً بدل نہ جاتا کینڈا وہی رہتا۔ فرض کرو مغلوں کے بعد مرہٹے دلی کے شہنشاہ ہوجاتے اور مرہٹی قومی زبان ہوجاتی۔ بایں ہمہ خیالات وافکار کی نوعیت میں مطلق فرق نہ آتا چنانچہ مرہٹہ بادشاہوں کے ادبی مظاہر خود اس کا ثبوت ہیں۔ لباس بدل جاتا مگر جسم وہی رہتا۔

جیسا کہ ہم شروع میں کہہ آئے ہیں اس جسم کے بدلنے کی ضرورت انیسویں صدی میں سامراج کی تباہ کاری اور ایک نئے معاشی نظام کی ضرورت نے پیدا کی ہے۔ حقیقتاً ہندوستانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب سامراج کے تخریبی کارناموں کی بدولت ہوا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ قوم کا تصور محدود حکمراں خاندانوں اور اُس کے نام لیواؤں سے بڑھ کر پوری قوم اور آہستہ آہستہ فرد وری پیشہ پر جا سے عبارت ہونے لگا۔ حالی یا سرسید کی ادبی حیثیت یا اہمیت صرف اس لئے ہماری نگاہ میں ہے کہ اُنہوں نے اس تبدیلی کو محسوس کرکے قوم کا نیا تصور پیش کیا۔ چنانچہ جب یہ نیا تصور پیدا ہونے لگا تو زبان کا سانچہ بھی نئے اور غیر مرئی طور پر ڈھلنے لگا حالی نے غزل اور قصیدہ کو چھوڑ کر جب نئی شاعری کی بنیاد ڈالی تو یہ ثواب کی غرض سے نہیں بلکہ دریا کے دھارے کے ساتھ بہنے کے لئے دوسرے تنگ نظر مسلمان عالموں، مورّخوں اور ادیبوں کی طرح اگر "بادشاہت" کی تال تلیوں میں پڑے رہتے تو اُن میں بھی مُردنی اور کثافت پیدا ہونے لگتی۔ اور آج ہم اُن کا نام بھی نہ لیتے نیا ادب، نئی زبان نئے معاشی ضروریات سے پیدا ہوتے ہیں۔ بہر کیف سرسید اور حالی مسلمان عوام اور اسلامی ملت کے تصور سے آگے نہ بڑھے

اُس وقت کا تقاضا یہی تھا۔ اب اس نئے دور اور خاصکر پچھلے ۱۰۔۱۵ برس میں (جس کے معاشی موجبات سے ہم اس وقت بحث نہیں کریں گے) قوم کا تصور 'ملت' اور امت سے بڑھکر پورے ہندوستان کا ہوگیا ہے۔ لیکن نئے قومی تصور کے سلسلہ میں ایک اصولی فرق کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ حالی یا سرسید کے سامنے تاریخی اعتبار سے ایک مٹتے ہوئے طبقہ کو بچانے کا سوال تھا ہمارے سامنے ایک آنے والے نوجوان اور زندہ طبقہ کا سوال ہے اگر اب تک وہ طبقہ برسرِ اقتدار آگیا ہوتا جو اس نئی قوم کی ساری بیداری اور سماجی ضرورتوں کے لئے ادبی وسائل پیدا کرتا تو قومی ادب اور قومی زبان کی تحریکیں ایک تعمیری پروگرام کی صورت اختیار کر لیتیں۔ لیکن صورت حالات اور اس لئے ادیب کے فرائض تعمیری نہیں، ایک نئے معاشی طبقہ کے برسرِ کار لانے میں مضمر ہیں۔ چنانچہ قومی ادب اور زبان کے دونوں مسائل سوراج کی طرح مستقبلی تصور ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی نئی سماجی ضروریات صرف ادب ہی کی نہیں بلکہ اس سے بہت بڑی تبدیلی کی محتاج ہیں جس وقت تک یہ تغیر نہ ہوئے یہ اونٹ کسی کل نہیں بیٹھ سکتا۔ قومی ادب اور زبان کی تحریک پوری سماجی تحریک اور سیاسی جدوجہد سے (چونکہ یہی کسی طبقہ کے قومی معاشی نظام پر قبضہ پانے کی فیصلہ کن صورت ہے) علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ جو طبقہ آئندہ برسرِ اقتدار ہوگا وہی قومی ادب اور زبان یا زبانوں کی تعمیر کرے گا اور یہ اس لئے نہیں کہ ہم جیسے پڑھے لکھے وطن پرستوں کی طرح اُس کے ذہن میں کچھ ادبی تصورات اور خیالی منصوبے پہلے سے نصب العین کے طور پر معین اور مقرر ہوں گے بلکہ خالصاً اپنے ضروریات اور عملی زندگی کی خاطر۔ آخر پرانے "قومی" ادب نے بھی تو عملی ضرورتوں سے پرورش پائی تھی اور اُن کے علمی ذخیرے بھی تو صرف اُنھیں علوم سے مالامال ہیں جن کی حکمراں طبقہ کو ضرورت تھی۔

ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس وقت یہ اہلیت جمہور میں موجود ہے۔ یہ تربیت جدوجہد ہی سے پیدا ہوگی البتہ ہماری سماج کے زندہ مسائل ہمارے سامنے ہیں اور آئندہ کے زندہ قومی ادب اور زبان کا مسئلہ ہمارے نزدیک اس پر موقوف ہے کہ سماجی جدوجہد میں میر اور اگوا بنکر کون سینہ سپر ہوتا ہے اور سماج کی مختلف سیاسی اور معاشی مانگوں کو کون پورا کرتا ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ چونکہ پرانے منصب داری نظام یا سامراج کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے لہٰذا سنسکرت اور انگریزی یا فارسی زبان کی بحث سرے سے خارج ہے مبحث کا یہ پہلو عمرانیات سے جاملتا ہے لہٰذا ہم یہاں اسی نکتہ پر اکتفا کریں گے۔

البتہ جیسا کہ ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں سیاسی تحریکات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے کل کے "قومی لیڈر"، اور ان کے

سر دھرے اس منصب سے گر چکے ہیں اور منطقی تقاضہ سے پیچھے ہٹ رہے ہیں جو اُن کی سماجی رجعت پسندی کی دلیل ہے۔ یہ بھی ہم نے ظاہر کر دیا ہے کہ چونکہ یہی رجعت پسندی اس وقت سہتیہ پرشد کی نگراں ہے اس لئے اس ادبی تحریک میں بھی پستی اور رجعت پسندی کے سب آثار موجود ہیں۔ چنانچہ یہ تحریک آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف دیکھتی ہے۔ ایڈیٹر "ہنس" کو قومی ادب کے تصور کے ساتھ جبلّی طور پر دالمیک اور پرانوں کا دور اور بادشاہت کا زمانہ یاد آتا ہے۔ وہ برہد کتھا کبھی پنچ تنتر اور کبھی بھاگوت دھرم و دیاپتی اور چندی داس۔ سور داس اور تلسی داس۔ نرسنگھ مہتا اور میرا بائی کبیر اور تکارام۔ الوار اور رامیج۔ ولبھ اور چیتنیہ سے جی بہلاتا ہے۔ بار بار فرکر بجنس رہبانوں اور صوفیوں کا دامن پکڑتا ہے جو اسی کی طرح زندہ سماجی مسائل اور جد و جہد سے جی چرا کر یاد خدا کو اپنے بچاؤ کا بہانہ بناتے تھے۔ اسے مسلمانوں میں اسمٰعیل شہید اور سید محمد مہدی جونپوری نظر نہیں آتے وہ صرف امیر خسرو اور ملک محمد جائسی سے کسب فیض کرنا چاہتا ہے۔ (ہنس اکتوبر صفحہ ۱۱۶) ہم چاہتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کے ان رومان نواز قصیدہ خوانوں کو اُن کی پہیلیوں اور مکرنیوں کے ساتھ ساتھ امیر خسرو کی مثنوی مطلع الانوار بھی یاد دلائیں تاکہ اُنہیں اس زمانہ کی صحیح حالت کا اندازہ ہو اور وہ رائج الوقت تاریخوں کے 'قومی' فریبوں سے دور ہو کر حقیقت پرستی کی منزل پر آسکیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں علاوہ حکمراں قوم کے عوام میں بھی ایک گونہ یکسانیت تھی جس سے آج کل کے دیش بھگت اپنے محدود قومی تصورات کے لئے تاریخی تقویت حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس قومی یکسانیت کا تصور ع من وتو ہر دو خواجہ تاشانیم۔ سے زیادہ نہ تھا جدید یا قدیم کسی انسانی مساوات کا اس میں دور دور پتہ نہیں۔ اس تمدن کی بنیاد ہی فرق مراتب پر تھی۔

علاوہ اس غیر تاریخی ماضی پرستی کے اس نئی تحریک میں زبان کی "پاکی" کا تصور بھی کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ برہمن کا جنیو یا کانگریسی کا کھدر اور یہ تصور خود اُس کے سماجی کھوکھلے پن کا ثبوت ہے۔ چنانچہ قومی زبان کے متعلق منشی پریم چند کو ابھی سے یہ ڈر لگنے لگا ہے کہ "جس ہندی کا بمبئی اور پونا اور میسور اور مدراس، ڈھاکہ یا اڑیسہ میں غیر ہندی زبان کی صورت میں بیوہار ہوتا ہے اگر کہیں وہی ہندی لکھنے میں بھی آنے لگی تو ہندی کا جنازہ ہی نکل جائے گا" (ہنس، نومبر صفحات ۱۱۵-۱۱۶) اُردو تو پہلی ہی لشکر اور بازار و کوچوں میں اور یہی اس کی "جمہوریت" کا عنصر ہے مگر ہندی 'قومی' بنتے ہی دیو بانی ہو گئی! کیا اب بھی اس تحریک کے بڑھاپے میں یا اس کے انحطاط پذیر ہونے اور مرنے والے سماجی نظام اور معاشی طبقوں سے اس کی ناتہ داری میں غرضکہ خود اس کے انحطاط پذیر ہونے میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ اگر اب بھی اس کا گمان ہے تو اس کا عوام کے متعلق لسانی اور ادبی ضروریات کا تصور بھی دیکھتے جائیے جن سے ان وطن

خواہوں کی قوم ہی عبارت ہے۔ خود "ہنس" نے اپنے اداریہ میں تو اب تک اس اہم اور فیصلہ کن بحث پر قلم نہیں اٹھایا اور غالباً آیندہ بھی پہلوتہی کرے البتہ پروفیسر نویدا صاحب نے اپنے مضمون موسومہ "صوبجاتی زبانوں کا مستقبل" میں "جنگلی جاتیوں" کی زبانوں کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "یہ بھاشائیں پشوؤں پکشیوں کی بھاشا سے تھوڑی آگے لیکن منشیوں کی بھاشا سے کچھ پیچھے ہیں" چنانچہ پروفیسر موصوف نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان بھاشاؤں کا دوسری سماج کی "گود میں جانا ہی اچھا ہے" ("ہنس" نومبر صفحہ ۴۲) یہ وہ تصور ہے جو سامراجیوں کے "نظام حکمبرداری" (منڈیٹ سسٹم) کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔ قوم کے یہ اجارہ دار نئے پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اس اجارہ کی خاطر خون تو کیا کبھی پسینہ بھی نہیں گرایا!۔

شاید پونداؔر صاحب کو علم ہو کہ پرتھوی پر ایک ملک روس بھی ہے جس میں ۱۵ کروڑ مخلوق بستی ہے اور کلچر۔ مذاہب اور زبان اور تمدنوں کے پھندپھاؤ اس ملک میں ہندوستان سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس ملک میں بجائے ایک زبان نافذ کرنے اور دوسرے تمدنوں کو گود دینے کے ہر زبان ہی نہیں بلکہ ہر بولی کو بھی از سر نو حروف تہجی دیکر سوویٹ حکومت نے ایک نئے ادب کے مرتب کرنے کا موقع دیا ہے۔ ۱۰-۱۲ سال کی مختصر مدت میں ان "جنگلی جاتیوں" نے شولوخوف اور دوسرے درجنوں ادیب پیدا کئے ہیں جو متمدن سرمایہ دار یورپ کے ادیبوں کو ہر جگہ چراغ دکھاتے اور ان کی رہبری کرتے ہیں۔ روسی ادب کے اس ظاہری صوبجاتی روپ سے اس کے "ملکی" اور "قومی" ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا اس لئے کہ وہ ایک زندہ اور بڑھنے والے طبقہ یعنی مزدور کا ادب ہے جس کی نگاہ میں صوبہ یا ملک نہیں بلکہ ساری دنیا ہے اور اس سے ورے وہ اس سے کم دیکھ ہی نہیں سکتا لیکن اس کی بین الاقوامیت اور سرمایہ داری لیگ اقوام یا وطن پرستوں کے منصوبوں میں زمین آسمان کا فرق ہے!

(۵)

اب ہم تنقید و تبصرہ کے نتائج بحث کو مختصراً پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بھارتیہ سہتیہ پرشد یا دوسری قومی ادبی تحریکوں کو ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے بعض اصولی باتیں طے کر لینا چاہئیں اس لئے کہ ہمارے اور دوسرے دیشوں کے بہت سے کام صرف اس لئے خراب بلکہ مضرت رساں ہو جاتے ہیں کہ ان تحریکوں کے بنانے والے بنیادی اینٹ ٹیڑھی لگا دیتے ہیں جس سے اوپر تک ساری کی ساری عمارت میں ٹیڑھ آجاتی ہے جو آخر میں کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔ تحریک شروع کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ کس طبقہ کے لئے قومی ادب یا زبان مرتب کی جا رہی ہے؟ دوسرے یہ کہ جب یہ زبان اور ادب تیار ہو جائیں گے تو ان سے کام کیا لیا جائے گا؟ دوسرے سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب پر منحصر ہے۔

جہاں تک ہمیں غور کرنے کا موقع ملا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سہتیہ پرشد نے ایسے طبقہ سے رشتہ ناتا جوڑا ہے جس کی

بڑھو تری کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں دیکھنے والوں کو خوب معلوم ہے کہ سماجی جدوجہد میں یہ متوسط طبقہ کے "قومی" لڑنے والے اور ان کے ہتیار فرسودہ ہو چکے ہیں چنانچہ ان کے ہاتھوں صحیح ادب و زبان کا پرچار بالواسطہ جتنا ہو سکتا تھا وہ ان کی جوانی کے زمانہ میں ہو چکا جس کا ہم تذکرہ مہاتما گاندھی جی کے اردو خط کے سلسلہ میں کر آئے ہیں۔ ستیہ پرشد اور دوسری سماجی تحریکیں مثلاً کھدر، ہریجن، گرام ادھار وغیرہ زبان حال سے بتلا رہی ہیں کہ بلند پایہ سماجی جدوجہد کے منصب سے یہ خود معزول ہو چکے ہیں۔ اس وقت یہ آسن خالی سا معلوم ہوتا ہے مگر یہ ایک دوسرے طبقہ کی آمد کا انتظار ہے جو برابر جدوجہد اور تربیت میں مصروف ہی غرضکہ یہ آسن زیادہ دن یوں خالی نہ رہے گا۔ اس نئے طبقہ کی سماجی جڑیں پہلے سے بہت زیادہ وسیع اور مضبوط ہوں گی اور اُس کا زبان و ادب کا تصور بھی متوسط طبقہ کی تنگ "جمہوریت" سے بڑھ کر پوری پرجا پر حاوی ہوگا صرف رجعت پسند سماجی طبقے اُس تصور سے خارج کر دئے جائیں گے یعنی جو آنے والی سماج میں زندہ رہنے کے لائق نہیں ہیں۔

اس لئے اس وقت ایک غیر نمو پذیر اور مادی ادب اور زبان کی بحث بے وقت کی راگنی ہے۔ اس تحریک کو سماجی جدوجہد سے ملا دینا چاہیئے۔ اس جدوجہد کے ختم ہونے پر بھی ادب کے تصور کو یہ تحریک آیندہ کے سماجی طبقہ کی عملی ضروریات سے معنی پہنائے گی۔ البتہ یہ ہم اندازہ کرتے ہیں کہ اس ادب کی ظاہری صورت گو ملکی بلکہ صوبجاتی اور قومی ہوگی مگر اس کا تخیل بین الاقوامی ہوگا اس لئے کہ موجودہ سماج کے سوال بین الاقوامی معاشی اور سیاسی حالات کے پابند ہیں۔ اس نئے قومی ادب کی بنیادیں فرسودہ مذہبی اور روحانی عقاید سے نہیں بلکہ مادی فلسفۂ حیات، جدید خیالات اور سائنس سے پرورش پائیں گی۔

زبان بھی ادب کی طرح سماجی تحریک کے ساتھ ساتھ بنتی جائے گی اور برابر بنتی رہے گی مگر اس کا سانچہ بھی عوام کی نئی ضروریات سے تیار ہوگا۔ بادشاہت کے دور کے بعد جس طرح ہماری عام ضرورتوں نے اردو یا ہندوستانی کی پرورش کی ہے یہ نیا دور اس ہندوستانی زبان کو پہلے سے اور زیادہ وسیع اور عوام کے لائق بنا دے گا یہ زبان نہ خود "پاک" ہوگی نہ "پاک" لوگ اسے مرتب کریں گے۔ بڑھتی ہوئی عام بیداری اور سماجی خیالات کی توسیع کے ساتھ ساتھ زبان بھی اپنی بساط بڑھاتی جائے گی۔ اس کے افکار جس طرح مرتب ہوتے جائیں گے اس کا سانچہ بھی بدلتا جائے گا۔ بہرحال نئے اور زندہ ادب کے ساتھ نئی اور جاندار زبان بھی تربیت پائے گی اور دونوں بڑھتے اور بدلتے رہیں گے۔ ادب اور زبانیں ایک مدت تک ایک سے زیادہ اور ہر خطہ کی ضروریات اور تاریخی حالات کے مطابق ہوں گے البتہ بنیادی تصورات اور تخیلات قومی ہوتے جائیں گے۔ نئے اوزاروں اور وسائل کا رواج اور نئی مادی ضرورتیں خود بخود ایک واحد

قومی ادب و زبان کو مرتب کردیں گی مگر اس میں "بالالتزام تبلیغ" کی مطلق ضرورت نہ ہوگی کیونکہ اس "بالالتزام تبلیغ" میں مذہبی، نسلی یا قومی سامراجی خیال کی روح پائی جاتی ہے۔

ادب اور زبان کی بڑھوتری کی پہلی شرط یہ ہے کہ ان کے سوتے پراچین اور ویدک یا مغلی زمانہ سے ہٹا کر براہ راست موجودہ سماجی جدوجہد اور زندگی کے نئے فلسفہ سے ملائے جائیں۔ تاکہ بجائے چند خود فریب مابعد الطبیعاتی تصورات کے زندگی اپنا مادی روپ دکھا کر فکر و ادراک کے لئے اپنے لازوال اور بے شمار خزانوں کی دنیا کھول دے اور علم و عمل کی خلیج کو پاٹ دے۔ رسم خط کا مسئلہ خالصاً سہولت اور عملی ضرورتوں کے مطابق طے پائے گا۔ آئندہ کی سماج جہاں بین الاقوامی فلسفہ اور نقطۂ نظر رکھے گی وہاں غالباً آسانی کی خاطر بین الاقوامی رومن حروف بھی اختیار کرے گی۔

بھارت ستیہ پرشد کی تحریک ہمارے متوسط طبقہ کے ہارے تھکے "قوم پرستوں" کی دوسری سماجی تحریکوں کی طرح آئی جاتی ہے۔ آنے والے سماجی طبقہ سے گھبرا کر یہ لوگ زبان اُن بوسیدہ سماجی طبقوں کے لئے بنانا چاہتے ہیں جن کے لئے تاریخ نے تابوت بنا رکھے ہیں۔ ستیہ پرشد کے بیدار ذہنوں کو اپنے ذہنی زندگی کی خاطر آنے والی سماجی تحریکوں کے لئے ادب کی "نئی دنیا" بنانی چاہیئے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی مشکلات بہت ہیں جس طرح "قومی تحریک" نے پچھلے ۱۵-۲۰ سال میں ذہنی کام کے لئے ایک نیا باب کھول دیا تھا اسی طرح آئندہ کے تخلیقی کاموں کی ضامن صرف یہ تحریک ہو سکتی ہے اس لئے کہ صرف یہی تحریک سماجی زندگی کی صحیح ترجمان ہوگی اور جو ادیب اس کے ساتھ نہ ہوں گے یا تو موری کے بند پانی کی طرح اُن کی ذہنی ترقی رک جائے گی یا بالالتزام تبلیغ کے پھندہ میں پھنس کر وہ خود اپنے ذہنی ترقی کے وسائل سے ٹکرا کر خودکشی کرلیں گے۔ ہماری آرزو ہے کہ دنیا میں تخلیقی کام کبھی نہ رکنے پائیں اس لئے کہ یہی انسانیت کی معراج اور اسی میں ہمارے جیون کی سچی مکتی ہے۔

چو در رونِ من در آئی دگر آرزو نہ بینی
مگر اینکہ شبنم تو یم بے کنار بادا

دادی اماں کا مکتب   سُردا ابعل
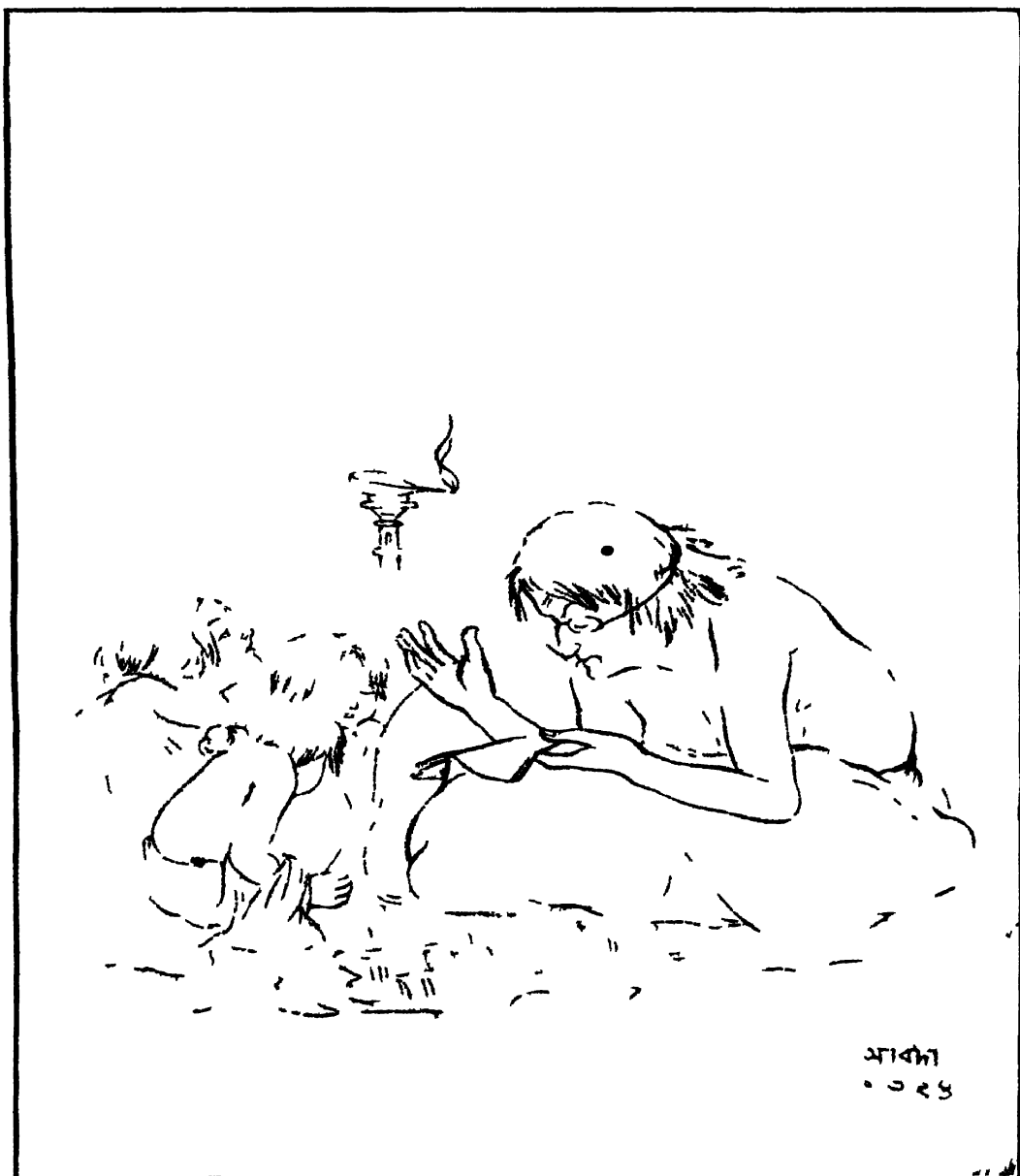
بابِ تنقید

حصۂ اوّل

اس تاریخی تبصرے کا مقصد ایک تو اس سال کی اہم کتابوں کا تذکرہ ہے، دوسرے اُن رجحانات کا تجزیہ مقصود ہے جو ہمارے اس جدید ادب کی گود میں پرورش پا رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ اوراق تشریحی بھی ہیں اور تنقیدی بھی۔

دو امور اس کام کے مؤید ہوئے۔ ایک تو یہ خیال کہ اس قسم کے خاکوں سے، ہمارے جدید ادب کی تصویر رفتہ رفتہ، بنائی جا سکتی ہے دوسرے چونکہ ہماری تنقیدیں ابھی تک بکھرے ہوئے اور بے ترتیب نقوش کی حد سے آگے نہیں بڑھیں اس لئے ان سب کو ایک رشتے میں منسلک کرنا اور ایک عام نقطۂ نظر (Perspective) سے دیکھنا، زیادہ وقیع، زیادہ مفید اور زیادہ اہم ہو سکتا ہے اور اس سے خیالات کو سلجھانے اور نظریات کو نئے سرے سے جانچنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

حصۂ اول میں جدید میلانات کا تجزیہ ہے اور حصۂ دوم میں بعض اہم کتابوں پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس تجزیے میں وہ مطبوعات شامل ہونے سے رہ گئیں جو وقت پر دستیاب نہ ہو سکیں۔ یہ کوشش لازماً نامکمل ہے۔ اپنے زمانے کے ہر نقش کی تفسیر نامکمل ہوتی ہے۔ اُسے ابھی اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ موجوں کے تھپیڑے کھا کر گہر بن جائے۔ مگر آئندہ اس کا التزام رکھا جائے گا کہ آئندہ سہیل میں یہ باب زیادہ جامع ہو۔ اسی طرح جدید انگریزی ادب اور جدید ہندی ادب پر تبصرے بھی سال بسال شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

نظم یہ دور تنقید کا دور کہا جاتا ہے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ انگریزی ادب کے وضع کئے ہوئے اصولوں سے ہمارے ادب العالیہ (classical literature) کو جانچا جاتا ہے یہ روش شروع شروع میں نہایت ضروری تھی۔ ہمارے یہاں فنِ تنقید کا قریب قریب فقدان تھا۔ ہمارے ادیب اور شاعر مطالعہ اور معلومات کے لحاظ سے کچھ

ممتاز نہ تھے۔ وہ بجائے سماج کے افراد ہونے کے، یکہ و تنہا، اپنی دنیا الگ بنائے ہوئے رہتے تھے۔ میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں "وہ جو کچھ جانتے تھے وہ ناکافی تھا" اس لئے اُن کے تجربات کی دنیا میں اضافہ ضروری ہو گیا تھا۔ انھیں بتانا تھا کہ اُن سے کس چیز کی، بلکہ کس قسم کی چیز کی، امید کی جاتی ہے۔ اُن میں مطالعۂ نفس کے ساتھ، نظر کی بلندی اور خیالات کی گہرائی پیدا کرنی تھی جو صرف وسیع مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان میں قدروں کا احساس بھرنا تھا۔ یہ مقصد بڑی حد تک حل ہو چکا ہے اور اچھی اچھی تنقیدی کتابیں پچھلے چند سالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر کچھ عرصے سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس روش کا اثر ہماری تخلیقی قوت پر پڑ رہا ہے اور تخلیقی ادب کے بڑھتے اور چڑھتے ہوئے دریا میں گویا بند باندھ دیا گیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ امسال جو کتابیں شائع ہوئیں اُن سے یہ اندیشہ کم ہونے لگا ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امسال کا ذخیرۂ ادب اگر عیار خالص نہیں تو اس کے لگ بھگ ضرور ہے۔

یہ سال ایک لحاظ سے شعرا کا سال ہے۔ کیونکہ اس سال میں ہمارے کئی ممتاز شعرا نے اپنا کلام شائع کیا ہے۔ اس میں سرفہرست علامہ اقبال کا تازہ مجموعۂ کلام بالِ جبریل ہے۔ بالِ جبریل پر کہیں ہیں ایک مفصل مضمون موجود ہے اس لئے یہاں ہم صرف اُن رجحانات کا ذکر کریں گے جو اس کتاب میں ملتے ہیں۔

اقبال نے بالِ جبریل پیش کر کے اس بات کو ثابت کر دیا کہ صدقِ جذبات، جوشِ فکر، سوز و گداز اور درد واثر صرف جذباتِ عشق و محبت کی عکاسی سے ہی نہیں اس عالمِ مجاز کی ہر چیز سے اُبل سکتے ہیں۔ حسنِ خیال، حسنِ ادا حسنِ نظر صرف مسائلِ ہجر و وصل کے لئے ہی نہیں مشکلاتِ انسانی کو حل کرنے کے لئے بھی صرف ہو سکتے ہیں۔ حقیقی شاعری میں صرف نغمہ یا صرف پیغام ہی نہیں ہوتا۔ اُس کی زبان بھی منتخب ہوتی ہے، وہ زبان جو تجربے کا وجدان الفاظ میں بکھیر دے۔

یہ باتیں اس شخص کے لئے جواب سے ۲۵ برس قبل کی شاعری کا دلدادہ ہے نہایت عجیب و غریب ہیں مگر ہمارے ذوق کی اس اصلاح میں اقبال کا خود بہت بڑا حصہ ہے۔ اُنھوں نے شاعری کے جمالیاتی عنصر کو کم کر کے اُسے حیاتِ انسانی سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اقبال کے ہاتھوں اردو شاعری کا مواد بھی بدلا اور صورت بھی۔ اُنھوں نے نظم کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ اُسے ایک نئی زندگی بخشی۔ اُس کی زبان سے مسائلِ مہمہ کو حل کیا۔ مشکلاتِ انسانی پر نظر

ڈالی اور اسرارِ حیات کے چہرے سے نقاب اُٹھائی۔ غزل میں تغزل کا عنصر کم کرتے کرتے اُسے بالکل حذف کر دیا اور اب وہ غزل سے بھی نظم کا کام لیتے ہیں۔ اقبال جس فن کے موجد ہیں اُسی کے مجتہد بھی ہیں۔

اس رنگ و آہنگ سے جو آج ساری فضا میں جاری و ساری ہے کوئی بھی شاعر اپنا دامن نہ بچا سکا۔ بعض قدامت پسندوں نے صورت وہی رکھی۔ اُنھوں نے غزل کی دنیا کو اپنی کل کائنات سمجھا مگر مواد وہی رکھنے پر وہ قادر نہ رہ سکے۔ بیشتر نے غزل اور نظم دونوں میں اظہارِ خیال کیا اور ایک کی گہرائی دوسرے کی روانی میں سمودی۔ اگرچہ ہمارے جدید دور میں چند پختہ کار غزل گو نظر آتے ہیں مگر اس دور کا کارنامہ نظم ہی ہے۔

نظم کی صورت سے یہاں بحث مقصود نہیں۔ جدیدیت سے متاثر ہو کر سانیت کے طرز پر بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں مگر یہ صنف اردو میں ابھی پوری طور پر کھپی نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جن شعرا نے اس طرز کو اپنایا اُن کی زبان میں وہ لوچ، لچک اور شیرینی نہیں جو اس قسم کی نظموں کی جان ہے۔ دوسرے ہمارے شعرا جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اُنھیں ہر بحر کا ترنم، اُس کی وسعتیں اور گہرائیاں، اُس کے امکانات اور اُس کی خامیاں معلوم نہیں۔ نہ اُنھوں نے اس بات کو جاننے کی ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کوشش کی ہے۔ بعض الفاظ سے جو مخصوص نغمہ نکلتا ہے اُنھوں نے اُس سے کام نہیں لیا۔ اس لئے انگریزی طرز پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مبارک سہی، کامیاب نہیں۔

قطعات و رباعیات کے لحاظ سے یہ دور ممتاز ہے۔ ہمارے شعرا نے اپنا ما فی الضمیر چار مصرعوں کے اندر ادا کرنا سیکھ لیا ہے۔ اُنھیں اب اپنا دردِ دل، کم سے کم الفاظ میں، زیادہ سے زیادہ اثر لئے ہوئے، کہنا آگیا ہے۔ مسدس اور تضمینیں نسبتاً کم نظر آتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی قدیم رنگ یا طرح پر طبع آزمائی کرنا اور کسی اُستاد کی روح سے زور آزمائی کی خواہش روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔

نظم کے مواد میں بھی کافی تنوع نظر آتا ہے۔ شبابیات کی داخلی و خارجی مصوری اگرچہ ابھی تک مقبول ہے (اور غالباً رہے گی) مگر اب وہ پیش پا افتادہ اور فرسودہ بندشیں کم ہو رہی ہیں۔ اس رنگ میں حال میں بعض اچھی اچھی، حقیقت میں ڈوبی ہوئی نظمیں کہی گئی ہیں۔ مناظرِ قدرت میں خارجی مصوری کی حد سے گذر کر ہماری شاعری داخلی مصوری کی حد تک آگئی ہے۔ اب شاعر جب اپنے گرد و پیش کا حال بیان کرتا ہے جب اپنے ماحول کی تصویر الفاظ میں

کھینچتا ہے، جب دریاؤں اور پہاڑوں، وادیوں اور مرغزاروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اُسے یہ سب کچھ کہنا چاہیے بلکہ اس لئے کہ وہ یہ سب کہنا چاہتا ہے، اُس کے جذبات اُسے مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی تصویروں میں، خود مصوّر کی ذات بہت نمایاں رہتی ہے۔ دیکھنے والا اُس کی آنکھوں سے دیکھتا اور اُس کے کانوں سے سنتا ہے، جو جذبات مصوّر کے دل کو تڑپا رہے تھے۔ وہ ناظر کے دل میں طوفان برپا کرتے ہیں۔ غرض اب مناظرِ قدرت کی شاعری میں شخصیت اور انفرادیت کی جھلک بھی نظر آنے لگی ہے خصوصاً بعض نوجوان شعرا کے ہاں۔ یہ روش نہایت مستحسن ہے۔

پیامی شاعری (applied poetry) بھی اقبال کی تقلید میں شروع ہوئی۔ بعض اچھے شعرا کے یہاں اس نے مقامی رنگ، مقامی الفاظ اور ماحول کی منظرکشی کی شکل اختیار کر لی۔ اُنہوں نے اپنے نغمات سے ساری فضا کو سرشار کیا۔ اُنہوں نے اپنے اپنے حلقہ کی برکات اور نعمتوں کے گُن گائے اور بغیر آورد کے اپنے پڑھنے والوں کے دل میں اس چیز سے محبت پیدا کی۔ بعض حلقوں میں پیامیہ شاعری جدیدیت کی بڑھتی ہوئی رَو میں بہہ گئی اور اس نے ایک بے معنی چیخ اور ہذیان کی صورت اختیار کر لی۔ اس زمرے میں وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان، باغی و غدّار کی کشاکش کو نمایاں کرتی ہیں۔ یہاں سچّی شاعری کم ہے، خطابت اور گرج زیادہ۔ اُن کا مقصد تخریب ہے۔ صدیوں کی آبیاری اور خون پسینہ ایک کرنے کے بعد جو کچھ تعمیر ہوا ہے۔ اُسے گرا دینا چاہتے ہیں، مگر اس کی جگہ کیا بنائیں گے، کونسے بت کی پرستش کریں گے، یہ معلوم نہیں۔

غزل جدید غزل کی اب جو حالت ہے وہ ہر لحاظ سے قدیم غزل سے الگ ہے۔ وضع الگ، لباس الگ، سج دھج الگ، بیان الگ، طرزِ بیان بھی الگ، طرزِ بیان تو خیر بدلنا ہی چاہیے تھا، خیال میں بھی تبدیلی ہوئی ہے۔ اب نقطۂ نظر میں فرق ہو گیا ہے۔ غزل اب بھی حسن و عشق کی داستان اور انسان کے سب سے لطیف، سب سے نازک اور سب سے گداز جذبات کا گہوارہ ہے، مگر اب ان جذبات اور ان جذبات کو برانگیختہ کرنے والے احساسات کا ذکر دوسرے طریقے سے ہوتا ہے۔ حلیہ و لباس اب تار تار ہو چکے، معاملہ بندی کا قصہ گیا۔ ولولہ و شوق کا اظہار اب دبی زبان سے ہوتا ہے تغزل ماسوا چند کے، خود غزل میں اتنا نمایاں نہیں رہا۔ اب تک لاش، کفن، میت کا ماتم ہوتا تھا اب ردِّ عمل کے طور پر بیشتر حضرات ایک سرمستی و خود فراموشی کے طالب ہیں۔ وہی خیام والی

خود فراموشی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ "دفترِ بے معنی" کو غرقِ مے ناب کرنے کے لئے تھی اور یہ دفترِ بے معنی سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے کے لئے ہے۔ جگرؔ، اصغرؔ، اخترؔ شیرانی اس شق میں آتے ہیں۔ دوسری طرف کفن اور میت کی عاقبت سدھانے والا بھی ایک پیدا ہوا۔ وہ فانیؔ ہے، جس نے اپنے فلسفۂ غم سے زندگی اور موت دونوں کو پُر عظمت اور عبرت انگیز بنا دیا۔ فانیؔ نے موت سے اُس کی ہیئت چھین کر اپنے خداداد قلم سے اُس میں ایسی لطافتیں بھر دی ہیں کہ وہ زندگی سے زیادہ گوارا ہو گئی ہے۔

اگلے غزل گو صاحبِ دل تھے۔ صاحبِ دماغ نہ تھے (سوائے غالبؔ کے) ہمارے غزل گو صاحبِ دل بھی ہیں اور صاحبِ دماغ بھی۔ بعض نے نشاطِ روح سے اپنا فلسفۂ زندگی خمیر کیا ہے، جیسے اصغرؔ، بعض نے جگرؔ کی طرح ماجرائے عشق بیان کرنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر دی ہیں۔ مگر جدید غزل میں گہرائی زیادہ ہو گئی ہے۔ شروع شروع میں بے معنی و مغلق ترکیبوں سے اس کا ڈھونگ کھڑا کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے خیال میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی تھی خیال کی یہ پیچیدگی عام شعرا میں ابھی موجود ہے مگر اچھے شعرا اس گنگا کو پار کر چکے ہیں۔

مشہور شعرا بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے، سرد و گرم چشیدہ ہیں، اس لئے وہ اس زمانے کے ہیجان، سراسیمگی اور انتشار سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے مگر نوجوانوں نے جب ہوش سنبھالا تو یہ انتشار شروع ہو چکا تھا اس لئے وہ سب یاسیت کے شکار ہیں۔ بعضوں کو امید کی جھلک نظر آتی ہے، بعض اپنے مذہبی عقائد سے یہ جھلک مستعار لیتے ہیں (جیسے حفیظ) مگر بیشتر اس درد و کرب میں مبتلا ہیں جس میں ان کا ماحول گھرا ہوا ہے۔ وہ چونکہ نوجوان ہیں اس لئے بالکل مایوس نہیں ہوئے بلکہ اس غم سے لذت لینے کی کوشش کرتے ہیں (جیسے اخترؔ انصاری)

رعایتِ لفظی سے ابھی گلو خلاصی نہیں ہوئی مگر اس میں کمی ضرور ہو گئی ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ رعایتِ لفظی کے لئے الفاظ کی جس پونجی کی ضرورت ہے وہ اس دور میں سب کے پاس نہیں اور کچھ اس لئے بھی کہ محض رعایتِ لفظی اب بُری بھی سمجھی جانے لگی ہے۔

بحیثیت مجموعی، یہ دور شعرا کا دور ہے۔ ایک خاص معیار کی شاعری عام طور پر ابھی وجود میں نہیں آئی، اکبر کے مقلدین کی تعداد ابھی زیادہ ہے، مگر اچھے شعرا نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ عیارِ خالص ہے۔ جدید نظم قدیم نظم سے بہت آگے ہے، اس کے لئے نئی نئی راہیں کھل گئی ہیں اور جدید غزل قدیم غزل کی صحیح جانشین ہے۔ ان شعرا کی تعداد اچھی خاصی ہے

جن کا نام اردو شعر و شاعری کی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔

ناول اور افسانے جب ہم افسانہ نگاری Fiction کی دنیا پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اگرچہ اس دور میں چند اچھے افسانے اور چند اچھی ناولیں شائع ہوئی ہیں مگر پریم چند کے پائے کا ایک بھی ناول نگار یا افسانہ نگار نہیں ملتا ہمارے یہاں جو افسانے ہیں وہ مقصدی ہیں۔ اُن میں یا تو کسی معاشرتی اصول کی تلقین ہوتی ہے، یا قدیم اور جدید تہذیب پر استہزا کیا جاتا ہے۔ پلاٹ کو توڑ مروڑ کر اُس کی صورت مسخ کر کے، اُسے ایک خاص ڈھرے پر چلایا جاتا ہے۔ پڑھنے والا کتاب کے چند صفحوں ہی سے، پورے قصہ کی تدریجی ترقی معلوم کر سکتا ہے۔ ہماری ناولوں کے افراد، نہ اپنی خوشی سے خوش ہوتے، نہ اپنی ہنسی ہنستے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی ماہر فن انہیں ایک ناچ نچا رہا ہے۔ وہ یا تو بہت بڑی سطح پر بنائے جاتے ہیں یا بہت چھوٹی پر۔ زندگی کے مطابق، اُن میں سے چند ہی ہوتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا جب انجمن اردوئے معلّٰی کے زیر اہتمام ہمارے ایک نوجوان ادیب نے افسانہ نگاری پر ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں مغربی افسانوں کے مطالعہ سے نظریات قائم کئے گئے تھے۔ اُن سے جب دریافت کیا گیا کہ اُنھوں نے اردو کے افسانوں کو کیوں نظر انداز کر دیا تو فرمانے لگے کہ "اردو میں افسانہ نگاری نے ابھی فن کی ابتدائی منازل بھی طے نہیں کیں"۔ ہمیں اس خیال سے کامل اتفاق تو نہیں مگر اس میں بہت کچھ اصلیت موجود ہے۔ افسانہ نگاری کی اس پستی کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس زمانے کا عام رجحان اس طرف نہیں ہے۔ مگر جب ہم اپنے مقبول عام رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہیں تو اگرچہ اُن کے سرورق پر "مطبی، اخلاقی، معاشرتی، اصلاحی، فلمی، علمی، ادبی" سب کچھ لکھا ہوتا ہے، مگر زیادہ تر اُن میں افسانے ہوتے ہیں جن کے اچھے اچھے جملے جلی قلم سے اوپر درج کر دئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ابھی خدا کے فضل سے فضل بک ڈپو قسم کے ادارے، ملک میں موجود ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ افسانہ نگاری کے عروج کے لئے جس فضا کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی ہمارے یہاں پیدا ہی نہیں ہوئی۔ یہ خیال صحیح ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ آج ملک میں دوسری زبانوں سے بکثرت تراجم شائع ہو رہے ہیں۔ خصوصاً انگریزی زبان کے مشہور افسانہ نگاروں کا کامیاب ترجمہ ہو چکا ہے۔ روسی، فرانسیسی اور جرمنی افسانہ نگاروں سے اردو داں حضرات

روشناس ہیں مگر سوائے چند اشخاص کے ابھی عام طور پر ان تراجم سے اثر قبول نہیں کیا گیا اور جو طبع زاد افسانے لکھے جا رہے ہیں اُن کے معیار میں کوئی اہم فرق نہیں آنے پایا۔

بعض مضمون نگاروں نے جن کا خاص میدان طنز ہے' جدید تہذیب کا مضحکہ اُڑانے کے لئے افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں طنز اور زبان کی چاشنی موجود ہے' مگر بحیثیت مجموعی افسانہ نگاری ابھی بہت پیچھے ہے۔

ڈراما ڈراما کی حالت افسانہ نگاری سے بھی خراب ہے۔ اس کے لئے بھی فضا ابھی سازگار نہیں ہے۔ سید امتیاز علی نے انارکلی پیش کرکے المیہ کا معیار ضرور بلند کر دیا مگر یہ انفرادی کوشش بہت جلد بھلا دی گئی۔ پروفیسر مجیب اور پروفیسر قریشی نے چند اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔ یہ حضرات ڈرامے کے امکانات سے واقف ہیں اور اس کی وسعتوں پر انھیں عبور ہے۔ انھوں نے مشکلات انسانی کے حل کرنے میں بھی ڈرامہ سے مدد لی ہے۔ مگر ان کے علاوہ دوسرے حضرات کی کوششیں ابھی بالکل ابتدائی ہیں۔ اگر دو چار اچھی چیزیں نکل بھی آئی ہیں تو لکھنے والوں کا "قصور" نہیں۔

مکتوبات ابھی تک ہمارے یہاں مشاہیر کے خطوط شائع کرنا کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان خطوط سے ہمیں اپنے مشاہیر کی سیرت کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ جو باتیں اُن کی تصانیف سے نہ معلوم ہو سکتی تھیں۔ ان خطوط میں برافگندہ نقاب نظر آتی تھیں۔ مثال کے لئے مولانا شبلی کے خطوط کو لے لیجئے۔ یہ خطوط اہم ضرور تھے مگر تھے سب قدیم طرز پر۔ اب اس میدان میں کچھ تجربات بھی ہوئے ہیں۔ قاضی عبدالغفار صاحب مصنف نقش فرنگ نے لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری لکھکر قدامت کی روح کو بری طرح مجروح کیا ہے لیکن آیندہ کے لئے ایک روشن مستقبل کا باب بھی کھول دیا ہے۔ انہوں نے اس صنف سے وعظ و نصیحت کا بھی کام لیا ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی اس کی اثر پذیری بڑھ گئی ہے۔ ہر خط کے درمیان جو وقفہ گزرتا ہے اس کے واقعات خود بخود نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور اگرچہ ہر خط اپنی جگہ مستقل ہے لیکن ان سب کو ایک رشتہ میں پرو کر ایک داستان تیار کر لی گئی ہے۔ کہیں کہیں ضرور یہ شبہ ہوتا ہے کہ مصنف اس میدان کو مختلف ملکی' سیاسی ادبی اور معاشرتی مسائل پر اظہار خیال کے لئے آڑ بنا رہا ہے مگر یہ اظہار خیال بجائے خود دلچسپ ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کے سامنے صرف ہر چیز کا نفسیاتی پہلو ہی نہیں اُس کی شعری کیفیتیں بھی رہتی ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں اور اُنہوں نے مکتوبات کے ذریعہ سے ایک معاشرتی مسئلہ کو چھیڑ کر اس صنف کے امکانات کو خوب واضح کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اثر پذیری میں یہ طرز بعض وقت

حقیقت نگاری کے سیدھے سادے طریقے سے بھی بڑھ جاتا ہی۔

تنقید اردو میں تنقید کا معیار اب بتدریج بلند ہوتا جا رہا ہی۔ سب سے پہلے شعر و شاعری پر تنقیدیں شروع ہوئیں مگر رفتہ رفتہ اب ادبیات کے ہر شعبے پر اچھی تنقیدیں ملنے لگی ہیں بعض کتابیں اس فن پر بھی شائع ہوئی ہیں۔ شروع شروع میں نقاد کی حیثیت ایک جج کی سی تھی جو اپنی ایک جنبشِ قلم سے کسی کو مہر و مہتاب کا درجہ بخشتا اور کسی کے کمالات پر خاک ڈال دیتا تھا۔ ڈاکٹر جانسن کو گزرے ہوئے ڈیڑھ سو سال ہو گئے انگریزی تنقید کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر ہمارے یہاں بیشتر حضرات اسی سنّتِ دیرینہ پر عامل رہے۔ اب جا کر یہ احساس بیدار ہوا ہی کہ نقّاد کا فرض فیصلہ کرنا نہیں ترجمانی کرنا ہے۔ وہ شاعر یا ادیب کا ترجمان ہوتا ہے اور عالم قدس کی فضاؤں میں پلے ہوئے جذبات و خیالات کو عوام کے جذبات اور احساسات کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اُس کی تفسیر اور تنقید کے بغیر سیکڑوں نقوش ناقابلِ فہم رہ جاتے ہیں۔ وہ جب تک مختلف زاویوں سے ایک نقطۂ مرکوز پر روشنی نہیں ڈالتا' اُس کے معانی و مطالب اُجاگر نہیں ہوتے۔ اُسی کے خون سے سوزِ جگر کی لالہ کاریاں' ہماری دنیا کو آب و رنگ دیتی ہیں۔ وہ خود فن کار ہوتا ہی اور ایک طرف ادیب کے شعورِ فنی میں اضافہ کرتا ہے اور دوسری طرف اُس کا مافی الضمیر صاف صاف اور کھلے کھلے الفاظ میں عوام تک پہونچاتا ہے۔

"نقاد کی حیثیت ایک ترجمان کی سی ہے" یہ احساس اب پیدا ہو رہا ہے اور یہی اس دور کا کارنامہ ہے۔ تنقید کی چمن بندی' مشرقی اور مغربی دونوں پھولوں سے ہوئی ہے مگر ابھی تک مغربی اصول اور مغربی نظریات ضرورت سے زیادہ حاوی رہے ہیں۔ جو رائیں ہمارے ادب القدما کے متعلق قائم کی گئی ہیں اُن میں ضرورت سے زیادہ انگریزیت کو راہ دی گئی ہے اور اس کے علاوہ اس تنقید نے تخلیقی قوت کو بھی کچھ نقصان ضرور پہونچایا۔ اس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

حصّہ دوم

نظم

جدید شعرا کے دواوین

بالِ جبریل | اس کتاب سے متعلق ایک مفصل مضمون سہیل میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ چند رجحانات جو اس کی اشاعت سے نمایاں ہوئے ہیں، اُن کا ذکر اس مضمون کے پہلے حصّہ میں ہو چکا ہے۔

سرودِ زندگی | اس کتاب پر بھی تفصیل سے دوسری جگہ لکھا گیا ہے۔ دو تین باتیں جو کہنے سے رہ گئی ہیں اُن کا اظہار ضروری ہے۔

اصغر کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کائنات کو حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی نظر بلند اور خیال وسیع ہے۔ اسلوبِ بیان پختہ اور شگفتہ ہے اور اُنھوں نے غزل کو "اس لطیف" اور شیریں کیفیت سے بھر دیا ہے جو حسن ہے تو ل میں جو مستی شراب میں۔ مگر ان کلمات سے شاعر کی تحسین کا حق کما حقہٗ ادا نہیں ہوتا۔ ہر بات کو کہنے کے سینکڑوں طریقے ہوتے ہیں مگر بہترین طریقہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ اصغر کے جدید مجموعۂ کلام میں یہ بات بہت نمایاں ہے۔ اور اسی لئے اُن کے بعض شعر، ہماری شاعری کے لئے "مایۂ ناز ہیں۔

نشاطِ روح کے مطالعہ سے اس نظریئے کو تقویت پہونچتی تھی کہ اصغر عوام کے نہیں خواص کے شاعر ہیں۔ اُن کے نغمات کی لہر ایک خاص طبقہ کے دلوں میں ہیجان برپا کرتی ہے اور بس۔ یہ بات بعض کے نزدیک کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو ایک بڑے شاعر کے لئے اچھی نہیں۔ اچھے شاعر کا پیغام ایک محدود طبقے کے لئے نہیں سب کے لئے ہوتا ہے جتنا وسیع ایک شاعر کا حلقۂ اثر ہوگا، جس قدر زیادہ وہ ابلاغ خیال کر سکے گا اُتنا ہی بڑا وہ شاعر ہوگا۔ سرودِ زندگی میں اندازِ بیان نشاطِ روح سے زیادہ شگفتہ ہے۔ اس میں اصغر کا مخصوص رنگ جس میں ڈوب کر آنسو بھی ستارۂ سحری نظر آتے ہیں، زیادہ جھلکتا ہے۔ اتنی گہرائی نہیں لیکن پختگی زیادہ ہے۔ شگفتگی بہت زیادہ ہے اور بحیثیتِ مجموعی سرودِ زندگی اُن کی عظمت کو خواص و عوام دونوں سے منوانے میں معاون ہو سکتی ہے۔

اصغر روح میں ایک لطیف خلش پیدا کرتے ہیں۔ یہ خلش اقبال کے دردِ جگر کی ٹیسوں کی پروردہ ہے اس لئے میں

اسے فالِ نیک سمجھتا ہوں۔

اُن کی کمزوری یہ ہے کہ وہ جلوہ و پردہ کے پیچ و تاب سے ابھی نہیں نکلے اور نہ ابھی نکلنے کے کوئی آثار معلوم ہوتے ہیں

شعلۂ طور حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کا یہ مجموعہ ابھی حال میں لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے اس نام سے مسلم یونیورسٹی پریس میں اُن کا منتخب کلام چھپا تھا مگر افسوس ہے کہ بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر وہ مشتاقوں تک نہ پہونچ سکا۔ اب جو کچھ شائع ہوا ہے اُس میں وہ سب کچھ ہے جو پہلے نسخے میں تھا اور اس کے علاوہ وہ تمام قدیم و جدید غزلیں بھی درج ہیں جو بالقصد یا بلا قصد پہلے نسخے میں درج نہ ہو سکی تھیں۔ اُن کا تازہ ترین کلام بھی شامل ہے اور اُن کے پہلے دیوان، داغِ جگر کا جو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا، انتخاب بھی ہے تمام کلام کو مختلف دوار میں منقسم کر دیا گیا ہے اور آخر میں فارسی کلام بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی صاحب کا ایک رنگین مقدمہ ہے اور شاعر نے خود بھی اپنے کلام کے متعلق کچھ لکھا ہے۔

کتابت و طباعت ہر لحاظ سے قابلِ اطمینان ہے اگرچہ اس میں وہ شان نہیں پائی جاتی جس نے پہلے نسخے کو ایک خاصے کی چیز بنا دیا تھا۔ اربابِ نظر جگر کی ایک عکسی تصویر سے بہت متاثر ہوں گے۔ ماہرِ فن آرٹسٹ نے شاعر کی سیرت کے تمام نقوش اس تصویر میں جمع کر دیئے ہیں اور وہ دراصل وہی معلوم ہوتے ہیں، جو وہ ہیں۔
اس ضمن میں شاعر کا اپنے متعلق وہ اعتراف بھی قابلِ ذکر ہے جو اُس نے شعلۂ طور کی ابتدائی سطور میں کیا ہے یعنی وہ یکسانیت جو اُس کے کلام اور اُس کی زندگی میں پائی جاتی ہے اور جس نے اُس کے کلام میں اس قدر تاثیر بھر دی ہے۔ جگر کی شاعری اور اُس کی زندگی میں بالکل تضاد نہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ جگر صاحب نے ایک مسلمہ امر کو نظر انداز کر دیا۔ ایک اچھا شاعر بھی ہر وقت اچھا کہنے پر قادر نہیں ہو سکتا اس لئے اُس کے کلام میں افراط تفریط کا ہونا ناگزیر ہے۔ ہاں جس کے یہاں یہ ناہمواری نسبتاً کم ہوگی اُسی نسبت سے وہ بڑا شاعر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات کی اہمیت اور ضرورت ہر جگہ تسلیم کی گئی ہے۔
ورڈس ورتھ (Wordsworth) کے مرنے کے بعد اُس کی شہرت بہت کم ہو گئی تھی حالانکہ اُس کے کلام کے کئی مکمل و مشرح ایڈیشن نکل چکے تھے۔ اُس کی عظمت و برتری کا صحیح اندازہ اُس وقت ہوا جب میتھو آرنلڈ

(M. Arnold) نے اُس کے کلام کا انتخاب شائع کیا اور اُس پر ایک زبردست مقدمہ لکھا۔ درد کا کلام منتخب کلام ہے اور خود دیوان غالب کا انتخاب غالب کی زندگی میں بلکہ اُن کے ایما سے ہوا۔ اُن کی شہرت کی تمامتر بنیاد اس منتخب کلام پر ہے۔ اس لئے ہمارا اپنا خیال ہے کہ اگر جگر صاحب مسی علی گڑھ والے نسخے کو چند ضروری اضافوں کے بعد شائع فرما دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔

انتخاب کی ضرورت اُس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عمر میں انحطاط کے ساتھ جگر کی شاعری میں بھی زوال شروع ہو گیا۔ یہ کوئی تعجب کی بات اس لئے نہیں کہ شروع سے اس کا اندیشہ تھا خاص جذباتی شاعری کا، چاہے وہ کتنے ہی بلند پائے کی کیوں نہ ہو اکثر یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ جگر کے کلام میں شروع سے جذباتی حصہ (Emotion content) زیادہ ہے اور تخیلی حصہ (Thought content) کم۔ اُن کی شاعری اُس بہتے ہوئے اور چڑھتے ہوئے دریا کی مانند ہے جو اپنے زور میں سب کچھ بہا لاتا ہے مگر جب اس کا زور ختم ہو جاتا ہے تو یہ "سب کچھ" لازمی طور پر سامنے آتا ہے۔

جگر، مومن و حسرت کے شاگرد رشید ہیں۔ اُن پر دیگر معاصرین کے مقابلے میں جدیدیت کا پرتو کم پڑا۔ وہ جہاں ہیں وہاں تنہا ہیں اور اپنے مخصوص رنگ میں جسے سرمستی و بےخودی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے منفرد ہیں۔ اُن کی غزلیں، اتنی غزلیں نہیں جتنی کہ مسلسل و مربوط نظمیں ہیں۔ یہی وجہ اُن کے یہاں مطلعوں کی زیادتی کی ہے اور اسی وجہ سے اگرچہ اُن کی اچھی غزلیں کافی مل جائیں گی لیکن اُن میں چند ایسے شعر جو دوسروں کے مقابلے میں بہت ممتاز ہوں، کم ملیں گے۔ بالفاظ دیگر اُن کا کلام زیادہ ہموار ہے۔ مکتبہ جامعہ نے ابھی حال میں ہمارے ممتاز شعرا کے سو سو شعر شائع کئے ہیں اور اس طرح اُن لوگوں سے جو پورا کلام نہیں پڑھتے یا نہیں پڑھ سکتے، ان شعرا کو روشناس کرا دیا ہے۔ غالباً اصغر اور جگر کے کلام کا ایسا انتخاب ساتھ ساتھ شائع ہوا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اصغر کے اچھے اچھے شعر انتخاب میں شامل تھے مگر جگر کے ساتھ انصاف نہ ہوا۔ اس سے یہ بہتر ہوتا کہ اُن کے سو اشعار کے بجائے دس غزلیں شائع کر دی جاتیں۔

اردو شاعری میں خمریات کا حصہ بہت کافی ہے اور کئی اچھے اچھے شاعروں نے ساقی اور صہبا سے اپنی وارفتگی کا اظہار کیا ہے۔ جگر اس محفل میں مبتدی نہیں بلکہ اُستاد کی حیثیت سے تشریف رکھتے ہیں مگر اُن کی دلچسپی اتنی ساقی

سے نہیں جتنی صہبا سے ہے"۔ یہی فرق اُن کی خمریات اور دیگر خمریات میں ہے۔

اُن کے کلام میں اگرچہ غزل کا داخلی رنگ جھلکتا ہے مگر اس میں اُنہوں نے ایک نئی بات پیدا کی ہے یعنی عشق کی انانیت۔ جگر کا محبوب اُنہیں کے حسنِ تخیل کا پرتو ہے وہ اُسے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ وہ جو کچھ ہے وہ اُن کے دم سے۔ اپنی غزلوں میں وہ اپنے محبوب کا حال کم بیان کرتے ہیں، اپنا زیادہ۔ اُن کا عشق، ایک نہایت تیز اور روشن مشعل کی مانند ہے جس کے سامنے اُن کا معشوق دھندلا دھندلا سا نظر آتا ہے۔ اُن کی داستان عشق کی داستان اور عشق کا ماجرا ہے۔ درد، ہجر، رقص، سرمستی، رندی، مایوسی، پشیمانی، لغزش، وارفتگی، جوشِ جنوں، کیفِ صہبا، ان سب کیفیات کی تصویریں جگر کے خداداد قلم سے ایسی ایسی نکلی ہیں کہ باید و شاید۔

جگر صاحبِ دل ہیں۔ وہ صاحبِ طرز بھی ہیں۔ اُن کا رقص، اُن کی مستی، اُن کا جوشِ بیان اور شدتِ احساس اردو غزل کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

زبان اچھی ہے مگر کلام میں کہیں کہیں معنوی غلطیاں ملتی ہیں۔ اکثر اشعار میں "کارواں در کارواں" اور آئینہ در آئینہ جیسی ترکیبیں موزوں کی گئی ہیں اور "حجاب اندر حجاب و جلوہ اندر جلوہ" کے تو کیا کہنے۔ غالباً صرف یہی چیز جگر نے اپنے دور سے سیکھی، اور کچھ نہیں۔

کارِ امروز یہ حضرت سیماب اکبرآبادی کا جدید مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے بھی اُن کے کلام کے چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جیسے نیستاں۔ مگر یہ مجموعہ اُن کی تمام جدید نظموں کا مجموعہ ہے اور اُس کو دیکھکر اُن کے کلام پر قرار واقعی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ سیماب صاحب آج سے نہیں برسوں سے لکھتے، لکھاتے، سنتے سناتے آئے ہیں۔ انہوں نے شاعری کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں اور عوام تک اس گنج گراں مایہ کو پہونچانے میں بڑی سعی کی ہے۔ فنِ عروض پر کئی کتابیں اُن سے یادگار رہیں اور اب تو اُن کے دم سے آگرہ میں ایک سیماب اسکول کی بنا پڑ گئی ہے۔ بادی النظر میں سیماب اور سیماب اسکول ایک دوسرے سے ہم رشتہ معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیماب کی شاعری اور سیماب اسکول میں کوئی نسبت نہیں۔ سیماب کی شاعری زندہ رہنے والی ہے اور سیماب اسکول کی بنا بقول مولانا حالی کے "پانی پر" ہے سیماب خود محض ایک رند ہی نہیں صاحب ہوش بھی ہیں، وہ اپنے گرد و پیش کا بھی جائزہ لیتے ہیں، وہ اُس فضا سے متاثر ہوتے ہیں جس میں وہ سانس

لے رہے ہیں اور اس لئے اُن کے اشعار میں تاثیر بھی ہوتی ہے۔ سیماب اسکول سستے، پست اور پُھس پُھسے ادب کی اشاعت کر رہا ہے۔ جس میں "دل صد پارہ کی مبتذل قاش فروشی ہے" اور بے معنی ترکیبوں کا بے معنی طلسم! ادب لطیف کی گمراہ کُن وادیاں اس کی جولاں گاہ ہیں اور ساغر و پیمانہ اس کی محدود دنیا یہاں نقل ہی نقل ہے، اصل کا پتہ نہیں۔

سیماب کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انہیں تمام اصناف سخن پر عبور ہے اُن کا تخیل بہت بلند نہیں مگر لطف زبان اور حسن بیان کے لحاظ سے وہ بہت ممتاز ہیں۔ اُن کی تمام شاعری دو حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے:۔

شبابیات و مناظر یہ سیماب کا اپنا میدان ہے۔ الفاظ معنی سے اس طرح ہم رشتہ ہیں گویا اسی لئے وضع ہوئے تھے۔ جا بجا شاعری بفوج ظفر موج کی طرح بہہ نکلتی ہے اور کلام کا پایہ بلند ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حقیقت نگاری کی وجہ سے ہے سیماب کی نظر میں "دیباچۂ شباب" اور "داستانِ شباب" کے سارے پہلو رہتے ہیں اور اسی وجہ سے اس قسم کے اشعار کا خاموش تلاطم پڑھنے والوں کو بھی بہالے جاتا ہے۔ "ارض تاج" کے جو گیت سیماب گاتے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انھیں "شاعر تاج" کہلائیں۔

پیامیہ شاعری یہاں وہ کوئی درس دیتے ہیں، اخلاقیات کا یا مذہب کا یا قومیت کا۔ اس میدان میں سیماب اپنی قادر الکلامی کے زور سے ایک خوش رنگ اور خوش نما طلسم تو تیار کر لیتے ہیں مگر اس میں کچھ گہرائی نہیں ہوتی۔ یہاں آکر وہ کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے ہیں انہوں نے اقبال کا اثر بہت کچھ قبول کیا ہے، مگر اپنے طور پر۔ فرق یہ ہے کہ اقبال اپنا مافی الضمیر صاف صاف اور کھول کر بیان کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ سیماب کا نصب العین کیا ہے یہ ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ کبھی وہ ماضی کی دل خوش کن فضاؤں میں سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ ساری دنیا کو پیام امن سناتے ہیں اور کبھی ہندوستان کی آزادی کے گیت گاتے ہیں۔ وطنیت کا مفہوم اُن کے نزدیک کیا ہے، یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا۔ گویا ایک آموختہ دہرایا جا رہا ہے جو اچھی طرح یاد نہیں۔

جدید تہذیب سے یہ بھی گریزاں ہیں اور دور حاضر کی تلخ حقیقتوں سے بھاگ کر ماضی کے دھندلکے میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ صنائع و بدائع کے بادشاہ ہیں۔ کلام میں زور ہمیشہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اثر بھی۔ اُن کے

متعلق ایک صاحب کا خیال یہ تھا ؎

صنعت گراست اما طبعِ رواں ندارد

نغمۂ روح | اس کتاب کے مصنف جناب اختر انصاری ہمارے نوجوان شعرا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ 'نغمۂ روح' آج سے تین سال قبل شائع ہوئی تھی۔ اب دوبارہ کافی انتخاب و اضافے کے بعد پھر سامنے آئی ہے۔ شروع میں قطعات ہیں۔ اس کے بعد غزلیں اور سب سے آخر میں نظمیں۔ ان کی ترتیب غالباً زمانے کے حساب سے نہیں ہے۔ تین سال کے عرصے میں شاعر کے شعور فنی میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور جو نظمیں یا غزلیں کمزور اور سست تھیں، اب کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔ اختر صاحب اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ زیادہ تر قطعات کو بناتے ہیں اور بعض بعض ٹکڑوں میں تو انہوں نے چار مصرعوں کی محدود دنیا میں اپنی شاعری کی تمام کہربائی قوتیں بھر دی ہیں۔

ہمارا زمانہ ایک لحاظ سے مایوسی (disillusionment) کا زمانہ ہے۔ مائل پرواز طبائع کو حالاتِ زندگی اتنی اجازت نہیں دیتے کہ اپنی خیالی دنیا میں رہ سکیں۔ گرد و پیش کی حقیقتیں اتنی تلخ ہوتی ہیں کہ وہ شاعر جیسے سریع الحس انسان پر بغیر اثر ڈالے نہیں رہتیں۔ اس لئے لازمی طور پر اُن میں قنوطیت آجاتی ہے۔ اختر صاحب کی شاعری بھی یاسیات سے لبریز ہے۔ اُن کی مسکراہٹ بھی غم آلود اور اُداس ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ انہوں نے دورِ جدید کے شعرا میں سے فانی کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور اسی لئے اُن کے کلام میں سوز و گداز اور درد و اثر بہت ہے، مگر خوشی کی بات ہے کہ وہ باوجود قنوطیت کے، اپنے غم سے لذت لیتے رہتے ہیں۔

اختر صاحب کے یہاں مضامین نئے نہیں ملیں گے۔ وہی "سیر کہسار" "محبت" "نغمۂ مغنیہ" "مطربۂ آبِ رواں" اور "برشگال" یہاں بھی ہیں۔ اُن کی داستان سب کی داستان اور اُن کی آپ بیتی جگ بیتی ہے۔ مگر اندازِ بیان میں انفرادیت ضرور جھلکتی ہے خود فرماتے ہیں ؎

سننے والے فسانہ تیرا ہے — صرف طرزِ بیان میرا ہے

موسیقی سے اختر صاحب خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ اس کی ذرا سی لہر سے اُن کے دل کے تاروں میں ارتعاش ہونے لگتا ہے۔ اس لہر سے اُن کی لذتِ غم میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی سے وہ اپنے "زخموں سے کھیلنے" کا حوصلہ مانگتے ہیں۔

نغمۂ روح کے شروع میں شاعر نے آرٹ پر چند خیالات قلم بند فرمائے ہیں۔ ہمارے خیال میں اُن کی چنداں

ضرورت نہ تھی۔ اُن کا فلسفۂ زندگی اور اُن کا جمالیاتی تصور اُن کے اشعار سے بہتر طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے۔

قدیم دواوین کے جدید اڈیشن

دیوانِ مومن | جناب ضیاء احمد صاحب ضیا بدایونی نے نہایت صحت و نفاست سے مومن خاں مومن دہلوی کے کلام کا یہ مشرح اڈیشن شائع کیا ہے۔ اب تک اس یوسفِ مصر معانی کے دیوان کے نسخے بازار میں نہایت ردی حالت میں ملتے تھے جن کو دیکھکر افسوس ہوتا تھا۔ ایک تو کلام مشکل اور مغلق، دوسرے نسخے اغلاط سے لبریز۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دورِ حاضر اس عظیم المرتبت شاعر کی عظمت سے صحیح طور پر آشنا نہ ہو سکا۔ اسپنسر (Spencer) کو اہلِ نظر نے امیر الشعرا (Poets of poets) کا خطاب دیا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی کا ہر بڑا شاعر اسپنسر کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیٹس کی طرح بہت سے شعرانے اسپنسر کو اپنا رہنما بنایا تا آنکہ اُن کا اپنا مخصوص اور انفرادی رنگ نہ پختہ ہو لیا۔ اسپنسر کے نغماتِ روح کے ساتھ وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو بعض اوقات نغمہ و رنگ بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ یہی بات حکیم مومن خاں مومن میں بھی ہے۔ جگر نے ایک ادبی محفل میں ایک نوجوان شاعر کو نصیحت کی تھی کہ اگر تغزل کی صحیح روح تک پہونچنا ہے تو مومن اور حسرت کو حرز جان بنا لو۔ اس خیال کی صحت سے انکار نہیں ہو سکتا بلکہ میرے خیال میں تو ہر اچھے شاعر کے لئے مومن کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ طرزِ بیان کی شگفتگی مومن پر ختم ہے اور ہر شاعر کو اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ غزل کے امام ہر دور میں گزرے ہیں مگر خالص تغزل کے علم برداران میں سے چند ہی حضرات ہیں۔ میر، مومن، داغ اور حسرت میں باوجود نمایاں فرق کے جو چیز مشترک ہے اور جو اُن کی شاعری کو اس قدر ممتاز بناتی ہے وہ یہی تغزل ہے۔ فاضل مرتب نے بڑی کوشش و جانفشانی سے بہت سے متداولہ نسخوں کا مقابلہ کر کے، حتی المقدور صحت کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اُن اغلاط کی فہرست بھی دے دی ہے جو دوسرے نسخوں میں ہیں اور جن کی اس کتاب میں تصحیح کر دی گئی ہے۔ اب اس کو کیا کہیئے کہ بعض نام نہاد اربابِ نظر اس فہرست کو کتاب کا غلط نامہ سمجھتے ہیں (ملاحظہ ہو رسالۂ اردو) غزلوں کے نیچے حاشیہ میں ضروری مطالب بھی دئے گئے ہیں جو اپنی جگہ پر مکمل ہیں اور جن کے مخاطب صحیح بقول مرتب "نہ مبتدی طلبا ہیں نہ منتہی علما" اور اس لئے حد سے زیادہ اطناب

یا ایجاز سے پرہیز کیا گیا ہے" یہ کتاب کی خوبی کی دلیل ہے کہ متذکرۂ بالا دونوں طبقے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں
دیوان کے شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ مومن کی شاعری پر ہے جس کے ذیل میں فاضل مرتب نے شاعر کے حالاتِ زندگی، سیرت اور ماحول پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اردو غزل میں مومن کا جو پایہ ہے اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں قول فیصل یہ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ صدق جذبات اور ندرتِ اسلوب میں کوئی اُستاد مشکل سے مومن کا ہمسر ہوگا۔"

ندرتِ اسلوب میں مومن کی برتری مسلّم ہے مگر ہمارے خیال میں صدق جذبات میں بہت سے اچھے شعرا اُن کے ہمسر ہیں۔

مومن کی عدم مقبولیت کے فاضل مرتب نے کئی سبب بتائے ہیں اور اس ناانصافی پر افسوس بھی کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کلام کی عدم مقبولیت کا باعث مومن خود ہیں۔ اُن کا انداز بیان شگفتہ سہی لیکن خیال ضرور پیچیدہ ہوتا ہے اور پڑھنے والا جب تک شاعر کے مفہوم پر حاوی ہو کلام کی شعریت اور اثر پذیری رخصت ہو لیتی ہے۔ بالفاظ دیگر اُن کا کلام خواص کے لئے ہے اور اپنا حلقۂ اثر اُنھوں نے اپنے آپ ہی محدود کر لیا ہے۔
دوسری وجہ رعایت لفظی میں غلو ہے۔ اردو شاعری الفاظ کی غلام ہے مجنوں کے ساتھ وحشت کا لفظ اس طرح چپکا ہوا ہے کہ ذہن فوراً اُس طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ رعایت لفظی و معنوی مومن پر ختم ہے۔ یہی بیک وقت اُن کی قوت اور یہی اُن کی کمزوری ہے، اسی سے وہ زندہ ہیں اور اسی سے اُن کی شاعری پر داغ آتا ہے۔

کمالِ داغ | یہ فصیح الملک داغ دہلوی کے کلام کا انتخاب ہے جو مولانا حامد حسن قادری نے اُن کے چاروں دیوانوں گلزارِ داغ، آفتابِ داغ، مہتابِ داغ اور یادگارِ داغ سے کیا ہے۔ شروع میں کوئی سوا سو صفحات کا مقدمہ ہے جس کے ایک حصہ میں اردو غزل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور دوسرے میں داغ کی شاعری پر تبصرہ ہے۔
قادری صاحب نے یہ انتخاب اور مقدمہ شائع کر کے داغ اور ہماری شاعری دونوں پر احسان کیا ہے۔ داغ کے کلام کا انتخاب ضروری تھا اور اس انتخاب سے داغ کے کلام کے محاسن اور زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔
داغ دہلوی اُن شعرا میں سے ہیں جن کی زندگی میں بڑی قدر ہوئی اور مرنے کے بعد ردِ عمل کے طور پر

ایک طوفان اعتراضات اور شکوک کا برپا ہوگیا۔ اس طوفان میں داغؔ کی شہرت کچھ ڈانواں ڈول سی ہونے لگی اور خصوصاً چکبست لکھنوی کے مضمون کے بعد سے تو اُن کی شاعری کو عیاشانہ اور مخرب اخلاق کہکر ٹال دیا گیا۔ چکبست نے داغ کے بعض کمالات کا اعتراف ضرور کیا لیکن اُن کے الزامات اُس زمانہ میں (یہ مضمون غالباً ۱۹۰۵ء کا ہی) داغ کی شہرت کو دفن کرنے کے لئے کافی سمجھے گئے۔ چکبست کے خیال میں داغؔ کا کلام دل میں چٹکی ضرور لیتا ہی مگر ایسی جیسی ایک "بانکی چنچل عورت" لیتی ہے۔ "اُن کا کلام اُن خواہشاتِ نفسانی کو برانگیختہ کرتا ہے جو محض جذباتِ حیوانی سے وابستہ ہیں" بالفاظ دیگر چکبست کے خیال میں داغؔ کی شاعری کے لئے سب سے موزوں لقب "عیاشانہ شاعری" ہے۔ یہ دونوں اعتراضات ایک ہی ذہنیت کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ ذہنیت جو جذبات کو دبانا اور اُن میں تفریق کرنا اپنی معراج سمجھتی تھی جس کے نزدیک دوسری چیزوں کی طرح شاعری اور الفاظ میں بھی ذات پات تھی، جو اعلیٰ جذبات کو گلے سے لگاتی اور اسفل جذبات کا گلا گھونٹتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حقیقت نگاری ضروری نہیں بلکہ ایک خاص رنگ میں شاعری (لفّاظی یا صنّاعی ؟) ضروری تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ داغؔ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں حقیقت نگاری کو رواج دیا۔ اُن سے پہلے جذبات کا خون کیا جاتا تھا اور حقیقت پر اتنے پردے ڈالے جاتے تھے کہ وہ موہوم سی ہوکر رہ جاتی تھی۔ اس لئے داغ کا جرم زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اُس چیز کو صاف صاف بیان کر دیا جس کا اظہار اب تک چھپ چھپ کر اور استعاروں میں ہوتا تھا۔ مطلب وہی ہوتا تھا لیکن اس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح عالم قدس سے جاملتا تھا اور حقیقت و مجاز کی ایسی پر پیچ بھول بھلیاں آجاتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ داغؔ سے پہلے عجز و نیاز، قناعت، تصوف، دنیا کی بے ثباتی کے مضامین باندھے جاتے تھے شاید اس لئے کہ "راہ نجات" کی کوئی تو صورت نکلے۔ داغؔ نے اس چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا ہر شعر پر محسوس کرتا ہے کہ یہ خود آیا ہے، لایا ہوا نہیں ہی۔

حامد حسن صاحب نے اپنے مقدمے کے پہلے حصہ میں غزل گوئی پر تفصیل سے ریویو کیا ہے اور اس ذیل میں اُن تمام جزئیات پر بھی نظر ڈالی ہے جن کے بغیر غزل غزل نہیں رہتی۔ اُنھوں نے قدیم و جدید غزل گوئی میں جو بیّن فرق ہوگیا ہی اُسے اچھی طرح واضح کیا ہے اور اس کے وجوہات بیان کئے ہیں۔

اس پیش کردہ معیار کے مطابق، دوسرے حصے میں اُنھوں نے داغؔ کی شاعری کو جانچا ہے اور اُن کا

فیصلہ یہ ہے۔

نمبر ا۔ زبان۔ (انتخاب الفاظ، لطف بندش، صفائی زبان، روانی) میں داغ کسی اردو شاعر سے کم نہیں اور اپنے زمانے میں بے نظیر ہیں۔

نمبر ۲۔ مضمون آفرینی۔

(الف) جدت ادا۔ مومن و غالب کے بعد داغ کا درجہ ہے۔

(ب) رفعت فکر و لطافت تخیل۔ مومن و غالب اور امیر مینائی کے بعد داغ کا نمبر ہے۔

(ج) وسعت و کثرت مضامین۔ داغ کا کوئی خاص درجہ نہیں۔

نمبر ۳۔ جذبات و معاملات۔ (متغزلانہ) یہاں داغ اپنے قدما سے بہتر نہیں ہیں۔ اپنے معاصرین میں امیر کے بعد اور جلال سے پہلے ہیں۔

(ب) بوالہوسانہ۔ میں داغ سب سے نمبر لے گئے ہیں اور یہ اُن کی شاعری پر ایک بدنما داغ ہے۔

نمبر ۴۔ شگفتگی بیان۔ شوخی و زندہ دلی۔ یہ داغ کا بہترین کارنامہ ہے .... اس وصف میں عہد قدیم سے عصر حاضر تک کوئی شاعر داغ سے بہتر کیا برابر و ہمسر بھی نہیں۔"

ہماری رائے میں شوخی و زندہ دلی میں ریاض اور حسرت اُن کے جانشیں ہیں۔

مسدس حالی (صدی ایڈیشن) یوں تو مسدس کے بہتیرے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور بہت کچھ اُس پر لکھا جا چکا ہے لیکن ان سب میں یہ صدی ایڈیشن جو مولانا حالی کی صدی کے جشن پر شائع ہوا، ایک خاص درجہ رکھتا ہے اس سے قطع نظر کہ یہ مسدس کا سب سے صحیح نسخہ ہے، اس میں ہمارے مشاہیر اہل قلم کے تبصرے اور مقدمے ایک جگہ جمع کر دئے گئے ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب، سید سلیمان ندوی صاحب اور خواجہ غلام السیدین صاحب کے ارشادات خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ بقول عابد صاحب کے "شعر حالی کی چھوٹ ان آئینوں میں اہل نظر کو کچھ اور ہی لطف دیتی ہے۔"

نثر

(ناول اور افسانے)

رنگین زمانہ یہ کتاب جناب محبوب حسن صاحب صوفی بی۔اے کی تصنیف ہے بقول مصنف اس ناول میں "سو برس بعد کی ہندوستانی سوسائٹی کا رنگ اور لکھنؤ کا نقشہ" دکھایا گیا ہے۔ قصہ کی ہیروین ایک نوجوان ڈاکٹر مس شعلہ ہے جس کی برق سامانیوں کی داستان صوفی صاحب نے صاف، سلجھے ہوئے اور دل نشین پیرائے میں بیان کر دی ہے۔ افراد کے ناموں میں کچھ علامتی رنگ جھلکتا ہے۔ رعایت لفظی ابھی تک کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ادب اور انشا پر جاری و ساری ہے۔

ناول کو زندگی کی تصویر بلکہ تفسیر کہنا چاہیئے۔ اور جس طرح مصور کے لئے صرف مشاہدے کی قوت کافی نہیں بلکہ تخیل کی رنگ آمیزی بھی اُتنی ہی بلکہ اُس سے زیادہ ضروری ہے، اُسی طرح ناول نگار میں کے تخیل میں وسعت نہ ہو تو اُس کا سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس ناول کو سو برس بعد کی داستان کہنا سو برس بعد کے زمانے کے ساتھ ظلم ہے۔ لکھنے والا باوجود ایک اچھا طرز تحریر رکھنے کے، اپنے گرد وپیش سے آگے نہیں دیکھ سکتا چونکہ وہ خود قدامت پسند ہے اس لئے اُس کے افراد بھی باوجود اس کے کہ وہ اکیسویں صدی میں چلتے پھرتے ہیں، اُس صدی کے نہیں معلوم ہوتے۔ شعلہ کے پہلو میں وہی دل ہے جو اس زمانے میں عورتوں کو قدامت اور جدیدیت کی کشاکش میں مبتلا رکھتا ہے۔ اگرچہ اُس کا لباس نیا ہے، سج دھج دوسری ہے مگر وہ دولت سے اُسی طرح خیرہ ہوتی ہے جس طرح ہندوستان جنت نشان کی کسی حرم سرا میں بیٹھنے والی نیک بخت۔ اُس کے خیالات اور جذبات درحقیقت اُسی ذہنیت کے پروردہ ہیں جو قدامت پسند ہے۔ اس کے علاوہ صوفی صاحب نے سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس سرعت سے بدلنے والے حالات کی روشنی میں بہت بعد از وقت معلوم ہوتا ہے۔ اُس زمانہ سے پہلے اس جنگ کا قطعی فیصلہ اور وہ بھی مزدور کے حق میں ہی ہوچکا ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "رنگین زمانہ" کے افراد اُس زمانہ کے نہیں جس میں وہ چلتے پھرتے دکھائے گئے ہیں اسی وجہ سے وہ کچھ بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔ نہ وہ اُس زمانہ کے لئے موزوں ہیں اور نہ وہ زمانہ اُن کے

لئے سازگار۔ اُن کی مثال اُن پودوں کی سی ہے جو ایک گرم جگہ سے اُٹھا کر ٹھنڈی جگہ رکھ دیئے گئے ہوں اور سردی میں ٹھٹھر رہے ہوں بیش بینی یا پیشین گوئی درحقیقت بہت مشکل ہے۔ اُس میں ترقی پذیری ہونی چاہیئے اور اس ترقی کو حال کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اس فرض سے انگلستان کا مشہور ادیب برنارڈ شا اپنی مشہور تمثیل (Back to Methasel) میں بہت اچھی طرح عہدہ برآ ہوا ہے۔ وہ نہ صرف ماضی کے دھندلکے میں اپنے افراد کی شخصیتیں اُجاگر رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے، نہ صرف حال کی بھول بھلیاں میں اُنھیں ایک خاص ہیئت اور صورت بخشتا ہے بلکہ استقبال کی نامعلوم فضاؤں میں بھی اُس کا قلم اپنا اعجاز دکھائے بغیر نہیں رہتا جس سرعت سے ہمارے سماج میں انقلاب ہو رہا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے سو برس کے بعد جو تغیر ہوگا وہ اس سے کہیں زیادہ گہرا ہوگا جو مصنف نے دکھایا ہے۔ "انسداد حمل" اور "مخلوط کلب" وہ خیالات نہیں جو ابھی خمیر وجود میں ہوں، ہمارے زمانے میں ہی ان کی اشاعت اور تشکیل ہو رہی ہے۔ آیندہ چلکران کی ایسی مخالفت نہ ہوگی جیسی اس کتاب میں کی گئی ہے۔ محبت کا جو (جمالیاتی) تصور پیش کیا گیا ہے وہ بھی اُس زمانہ میں نبھنا مشکل نظر آتا ہے لہذا کتاب کا خاتمہ ذرا بے جوڑ سا ہے۔

غرضکہ یہ کتاب مستقبل کی تصویر نہیں، حال کا ذرا طنز آمیز عکس ہے۔ صرف نقوش گہرے کرنے سے تصویر نہیں بدلتی۔ اس کے لئے نظر کی گہرائی کی ضرورت ہے جو اس کتاب میں مفقود ہے۔

زندگی اس کتاب میں حیاتِ انسانی کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ بقول مصنف "اس کا ماخذ نہ ڈیوانیہ کامیڈیہ (Divine Comedy) ہے نہ ابن عربی کی کوئی تصنیف۔ تمام مذاہب کا یکساں کارفرما اصول ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ یہی اصول اس کتاب کا اساس بنیاد ہے۔"

زندگی کو محض ناول یا افسانہ کہنا صاحبِ زندگی کے ساتھ ظلم ہوگا۔ یہ ایک نگارخانہ ہے جس میں دنیا کی مختلف تصویریں اور ان تصویروں کے مختلف نقوش بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتاب کا ڈھانچہ علامتی ہے اور ازمنہ وسطیٰ کی اُن کتابوں کی یاد دلاتا ہے جن کی بنیاد ایک خواب، عالمِ بالا کی سیر، اور اس خواب کی تعبیر پر رکھی جاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی توبۃ النصوح قسم کی کتاب ہے۔

زندگی کے اس اسٹیج پر جو افراد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان کی سیرت کی نقل اتارتے ہیں اور اس نقل کو بمنزلہ

اصل کے بنانے میں، چودھری افضل حق اچھی طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے خدمت خلق کا نصب العین بھی اچھی طرح واضح کیا ہے۔

طرز تحریر ضرورت سے زیادہ قدیم ہے۔ ممکن ہے آج سے ۲۵ سال پہلے مقبول ہو۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"حسن نے کمان ابروئے مژگان کے تیر برسانے شروع کئے۔ میں ایک آہ بے اثر لیکر سینہ سپر ہوا مگر ایک ہی وار میں سینہ چھلنی ہو گیا۔"

"تخیل نے درختوں کی سبز جھالریں سے جھانک کر دیکھا تو منزل محبوب کا نظر فریب منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ ساقئ بزم افروز کی مے گوں آنکھیں نوازش ہائے پیہم میں مصروف تھیں اور شیریں نغموں سے گرد و پیش کی ساری فضا معمور۔"

خیر و شر کی گتھی سلجھانے میں مصنف کی نظر زیادہ تر سطحی عکاسی پر رہتی ہے۔ وہ گناہ کی ترغیب کا متشکل ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر انھیں اطمینان نہیں ہوتا۔ "خان دوراں جو دراصل قدیم (Mysteries + Moralities) کے علامتی افراد کی مانند مجسم ترغیب گناہ ہے، اس طرح اپنے اصلی لباس میں آشکار ہوتا ہے:۔

"میں نے چاہا کہ اس کی عبا کے کنارے کو پکڑ کر پوچھوں کہ میں تیرے قبضہ سے کیونکر نکل گیا۔ مگر وہ نہ رکا۔ اس نے کنارے کو جھٹکا دیا مگر میں نے دامن تھامے رکھا۔ اس کی ناک سے سگرٹ کے دھوئیں کی طرح ایک غبار سا اٹھا اور بتدریج پھیلنا شروع ہوا۔ اس دھوئیں سے ایک نہایت کریہہ شکل نمودار ہوئی۔"

چودھری صاحب صرف اسی پر بس نہیں کرتے وہ جب جنت الفردوس کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے حسن ظاہری اور اس کی آرائشوں کی تعریف میں کھو جاتے ہیں:۔

"ہر منزل پر نیا منظر تھا۔ ہر منظر میں طرب و نشاط کی ہزاروں دلآویزیاں۔ باغ سدا بہار۔ میوے موسم کی قید سے آزاد۔ ہر جگہ زعفران کے کھیت میلوں تک کھلا ہوا موتیا...... یہ دنیا بھی عجب دنیا تھی۔ پھول شاخوں سے تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ کہیں سبز شاخیں آب رواں پر جھک رہی تھیں۔ موتی کے کنارے والی نہریں قوس قزح کی طرح ہفت رنگ پانی بہہ رہا تھا۔"

چودھری صاحب جنت و دوزخ کے ان ظاہری خصائص پر اپنا سارا زور قلم صرف کر دیتے ہیں۔ انھیں یہ خیال

نہیں رہتا کہ اقبال نے بانگِ درا میں جہاں جہنم کا نقشہ کھینچا ہے وہاں صرف یہ لکھ کر کہ یہاں "جو آتا ہے اپنے انگار ساتھ لاتا ہے"، جہنم اور گناہ دونوں کو عبرت خیز بنا دیا ہے۔ اثر پذیری جزئیات کی تصویر کھینچنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اُس کے لئے صرف دو ایک نقش کافی ہیں بشرطیکہ اُن نقوش میں مصور کی ساری حرارت اور ساری گرمی سما گئی ہو۔

جوشِ فکر | جناب سلطان حیدر جوش کے مضامین اور افسانوں کا یہ مختصر مجموعہ، حاجی محمد طیب صاحب نے ڈسٹرکٹ گزٹ پریس علی گڑھ سے نفیس کاغذ پر شائع کیا ہے۔ انتخاب اس نہج پر ہے کہ "افسانوں اور مزاحیہ نقوش کے علاوہ، علمی، ادبی، معاشرتی، ہر رنگ کے مضامین اس مختصر مجموعہ میں آجائیں"۔

جوش صاحب آج سے نہیں اُس وقت سے لکھتے ہیں جب کہ مخزن مرحوم کی ضیا باریوں سے دنیائے ادب میں روشنی ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے جس فضا میں آنکھ کھولی اُس میں مغربی تہذیب کے چڑھتے ہوئے دریا اور مشرقی تہذیب کی اُترتی ہوئی لہر کو ایک ساتھ دیکھا۔ اُنھوں نے اکبر کی لطیف زہرناکی اور اقبال کے غم و غصہ سے فائدہ اُٹھایا اور خود بھی اُسی رنگ میں رنگ گئے۔ اُن کے ناول اور افسانے مقصدی افسانے ہیں اور اُن کے عنوانات کے لحاظ سے طنزیات کی صف میں بھی اُنھیں ممتاز جگہ ملتی ہے۔ اُس وقت "زندگی مردہ اور روحِ زندگی افسردہ تھی"، اس لئے اپنے مطلب کو سیکڑوں استعاروں کے پردے میں چھپانا ضروری تھا۔ جوش کی طنز نہایت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے "ابلیس"۔

جوش صاحب کا قدم محسوسات کی دنیا میں بھی آگے پڑتا ہے۔ وہ ایک لطیف طرز نگارش کے مالک ہیں۔ ایک طرح کے صنعت گر بھی ہیں اور اُن کی انشا نگوں کے جڑنے سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ و معنی مل کر اُن کے رنگ کو ایک پُرشباب عورت سے زیادہ دلفریب بنا دیتے ہیں۔

جوش فلسفۂ شباب سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ موضوع لوٹ پھیر کر ہر مضمون میں وہ دہرا بھی دیتے ہیں۔ اُن کو قدامت پسند کہنا بیجا نہ ہوگا (Traditionalist) اس طبقہ میں بات کسی مقصد کو پورا کرتی ہو یا نہیں سلیقہ سے کہنی چاہیئے۔ اس میں زبان کا چٹخارہ ضروری ہوتا ہے اور رعایت لفظی کی چاشنی بھی۔

بہتر ہوتا اگر جوش صاحب کے افسانے اور مضامین الگ الگ شائع کئے جاتے ——— اُس وقت دونوں کے ساتھ زیادہ انصاف ہو سکتا۔

مکتوبات

مکتوباتِ نیاز مکتوبات، لکھنے والے کی سیرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جن کی زندگی یا تو دوسروں کو دھوکا دینے میں گزرتی ہے، یا وہ خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ گویا دنیا کے جلسوں میں، بازاروں میں اور تفریح گاہوں میں، اپنے چہرے پر ایک نقاب ڈالے رہتے ہیں۔ دنیا اُنہیں عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔ اُن میں طرح طرح کے کمالات فرض کرتی ہے اپنے خیال میں اُنھیں اچھی طرح سمجھ لیتی ہے مگر اُن کی اس حقیقت کو نہیں پا سکتی جو یہ نقاب چھپائے ہوئے ہے۔ اُن کی تقریروں، تحریروں حتیٰ کہ شاعری تک میں اُن کی شخصیت کا عکس نہیں جھلکنے پاتا۔ مگر اپنے نجی خطوط میں ہر شخص اپنا نقاب اُتار پھینکتا ہے اور وہی نظر آتا ہے جو وہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ "مکتوباتِ نیاز" اُن کی تمام تصانیف سے زیادہ اہم ہیں۔ جو کچھ اُنھوں نے اب تک لکھا اس کی شوخی اور رعنائی ہماری انشا اور ادب کے لئے مایۂ ناز سمجھی جاتی ہے۔ مگر اُنھوں نے غریب اردو کی گردن پر اپنے "اختراعات فائقہ" کا ایسا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے کہ معلوم نہیں کب اُس سے گلو خلاصی ہو سکے۔ یہ خطوط بھی اُسی طرزِ تحریر کے حامل ہیں، اُسی قدیم طرزِ نگارش کا عکس ہیں جس کے خلاف لیلیٰ کے خطوط میں بغاوت کی گئی ہے۔ مکتوبات میں ایک شخصیت جلوہ گر ہے جو ہمارے سامنے مختلف پہلوؤں سے آتی ہے۔ کہیں سخن فہم بنکر کہیں سخن گو کہیں رندِ خراباتی بنکر کہیں ناصح۔ کہیں مذہب و اخلاق سے بیزاری کا پہلو لیکر اور کہیں عورتوں کے حقوق کی علم بردار بنکر، مگر سیدھا سادھا انسان بنکر کہیں نہیں۔ ایک مافوق الفطرت، شعر و ادب میں ڈوبی ہوئی ذہنیت جو اپنی ساری اُمنگیں اور ساری جرأت زندگی سے نہیں، شعر و شاعری اور وہ بھی "آتش سیال میں" ڈوبی ہوئی شاعری سے مستعار لیتی ہے، جو جدیدیت کے نام نہاد لباس میں اپنی قدامت کو چھپانے کی بے سود کوشش میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب نیاز کا قلم جذبات کی دنیا میں اپنی عریاں نگاری سے ہلچل برپا کر دیتا تھا۔ وہ کیفیت جو اس انشا کو آب و رنگ دیتی تھی اور اُسے نکھارتی تھی اب مفقود ہے۔ خوش گلوئی رخصت ہوئی اب صرف منھ بنانا رہ گیا ہے۔ وہی اشعار کی فراوانی (جو مدن تھیٹر کے چند مشہور "نیک نام" ڈراموں کی یاد دلاتی ہے) وہی قائل

رات۔ وہی جارحیا کی کنیز، وہی آتشِ سیّال اور وہی موضوعِ جمیل۔ اور اس کے ساتھ وہی مذہب و اخلاق کے ساتھ آنکھ مچولی یہاں بھی موجود ہے۔ پند و نصیحت زیادہ ہے، جوش و روانی کم۔

نیاز صاحب کے خطوط کو دیکھ کر پوپ (Pope) کے خطوط یاد آگئے اور پوپ کا زمانہ بھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ پوپ کے خطوط اور اُن کی اشاعت کے ساتھ کیسے کیسے دلچسپ واقعات وابستہ ہیں اور پوپ کے خطوط کی، اُس کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے، کیا اہمیت ہے۔ دونوں کے خطوط میں وہ بات مفقود ہے جو خطوط کا طرۂ امتیاز ہے یعنی وہاں بھی چہرے پر نقاب پڑا ہوا ہے اور یہاں بھی۔ وہاں بھی دنیا کو اپنے متعلق ایک خاص فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش ہے اور یہاں بھی۔ نیاز صاحب، حقیقت کی اس دنیا میں آکر بھی، انسان نہ بن سکے۔ وہ انسان جو بحیثیت باپ، بھائی، شوہر یا عاشق کے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ سوائے چند خطوط کے بیشتر اسی مصنوعی طرز میں لکھے گئے ہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ——

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری یہ دونوں کتابیں کئی پہلو سے اہم ہیں۔ ان میں ہمارے ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ادب زندگی سے جتنا قریب ہوگا اُسی قدر اُس کی اہمیت اور اثر پذیری بڑھتی جائے گی۔ اس دعوی کی بیّن دلیل قاضی عبدالغفار صاحب کی یہ دونوں کتابیں ہیں۔ ان میں وہ بے تابی، بےچینی، اور سراسیمگی سانس لے رہی ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کو پراگندہ کئے ہوئے ہے۔ موضوع اردو میں نیا سہی، سماج کے لئے کوئی نیا نہیں بلکہ برسوں سے ناسور بنکر سماج کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ لیلیٰ کے خطوط کا تعارف مصنف ان الفاظ میں کراتا ہے:—

> "اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ...... تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جس وقت تک ہندوستان کی عورت کے ساتھ پورا انصاف نہ کیا جائے گا سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادّعا محض حرفِ غلط رہے گا۔"

> "لیلیٰ کا تبسم ایک فوارۂ خون، اس کی بزلہ سنجی ایک فریاد اور اُس کی ظرافت ایک دُکھی کی پکار ہے۔ اُس کی شوخیوں میں اُس کے دل کا درد مستور ہے، اُس کی شرارتوں میں اُس کی جراحتیں پوشیدہ ہیں ...... وہ ہنس ہنس کر اپنے اُن زخموں سے کھیلتی ہے جو اُس کے وجود معنوی پر ناسور بنکر رہ گئے ہیں۔"

"لیلیٰ کی زندگی کا ہر نقش فریادی ہے"۔ ذلیل عصمت فروش، بیسوا، جسے سماج دن کے اجالے میں ٹھکراتا اور رات کے اندھیرے میں گلے لگاتا ہے، مردوں سے انتقام لینے کے لئے میدان میں آئی ہے۔ عورت کی مظلومیت وہ خونچکاں داستانوں سے ثابت نہیں کرتی، وہ خود سراپا داستان ہے۔ اس کا یہ سارا سب وشتم "مشاہد" حق کے لئے گردش میں لایا گیا ہے۔ وہ صرف یہی کہہ سکتی ہے:۔

"مردوں نے جیسا چاہا عورتوں کو بنا دیا۔ ہیرے کی چمک چھین لی اور جو باقی رہا اُسے ہوا میں اُڑا دیا"

یہ وہ ڈرامہ ہے جس کی ابتدا تیسرے ایکٹ سے ہوتی ہے۔ مصنف اتنی زحمت نہیں گوارا کرتا، نہ اس کی ضرورت سمجھتا ہے کہ لیلیٰ کے کیرکٹر میں ترقی پذیری دکھائے۔ لیلیٰ شروع سے حسن فروش فلسفی ہے، یہی اس کی زندگی (یا موت؟) کا راز ہے۔ اس کی اگلی زندگی کی طرف اگر کہیں اشارہ بھی ہے تو چند الفاظ میں:۔

"اس کم عرصہ میں میں نے بہت زیادہ فاصلہ طے کر لیا۔ دوشیزگی کے خلوت خانہ سے نکل کر بازار میں آگئی۔ یہ میرا پہلا مرد ہی جس نے مجھے عورت بنایا مگر بیوی نہ بنایا۔ جس نے مجھے میری شاخ سے چُن کر چند روز گلے کا ہار بنایا اور پھر مسل کر بدر رو میں پھینک دیا۔ جس ظالم نے میری دوشیزگی کو وہاں پہنچا دیا جہاں اب تم دیکھ رہے ہو۔ جس نے مجھے وہ بنا دیا جو میں اب نظر آتی ہوں"۔

اس نگار خانہ میں آپ کو مختلف نقوش نہیں ملیں گے۔ نقش صرف ایک ہے۔ صرف مصوّر کی موکاری و موشگافی میں فرق ہے۔ کہیں وہ گہری ہے کہیں ہلکی۔ کہیں غصّہ ہے کہیں طنز و استہزا۔ کہیں ہذیان ہے کہیں سکوت غم آمیز۔ ایک خاص نقطے پر ساری روشنی مرکوز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود (canvas) چھوٹا ہونے کے حقیقت نگاری بدرجۂ کمال ہوئی ہے"۔

لیلیٰ کی نفسیاتی کیفیت، اُس کے دل کا حال دکھانے میں مصنف کے قلم نے کمال کر دیا ہے۔ ایک ایک فقرے سے زور قلم کا مظاہرہ ہوتا ہے" اگرچہ ایک سطر بھی زور قلم کے مظاہرے کے لئے نہیں لکھی گئی"۔

"شمع کس قدر جلد پگھلتی ہی۔ جس قدر تیز جلتی ہے اُسی قدر جلد ختم ہوتی ہے۔ میری زندگی کی شمع اب بہت تیز روشن ہی اور انشاءاللہ بہت جلد گُل ہوگی! اپنی زندگی کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہوں! تم اور تم جیسے سب آئیں اور مجھ خانہ بر انداز کی زندگی کی پونجی کو جلد سے جلد لوٹ لیں!"

"مردوں کی تمام ازدواجی زندگی یک طرفہ ہوتی ہے کتنی زندگیوں کے دریا تمہاری پیاس نے خشک کر دیئے مگر تم نے صرف اپنی ہی پیاس کو یاد رکھا ——— دریا کا پانی خشک ہوا جاتا ہے اس کی کبھی پروانہ کی۔"

"مرد فطرتاً خانہ بدوش ہے اور عورت وطن پرست۔ مرد ہر جگہ اپنا گھر بنا لیتا ہے، ہر جگہ اپنا دل لگا لیتا ہے اور عورت جس دیوار کے سائے میں بیٹھ جاتی ہے، پھر اٹھ نہیں سکتی۔ وہیں سے اُس کا جنازہ اُٹھتا ہے ——— اور اگر اُٹھ بھی جائے تو عمر بھر اُس دیوار کے سائے کو نہیں بھولتی۔ باغوں میں رہتی ہے، محفلوں میں جلوہ ریز ہوتی ہے، سمندروں کے طوفان دیکھتی ہے، بیابانوں میں سے گزرتی ہے اور پھر اُس دیوار کے سائے کو تلاش کرتی ہوئی آتی ہے ——— بھول نہیں سکتی تاآنکہ اُس کو وہ نیند نہ آجائے جو دنیا کی ہر چیز کو بھلا دیتی ہے!!"

رسالہ اُردو کے ریویو نگار نے اعتراض کیا ہے کہ اگر لیلیٰ کی زندگی کے تمام پہلو دکھائے جاتے تو مصنف کا مقصد زیادہ صحیح طور پر بر آتا مگر ہمارے خیال میں یہ طرزِ تحریر ایک لحاظ سے براہِ راست حقیقت نگاری سے بہتر ہے اس میں اگرچہ (canvas) مختصر ہوتا ہے مگر روشنی ایک جگہ مرکوز رہتی ہے اور اس لئے اثر پذیری کا زیادہ امکان ہے۔ کنایہ صراحت سے اکثر بلیغ ہوتا ہے۔

مجنوں کی ڈائری ایک قلمی تصویر ہے جس میں عہدِ جدید کے ایک ہندوستانی نوجوان کی معنوی کیفیات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عورت کی مظلومیت کی داستان بدقسمتی سے لیلیٰ کی زبان سے بیان کی گئی تھی۔ اس لئے اس لیلیٰ کے مجنوں کا بھی ذکر ضروری تھا (ہر لیلیٰ کا ایک مجنوں ہوتا ہے)

یہ نوجوان تہذیب جدید کی تمام نعمتوں سے مالا مال ہے۔ دولت ثروت، تعلیم اور آزاد خیالی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس لئے وہ ہر چیز کو اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر قدم شئے کو جدیدیت کی کسوٹی پر کستا ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری کسی بارے میں محسوس نہیں کرتا اس لئے اُس کا مقصد حظِ نفس کے سوا اور کچھ نہیں۔ عیش و عشرت کے اس سمندر میں ہچکولے کھاتے کھاتے آخر امید کی ایک کرن دکھائی دیتی ہے۔ منوں راکھ کے ڈھیر کے نیچے ایک چنگاری خوابیدہ ہے جو باوجود اُس کی تمام منطق کے اُسے راہِ راست کی ترغیب دیتی ہے نوجوان مذہب

اور اخلاق کے سارے بندھن توڑنا چاہتا ہے مگر آخر خود اُس میں جکڑ جاتا ہے۔

یہی اس ڈائری کا پلاٹ مگر منطق بکھری ہوئی ہے، خیالات میں پراگندگی ہے، انتشار و اضمحلال ساری کتاب پر طاری ہے۔

قاضی صاحب کا یہ خود پرست اور خود پسند ہیرو اپنی صفائی کے لئے یا اپنی تفریح کے لئے سیکڑوں پینترے بدلتا ہے کبھی تشکیک کے دامن میں پناہ لیتا ہے، کبھی سوچنے سے گریز کرتا ہے مگر تسکین حاصل نہیں ہوتی تو مجبوراً نکاح کی راہ پکڑتا ہے۔

مجنوں کی ڈائری کا مصنف لیلیٰ کے خطوط کے لکھنے والے کی نقالی کرتا معلوم ہوتا ہے۔ پڑھنے والوں نے لیلیٰ کی داستان پڑھکر اُس کے مجنوں کی جو تصویر اپنے خیال میں بنائی تھی وہ بجائے خود مکمل تھی۔ اس لئے اس کتاب کی دراصل ضرورت نہ تھی

ڈرامے

آغازِ ہستی یہ برنارڈ شا کی مشہور تمثیل بازیہ متھوزلہ (Back to Methuselah) کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے فرض سے جناب مجنوں گورکھپوری بہت اچھی طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے اور طرزِ تحریر میں کہیں وہ اُلجھاؤ نہیں پیدا ہوا جو نام نہاد تراجم میں پایا جاتا ہے۔ برنارڈ شا سے اردو داں حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ اُس کی تمثیلوں کے خلاصے، اُس کی تقریروں اور تنقیدوں پر تبصرے ہمارے ممتاز رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شا کی تصانیف میں اس تمثیل کا پایہ بلند ہے۔ اس لئے اس کا اردو میں ترجمہ ہمارے ڈرامے اور ادب میں نئی نئی راہیں کھول سکتا ہے۔ پیش بینی اور بازگشت دونوں کا لطف بیاں موجود ہے۔ شروع میں جناب مجنوں کا ایک چھوٹا سا مقدمہ ہے جس میں تمثیل نگار کے فن پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔

بہتر ہوتا اگر برنارڈ شا کا مقدمہ بھی کتاب میں شامل ہوتا یہ مقدمے دراصل برنارڈ شا کے ڈراموں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بقول ایک مشہور نقاد کے اُس کا کارنامہ اُس کے دیباچے ہوتے ہیں جن کے آخر میں چاشنی کے لئے چند صفحے کی ایک تمثیل ہوتی ہے۔ کتاب نہایت نفیس چھپی ہے۔

تنقید

مجلس

شکر کا مقام ہے کہ ہماری درسگاہیں اب صرف ایک فرسودہ رسم تعلیم کا گہوارہ نہیں رہیں بلکہ اُن کی فضا میں بیداری کی روح بھی سانس لینے لگی ہے اور طلبا اپنا زمانۂ تعلیم صرف مغربی ادبیات و سائنس کا چھوٹا ذوق حاصل کرنے میں صرف نہیں کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ اس پیش نہادیں قدیم اصول اور مسلّمات کو دوبارہ جانچیں اور نقد ونظر کی دنیا میں ایک نئے باب کا افتتاح کریں۔

پنجاب کی درسگاہوں میں گورنمنٹ کالج لاہور ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ پنجاب کی زندگی، بیداری اور قوت عمل کا بہت کچھ اندازہ اُن مبارک کوششوں سے ہو جاتا ہے جو اس تعلیم گاہ میں ہوتی رہتی ہیں۔

ابھی حال میں وہاں ایک مجلس اردو ہمارے مایۂ ناز ادیب پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی زیر نگرانی قائم ہوئی ہے۔ یہ مجلس بڑا مفید تنقیدی کام کر رہی ہے۔ زیر نظر کتاب میں وہ تمام مقالات یکجا کرکے شائع کئے گئے ہیں جو ایک سال کے اندر پڑھے گئے۔ یہ سب مقالات اراکین مجلس کے علمی و ادبی ذوق کا اچھا نمونہ ہیں۔

مضامین کافی متنوع ہیں۔ ان میں سے پریم چند اقبال اور درد منظر اور اختر شیرانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر مضمون، لکھنے والے کی علمی قابلیت اور بالغ نظری کا روشن کارنامہ ہے۔ پریم چند کی عظمت اور اُن کے آرٹ کی اہمیت کو اُس نے نہایت کامیابی سے واضح کیا ہے پریم چند کے متعلق ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے:۔

"اردو کو آج تک اُن سے بہتر افسانہ نویس نصیب نہیں ہوا"

ہمارا خیال ہے کہ آغا عبدالحمید صاحب نے پریم چند کی تازہ تصنیفات کو پیش نظر نہیں رکھا۔ پریم چند اب ربع صدی سے لکھتے آئے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عمر کے ساتھ شعور فنی میں اضافہ ہو مگر اس کے برخلاف ان کے جدید ناول اُن کی پچھلی کتابوں سے بہت پست ہیں۔

دوسرے اُن کا طرز تحریر نا ہموار ہے۔ اچھا یکساں اور ہموار طرز بیان لکھنے والے کی قدرت کی دلیل ہے۔ جہاں افراط تفریط بھی پڑھنے والے کو کھٹکنے لگتی ہے۔ کبھی تو پریم چند اس کثرت سے فارسی الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اُن پر کسی رضا خانی بریلوی کا شبہ ہونے لگتا ہے اور کبھی وہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگاتے ہیں ہندی پر انہیں بیشک عبور ہے اور ہندی کا رس لیکر انہوں نے اردو کو زیادہ شیریں بنا دیا مگر کچھ عرصے سے وہ "چوکا بنانے" میں بری طرح مصروف ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا انجام خدا جانے کیا ہو

اختر شیرانی کی شاعری پر جناب راشد کا مضمون نہایت دلچسپ ہے۔ راشد صاحب اختر شیرانی کی روح تک پہونچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ شیرانی ہماری اس بیسویں صدی میں ازمنۂ وسطیٰ کے ایک نایٹ کی طرح ہے۔ اُس کی دنیا عشق کی دنیا ہے، جوانی کی دنیا ہے، سرشاری کی دنیا ہے۔ شباب کی حرارت اُس کے رگ و پے میں طوفان برپا کئے ہوئے ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سلمیٰ کے عشق میں مست، طنبورہ بجاتا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ گنگناتا بھی جاتا ہے۔

اختر کی شاعری محسوسات کی شاعری ہے۔ اُس نے اپنے زورِ قلم سے حقیقت کو رومان آلود بنا دیا ہے۔ سلمیٰ ایک حقیقت ہے اور اُس کا تصور اور اُس تصور کے تاثرات رومانی کمخواب میں موتیوں کی جھالر لگی ہوئی ہے۔

سانیٹ Sonnet اب اردو میں کافی عام ہے۔ گو ہماری عروسِ شاعری پر یہ لباس کھلتا نہیں مگر اختر صاحب کے یہاں اس کی اجنبیت بہت کم رہ جاتی ہے۔

فاروق صاحب نے جو مضمون فانیؔ پر لکھا ہے اُس میں شاعر کے ساتھ واقعی انصاف نہیں ہوا۔ اُن کے خیال میں فانیؔ اور غالبؔ کا مقابلہ غالبؔ کی توہین کے مترادف ہے۔ وہ فانیؔ کے یہاں میت، کفن اور لاش سے بھی گھبراتے ہیں لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ فانیؔ کے ماتم اور لکھنوی شعرا کی موت میں کتنا فرق ہے۔ فانیؔ نہ غالبؔ سے بڑھکر ہیں نہ غالبؔ کے مقابلے نہ وہ غالبؔ سے کم ہیں۔ فانیؔ نے غالبؔ کی روش پر چلنا چاہا ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح غالبؔ رہگذر کو نہ پہچانتے ہوئے ہر راہرو کے ساتھ تھوڑی دور چلا کرتے تھے۔ فانیؔ، میرؔ، حسرتؔ اور غالبؔ کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہیں اور اپنے رنگ خاص میں بے مثل۔ انھوں نے دوسروں کے رنگ میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے اور دوسروں کے مقابلے میں بھی: مثلاً

شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی — پھر موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی

کچھ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے — چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید

شعلے سے لپکتے ہیں اس کسوتِ مینا سے — شاید کہ پیام آیا پھر وادیِ سینا سے

تاریخ جمالیات اس سے تاریخی ریویو میں اہلِ مغرب کے فلسفۂ حسن و فنونِ لطیفہ پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ جناب مجنوں نے مشرق میں جمالیاتی تصور کو غالباً جان بوجھکر نظر انداز کر دیا۔ وہ اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ مگر اُن کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ جمالیات واقعی (aesthetics) کے تمام معانی و مطالب پر حاوی نہیں مگر ایک تو یہ لفظ اب یہ اس معنی میں مستعمل ہو چلا ہے دوسرے، اس سے زیادہ اصل مفہوم سے قریب کوئی اور اصلاح نہیں پہونچتی۔

ایک چھوٹے سے مقدمے کے بعد مصنف نے یونان اور روم میں جمالیات کے تدریجی ارتقا کو نمایاں کیا ہے اور اُس کے بعد ازمنۂ وسطیٰ کی بھول بھلیاں سے گذر کر جس کی تاریکی میں مشکل سے کسی ضابطہ اور منظم تحریک کی شکل نظر آسکتی ہے، دورِ جدید

کی تحریکات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سرسری نظر میں صرف چند رجحانات کا تجزیہ ہی ممکن تھا اس لئے موضوع ضرور ایک حد تک تشنہ رہ گیا
آخر میں مجنوں صاحب کی رائے ہے کہ "اب دنیا کا مذہب اور دنیا کا تصوف جمالیات ہوگا"۔ ہمیں اس سے اختلاف
ہے چاہے اس مذہب کا نام "تصوف جدید" ہی کیوں نہ ہو۔ احساس حسن اور تلاش حسن انسان کے خمیر میں شامل سہی مگر
اس کا تصور اور اس کے متعلق زاویۂ نظر مختلف ادوار میں بدلتا رہا ہے۔ خصوصاً آیندہ چلکر مذہب جمالیات جس کا مقصد
زندگی برائے ادب ہے، ذرا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔
بہتر ہوتا اگر کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ اُن اصلاحات کی دے دی جاتی جو اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں۔ اس
طریقے کی اہمیت جتانا تحصیل حاصل ہے۔
کتاب نہایت نفیس چھپی ہے اور چونکہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اس لئے لائق تحسین ہے۔

منشورات | جناب برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے بارہ مضامین کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر لسانیات سے متعلق ہیں
کیفی صاحب کی یہ کتاب ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اُنھوں نے اُس قابل اعتراض روش کے خلاف بجا صدائے
احتجاج بلند کی ہے جس کی رو سے "ذاتی پسند اور جاؤ بے جا جونپ" پر اجتماعی مفاد کو قربان کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات
کی ہے کہ زبان اور لسانیات سے متعلق جو نظریات ہیں اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید اصلاحات و تراکیب کا استعمال ہونا چاہیے
ورنہ ادب بے راہ روی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کتاب میں مبادیات فصاحت، اردو کی موجودہ ضروریات اور متروکات
خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہیں۔
اردو ادب کے متعلمین منشورات سے خاص طور پر فائدہ اُٹھائیں گے کیونکہ اُنہیں اس میں زبان اور اُس کے
تغیر و تبدل کے متعلق سارے مباحث ملیں گے۔

تعلیم

اصول تعلیم | اس کتاب کی اشاعت سے اردو کے تعلیمی سرمائے میں، جو درحقیقت ابھی تک برائے نام تھا، ایک بیش قیمت
اضافہ ہوا ہے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ نہ صرف تعلیمی مباحث
میں مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اردو اور انگریزی دونوں کے مایۂ ناز انشاپرداز بھی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے ساتھ
ہی انگریزی میں آپ کی نہایت اہم تصنیف "مستقبل کی درسگاہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں اُس تعلیمی ادارے کا ایک
مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے جو صحیح معنی میں قوم کے نونہالوں کی تربیت کا گہوارہ ہوگا اور جس کے زیر اثر ایک طرف اُن کی

انفرادیت کو چمکنے اور نشو و نما پانے کا پورا موقع ملے گا اور دوسری طرف وہ ہمارے سماج کے زیادہ بہتر اور زیادہ مفید افراد بن سکیں گے۔ زیر نظر کتاب کا مقصد اس سے زیادہ جامع ہے۔ اس میں علم تعلیم کے تمام اصول واضح و دل نشیں انداز میں بیان کئے گئے ہیں اور اس لئے اگر ہمارے معلّمین اس کتاب کو اپنا رہنما بنائیں اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں تو وہ ایک بڑی حد تک موجودہ بے راہ روی کو روک سکتے ہیں۔

تعلیم کا مسئلہ، حقیقت میں بڑا اہم اور بڑا پُرپیچ مسئلہ ہے۔ اسی پر ہماری قومیت کے بقا اور تحفظ کا دار و مدار ہے اور اس کا حل اتنا آسان نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی ایک جماعت یا طبقہ کے بس کا روگ نہیں۔ آج کل ہماری درسگاہوں میں جو معلم ہیں اُن میں سے بیشتر تعلیم کے مسلمہ اصولوں سے ناآشنا ہوتے ہیں کچھ اسے محض کسب معاش کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس کے عظیم الشان امکانات کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو حتی المقدور تعلیم کے تمام تربیتی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس گروہ میں خود سیدین صاحب کے بہت سے شاگرد ہوں گے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک چنا تو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اس لئے اس نیک نیت طبقہ کی ساری کوششیں درحقیقت ایک دائرے کے اندر رہتی ہیں۔ ان کا اثر دور رس اور دیرپا نہیں ہوتا۔

یہ بات صرف اسی وقت حاصل ہوگی جب عام طور پر سماج تعلیم کی اہمیت، اس کے مقاصد اور اس کے اجتماعی افادہ سے واقف ہو جائے گا اور جب تک یہ نہ ہوگا اُس وقت تک ہمارے نظام تعلیم میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارا نظام تعلیم ہمارا نہیں، غیروں کا لایا ہوا ہے اور ہم خود اُس کے نقائص سے من حیث القوم اب تک بے پروا رہے ہیں ہم نے اپنے طرز پر تعلیم دینے کے لئے کوئی جد و جہد نہیں کی ہے! اور اس لئے موجودہ نظام میں کوئی قرار واقعی ترمیم نہیں ہوئی کیونکہ سماج کی متفقہ آواز یا متحدہ آرزو کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

اس فضا کو پیدا کرنے کے لئے اور اس آرزو کو "نوائے سینہ تاب" بنانے کے لئے "اصول تعلیم" اور "مستقبل کو درسگاہ" جیسی کتابیں بہت مفید ہوں گی۔ کیونکہ انھیں کی بتائی ہوئی بنیادوں پر ہماری قومی زندگی کی عمارت کھڑی کی جائے گی۔

کتاب کے پہلے حصے میں تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق سے بحث کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ تعلیم کا رشتہ تمدن کے مختلف شعبوں سے کیا ہے اور وہ کس طرح اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے ذیل میں سیدین صاحب نے طلبا کے قدرتی ماحول اور اس کی تعلیمی اہمیت پر بجا طور پر زور دیا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مدرسۂ عمل کے اصولوں کی تشریح کی گئی ہے۔ مدرسۂ عمل کے نظریات آج کل کی درسگاہوں سے بالکل مختلف ہیں اور اس کی تفصیل میں ذہنی اور جسمانی تربیت کے تعلق اور وحدت کو ظاہر کیا گیا ہے تیسرے حصے کا

تعلق اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے اصولوں سے ہے۔ یہاں اخلاق کا عام مفہوم نہیں بلکہ حقیقی اور وسیع ترین مفہوم ظاہر کیا گیا ہے اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ طلبا کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کس طرح کرنی چاہیئے۔

مصنف نے اصولِ تعلیم میں زیادہ تر اسکولوں کی ضروریات کو مدنظر رکھا ہے اور اعلیٰ تعلیم کو نظرانداز کر دیا ہے۔ اُن کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسکول ہی وہ ادارہ ہے جہاں ہمارے ان جدید نظریات کی روشنی پہلے پہنچنی چاہیئے کیونکہ وہاں طلبہ کی سیرتوں کا مطالعہ زیادہ اچھی طرح ہو سکتا ہے اور کالجوں میں کوئی اصلاح ناممکن ہے جب تک مدرسے کی تعلیم کو صحیح اصولوں پر نہ قائم کیا جائے۔

بعض نکتہ چیں ممکن ہے تعلیم کے ان جدید نظریات کو مغربی خیالات کی نقل اور اُن کا ہو بہو چربہ سمجھیں۔ اُن کے استفادہ کے لئے مصنف کا یہ قول کافی ہوگا:-

"تعلیم کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں اور قومی زندگی عبارت ہے اُن تمام اثرات اور عناصر سے جن کا تدریجی ارتقا ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس لئے ہم کسی نظام تعلیم کو نہ پرانے لباس کی طرح بے پروائی سے اُتار کر پھینک سکتے ہیں نہ نئے لباس کی طرح بے تکلفی سے پہن سکتے ہیں۔ وہ ایک نفسی اور روحانی نظام ہے جو آہستہ آہستہ قومی زندگی کی سرزمین سے اُگتا ہے اور اُس کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے"۔

ان ابواب کے سرسری مطالعہ سے ہی جو احساس سب سے شدید ہوتا ہے وہ ہماری موجودہ تعلیم کے ناقص ہونے کا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہماری درسگاہوں میں تعلیم کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے آزادیِ خیال اور حریتِ فکر کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ ماحول سے بے تعلقی و بیگانگی کا سبق پڑھایا جاتا ہے، انفرادیت کا خون کیا جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ سماج کو اس تعلیم سے کوئی فائدہ پہونچے اُس پر "کتابے چند" کا بے جان اور بھاری بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح جو مواد تیار ہوتا ہے اُس سے ہمارے مفکرین اور مدبرین سیاسی رہنمائی اور قومی بہبود کی امید رکھتے ہیں۔

آل احمد سرور

ضمیمہ

(سال بھر کی اہم ادبی مطبوعات)

حصۂ نظم

کتاب	مصنف
بالِ جبریل	علامۂ اقبال
سرودِ زندگی	اصغر گونڈوی
شعلۂ طور	جگر مرادآبادی
کارِ امروز	سیماب اکبرآبادی
خمستان	اثر صہبائی
نغمۂ دل	دل شاہجہانپوری
حضرت امجد کی شاعری	امجد حیدرآبادی
رزم	وقار انبالوی
سی پارۂ دل	اختر جوناگڑھی
نغمۂ روح	اختر انصاری
نقشِ دوام	عدم

(انتخابات و جدید ایڈیشن)

کتاب	مرتب
کمالِ داغ	مرتبۂ حامد حسن قادری
دیوانِ مومن	مرتبۂ ضیاء احمد ضیا
مسدس حالی (صدی ایڈیشن)	مرتبۂ سید عابد حسین
نقش چغتائی (غالب کا مصور ایڈیشن)	عبدالرحمن چغتائی

تنقیدات

کتاب	مصنف
مختصر تاریخ ادب اردو	سید اعجاز حسین
اردو میں ڈراما نگاری	بادشاہ حسین حیدرآبادی
مجلس	اراکین مجلس گورنمنٹ کالج لاہور
منثورات	کیفی دہلوی
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری
تنقیدات عبدالحق	مولوی عبدالحق

اُردو کا پہلا ناول نگار	اویس احمد
مقالاتِ حالی	....
فنِ انشا پردازی	محی الدین زور
طنزیات	رشید احمد صدیقی

تعلیم

حیدرآباد میں تعلیمی ترقی	عبدالقادر سروری
عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی ..	محی الدین زور
اصولِ تعلیم	خواجہ غلام السیدین

مکتوبات

مکتوباتِ نیاز	نیاز فتح پوری
لیلیٰ کے خطوط	قاضی عبدالغفار
مجنوں کی ڈائری	قاضی عبدالغفار

ناول، افسانے و متفرق

نجات	پریم چند
شمیم (دوسرا ایڈیشن) ..	فیاض علی خاں
زندگی	چودھری افضل حق
رنگین زمانہ	محبوب علی خاں صوفی
شہیدانِ وفا کا خون بہا کیا ..	خواجہ غلام السیدین
جوشِ فکر	سلطان حیدر جوش
خواب و خیال	مجنوں گورکھپوری

ڈرامے

انجام	پروفیسر مجیب
کھیتی	"
قربانی	کشن پرشاد کول
آغازِ ہستی	مجنوں گورکھپوری
پروین و ثریا	شاہد دہلوی

انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد — ''زہے روانئی عمر...''! — اسر - چغتائی

کوبڑ

(رشید احمد صدیقی (علیگ))

کیچ اور کیچڑ کی بحث میں سُنتے ہیں، دلّی اور لکھنؤ والوں میں سے کسی ستم ظریف نے ایسے مقام پر تان توڑی کہ ؎

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

کی صورت پیدا ہو گئی۔ کُب، کوب یا کوبڑ میں بھی ایک حرف ایسا آیا ہے جس کے ترک یا قبول کا مسئلہ عبرت ناک حد تک دلچسپ یا دلچسپ حد تک عبرت ناک بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن میں ایک خالص ادبی بحث کو مقامی رنگ یا روایات سے ملوّث نہیں کرنا چاہتا۔ سوال یہ ہے کہ صحیح لفظ کُب ہے یا کوبڑ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا ارادہ مطلق یہ نہ تھا کہ میں صحتِ اخلاق کی مانند صحتِ الفاظ کے سلسلے میں بھی ناظرینِ سہیل کے لئے عذابِ جان بن جاؤں۔ لیکن بعض حلقوں میں اس لفظ کے بارہ میں عجب خلط مبحث ہو رہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کُب ہے، بعض کا بیان ہے کہ کوب ہو تو بہتر ہے، پورب کے ساکنوں کو اس پر اصرار ہے کہ ہونا کوبڑ چاہیئے۔

لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اس لفظ کا مدار تمام تر کُب یا کوبڑ کی نوعیت، سائز یا شدّت پر ہے۔ کُب، کوب یا کوبڑ میرے نزدیک اپنی اپنی جگہ پر سب صحیح ہیں اور ان کا مدار ہمارے آپ کے فیصلہ پر اتنا نہیں ہے جتنا خود کبڑوں کی ذہنیت پر ہے۔ ہمارے مکرم بزرگ قاضی جلال الدین صاحب فرماتے تھے کہ زبان کا ذخیرہ الفاظ سے نہیں بلکہ تلفظ سے بڑھانا چاہیئے اور کسی زبان کی ترقی یا وسعت کا معیار بھی یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں تلفظ کے تنوعات سے مفہوم کے تنوعات کا کہاں تک امکان ہے۔ اس بارۂ خاص میں ان کا خیال ہے کہ کوئی دوسری زبان اُردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مثلاً مختلف سائز اور نوعیت کے ہوائی جہاز ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ان کے مختلف نام ہیں۔ اُردو میں یوں کہہ سکتے ہیں، معمولی چھوٹے موٹے جہاز کو صرف ہوائی جہاز۔ اس سے بڑے کو حوائی جہاز، اس سے بڑا ہو تو حوائی جحاز۔ اس سے بھی بڑا ہو تو

حوائی جہاز اور سب سے بڑا ہو تو پھر حوائی جہاض۔ نوعیت میں اختلاف ہو تو جہاز کو مختلف اعراب دے دینا چاہیے جہاز، جُہاز۔ اسی طرح اور بہت سی ترمیمیں ہو سکتی ہیں۔ عورتوں کی اقسام کی مانند مَردوں کی بھی اقسام ہو سکتی ہیں مثلاً: مَرد، مِرد، مُرد، مَرَد، مَرِد، مُرُد، مِرِد، مَردُود وغیرہ۔ اسی طرح عورت کی بھی گردان ہو سکتی ہے۔ لیکن مرد کی آخری قسم کی طرف اشارہ کرنے کے بعد عورتوں کو بحث میں لانا دلاوری کے خلاف ہے اور میں چاہتا بھی نہیں کہ کبڑے کی بحث میں ناظرین بھی عورتوں کے ساتھ کھنچے کھنچے پھریں!

بہرحال کُب، کوب یا کوبڑ کا مدار اس پر ہے کہ کُب کوب یا کوبڑ کس قسم کا ہے، کس سائز کا اور کس شدت یا قوت کا ہے۔ شدت یا قوت کا یہاں وہی مفہوم ہے جو علم کیمیا میں ٹنکچر، الکوہل وغیرہ کا ہوتا ہے۔ کُب کے معنی یہی چھوٹا منا سا کُب، کوب اس سے ذرا بڑا، کوبڑ سبھوں کا قبلہ گاہ۔

اب میں ذرا فلسفہ قسم کے علوم وغیرہ کی مدد سے کوبڑ یا کُب پر اظہار خیال کروں گا۔ کیوں کہ بقول میرے ہی جب تک اس قسم کی چیزوں کا حوالہ یا واسطہ نہ دلایئے نہ اپنا نفس موٹا ہوتا ہے اور نہ دوسروں پر رعب پڑتا ہے!

ایک دن میں اور میرا ٹوٹا ہوا مونڈھا دیوار سے ٹکے ہوئے اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ حالی سنٹزی میں شرکت کرنی چاہیے یا جنگ حبش میں۔ سوچتے سوچتے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے مونڈھے نے میری اور میں نے مونڈھے کی جگہ لے لی ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ بھی نہیں تھا۔ یوں بھی آپ کبھی اچانک دیکھیں تو یہ معلوم کرنا دشوار ہوگا کہ میں مونڈھے پر بیٹھا ہوں یا مونڈھا مجھ پر رونق افروز ہے۔ یہ بہت معمولی سی بات ہے۔ آپ کا حسنِ ظن یا میری اور مونڈھے کی شباہت تام۔ لیکن اتنی سی بات فلسفہ کی بدتوفیقی سے خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ بہرحال میں نہیں چاہتا کہ اس مسئلہ کو طوالت دے کر مونڈھے یا فلسفی کی حق تلفی کروں۔ مونڈھے نے کہا کیوں میاں کہاں ہو، میں نے کہا ہوں تو جہاں کا تہاں لیکن سوچتا یہ ہوں کہ اگر ساری دنیا مونڈھا ہو جائے تو مجھے کیا کرنا پڑے گا۔ مونڈھے نے قہقہہ لگایا، بس اسی طرح جیسے ایک ٹوٹا ہوا مونڈھا قہقہہ لگا سکتا تھا، اس نے کہا تم اتنے دنوں مونڈھے پر بیٹھے لیکن تم کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا

کہ ساری دنیا مونڈھا نہیں بن سکتی بلکہ مونڈھا خود ساری دنیا ہے۔ ساری دنیا مونڈھا بن جائے تو کپڑے کہاں سمائیں اور جس دن سارے کپڑے دنیا میں سما گئے بس تم جانو اسی دن پورن راج ہے۔ میں بولا کامریڈ مونڈھے میں کوبڑ کے مسئلے پر اکثر غور کرتا رہا ہوں، بات کاٹ کر مونڈھا بولا اور میں اسے جھیلتا بھی رہا ہوں۔ میں نے کہا دیکھو بات کاٹنا بڑی نازیبا حرکت ہے۔ نظام اجتماعی میں انفرادی مداخلت ممنوع ہے۔ دنیا نے اس لعنت سے ابھی نجات پائی ہے لیکن تم بہرحال مونڈھے ہو اس لئے مجبور ہو۔ مونڈھا بولا میری عادت بیچ میں بولنے کی نہیں ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ نظام اجتماعی کب سے ہو گئے پھر یہ بتائیے کہ جس چیز کو آپ نظام اجتماعی بتاتے ہیں وہ خود انفرادیت کی عیوب سے کب پاک ہے، نظام اجتماعی بجائے خود ایک انفرادیت ہے، ایسی انفرادیت جو نامعقول حد تک سرد، ساکن، غیر نامی اور لاتعقل ہوتی ہے۔ دنیا کا پرانا قاعدہ ہے کہ وہ لعنتوں سے پاک نہیں ہوتی۔ وہ صرف لعنتوں کی شکل محل یا موقع بدل دیا کرتی ہے۔ دنیا صرف ایک چالاک قسم کی دوکان داری ہے۔ اچھی انگریزی دوکانوں پر آپ نے دیکھا ہوگا، ایک ہی چیز کو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف مقامات پر مختلف زاویہ سے اور مختلف دوسری چیزوں کے ساتھ رکھتے رہتے ہیں۔ خریدار اسے محسوس نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ نئی چیز آگئی اور پرانی غائب ہو گئی۔ دوکان کی شان و شوکت اور حسین بیچنے والی کے انداز تکلم و تبسم سے آپ اتنے مرعوب اور متاثر ہوتے ہیں کہ تمام عمر اپنی غلط فہمی سے آگاہ نہیں ہو پاتے۔ میں نے کہا دوست تم مراق میں مبتلا ہو اور حقائق سے بے خبر۔ تم صرف مونڈھے ہو جدت اور ترقی کے منکر بھی اور اس سے محروم بھی، مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ مونڈھے نے کہا تم مجھ پر ترس کھاتے ہو تو خیر میں بھی تمہارا مضحکہ نہیں اڑاؤں گا۔ لیکن اس سے مسئلہ کی نوعیت اور اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ تم کو شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ مجھ میں تم میں من تو شدم تو من شدی کا تعلق ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اصل میں وہ تمہارے ہی وساوس اور خطرات ہیں لیکن اس چیز کو تم کبھی نہ سمجھو گے اور محض اس لئے کہ تم اسے سمجھنا پسند نہیں کرتے یا اس کا سمجھنا برداشت نہیں کر سکتے۔

میں نے کہا موجودہ نظام میں مساوات کو ان حدود تک پہنچا دیا گیا ہے جن تک انسانی عقل کی رسائی ہو سکتی تھی اور امید بھی کی جاتی ہے کہ جمہور نے جمہوریت کے لئے جو کچھ نافذ کیا ہے وہ مفید ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

میری بات کو بندھی ٹکی سمجھکر مونڈھا کچھ بے صبر سا ہو رہا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً جواب دینا شروع کر دیا اور وہ بھی اس طور پر گویا اس نے میری گفتگو کو قابل اعتنا نہیں خیال کیا۔ اس نے کہا مساوات کا تمھارا تصور قطعاً غلط ہے بے سرو پا بھی۔ تمھاری مساوات صرف ایک تقسیم ہے اقتصادی نقطۂ نظر سے۔ تمھاری سب سے بڑی کامیابی یہ ہو سکتی ہے کہ دنیا میں امیر اور غریب کی تفریق قائم نہ رہے۔ بالفاظِ دیگر ہر شخص امیر ہو جائے یا ہر شخص غریب ہو جائے یا ان کے بین بین رہے۔ تم بدی اور گناہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے اور سمجھتے ہو کہ معاشری جرائم نتیجہ ہیں فطری ضروریات کی تکمیل کا۔ امیروں کی دولت غریبوں کو انتقام پر مائل کرتی ہے اور یہی ذرائع انتقام معاشری برائیاں ہیں۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا۔ مسٹر مونڈھے تم ساری معاشری خرابیوں کا حل یہی پیش کرتے آئے ہو کہ امیر خیرات کریں اور غریب متوکل ہو جائیں! مونڈھے نے کسی قدر آزردہ ہو کر کہا نہیں جناب میں وہ نہیں کہنا چاہتا تھا جو آپ نے میرے سر تھوپنے کی کوشش کی ہے میں نہ بدعقل ہوں اور نہ بزدل۔ میں خیرات اور توکل دونوں کو بے معنی سمجھتا ہوں اگر دولت ایمانداری، محنت اور سچائی کے ساتھ جمع کی گئی ہے تو خیرات کیوں اور کس مد میں؟ خیرات کو انفرادی حیثیت نہ دینا چاہیئے۔ یہ حکومت کا فرض ہے کہ ایک طرف وہ غیر مستطیع کی مدد کرے اور دوسری طرف اس کا احتساب کرتی رہے کہ کوئی شخص بے ایمانی، ناخدا ترسی یا محض اتفاقیہ طور پر دولت مند نہ بننے پائے۔ آپ تمام معاشری امراض کی اصلاح اقتصادی نسخہ سے کرنا چاہتے ہیں اور ثبوت میں تاریخ اور تاریخی واقعات پیش کرتے ہیں۔

میں نے جلدی سے کہا اور کیا' مونڈھے نے کہا تو مبارک ہو کہ آپ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں میں سمجھتا تھا کہ آپ بڑی مشکل سے لائے جا سکیں گے۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ اقتصادی مطالبات کی خلاف ورزی کی جائے۔ لیکن اقتصادی داعیات کے سمجھنے میں آپ غلطی کرتے ہیں۔ زندگی اتنی سادہ اور سہل نہیں ہے جتنا آپ اسے سمجھتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی دقت یا محرومی یہ نہیں ہے کہ کوئی امیر ہے یا غریب ہے جس کے لئے آپ کا اقتصادی نسخہ موثر ہو سکے، ممکن ہے آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ ذہنی اور اخلاقی پیچیدگیاں بھی اقتصادی ہی داعیات یا مطالبات کی رہینِ منت ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اقتصادی غیر مساوات بجائے خود مرض نہیں بلکہ علامت مرض ہے۔ اس سلسلہ میں آپ تاریخ اور تاریخی واقعات پر زور

دیتے ہیں۔ اقتصادی حالات وحوادث تاریخی ہو سکتے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ حالات وحوادث کہا جا سکتا ہے نہ کہ نتائج حالات وحوادث۔ اس لئے تاریخ پر اعتماد کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ زندگی مجموعہ ہے بہت سی ذہنی، اخلاقی، معاشرتی، طبعی، کیمیاوی داعیات ان کے متعلقات اور ان کے کسر و انکسار کا۔ جب تک ان پر بحیثیت مجموعی نظر نہ رکھی جائے گی اور ان پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنا اور صحیح نتیجہ پر پہنچنا آسان نہیں ہے اس وقت تک محض اقتصادی محور پر گردش کرنے سے مطلب برآری نہیں ہو سکتی۔ صرف معیشت کی تقسیم زندگی کے توازن کو نہ تو متعین کر سکتی ہے اور نہ اسے برقرار رکھ سکتی ہے۔

مونڈھے کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کی بحث سے تھکنے کے بجائے "لھکنے" پر آمادہ ہے اور میں اسے اپنی توہین اور مونڈھے کی زیادتی سمجھتا تھا اس لئے بول اٹھا، کامریڈ مونڈھے میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی بحث سے تمہاری فرسودہ صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور جس قسم کی بحث تم نے چھیڑی ہے وہ تمہاری مونڈھیت کی منافی ہے اور کسی حد تک دوسروں کے لئے مخل عافیت بھی ہو سکتی ہے اس لئے میں اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

مونڈھا بولا، دیکھو میں طعن وتمسخر، وعظ وتلقین، تسبیح وتہلیل کسی سے متاثر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مونڈھا نتیجہ ہے اس لئے حقیقت اور انسان محض ایک حادثہ ہے اور حادثہ بھی ایسا جس کا کوئی انجام نہیں اس لئے ناقابلِ اعتنا۔ تم کہتے ہو دنیا سے تفریق مٹائی جا چکی ہے لیکن تم کو نہیں معلوم تفریق اگر واقعی ہے تو کبھی مٹائی نہیں جا سکتی۔ تمہارا خیال ہے کہ آئندہ کی نسل تمہارے مسلک پر چل کر نجات حاصل کرے گی اور پچھلی عادتیں بھول جائے گی۔ لیکن تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آئندہ نسل کے میلانِ ذہنی کا مدار عادت چھوڑنے پر نہیں بلکہ نئی عادات کے اختیار کرنے پر ہے۔ آئندہ بہت ممکن ہے مونڈھا انسان بن جائے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان مونڈھا بن جائے۔ میں نے کہا لیکن تفریق کو کم کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ وہ نہ ہونے کے برابر ہو جائے، مونڈھا بولا۔ جس چیز میں کم ہونے کا امکان ہے اس میں بڑھنے کی بھی صلاحیت ہو سکتی ہے۔ آپ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ آپ انسان کو مونڈھا بنا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی یہ زیادتی ہے کہ آپ مونڈھے کو انسان بنانا نہیں چاہتے اور یہ سب محض اس لئے کہ آپ مرض کا علاج نہ تو

کرتے ہیں اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صحت کا نظریہ بدل دیا جائے یہاں تک کہ لوگ مرض کو
بھی صحت سمجھنے لگیں۔ میں نے مونڈھے پر ترس کھاکر کہا ۔ کامریڈ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تم الفاظ کے
گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہو اور چاہتے ہو کہ دوسرے بھی اسی میں مبتلا ہوجائیں، مجھے تم سے ہمدردی ہے
لیکن میں تمھاری دلیل کا قائل نہیں ہوں۔

مونڈھے نے نہایت روکھے پھیکے انداز میں جواب دیا، میں تو صرف مونڈھا ہوں، انسان نہیں
اس لئے میں صرف وہی کہہ سکتا ہوں جو میرے ذہن و دماغ میں ہے، انسانی مصالح کو حقائق پر ترجیح دینا
انسانوں کا کام ہے۔ مونڈھے کو یہ تعیش حاصل نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ آپ مرض کا ازالہ نہیں کرتے
صرف صحت کا تصور بدلنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ مریض ذہنی صحت کے تصور کا متحمل ہی
نہ ہو سکتا ہو، میں نے کسی قدر تند و ترش ہو کر یہ کہا کہ ایک فرسودہ مونڈھے کا فیصلہ کسی نوجوان کے نزدیک
قابلِ قبول نہ ہوتا، دنیا کے لئے بہت بڑا حادثہ ہوگا، مونڈھے نے سُنی اَن سُنی کردی۔ کہنے لگا۔ اگر
کسی کی بینائی کمزور ہو تو آپ کے نزدیک اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ دوسروں کی بینائی کو بھی اسی سطح پر
لایا جائے اور دنیا کو یہ مان لینے کی دعوت دی جائے کہ بینائی کے اعتدال کا معیار ہی یہی ہے جس کو
شفاتاک کا صحیح تصور نہ ہو وہ صحت کی پیغمبری کیوں کرے!
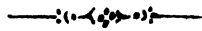
کچھ عرصہ تک میں جمائیاں لیتا رہا جس کا جواب چُرچرا چُرچرا کر مونڈھا دیتا رہا، میں نے کہا
بھائی مونڈھے طبیعت کچھ یونہی سی ہو رہی ہے۔ تھوڑا بہت نشہ پانی ہو جائے تو ہم دونوں ایک دوسرے کو
صحیح فضا میں صحیح زاویہ سے دیکھ اور سمجھ سکیں گے۔ پھر تم جانو کپڑوں کی بحث جہاں کی تہاں رہی جاتی
ہے، لوگ کہیں گے کپڑے کو مونڈھے کے سر تھوپ کر نکل گیا۔ تمھارا کیا مونڈھے اور کپڑے میں اول تو
تمیز کرنا دشوار ہے دوسرے یہ کہ تمیز کر ہی کے تمھارا کیا کرلیں گے۔ تمھیں کسی کی پروا تو ہے نہیں، ہم تم پر
بیٹھنا چھوڑ دیں گے تو بچے تم سے کھیلنا شروع کردیں گے اور تم اس حالت کو پہنچ چکے ہو کہ لڑکے
تم کو لڑھکاتے رہتے ہیں یا اُلٹا کرکے بیٹھ جاتے ہیں تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب تمھارا یہی مصرف ٹھیک ہے

لیکن ہوشیار رہنا، ایک دن بڑی بی کی نظر بھی تم پر پڑ رہی تھی، ان کو ایندھن کی طرف سے بھی اطمینان نہیں رہتا اور واقعہ یہ ہے کہ تمھاری وجہ سے مجھے بھی بعض دفعہ نہایت درجہ شرمسار ہونا پڑا ہے۔ اکثر مہمان یا ملاقاتی آئے ہیں تو میں نے ان سے تمھارا تعارف نہایت خلوص اور گرمجوشی سے کرایا لیکن تم نے کسی کو نچلا بیٹھنے نہیں دیا۔ ذرا تم سے غافل ہوا اور تم نے اسے چت کر دیا، یہی سبب ہے کہ لوگ آتے ہیں اور کھڑے کھڑے واپس جاتے ہیں شکایت کرنے پر کہتے ہیں کہ جناب آپ کے ہاں بیٹھنے کی کوئی چیز نہیں ہے اور زمین پر لیٹنے کے لئے کچھ آپ ہی کا مکان مقرر نہیں ہے۔ اللہ کی زمین یوں بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے!

مونڈھا بولا، جناب اس میں میرا کیا قصور ہے، بچّوں سے تو مجھے الفت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہی میری مختلف النوع حیثیات سے واقف ہیں اور اس کی داد دیتے ہیں۔ بڑی بی کی نظر مجھ پر جب کبھی پڑی ہے آپ اس خاکسار پر رونق افروز رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے اگلے پچھلے گناہوں کو یاد کرتے ہوں اور ایک دوسرے سے شرمندہ ہوتے ہوں۔ رہے آپ کے ملاقاتی اور مہمان، آپ ہی بتائیے وہ کس قماش کے ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیئے۔ اول تو یہ 'خانۂ انوری' سرِراہ واقع ہے اور دروازہ کھلا رہتا ہے۔ میں تو ہر وقت دیکھتا رہتا ہوں، سامنے سے اچھے خاصے چلے جا رہے ہیں، دروازہ کھلا دیکھا اور رُخ بدل دیا۔ کتّا، بکری، گدھا، خچر، بیل ہوا تو ایک آدھ ہڈّی، دو چار ڈھیلے، یا نسات گالیاں یا تھوڑی بہت پتّیاں اور پودے کھا کر چل دیا۔ ان کے علاوہ کوئی اور بزرگ ہوئے تو میرا کان پکڑا اور بیٹھ رہے۔ بچّوں کے ساتھ تفریح شروع کر دی میرے ٹکڑے توڑ توڑ کر کان یا دانت کریدنے لگے۔ پان ملا تو وقتاً فوقتاً پیڑ پودوں کو رنگتے رہے آپ نہ ہوئے تو ماںجیر شما سلامت ورنہ لعنت ہے میری زندگی پر اور تف ہے آپ کی اوقات پر۔ سوا مہمل اور لایعنی گفتگو کے میں نے کبھی کوئی معقول بات نہ سنی۔ شعر شاعری، مضمون نویسی، معافی فیس، خدا رسول، اشتراکیت و شیطنت، اسلام کے سپاہی اور ملت کی تباہی، یونیورسٹی، خورجہ کا اچار، گلاب کے اقسام، امتحان کے سوالات، ممتحن کے جوابات، مسلمانوں کا افلاس، قرضہ کا سوال، آپ کی بدحواسی اور میری ...... قلابازی!

بات کرنے اور پان کھانے کی کوئی حد ہوتی ہے، آپ دونوں کو سوچنا چاہیئے کہ میں یونیورسٹی کا ایک مونڈھا ہوں، میرے اپنے بھی فرائض ہیں جن کے لئے مجھے اطمینان، فراغت، یکسوئی کبھی نہ کبھی ضرور نصیب ہونا چاہیئے۔ یونیورسٹی کی صلاح و فلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے مونڈھوں کے حقوق عزت و آسائش کی نگہداشت کرے ورنہ آپ جانتے ہیں مونڈھوں کی قلابازی ...... الخ
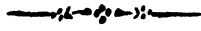
مونڈھے کی ہزیان سرائی نے مجھے کچھ ایسا گو مگو میں رکھا کہ باوجود اس کے کہ اس کا لب و لہجہ اکثر باغیانہ رہا میں مسلسل گول رہا۔ بالآخر میں نے کہا "میرے معزز دوست مونڈھے" میں تمھارے جذبات کا احترام کرتا ہوں اور اسے سلام کرتا ہوں مونڈھے نے یک لخت چلا کر کہا۔ تم چالاک ہو یا نہ ہو نالائق یقینی ہو، "یہ سلام کرتا ہوں" کیا ہے۔ میں نے سہم کر کہا کہ اکثر لوگوں کو میں نے تقریر کے دوران میں اپنے ممدوح کی تعریف میں یہ کہتے سُنا ہے کہ میں آپ کو یا آپ کی فلاں فلاں چیز کو سلام کرتا ہوں مونڈھے نے جھنجلا کر کہا انگریزی کی تقریر رسنی ہوگی، اس میں سلام کرنا ٹھیک ہے اُردو میں ایسے مقام پر سر نیاز یا سرِ عقیدت خم کرنا کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ میرے پیارے دوست، مجھے معاف کرو، مونڈھا سنتے سنتے پھر بپھر گیا۔ گرج کر بولا۔ کیوں جی بے حیائی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ میں کوئی آپ کی معشوقہ ہوں یا نورِ چشمی قسم کی کوئی چیز جو آپ پیارے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو ابھی اتنی بھی تمیز نہیں آئی کہ ہر لفظ کا مترادف ہر بھلے مانس یا ہر موقع کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ یہ پیاری، پیار یا پیارے کا لفظ کبھی اپنے بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ انھوں نے بے تکلف کسی معقول مجمع یا اشخاص کے سامنے استعمال کیا ہو یہ چھوکرے چھوکریاں جن کے مہملات یا فواحش سے آج کل کے رسائل بھرے ہوتے ہیں جو چاہیں لکھ جائیں آپ کو اس بڑھاپے میں کیا سوجھا ہے کہ گندگیوں کے طومار میں اضافہ کر رہے ہیں میں نے کسی قدر مربیانہ انداز میں کہا جناب آپ معاف فرمائیں۔ آپ کی ترکیب سینٹھے سے ہوئی ہے غالباً اسی سبب سے آپ سٹھیا سے گئے ہیں۔ مونڈھے نے غرّا کر کہا تم پر اور تمھاری رعایت لفظی دونوں پر خدا کی پھٹکار۔ یہ ظرافت نہیں ہیضہ ہے۔ میں نے کسی قدر خجل اور بہت کچھ سہم کر کہا۔ بھائی دیکھو بات میں بات نکل آتی ہے

اور اصل بات نظر انداز ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کبڑوں کا ساتھ نہ چھوٹنے پاتا۔ ادھر تم نے ہیضہ کا نام لیا تو مجھے طب کا تشابہ لگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ طبی نقطۂ نظر سے کُب یا کوبڑ پر ایک محاکمہ ہو جائے۔

مونڈھا بولا، دیکھو تشابہ لگنا بھی کوئی معقول بات نہیں ہے۔ ایسے آدمی کو خفیف الحرکت کہتے ہیں۔ تشابہ اکثر الفاظ اور خیال ہی میں نہیں لگتا بلکہ یہ پیش خیمہ ہے اس حالت کا جب تمھارے ایسے لوگ اُس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا اب تک صحیح نام متعین نہیں ہوا ہے۔ یعنی جب انسان کو الفاظ اور اقوال ہی میں نہیں بلکہ اعمال میں بھی تشابہ لگنے لگتا ہے۔ ایک ہندی مثل میں اس کی ترجمانی یوں کی گئی ہے،

گئے تھے ہر بھجن، بیننے لگے کپاس

تمھارے بڑے بڑے ماہرینِ وظائف الاعضا یا تشریح ابدان بتاتے ہیں کہ انسان کا جسم نہایت چھوٹے چھوٹے خلیات یا غدود پر مشتمل ہے۔ انھیں کی باہمی ترکیب و تحلیل کا نام زندگی ہے اور زندگی کا اعتدال یا انحراف انھیں سے وابستہ ہے۔ لیکن یہ جسم و جسمانیت کے اعتبار سے زندگی کا تصوّر ہے۔ روح، ذہن اور عقل دوسری چیزیں ہیں جن کے بارہ میں بعضوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا نظام بجائے خود جداگانہ ہے لیکن مونڈھوں کی تحقیقات یہ ہے کہ روح ذہن، عقل یا اس قبیل کی دوسری چیزیں بجائے خود جداگانہ حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کا تعلق اس نظام سے وابستہ ہے جس سے یہ خلیات اور غدود مرکب و ممزوج ہیں۔ انسانوں کی موجودہ تحقیقات جہاں تک پہنچ چکی ہے، مونڈھے اس سے آگے بڑھ چکے ہیں یعنی یہ خلیات بجائے خود ایک کیلی پر رقص کرتے ہیں۔ اس کیل یا کیلی کو مونڈھوں کی اصطلاح میں کوبڑ کہتے ہیں۔ آپ نے تو اکثر سُنا ہوگا لوگ اکثر دماغ کی کیل کا ذکر کیا کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں جوتے کا بھی بے تکان استعمال کرتے ہیں جوتے کا یہ مصرف غیر شاعرانہ ضرور ہے لیکن واقعہ پھر واقعہ ہے اور سننے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ آپ جوتے کے اس عجیب و غریب استعمال سے باز رکھے جائیں تو اکثر یہ چیز (؟) بجائے خود آپ کے دماغ میں چلنے لگتی ہے۔ بہرحال، آپ نے اس کیل کا ذکر تو کر دیا لیکن اس سے آگے نہ بڑھ سکے مونڈھوں نے اس کی تحقیقات شروع کر دی۔ کیونکہ مونڈھوں کا خیال ہے کہ جو بات اضطراراً زبان پر آتی ہے اس کا کسی نہ کسی

حد تک وجود ضرور ہوتا ہے۔

مونڈھے نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس نے کہا دماغ کی اسی کیلی یا کوبڑ سے زندگی کی ساری حماقتیں وابستہ ہیں۔ میں نے کہا حماقتیں؟ مونڈھا بولا اور نہیں تو کیا۔ زندگی حماقت نہ ہوتی تو موت کیوں لازم آتی۔ تم حماقت کو ان معنوں میں لینے کے عادی ہو جن میں بالعموم بے وقوف لیا کرتے ہیں۔ میرا مقصد احمقوں کی حماقت سے نہیں ہے بلکہ نفس حماقت سے ہے۔ حماقت بجائے خود اتنی بری چیز نہیں ہے جتنی احمقوں نے اسے بنا رکھا ہے۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا' تو کیا عقلمندوں کی بھی حماقت ہوتی ہے۔ مونڈھے نے کہا' تم نرے مولوی معلوم ہوتے ہو اور صرف بال کی کھال کھینچنا چاہتے ہو۔ اول تو تم کو معلوم نہیں کہ دنیا میں عقلمند کوئی نہیں ہے۔ انسان عقلمند ہوتا تو شیطان کی پھر کیا ضرورت تھی۔ انسانوں کی ساری برگزیدگی اس میں ہے اور اسی میں اس کی تباہی بھی مضمر ہے کہ وہ عقل کے بجائے جودت یا جبلّت کو کام میں لاتا ہے' اسی کے لئے زندہ رہتا ہے اور اسی کے طفیل میں مرنا گوارا کر لیتا ہے۔ زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان میں سے کسی کو لے لیجئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے حامل یا علمبردار اسی کیلی یا کوبڑ پر گردش کرتے ہیں جن کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ میں نے فلسفیانہ بے خودی و بے خبری میں دریافت کیا مثلاً؟ مونڈھا بولا" اپنے آپ ہی کو لے لو' میں چونک پڑا اور دفع الوقتی اور خوشامد کے لہجہ میں بولا' میرے بھائی' کسی اور کا ذکر کرو' میرا کیا۔ خوش قسمتی سے نہ دولت مند ہوں اور نہ اتفاق سے عورت' اس لئے میرے بارہ میں دنیا کسی قسم کی دل چسپی کا اظہار کرنے پر آمادہ نہ ہو گی۔ مونڈھا بولا' لیکن یہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ دنیا کی دل چسپی کے لئے خاص خاص عنوان مقرر ہیں' میں نے گھبرا کر کہا۔ میرے بھائی میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں' مجھے معاف کر دو۔ دنیا کو دل چسپی ہو یا نہ ہو لیکن جب اس کار خیر میں مونڈھے شریک ہو جائیں تو پھر آبرو کی خیر نہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم موضوع کو علمی حدود سے آگے نہ بڑھنے دو۔ مونڈھا ٹھٹھا مار کر ہنسا اور کہنے لگا کہ حدود متعین کرنے والے آپ کب ہوتے ہیں حدود تو وہ متعین کریں گے جن کا استغاثہ سب سے پہلے آپ کے خلاف عدالت میں پہنچے گا۔ میں نے کہا اور غالباً ایک آہ سرد کھینچ کر' ہاں بھائی سچ کہتے ہو لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ جتنے پتے کی بات

تم نے کبھی ہر اتنی ہی ہمدردی اور خدا ترسی سے بھی کام لو گے۔

(لیکن میری تمام منت سماجت بے کار ثابت ہوئی، مونڈھے کو میرے بارہ میں جو کچھ کہنا تھا اُس نے کہا اور میں نے سُنا۔ لیکن مونڈھے نے ازراہ کرم مجھے اجازت دیدی ہر کہ میں اس کے بیان اور اپنے ناگفتہ بہ حالات کو شائع نہ کروں۔ مونڈھے کی اس سیر چشمی سے میں بہت متاثر ہوا۔ مونڈھے کی اسی بات سے میں اس کا پرستار ہوں کہ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتا لیکن اس کے لئے کسی مکان کی چھت یا چھپرا ہے کی ضرورت نہیں سمجھتا اور نہ یہ کہ آپ سننے پر آمادہ ہوں یا اس کے ہم نوا یا شریک کار نہ بنیں تو وہ آپ کی زندگی آپ پر حرام کردے)

مونڈھے نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ دنیا کے کسی کاروبار کو دیکھو اسی کیلی یا کوبڑ کی کارفرمائی نظر آئے گی ہر شخص اپنے کوبڑ ہی کی خاطر مارنا اور مرنا چاہتا ہر۔ شاعر، سیاست داں، جنرل، بادشاہ، تاجر، لیڈر، عارف، جوگی، امیر غریب، چھوٹا بڑا، تندرست، مریض غرض کسی شخص کا جائزہ لو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ سارا کھیل کوبڑ ہی کا ہر۔ یہ نہ ہو تو نوع انسان وجود معطل کے سوا کچھ اور نہیں۔ کوبڑ بیساکھی ہر جس کے سہارے انسان کھڑا ہوتا ہر اور چلتا پھرتا ہر۔

میں نے کہا مسٹر مونڈھے تمھارا مطالعہ یا تمھاری تحقیقات نہایت عجیب و غریب ہر لیکن میں زرا کند ذہن واقع ہوا ہوں اس لئے جب تک تم مجھے اس کی مثالیں نہ دوگے نہ میں کچھ سمجھوں گا اور نہ غالباً تمھارے دوسرے بھائی بند تم پر فخر کرسکیں گے۔ مونڈھے نے کسی قدر زہر خندے سے کہا۔ میرے بھائی بند صرف مونڈھے ہیں ان کو غیر معمولی مونڈھا بننے کی نہ ہوس ہر اور نہ حاجت۔ ہم میں ہر ایک مونڈھا ہر اور اس پر قانع ہر۔ یہ تو تم انسان ہو جس کو جب تک ابنائے جنس پر کوئی تفوق حاصل نہ ہو اپنے آپ پر اعتماد ہی نہیں ہوتا۔ تم ہمیشہ سہارا ڈھونڈھتے رہتے ہو اور مونڈھے تمھیں سہارا دیتے ہیں، جس کا خود سہارا بگڑ جائے اس کو دوسرے کے سہارے کی کیا پروا۔ میں نے کہا۔ اس میں کیا شک ہر، آپ جیسا کچھ سہارا دیتے ہیں اس کا اشارہ اس سے پہلے کیا جاچکا ہے۔ اس سہارے پر صرف ایک مونڈھے کو ناز ہوسکتا ہر۔ مونڈھے نے کہا۔ سہارا پھر سہارا ہر۔ اس لئے سہارا ڈھونڈھنے والا جہاں کا تہاں ہی رہا !

میں نے بلحاظ دفع الوقتی مونڈھے کی منطق تسلیم کرلی لیکن اس انداز سے گویا مونڈھا پھر مونڈھا ہر

اس لئے میرا قائل ہونا اتنا ضروری نہ تھا جتنا مونڈھے کی تالیف قلوب بربنائے مصلحت ضروری تھی اس لئے میں نے کہا۔ نہیں نہیں میرا مقصد یہ نہ تھا کہ تمھاری توہین یا دل آزاری ہو۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ گفتگو لطف کی ہے اس لئے اسے طوالت دی جائے تو مزید لطف کا باعث ہوگا۔

مونڈھے نے کسی قدر رازدارانہ لہجہ میں کہا کہ اس کیں یا کوبڑ کی حقیقت سمجھ لینا آسان ہے لیکن دقت یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کوبڑ چھپانے کی بڑی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے ایسی احتیاطی تدابیر عمل میں لاتے ہیں کہ ان کے کوبڑ کا متعین کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ برنارڈشا ہی کو دیکھو سر سے پاؤں تک کوبڑ ہے اور اس کا کوبڑ ایسے ایسے محور پر گردش کرتا ہے کہ معمولی نظریں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن اس کے کوبڑ میں توازن ایسا ہے کہ ذہن کو کسی طرف منتقل کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اس کی نظر اتنی دور رس نہیں ہے جتنی خُرد بیں واقع ہوتی ہے۔ وہ واقعات نہیں دیکھتا اور نہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اس کی کمزوری ہے لیکن ایک طاقت ور خُردبین کی طرح وہ اس حقیر ترین "آرگنزم" کو دیکھ لیتا ہے جن کا ؎

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے!

اور جن سے اس دنیا کے تمام مظاہر بالیدہ اور برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ پھر یہ ان پر حکم لگاتا ہے۔ اس لئے سائنس کی رو سے ان احکام کے قرین وقوع ہونے میں شبہ نہیں رہتا لیکن ان کا امر واقع ہونا ہمیشہ مشتبہ رہے گا۔ تم جانتے ہو برگد کے بیج سے برگد کی بالیدگی یا برگزیدگی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا بلکہ خود برگد کا احصا اس کے بیج کے سمجھنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ شا روایت کا دشمن ہے لیکن خود اس کے گوشت پوست میں روایات جاری و ساری ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے وہ پروٹسٹنٹ ہے اور نسب کے اعتبار سے انگریزی آئرستانی۔ اس نے اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر رومن کیتھولک آئرستانیوں سے افضل سمجھا اور اسی احساس تفوق نے اس کو ہر چیز کو روند دینے پر آمادہ کیا۔ وہ بادشاہ ہے شہری نہیں بن سکتا۔ پھر یہ بھی مشتبہ ہے کہ ہم اس کی کس چیز پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کی بغاوت یا تمرد پر یا اس کی زبان و بیان پر جو اس کا سب سے زیادہ ہلاکت بار لیکن دلنشیں آلہ ہے۔ وہ الفاظ اور فقروں سے ایکٹ کراتا ہے اور ہم ان الفاظ او فقروں کی حرکت؛ انداز اور آواز سے مسرور مرعوب یا مسحور ہو جاتے ہیں لیکن مطمئن نہیں ہوتے۔

جی۔ کے چسٹرٹن برنارڈشا کا قائل نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ برنارڈشا نے ممکن ہے راستہ کا انتخاب غلط نہ کیا ہو لیکن جس منزل پر وہ ہم کو لے جانا چاہتا ہے وہاں حرکت ہے زندگی نہیں، آواز ہے موسیقی نہیں، رنگ ہے لیکن قوس قزح نہیں۔ تاہم تم کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ چسٹرٹن بجائے خود اتنا شاد و شگفتہ نہیں ہے جتنا کہ برنارڈشا۔ چسٹرٹن کا کوبڑ بھی ایک پہیلی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے اور جب کامیاب ہوتا ہے تو بد دل اور مایوس ہو جاتا ہے۔ اس نے زندگی کو کشتی سمجھ رکھا ہے یعنی جس طرف کشتی کو لے جانا چاہیئے اس کے خلاف پتوار کو حرکت دینی چاہیئے۔ ظاہر ہے ایسا شخص ہمیشہ بھلائی کی کوشش کرے گا لیکن اس کی توقعات کبھی پوری نہ ہونگی۔

ونسٹن چرچل کو انگلستان میں جو اہمیت اور قبول عام نصیب ہے وہ اس بنا پر کہ چرچل ہر موقع اور معاملہ کو خواہ وہ کتنا ہی سنگین نازک یا خطرناک کیوں نہ ہو ہمیشہ شربت کا گھونٹ سمجھتا ہو یا نہ ہو لیکن اس کا یقین دلا دیا کرتا ہے۔ وہ جس منصب سے معزول کیا گیا اس کے بعد ہی اس سے بڑے منصب پر فائز کیا گیا انسانی طبائع کی یہ افتاد ہے کہ وہ کسی شخص کی پیروی اس بنا پر نہیں کرتی کہ وہ بڑا فرزانہ، بہادر یا مقدس ہے بلکہ وہ مشکلات کو آسان سمجھتا ہے اور اس کا یقین دلا دیتا ہے۔ چرچل کی کامیابی اس کے اسی کوبڑ پر رقص کرتی رہتی ہے۔

اس کے برخلاف لائڈ جارج ہیں۔ لائڈ جارج ان لوگوں میں ہیں جن کو غیر ایمان دار نہیں کہا جا سکتا اور محض اس بنا پر کہ وہ مواعظ جبلی کے قائل کب ہیں۔ لائڈ جارج کا کوبڑ دو شاخہ ہے۔ بجائے خود یہ آرٹسٹ ہے۔ لیکن سیاست میں پھاند پڑا اور آرٹسٹ کے داعیات بھلا نہ سکا۔ اس لئے اس کی جبلت اور غیر فطری انتخاب میں ہمیشہ کشاکش رہی۔ آرٹسٹ اور سیاست داں کے صحائفِ اخلاق بالکل جداگانہ ہیں۔ آرٹسٹ کا اولیں فرض یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام مظاہر سے آشنا رہے تاکہ اس میں ہمدردی اور وسعتِ نظر پیدا ہو سیاست داں کا اولیں فرض یہ ہے کہ وہ سوائے مفاد عامہ کے ہر خیال سے منھ موڑ لے اور اپنی جماعت سے ہر اس شخص کو نکال دے جس کے مقاصد مفاد عامہ کے منافی ہوں اور جو صرف مال غنیمت سے مستفید ہونا چاہتا ہو۔ لیکن آرٹسٹ کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ دیگر آرٹسٹ کا ہمساز و دمساز رہے اور اس کا خیال نہ کرے کہ ان کی "پیداوار" کہاں جاتی ہے اور کیا ہوتی ہے۔ سیاست داں کا فرض اس سلسلہ میں بالکل برعکس

ہوتا ہی۔ اس کا یہ ناقابل عفو جرم ہوگا کہ وہ کسی ایسی تحریک یا تجویز کو پاس ہوجانے دے جو مفاد عامہ کی معین تو ہو لیکن اس سے اُس جماعت کا اقتدار بڑھ جائے جس کا اثر بحیثیت مجموعی ملک کے لئے مضر ہو! لائڈ جارج نے آرٹسٹ کے فرائض تو ملحوظ رکھے لیکن سیاست داں کے فرائض بالکل فراموش کردیئے۔ بایں ہمہ سب سے بڑا کمال اس شخص کا یہ ہو کہ جب لوگ اس سے بہت زیادہ متنفر ہوتے ہیں اس وقت بھی اسے عزیز رکھتے ہیں۔ اس کے کو بڑ میں کیمیاوی اور میکانیکی دونوں خاصیتیں ہیں۔ اس کی پستی کی بنا پر ہم اس پر اعتماد نہیں کرتے اور اس کی عظمت کی وجہ سے ہم کو خود اپنے اوپر اعتماد نہیں ہونے پاتا۔

اس سلسلہ میں ریمزے میکڈانلڈ کو بھی نظر میں رکھو۔ یہ شخص ان لوگوں میں ہو جن کا عقیدہ یہ ہے کہ آخرت میں بہشت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہو کہ دنیا میں احمق بھی کہلائے۔ یہ شخص اُس زمانہ میں سب سے زیادہ بلند و پُرسطوت تھا جب اس کی جماعت نہایت قلیل اور کس مپرس تھی۔ اس کی مثال ایسے شخص کی ہو سکتی ہو کہ جس نے شباب میں محبت کی ہو اور ناکام رہا ہو اور پھر تمام عمر "تندیِ صہبائے الفت" سے "گرم و گداز" رہا۔ کیونکہ بصورت دیگر یقینی ہو کہ وہ شادی کے فرائض اور اس کے مکروہات سے پورے طور پر عہدہ برآ نہ ہوسکتا۔ میکڈانلڈ پر یہی حادثہ گزرا جب تک وہ تجرید و تخئیل کی دنیا میں رہے "جوہرِ اندیشہ کی گرمی" بے پناہ رہی لیکن وزیر اعظم بنکر کہیں کے نہ رہے۔

میں نے کہا مونڈھے صاحب کیوں نہ ہو آپ اپنی تمام بزرگی اور فرسودگی کے باوجود بھی جب گفتگو کرنے پر آتے ہیں تو اپنے علم و فضل کے اظہار کے لئے یورپ ہی کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ آج کل تحقیق اور تفتیش کی اہمیت اور جامعیت صرف اس طور پر مسلّم ہوسکتی ہو کہ ہم اس کے ثبوت میں ولایتی مصنفین یا ولایتی انکشافات کا واسطہ دلائیں۔ تنقید، فسانہ نگاری، غرض اس قسم کے جتنے علوم ہیں اُن سے ہمارے ادیب صرف اس حد تک آشنا ہیں کہ ان کا ترجمہ اُردو میں کرکے کسی رسالہ میں شائع کرا دیتے ہیں اور بس۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ ہمارے شعر و ادب یا ہمارے شعرا و ادبا کا جائزہ اُن اصول و قوانین سے کرتے جو مغرب کے ائمۂ فن نے وضع کئے ہیں اور جن سے وہ اپنے شعرا اور ادبا کو پرکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو انگریزی شعر و ادب سے ناآشنا ہیں

ان اُردو تراجم سے کسی قسم کی بصیرت حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ کام جتنا مشکل ہے اتنا ہی لفظ بلفظ ترجمہ کر دینا آسان ہے۔ تم نے بھی یہی حرکت کی ہے اور اس پر میں خاموش رہوں تو تمھارا دماغ خراب ہو اور کچھ کہوں تو آبرو ریزی ہو۔

مونڈھا پہلے تو کچھ چپ رہا لیکن پھر کسی قدر سنجیدگی سے بولا "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہندوستان زندگی کی کشاکش اور اس کی توقعات سے اتنا کبھی آشنا نہیں رہا جتنا کہ یورپ رہا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کے ہاں وہ چیزیں نہیں ملتیں جو یورپ میں عام اور مکمل ہو چکی ہیں۔ ہندوستان نوامیس طبعی کے مصائب و مہالک (مثلاً طوفان، سیلاب، قحط، وبا، آب و ہوا وغیرہ وغیرہ) سے جس قدر آشنا ہوتا رہتا ہے اتنا ہی یورپ سیاسی، معاشرتی اور ذہنی انقلابات سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور یہی سبب ہے کہ مشرق یکساں اور یکسو ہے اور اس درجہ یکساں اور یکسو کہ اس پر ایک حد تک جمود طاری ہو گیا ہے۔ یورپ میں یکسوئی ہو تو وہاں کی مخلوق تباہ ہو جائے۔ بالفاظ دیگر زرعی ممالک صنعتی ممالک سے کہیں زیادہ زندگی اور اس کے علائق سے اجنبی رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عملی زندگی سے یورپ، ایشیا سے زیادہ مکمل اور زیادہ آشنا ہے۔ اس لئے جن علوم اور فنون سے جس طور پر اور جس حد تک وہ باخبر، مرصّع یا مسلح ہے وہ ہندوستان میں معدوم ہے۔ سائنس کے کرشموں کو جانے دیجئے۔ تنقید، فسانہ نگاری، ناول، ڈراما، سینما یورپ کے آوردہ ہیں۔ یورپ والوں نے ان چیزوں کو زندگی میں دیکھا اور برتا ہے۔ ہندوستان کو ان کے مواقع نہ تھے اس لئے یہ چیزیں یہاں نہایت ابتدائی مراحل میں ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہم ان کو اپنے ہاں تطبیق دینے سے قاصر رہتے ہیں اور یہ چیزیں ہمارے ہاں نہایت درجہ ابتدائی حالت میں ہیں۔

اب مونڈھے نے کسی قدر سرگرم ہو کر کہنا شروع کیا "ہندوستان کے شعرا یا فسانہ نگاروں کا کیا کہنا۔ ان پر بگڑنا بھی بدمذاقی ہے اس وجہ سے اور یہ کہ ہر کس و ناکس نے ان کو بُرا کہنا اپنا شعار بنا لیا ہے ان بزرگوں سے کوئی پوچھے کہ آپ خود شعر اور افسانہ سے کب متہم ہوئے کہ آج شعرا یا افسانہ نگاروں کے لئے عذاب جاں بن گئے ہیں۔ ان دنوں اُردو کے رسالوں میں عجیب وبا پھیلی ہوئی ہے۔ ہر قسم کے بے فکروں کو دعوت دے رکھی ہے کہ آپ سے شعر و افسانے کیسے سرزد ہوتے ہیں۔ اس مصرعۂ طرح پر وہ طومار باندھے گئے ہیں کہ شرفا پر دنیا تنگ ہو گئی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس پر خاص خاص اوقات ہیں۔ تسمہ پا اقسام کے

فرشتے نازل ہوتے ہیں اور اس کا گلا گھونٹنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ زبان اور آنکھیں باہر نکل آتی ہیں اور یہ شعر یا افسانہ اُگلنے لگتا ہی۔ ایک صاحب جب تک کسی حسین دوشیزہ کو اپنے آپ پر عاشق نہیں پاتے اس وقت تک مطلق جھک نہیں مارتے۔ ایک ایسے ہیں جو خلوئے معدہ میں کچھ فرمانا شروع کرتے ہیں۔ دوسرے حقّہ، پان، خوشبو، تنہائی، موسیقی، سینما، برنارڈ شا، ہارڈی، شملہ، کشمیر، چوپاٹی۔ دوسروں کی دولت، اپنی کم ظرفی، جوان بیوہ، کھدر کی ساڑی، بخار کھانسی بغیر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم یقین مانو یہ صرف دھتوریا پن ہی۔ اچھے معقول لوگ اس وقت تک ہرگز لکھنے لکھانے پر مائل نہیں ہوتے جب تک کہ ان کی جان یا عزت خطرہ میں نہ پڑ جائے۔

میں نے کہا۔ میرے دوست تمھارے سر عزیز کی قسم، سچ کہتے ہو۔ مونڈھا تیور بدل کر بولا لعنت ہی میرے سچ بولنے اور تمھارے قسم کھانے پر۔ یہ قسم کھانا نہیں ہی اسے لفنگا پن کہتے ہیں۔ میں نے نہایت خفیف ہوکر کہا۔ بھائی معاف کرو۔ تم یقیناً سچ بولے اور میری قسم بھی مخلصانہ تھی یہ اور بات ہی تمھارا سر کسی قدر خلاف واقعہ ہو۔ مونڈھے نے کہا۔ کم ظرف کی سب سے بڑی علامت یہ ہی کہ وہ قائل ہونے پر بھی طعن و تمسخر سے باز نہ آئے۔ میں نے کہا۔ میرے دوست یہ بھی عالی ظرفی کا کچھ اچھا نمونہ نہیں ہی کہ کم ظرفوں پر بار بار ان کی کم ظرفی جتائی جائے۔

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے اور غالباً اس اندیشہ سے کہ جو پہلے بولا گویا اس نے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔ مونڈھا بڑا گھاگھ تھا اس نے کچھ ایسا حبس دم کیا کہ میں گھبرانے لگا۔ چنانچہ میں نے کسی قدر کاوا کاٹ کر کہا، آج کئی دن بعد موسم میں اعتدال پیدا ہوا۔ کیسی اچھی دھوپ نکلی ہی، مونڈھا یکلخت برس پڑا۔ کیوں جی، کیا کسی دوشیزہ کو بھگالے جانے کا ارادہ ہی جو سلسلہ گفتگو چھیڑنے کے لئے تم نے وہی بند ہانکا۔ فرسودہ مغربی طریقہ اختیار کیا کہ موسم اچھا یا بُرا ہی۔

میں نے کہا بھائی میں مشرقی نہیں پوربی ہوں بات نہ کروں تو باولا ہو جاؤں۔ لیکن تم نے ایسا دم سادھا کہ مجھے اختلاج ہونے لگا۔ حالانکہ ابھی ہندوستانی کپڑوں کی تفصیل باقی ہی۔ مونڈھے نے کہا تفصیل تو کب کی ختم ہو جاتی لیکن تم بیچ میں ایسے ایسے رخنے پیدا کرتے رہتے ہو کہ بات کہیں سے کہیں

جا پہنچتی ہے۔ میں نے کہا پچھلی بار ہندوستانی شعرا اور افسانہ نگاروں تک بات پہنچی تھی وہیں سے پھر سلسلہ شروع کر دیا جائے
مونڈھا بولا' میں شعرا پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں نہ کہ وباپر۔ تم نے ماگھ میلا دیکھا ہوگا۔ اس ماگھ میلے کا
بھی ایک قبلہ گاہ ہوتا ہے جس کو شاید کمبھ کا میلہ کہتے ہیں جو غالباً ۲۵ - ۳۰ سال بعد ہوا کرتا ہے۔ اس میلے میں تم نے ایک
جماعت 'ناگا' لوگوں کی دیکھی ہوگی جس طرح میلہ کے موقع پر یہ خروج کرتے ہیں اور ان کی جو کچھ ہیئت کذائی
ہوتی ہے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے' ٹھیک اسی طرح مشاعرہ کے موقع پر یہ ناگا شاعر جمع ہوتے ہیں مشاعرہ
اور کمبھ کے میلے میں صرف یہ فرق ہے کہ مؤخر الذکر کی نوبت مدت بعد آتی ہے۔ موت کی مانند مشاعرہ کا بھی کوئی
وقت معین نہیں ہے 'ناگا' اور 'ننگے' میں یوں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ ننگے کو آپ جو معنی چاہیں پہنالیں کوئی
قباحت لازم نہ آئے گی اور میری طرف سے 'بھوکے' بھی شامل کر لیجیے تو پھر سارا مشاعرہ ... ... نورٌ علیٰ نور!
مونڈھے نے کسی قدر مطمئن ہو کر کہنا شروع کیا' ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں ان شاعروں کا
تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن کے کوبڑ معنوی اور مخصوص ہیں نہ کہ ان لوگوں کا جو جاکڑ پر کوبڑ لئے پھرتے ہیں۔ کہنے کا
مقصد یہ ہے کہ ان شاعروں سے ان کے کوبڑ چھین لئے جائیں تو ان کی ساری خصوصیات زائل ہو جائیں اور
یہ کہیں کے نہ رہیں۔

اقبال کو آج جو سربلندی شعرا میں حاصل ہے اس پر کسے ایمان نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کبڑے شاعروں نے
اپنی اپنی بیساکھی سنبھال لی تھی لیکن انجام یہ ہوا کہ ان سب کو یقین آگیا کہ اقبال کے مقابلہ میں ان کے کوبڑ اور
بیساکھی دونوں کی خیر نہیں۔ اس لئے سب چپکے ہو گئے۔ اب بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی غرفش سنائی دے جاتی ہے
لیکن اس کی مثال کوٹھی کے اَن اپاہج چوکیداروں کی ہے جو سرِ شام اونگھنا یا سونا شروع کر دیتے ہیں لیکن
دو چار بھلے مانس گزرنے لگیں تو کھنکارنے لگتے ہیں جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آپ کی شرافت اور دیانتداری
مسلّم لیکن خاکسار بھی نمک حلال ہے!

ہر زبردست اور حقیقی شاعر کی شاعری کی مانند اقبال کی شاعری بھی خاص خاص کیلیوں پر گھومتی ہے۔
اس کوبڑ کی مثال نظام شمسی سے دی جا سکتی ہے یعنی جس طرح اجرام فلکی کسی مخصوص سورج یا ستارہ کے نظام سے
وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اقبال کے الہامات بھی خاص خاص مراکز سے وابستہ ہیں۔ ان سے انحراف

ناممکن ہے۔ مثلاً: جبریل، رومی، نیٹشے، آدم، یزداں، کعبہ و سومنات، اسداللّٰہی، رازی، غزنوی، پرویز، چنگیز، غزالی، عطار، شاہیں، قہستانی، صوفی و ملاّ، زندیق، خیبر، عرب و عجم، لاالٰہ، الاّ ہو، فرنگ، المانی، قیصر و دارا، غازی، شیطان، سمرقند، تبریز، کارواں، ضمیر، خضر، فلاطون، شیشہ، عقاب، المان، عطار، فاروق، کلیم، ایاز، توران۔

اسی طرح اکبر کے بھی کوڈ ہیں مثلاً:

کمسریٹ، اونٹ، علی گڑھ، پائنیر، گئو، مس، شیخ جی، مولوی، چندہ، کالج، بدھو، برہمن، عرضی، پریڈ، صاحب، میم، گزٹ، جمن، ہسٹری، پتلون، منصور، ڈاروِن، بوزنہ، توپ، یورپ، امتحان، پرچہ، خانساماں، پلٹن، اسپیچ، بنگلہ، نیچر، ٹٹو، مہذب، سرسید، لنگوٹی، گدام، ٹفن، بسکٹ، فیشن، ڈاکٹر، ہسپتال، رپٹ، تھانہ، ناقوس، پوری، انجمن۔

غالبؔ کا بھی رنگ دیدنی ہے۔

دام شنیدن، شہر آرزو، صید ز دام جستہ، محشر خیال، پہلوئے اندیشہ، باندازِ چکیدن، طعنۂ نایافت، شبنمستان، نسیہ و نقد دو عالم، جوہر اندیشہ، صیقل، زمرد، طاق نسیاں، سنگ و خشت، خود داریِ ساحل، معاشِ جنوں، نبضِ خس، شہپرِ رنگ، زنجیرِ رسوائی، مبادا، صبح محشر، کنگرِ استغنا، افشردۂ انگور، برگِ ادراک، گلبانگِ تسلّی وغیرہ۔

اصغرؔ بھی اس وادی میں پیچھے نہیں رہے ہیں، مثلاً:

حسن بیان، مجاز و حقیقت، حسن نظر، پردہ، تجلّی، رنگ صہبا، شوق، رنگینی مینا، وادیِ سینا، شاخِ آشیاں، شبنم، عقل و عشق، ساز و راز، رند، داستان، ساحل، محفل، خستگی، قیدِ نظر، فتادگی، پرواز، قفس، نغمۂ مستی، رند، برسوں، جلوۂ بے رنگ، عکس، حجاب، نمودِ ذوق، لاہوت، آواز، کاوشں وغیرہ۔

مونڈھے کی اس مردم شماری کی رپورٹ سے مجھے بڑی وحشت ہوئی اور یہیں میں نے کہا میرے دوست

تمھاری اس فہرست خوانی پر میں تم کو داد دیتا ہوں بشرطیکہ تم میرے ساتھ بھی ہمدردی کرو۔ میرے نزدیک اس فہرست کا بہترین مصرف یہ ہے کہ شعرا یا والدین اس میں سے اپنے لئے تخلص منتخب کریں۔ یا بچوں کا نام رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم نے دوسرے شعرا کے کوڑوں کا شمار کرنا شروع کیا تو نہ میری خیر ہے اور نہ سہیل کی۔ شعرا اور طلبا کے منھ لگنا بزرگوں کے نزدیک غیر دانشمندانہ فعل سمجھا گیا ہے۔

مونڈھے نے کہا۔ میرا مقصد کسی کی توہین نہیں ہے بلکہ میں نے سب کے کوڑے عرض کئے ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ شاعری کے بارہ میں جو لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاعری وہبی چیز ہے تو یہ بڑی ہولناک غلط فہمی ہے۔ شاعری بھلمنساہت قسم کی کوئی چیز نہیں ہے کہ بھلامانس ہونا بجائے خود ایک معقول فعل ہے اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ آدمی سمجھدار بھی ہو۔ لکھا پڑھا بھی ہو، دنیا دیکھے بھالے ہو، اچھی بُری صحبتوں میں بیٹھا ہو۔ ہمارے شاعر صرف اس پر اکتفا کرلیتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں اور ہم ان کے ساتھ ہر قسم کی خوبی یا خرابی محض اس بنا پر وابستہ کردیتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں۔

مستثنیات سے قطع نظر اُردو شاعری کی یہی اصلی خرابی ہے۔ چنانچہ ہمارا شاعر صرف اس فکر میں رہتا ہے کہ شعر کہے جائے، مقدمہ لکھاتا جائے، دیوان چھپاتا جائے اور —— فاقہ کرتا جائے۔ وہ شعر کہنا مقصود بالذا سمجھنے لگا ہے چنانچہ آپ دیکھیں گے بات کرنے کی اُسے تمیز نہیں، سلیقہ سے رہنا اُسے نہیں آتا، کسی مسئلہ پر اس سے گفتگو کیجے تو ٹھکانے کا جواب نہیں دے سکتا۔ معقول کتابیں اس کی نظر سے نہیں گزریں، حسنِ معاشرت سے وہ بے خبر۔ غرض کہ محض شاعر ہونے کے بعد، وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر اور بے نیاز رہتا ہے کہ دنیا نے علوم فنون، ایجادات وانکشافات، اخلاق وتمدن اور اس قبیل کی دوسری چیزوں میں کہاں تک ترقی کرلی ہے اور ان سے آشنا ہونا یا استفادہ کرنا ضروری بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ اس کے کلام میں تازگی، طرفگی لطافت، بانکپن، عمق، وسعت، بلندی، زور یا صلابت نہ پائیں گے۔ وہ زندگی کا منکر اور جذبات کا بندہ بن جاتا ہے۔ اور محض اس بنا پر کہ زندگی کو برتنا پڑتا ہے اور یہ مشکل چیز ہے اور جذبات غیر شعوری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اس لئے ان کو سہل الحصول سمجھتا ہے۔ وہ محنتی اور ایماندار ہونا پسند نہیں کرتا اس لئے کہ توکل نے اسے اپاہج بنادیا ہے۔

میں نے ایک آہ کھینچی اور ایسے سُروں میں کہ اسے ضرورت کے وقت یاس وحزن سے بھی تعبیر کیا جاسکتا تھا اور خفگی وخجالت سے بھی۔ مونڈھا خاموش ہوگیا لیکن اسی انداز سے کہ آپ چاہیں تو اسے ہمدردی کی بنا پر سمجھ لیں اور چاہیں تو تکدّر اور برہمی کو اس کا سبب قرار دیں لیں۔

میں نے کہا ہِتّرِم! مونڈھے نے بدک کر کہا یہ کیا' میں بولا' یہ ہندی اور فارسی کا ملاپ ہے' آواز کے اعتبار سے سنسکرت اور معنی کے لحاظ سے اُردو یعنی میرے دوست! مونڈھا بولا نہایت خوب' اللّٰھم زد فزد۔ اس جدت کی داد یا تو آپ کو دی جاسکتی ہے یا سر رضا علی کو جو افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کی نگہداشت کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے اس اجتہاد سے اس خیال کے ہندوؤں کی بھی تشفی ہو جائے گی کہ ہندوستان میں صرف ہندو رہ سکتے ہیں لطف یہ ہے کہ یہ خیال ہمارے دوستوں میں اُس وقت پیدا ہوا جب مسولینی حبش میں اس کا جواب ہلال احمر کو دے رہا ہے اور جرمن کہنے لگے ہیں کہ ہم کو ہماری نوآبادیات واپس ملیں۔ ہندوستان چھوڑنے کا غم مسلمانوں کو کب ہے' فکر انگریزوں کو ہونی چاہیئے یا پھر ڈاکٹر امبیدکر کو اور پھر کچھ اور نہیں تو یہ کیا کم ہے کہ مسلمانوں کے چلے جانے سے' سکھوں کو مسجد شہید گنج مل جائے گی' ہندستانی اکیڈمی کو اُردو ہندی کے قضیہ سے نجات حاصل ہو جائے گی مسلم یونیورسٹی کا میزانیہ متوازن ہو جائے گا اور اسٹیشنوں پر چائے سے ہندو مسلمانوں کی تفریق مٹ جائے گی۔

میں نے کہا مونڈھے صاحب' اس قدر برہم ہونے سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور آپ کا سن وسال اور آپ کی حالتِ صحت ایسی نہیں ہے کہ آپ ان باتوں سے اس درجہ متاثر ہوں۔ مونڈھے نے کہا موت سے وہ ڈرے جسے موت پر ایمان نہ ہو' تم اس لئے ڈرتے ہو کہ سمجھتے ہو شاید موت ٹل جائے حالانکہ موت آگئی تو ٹلتی نہیں اور نہیں آئی تو ہرگز نہیں مروگے۔ میں نے کہا اس قسم کی منطق سے تم کو شرم نہیں آتی۔ پڑھے لکھے سمجھدار لوگ اسی قسم کی بندھی ٹکی باتوں پر ہنستے ہیں' مونڈھا بولا' سمجھدار لوگ منطق پر ہنستے ہیں ایمان کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ دنیا منطق سے نہیں ڈرتی وہ ایمان سے لرزتی ہے۔ لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھوگے۔ ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ ابھی ابھی اخبارات میں ایک خبر آئی تھی کہ ترکی' عراق' عرب فارس اور افغانستان کی حکومتیں ایک ایسٹرن بلاک قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے ان کا مقصد

کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن ہندوستان ٹائمز کے کان کھڑے ہوگئے اور اس نے نہایت دل سوزی کے ساتھ ہم مسلمانوں کو اطلاع دی ہے اور غالباً اس اندیشہ سے کہ ہم ہندوؤں کے اعلان کے مطابق ہندوستان کو فی الفور خیرباد نہیں کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کو پین اسلامزم یا خلافت وغیرہ کا خواب نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اس بلاک کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے بلکہ یہ محض بے کاری کا ایک مشغلہ ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ ہندوستان ٹائمز کو اس قدر ہمدردی کی اظہار کی ضرورت کیا تھی۔ ابھی ہندوستان ٹائمز کی آواز ہندوستان کے طول و عرض میں پورے طور پر پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ مہاسبھا کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوتا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے اور ایک صاحب والسرائے سے درخواست کرتے ہیں کہ سر رضا علی شادی نہ کرنے پائیں کیونکہ اس سے جنوبی افریقہ میں جماعتی مناقشہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے!

میں نے کہا بھائی مونڈھے تم تو مونڈھے نہیں خاصے سیاست داں نکلے اور تم جانتے ہو کہ میں مونڈھے پر بیٹھکر پالٹیکس پر گفتگو کرنا قطعاً پسند نہیں کرتا۔ پالٹیکس پر گفتگو کرنے کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ یا تو خود قیدخانہ جائے یا دوسروں کو بھجوائے۔ میں اپنے میں کسی ایک کی بھی اہلیت نہیں پاتا اور پھر اصولاً مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ تم علمی اور ٹھوس باتوں کو چھوڑ کر روزمرہ کے واقعات یا متفرق اشخاص پر اظہار خیال شروع کردو۔ مونڈھے کو میری اس بیان کی صداقت پر یقین نہیں آیا، اس نے کہا، گھا گھیت کسی اور سے کرنا۔ بات اصل یہ ہے کہ علمی قسم کی باتوں سے دوسروں پر رعب پڑتا ہے اور روزمرہ کے واقعات یا اکّا دکّا اشخاص پر اظہار خیال کرنے سے آدمی پٹ جایا کرتا ہے اس لئے آپ نے فی البدیہہ یہ اصول گڑھ دیا۔ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ انسان اس وقت تک کسی اصول کی آڑ نہیں پکڑتا جب تک اس کا بے ایمانی کا ارادہ نہیں ہوتا۔ جب دیکھو کہ کوئی شخص گفتگو اس طور پر کرنے جا رہا ہے کہ اس کا "اصول یہ ہے" تو فوراً سمجھ لو کہ وہ جھوٹ بولنے یا بے ایمانی کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے ایسے وقت میں یا تو تمھیں جلد سے جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہیئے یا پھر مبلّغ اصول کی زدوکوب شروع کر دینی چاہیئے۔

میں نے کہا دوست کوئی ایسی صورت نکالو جس سے نہ تو یہ معلوم ہو کہ علمیت کی آل انڈیا قسم کی کوئی

چیز مقصود ہے اور نہ اس سردی میں ہلدی پھٹکری کی تلاش کرنی پڑے۔ بات اصل یہ ہے کہ تم نے کبڑوں کی بحث میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے سمجھنے کے لئے شانتی نکیتن وغیرہ قسم کے آرے کی ضرورت ہوگی اور تم سمجھو یہ مسلم یونیورسٹی ہے جہاں ۶ گھنٹے پڑھائی کے اور پانچ وقت نماز کے مقرر ہیں اور بقیہ اوقات میں یا تو سائرن کی تعیفر سنئے یا دردمندانِ قوم کی سب وشتم۔ اس لئے میں چاہتا ہوں جو کچھ کہو وہ ایسی کہو کہ جلد ہی سمجھ میں آ جائے اور اس سے جلد فراموش ہو جائے۔

مونڈھا ذرا فیاضی سے مسکرایا یعنی اس شخص کی مسکراہٹ کی مانند جس کے دانت مصنوعی ہوں اور ڈھیلے بھی۔ بولا دردمندانِ قوم کے کوبڑوں پر اظہارِ خیال کرنے کے لئے وقت اور فرصت چاہیے۔ تم کو شاید معلوم نہیں ہے کہ جس قوم پر سب سے زیادہ آفت نازل ہونے والی ہوتی ہے اس میں دردمندانِ قوم کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ مونڈھا ہونے کی حیثیت سے مجھے دردمندانِ قوم کے سمجھنے کے بڑے مواقع حاصل رہے ہیں۔ اور تمھیں شاید معلوم نہ ہو، ہر قوم کے دردمند بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے دردمند اور قسم کے ہوتے ہیں، مسلمانوں کے اور قسم کے۔ ان کی ذہنیت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان کے کوبڑوں کا عمودی اور افقی سکشن تراشا جائے اور اس کا خردبینی معائنہ کیا جائے۔ میں گھبرا گیا، بولا، اخی مونڈھے، اللہ بخشو، تم جہاں مجھے لئے جا رہے ہو وہاں میرا یقیناً وصال ہو جائے گا۔ مجھے پکّے گانے اور سائنٹفک بحث دونوں سے وحشت ہوتی ہے اور تم کو تو معلوم ہے مجھے جب وحشت ہوتی ہے تو مجھے کم اور دوسروں کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔

مونڈھے نے کہا، دنیا ایک مسلسل کوبڑ ہے جس طرح جغرافیہ میں خطِ ارتفاع کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح نوعِ انسان کے کوبڑوں کا بھی خطِ ارتفاع بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن تم اب تفصیل سے گھبرانے لگے ہو اس لئے میں کوبڑوں کی صرف بعض جزئیات کو معرضِ بحث میں لانا چاہتا ہوں لیکن اس قسم کے کوبڑ کو سمجھنے کے لئے بعض موٹی موٹی باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ مثلاً: طبیعاتی نقطۂ نظر سے صفحۂ ارض کے کوبڑ پہاڑ اور پلیٹو، خود پہاڑوں کے کوبڑ بسبیل تذکرہ نینی تال اور شملہ، نینی تال اور شملہ کے کوبڑ کسی کی بیوی کسی کے شوہر

شوہر اور بیوی کے کو بڑ مغربی داعیات اور مشرقی واہیات، موخر الذکر کے کوبڑ رشید احمد صدیقی۔ رشید احمد صدیقی کا کوبڑ۔ ..... مونڈھا یہیں تک پہنچا تھا کہ "اسٹما سفرکس" (فضائی خلفشار؟) کا ایسا ہنگامہ بلند ہوا کہ کچھ سنائی نہ دیا، سکون ہونے پر میں نے کہا۔ کیوں جناب اب شرافت یہی رہ گئی ہے کہ آپ وعدہ کرنے پر بھی اپنی اصلیت سے باز نہیں آتے۔ مونڈھے نے کہا تم تو ناحق گھبرا گئے۔ میں جو کچھ کہنے والا تھا۔ اس سے تم یقیناً خوش ہوتے یہ اور بات ہے کہ تم سے جو وابستہ کیا جاتا وہ میرا ازلی دشمن بن جاتا، میں نے پیچ و تاب کھا کر کہا، آپ جو احسان مجھ پر کرنے والے تھے اس کا شکریہ۔ لیکن اوباشی اور کمینگی بھی کچھ اسی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔

مونڈھے نے کہا شاباش کیسی ستھری زبان اور کتنا پاکیزہ اسلوب بیان ہے اور ذرا چہرہ کا برنخ تو ملاحظہ فرمائیے، حبش کا رلیف نقشہ ہے جس میں دریائے نیل کا منبع - - ..... مونڈھا خاموش ہونے والا نہ تھا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لمحہ بلمحہ ایک سے ایک تلخ حقیقت بیان کرتا جائے گا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک گرگ باراں دیدہ بیاس کی طرح جسے زک پہنچ چکی ہو لیکن خون کے گھونٹ پی کر ہشاش بشاش ہو میں نے کہا۔ مانتا ہوں دوست، کیا بات کہی ہے، بھائی بڑے ذہین ہو، خدا خوش رکھے، (ایک تھکی ہوئی آہ کے ساتھ) ؎

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ!

مونڈھے نے کہا چہ چہ چہ، تم تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ بھائی خدا بخشے یا نہ بخشے لیکن تمھاری خوبیاں مسلّم ہیں۔

کچھ دیر تو میں اپنی اوقات پر نفرت کرتا رہا اور مونڈھے کی شیطنت پر انگاروں پر لوٹتا رہا لیکن اس خیال سے کہ دنیا فانی ہے اور یونیورسٹی میں تعطیل ہے مونڈھے سے سلسلۂ کلام جاری رکھنے پر آمادہ ہو ہی گیا اور چونک کر بولا۔ ہاں خوب یاد آیا (نامعقول کلام کو ختم کرنے اور معقول کلام کے شروع کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے) تم نے کبڑوں کے بعض نہایت دلچسپ خصائص بیان کرنے شروع کئے تھے، مونڈھا کچھ بڑبڑایا جس کو میرے واہمہ نے یہ بتایا کہ مونڈھا میری بات ٹالنے کی شرمناک کوشش پر باآواز بلند کچھ

سوچ رہا ہے لیکن اب میں کافی ڈھیٹھ ہوگیا تھا اس لئے دشنام مے فروش، پی کر بولا لیکن بھئی نام وام لینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم تم یونہی کیا کم بدنام ہیں، کسی نے کوئی بات اڑا دی تو تخفیف تصدیعہ قسم کا کوئی حادثہ ہوجائیگا۔ مونڈھا بولا، بدنام ہوگے تو تم، یہ میں کہاں سے بیچ میں آگیا۔ مونڈھے کی یہ سرد مہری اور کج خلقی مجھے نہایت شاق گزری لیکن کیا کرتا۔ خون کے گھونٹ پہلے ہی پی چکا تھا، انگارے پر بھی لوٹ چکا تھا۔ دشنام می فروش قسم کی چیز بھی حلق سے اتاری جاچکی تھی، اس لئے سوائے جل بھن کر کباب ہونے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا، وہ بھی ہولیا تو میں نے کہا گزشتہ را صلواۃ، لیکن ابھی پوری بات بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مونڈھا کئی بار تھڑی تھڑی کرچکا تھا۔ میں نے آخر جھنجھلا کر کہا۔ بھائی تم نے تو سانس لینا دشوار کردیا۔ مونڈھے نے کہا۔ آخر تم کو تمیز کب آئے گی، گزشتہ را صلواۃ قسم کے فرسودہ فقرے استعمال کرنا کب چھوڑو گے۔ میں نے کہا۔ اچھا بھائی کان پکڑتا ہوں، توبہ کرتا ہوں۔ اب کروں تو جو سزا چور کی، اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ مونڈھا بڑی بھیانک آواز سے چیخا چپ!

میری خاموشی میں فدویت کا رنگ پاکر مونڈھا کچھ ڈھیلا پڑا۔ اس نے کہنا شروع کیا، اس وقت ہندوستان میں ہندو مسلمان انگریز متضاد جذبات کی کشاکش میں مبتلا ہیں۔ ہندو جاہ چاہتے ہیں اور مسلمان روٹی انگریز دونوں چاہتے ہیں۔ ہندوستان کو کوئی نہیں چاہتا۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، میں اس قسم کی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ مونڈھا قدرے چیں بجبیں ہوکر چپ رہا۔

کسی قدر تامل کے بعد اس نے کہا، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہر شخص اپنے اپنے کوبڑ میں مبتلا ہے۔ عام طور پر اسے انگریزی میں کمپلکس کہتے ہیں۔ جس کی تعبیر فارسی میں "ہرکس بخیالِ خویش خبطے دارد" سے کی گئی ہے۔ ابھی اس دن ایک صاحب تم سے ملنے آئے تھے۔ تم نے ان کے بارہ میں کیا خیال قائم کیا۔ ان کا کوبڑ سب سے زیادہ دلچسپ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے زیادہ لمبی ناک کسی کی نہیں ہے اور ان سے زیادہ عقلمند کوئی دوسرا نہیں ہے اور پھر شکایت یہ کرتے تھے کہ وہ کسی میں خلوص نہیں پاتے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ ان کی عقلمندی کبھی کسی دوسرے میں خلوص اور ہمدردی کے جذبات نہیں ابھار سکتی۔ ورنہ دنیا میں سب سے زیادہ ہمدرد اور مخلص شیطان کے ہوتے۔ اگر طاعون کی چھوت سے بچپن نہیں پیدا ہوسکتی تو عقلمندی کی

بھوت سے ہمدردی یا خلوص کیوں پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ بزرگ کبھی اس کے قائل نہ ہونگے کہ وہ اپنی عقلمندی سے ہمیشہ خود ہی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں حالانکہ اس دنیا میں عقلمندی سے فائدہ وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جو کبھی کبھی اپنی عقلمندی سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچنے دے۔ اس میں شک نہیں عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اپنا فائدہ ہاتھ سے نہ دے۔ لیکن سب سے بڑی عقلمندی یہ ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہو تو خاموش بھی رہے۔
تم نے محسوس کیا ہوگا یہ اپنے آپ کو مظلوم بھی سمجھتے ہیں حالانکہ اُنھوں نے مظلومی کا معیار یہ رکھا ہے کہ وہ چیز جس کے یہ مستحق نہیں ہیں وہ ان کو کیوں نہ حاصل کرنے دی گئی۔ خدا نے ان کو دولت اور حکومت دونوں دے رکھی ہے، بیوی اور بیٹیوں کا بھی شوق ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کو بڑ سے

لگا ہے پاؤں میں نکلا ہے سر سے

ان کو یہ نہیں معلوم کہ دولت اور حکومت سے اطمینان قلب نہیں حاصل ہوتا بلکہ اطمینان قلب سے سب کچھ میسر آجاتا ہے۔
ایک دوسرے بزرگ ہیں جن کی آوازیں کو بڑ ہے۔ یہ تھوڑے سے درد مند قوم بھی ہیں۔ ان کے نزدیک یونیورسٹی کا کوئی کام ٹھکانے سے نہیں چل رہا ہے اور محض اس لئے کہ یونیورسٹی نے ان کی آواز سے نہیں بلکہ سائرن سے فائدہ اُٹھانا زیادہ بہتر سمجھا، ان کو یہ مغالطہ ہے کہ معاملہ فہمی اور خلوص میں ان کا ثانی کوئی نہیں ہے اور کسی اور میں اس قسم کی کوئی صلاحیت پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ جلد مر جاتا ہے۔ موت وغیرہ قسم کی چیز کو ہر شخص مختلف معنی پہناتا ہے، آپ معنی پہنانے کے بجائے اس کے اُمیدوار رہتے ہیں کہ موت اپنا کام کر جائے اور متوفی کے وارث خود قرار پا جائیں۔ یہ ان لوگوں میں ہیں جن کو یونیورسٹی اگر بڑیاں بھیجنے کا ٹھیکہ نہیں دے سکتی تو یونیورسٹی بے ایمان اور خائن ہے اور بیڑیوں سے بڑھکر دنیا میں مفید کوئی چیز نہیں ہے۔ جس طرح سے بعض مریضوں کو بعض غذائیں نہیں راس آتیں اسی طرح ان کو کسی کی نیک نامی نہیں بھاتی۔ سوٹ پہنتے افیوں کھاتے اور اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طور پر کسی کو رسوا کیا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ ہیچ پوچ اور حقیر فقیر ایسے واقع ہوئے ہیں کہ لوگوں کو خیال بھی نہیں آتا کہ آپ کی طرف توجہ کریں۔ ان سے کچھ بعید نہیں ہے کہ کبھی یہ اپنی کس مپرسی کا یوں بدلہ لیں کہ کلاک ٹاور سے رسی باندھ کر خود کو پھانسی لگالیں اور جب سے یہ کتبۂ مزار بر آمد ہو:

"دردمندانِ قوم کی طرف سے نونہالانِ قوم کی خاطر"

آپ نے حال ہی میں ہندوستان سے سفر کیا ہے اور فی الحال سراندیپ میں رونق افروز ہیں۔ سنتے ہیں بکاولی کے عشق میں جسم کا نصف حصہ پتھر کا ہوگیا ہے۔ انگریزی میں اسے جو چاہیں کہہ لیں اردو میں صرف "نصف پتھر" کہتے ہیں۔

اس مضمون کی ابتدا یوں ہوئی کہ سہیل کے جب سارے مضامین لکھے جا چکے اور چھپ چکے تو سرور حسن کہا کہ اب آپ کا ہو جائے۔ چنانچہ جتنا جس دن لکھ لیا اتنا کاتب صاحب کے پاس پہونچا دیا گیا، خدا جانے اب تک کتنا لکھ چکا اور کیا کیا لکھتا رہا۔ یہ ضرور ہے کہ اصل مضمون آج سے شروع ہونے والا تھا لیکن ابھی ابھی اطلاع آئی کہ داستان بہت بڑھ گئی اور اب زیادتی ہوگی۔ چنانچہ یا علی کہکر اٹھ کھڑا ہوا اور مونڈھا بقیہ آئندہ ہوکر رہ گیا۔